Registered No. [illegible]

جلد ۲۷ } عدد ۱ ، ۲

۱۹۴۶ء

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

۱۹

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

دار الاسلام - جمال پور - پٹھانکوٹ

قیمت فی پرچہ ایک [illegible]

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے اُن مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جنکے متعلق آجکل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں مثلاً توحید، ہدایت و ضلالت، عبادت، جہاد، آزادی، رواداری، قومیت اسلامی، عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسول کی صحیح حیثیت، رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت، قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔ حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔ قیمت بجلد (۳؍) علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات — یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم، اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب ان سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہوگئی ہیں۔

ضخامت ۰۴۲ صفحات۔ قیمت غیر مجلد -/۲/۸ علاوہ محصول ڈاک

فہرست مضامین

عدد ۱، ۲	رجب، شعبان ۱۳۶۴ھ مطابق جولائی، اگست ۱۹۴۵ء	جلد ۲۷

سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دارالاسلام پٹھانکوٹ

سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ترجمان القرآن کی پچھلی اشاعت میں تقویٰ پر ہم نے جو مضمون لکھا ہے اس سے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ تقویٰ دراصل حدودِ الٰہی کی نگرانی و حفاظت کا نام ہے۔ جو شخص زندگی کے سفر میں، ہر مرحلہ پر، یہ جاننے کی کوشش کرے کہ خدا نے اس کے بڑھنے اور رکنے کے لیے کیا حدود قائم کیے ہیں اور پھر خدا اور روزِ آخرت کے ڈر سے خلوت و جلوت میں ان حدود کی نگرانی کرے اور دیدہ و دانستہ کسی حد کو توڑنے کی جرأت نہ کرے وہ متقی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ بات کس طرح حاصل ہو کہ آدمی اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں، خواہ اس کا تعلق پرائیوٹ زندگی سے ہو یا پبلک سے، مسجد سے ہو یا بازار سے، اخلاق سے ہو یا سیاست سے، اسی طرح اپنے سارے معاملات میں، خواہ ان کا تعلق غریب سے ہو یا امیر سے، دوست سے ہو یا دشمن سے، عزیز سے ہو یا بیگانہ سے، علیٰ ہٰذا القیاس ہر حال میں خواہ غصہ میں ہو یا محبت میں، تنگی میں ہو یا فراخی میں، خدا کے قائم کیے ہوئے حدود کا اس طرح پابند ہو جائے کہ اگر کبھی جہالت سے بال برابر بھی اس کی پابندی میں فرق آ جائے تو ہوش آتے ہی اس وقت تک کے لیے اس پر کھانے اور سونے کی لذت حرام ہو جائے جب تک وہ اپنے غلط سمت میں اٹھائے ہوئے قدم کو واپس نہ لے لے اور استغفار و توبہ کے ذریعہ سے اصلاح مافات نہ کر لے؟ ظاہر ہے کہ یہ سوال نہایت اہم ہے۔ اسی سوال کا صحیح جواب دین کے خزانہ کی اصلی کلید ہے۔ اور اسی سوال کے جواب سے یہ بات واضح ہو گی کہ ہماری خانقاہیں، جو تقویٰ پیدا کرنے کا واحد ذریعہ خیال کی جاتی ہیں، اس مقصد کے لیے کس حد تک مفید ہیں؟

دنیا میں انبیاء علیہم السلام کا گروہ وہ گروہ ہے جس کا مخصوص کام ہی تقویٰ کی دعوت اور اس کی تعلیم ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلعم کو ابتدائے وحی میں حکم ہوا کہ یٰایھا المدثر قم فانذر (اے چادر لپیٹنے والے کھڑا ہو اور لوگوں کو ڈرا)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذمہ پہلے روز جو کام سپرد کیا گیا یہی تھا کہ وہ فرعون کی قوم کو تقویٰ کی دعوت دیں [اذ نادیٰ ربک موسیٰ ان ایت القوم الظالمین، قوم فرعون الا یتقون] (جب کہ تیرے رب نے پکارا موسیٰ کو کہ ظالم قوم کے پاس جاؤ، فرعون کی قوم کے پاس کیا وہ تقویٰ نہیں اختیار کریں گے۔) حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ ہوا ہے [کذبت قوم نوح المرسلین۔ اذ قال لھم اخوھم نوح الا تتقون۔ انی لکم رسول

امین فاتقوا اللہ واطیعون] (نوح کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا، جب کہ ان کے بھائی نوح نے کہ تم تقویٰ نہیں اختیار کرتے، میں تمہارے لیے ایک امین رسول ہوں پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو) بعینہٖ یہی بات حضرت ہودؑ کی دعوت میں دو مرتبہ، صالحؑ کی دعوت میں دو مرتبہ اور لوط و شعیب علیہم السلام کی دعوت میں دو دو مرتبہ بیان ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوت کا بالکل ابتدائی نقطہ ہے۔ ہر نبی جو آتا ہے وہ اپنی قوم کو جس بات کی سب سے پہلے دعوت دیتا ہے وہ یہی ہے کہ اے لوگو تقویٰ اختیار کرو۔ پس تقویٰ کی تعلیم کا صحیح طریقہ معلوم کرنے کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ حضرات انبیائے کرام لوگوں میں کس طرح تقویٰ پیدا کرتے ہیں۔

ہم نے جہاں تک حضرات انبیاء کے طریقہ تعلیم تقویٰ کو قرآن مجید سے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ یہ حضرات اپنے زمانہ کی فسق و فجور سے بھری ہوئی دنیا پر جب نظر ڈالتے ہیں، اور انسان کی خدا سے بغاوت و سرکشی اور شہوات نفس کی پیروی میں آزادی و بے قیدی کے اسباب پر غور کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر یہ حقیقت واضح فرماتا ہے کہ انسان کی ان تمام سرکشیوں اور بے قیدیوں کی تہ میں تین چیزیں کام کر رہی ہیں۔ پہلی یہ ہے کہ لوگوں میں خدا اور اس کی صفات کا تصور بالکل غلط ہو کے رہ گیا ہے۔ دوسری یہ کہ لوگوں میں اس زندگی کے بعد کسی زندگی کا یا تو سرے سے تصور ہی نہیں ہے اور اگر ہے تو اس تصور میں ایسی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں کہ اس کی گرفت انسان کی عملی زندگی پر بالکل باقی نہیں رہی ہے۔ تیسری یہ کہ لوگوں میں سرے سے اللہ تعالیٰ کے حدود و محارم کا علم ہی مٹ گیا ہے۔ لوگ جانتے ہی نہیں کہ ان کے نفس کی خواہشوں اور دل کی چاہتوں پر کوئی روک بھی ہے۔ پس حضرات انبیائے کرام اپنی ساری قوت ان تینوں چیزوں کی اصلاح پر صرف کرتے ہیں اور جس رفتار سے وہ خدا اور اس کی صفات، آخرت اور اس کے نتائج، احکام الٰہی اور اس کے مصالح لوگوں پر واضح کرتے جاتے ہیں اسی رفتار سے لوگوں میں تقویٰ پیدا ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ جب انبیائے کرام اپنے کام سے فارغ ہو کر دنیا سے رخصت ہوتے ہیں تو اپنے پیچھے متقیوں کا ایک ایسا گروہ چھوڑ جاتے ہیں جو مدتوں تک اس تقویٰ کی حرارت کو لوگوں میں باقی رکھتا ہے۔

یہاں ہم ان تینوں چیزوں کی کسی قدر تفصیل کر دینا چاہتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ خدا، آخرت اور حدود الٰہی کے علم میں کس طرح کی غلطیاں ہیں جن کی حضرات انبیائے کرام کو اصلاح کرنی پڑتی ہے اور جن کی اصلاح کے بغیر تقویٰ کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔

۱۔ پہلی چیز یعنی خدا کے تصور کا جب یہ حضرات اپنے گرد و پیش کی دنیا پر نظر ڈال کر جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یا تو لوگ سرے سے خدا کو مان ہی نہیں رہے ہیں۔ یا مان رہے ہیں تو اس طرح مان رہے ہیں کہ اس طرح ماننے اور نہ ماننے میں نتیجہ کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔ مثلاً جو لوگ خدا کو مانتے ہیں وہ صرف اس حد تک مانتے ہیں کہ وہ آسمان و زمین کا خالق ہے۔ یہ نہیں مانتے کہ وہی تناسب کا مالک اور حاکم بھی ہے۔ یا یہ تو مانتے ہیں کہ ہر چیز کو وجود اسی نے بخشا ہے لیکن یہ نہیں مانتے کہ وہی تناسب کا محافظ و نگران بھی ہے۔ ان کے نزدیک اس میں کوئی قباحت نہیں کہ آسمان کے عرش حکومت

پیدا کر دیا ہو اور زمین کا انتظام وہ اپنے دوسرے مقربین کے حوالہ کر کے اس سے بالکل غیر متعلق ہو جائے۔ اسی طرح وہ خدا کو بھی مانتے ہیں اور اس کے ساتھ اس کے دوسرے سیکڑوں شریکوں کو بھی مانتے ہیں جن کو اس کے دربار میں ایسی رسائی اور تقرب حاصل ہے کہ جس کو چاہیں معاف کرا دیں اور جس کو چاہیں سزا دلا دیں۔ اس کی عبادت کا حق ان کے نزدیک اس سے ادا ہو جاتا ہے کہ مخصوص اوقات میں اس کی پوجا کر لی جائے یا اس کو خوش کرنے کے لیے اس کے حضور میں کوئی نذر گذران دی جائے یا کوئی قربانی پیش کر دی جائے۔ اس عبادت کے مقتضیات میں سے نہ تو یہ بات ہے کہ تنہا اسی کی اطاعت اور غلامی کی جائے اور نہ وہ خدا کی صفات کا یہ کوئی لازمی تقاضا سمجھتے کہ وہ خلق کی ہدایت کے لیے کوئی قانون نازل کرے اور کوئی نبی و رسول بھیجے اور انسانوں پر اس کی اطاعت لازمی ہو۔ علیٰ ہذا القیاس وہ خدا کو خالق مانتے ہیں لیکن یہ نہیں مانتے کہ وہ مار دینے کے بعد دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔ یا انسان کے تمام کھلے اور چھپے سے واقف ہے، یا اس کے ہر کام میں حکمت ہے، یا وہ عادل اور قسط کو قائم کرنے والا ہے یا دوسروں کے خوف و لحاظ اور ان کی مدد و اعانت سے بالکل مستغنی ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کو نہ ماننے والے اور اس طرح ماننے والے نتیجہ کے لحاظ سے یعنی خدا سے بے خوفی میں، دونوں برابر ہیں۔ پہلا گروہ اس وجہ سے بے پروا ہے کہ وہ خدا کو مان ہی نہیں رہا ہے اور دوسرا اس وجہ سے مستغنی ہے کہ اس نے خدا سے بچنے کے لیے صدہا راستے پیدا کر لیے ہیں اس وجہ سے انبیائے کرام پہلے گروہ میں خدا کا اعتقاد پیدا کرتے ہیں اور دوسرے گروہ کے عقیدہ کی اصلاح کرتے ہیں کیونکہ جب تک خدا پر سچا اور پکا ایمان نہ ہو اور وہ ایمان شرک کی تمام آلائشوں سے بالکل پاک نہ ہو اس وقت تک خدا سے تقوی ایک بالکل بے معنی لفظ ہے۔ جو شخص خدا کو تنہا مالک اور حاکم مان ہی نہیں رہا ہے آخر وہ اس کی اطاعت و بندگی کیوں کرے؟ جو شخص اس کو علیم و خبیر یقین ہی نہیں کر رہا ہے وہ خلوت و جلوت میں اس سے اس طرح ڈرتا کیوں رہے کہ اس کے کسی حکم کی ادنیٰ خلاف ورزی بھی نہ ہونے پائے؟ اور بالفرض وہ پبلک میں کسی مصلحت سے کوئی کھلی ہوئی نافرمانی نہ کرے لیکن آخر تنہائی میں اس کا خوف اپنے اوپر کیوں مسلط رہنے دے؟ جو شخص اس بات پر عقیدہ رکھتا ہی نہیں کہ خدا عادل اور قسط کو قائم کرنے والا ہے وہ ظلم و ناانصافی سے کیوں ڈرے؟ جو شخص اس بات کا قائل ہی نہیں کہ خدا کو ہماری روزمرہ زندگی سے کوئی تعلق ہے، اور اس نے ہماری اس زندگی کو حدود کے اندر پابند رکھنے کے لیے کچھ قوانین اتارے ہیں، آخر وہ خدا سے ہر قدم پر کانپتا کیوں رہے؟ جس شخص کا اس بات پر ایمان ہی نہیں کہ خدا ہی حاکم علی الاطلاق، بادشاہ اور قانون ساز ہے۔ آخر وہ اپنی یا دوسروں کی حکومت اور قانون سازی کو بغاوت کیوں سمجھے؟ اس وجہ سے تقوی پیدا کرنے کے لیے سب سے مقدم چیز یہ ہے کہ خدا کی ذات، اس کی صفات اور اس کے حقوق کا صحیح صحیح علم پیدا کیا جائے اس کے بغیر تقوی پیدا کرنے کی ساری تدبیریں بالکل اوپری ہوں گی جن سے ممکن ہے خانقاہی قسم کا ایک بالکل غیر متوازن تقشف تو پیدا ہو جائے لیکن وہ تقوی ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا جو حدود الٰہی کی کامل محافظت سے عبارت ہے اور جس کو پیدا کرنے کے لیے حضرات انبیائے کرام تشریف لائے تھے۔

---

(۲) دوسری چیز یعنی عقیدۂ آخرت کا جب انبیائے کرام جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ لوگ یا تو سرے سے موت کے بعد کسی زندگی اور روزِ حساب کے قائل ہی نہیں رہے ہیں اور اگر قائل ہیں تو صرف ایک مفروضہ کے درجہ میں قائل ہیں اور یہ مفروضہ بھی ان کے اندر خدا اور اس کے حدود کا احترام اور خوف پیدا کرنے میں بالکل بے اثر ہے کیونکہ اگر ایک طرف وہ یہ مانتے ہیں کہ اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی ہے جس میں اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی پڑے گی تو دوسری طرف شرکاء و انداد کی شفاعت کے بھی قائل ہیں جن کی نسبت ان کا اعتقاد ہے کہ وہ خدا کے ہاں اس قدر زور و اثر رکھتے ہیں کہ وہ اپنے پرستاروں کو بہرحال خدا سے بخشوالیں گے۔ دوسرے بعض ایسے ہیں جو اپنے نسب ہی کو اپنی نجات کے لیے بالکل کافی سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کے آباء و اجداد خدا کے محبوب تھے اس وجہ سے وہ بھی اللہ کے محبوب اور چہیتے بن گئے ہیں اس وجہ سے اولاً تو خدا کی جہنم کے وہ سزاوار نہیں اور اگر سزاوار ٹھہرے بھی تو زیادہ سے زیادہ چند دنوں کے لیے۔ بعض دوسرے اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہیں کہ انسان فطری گنہگار ہے۔ اس کے پاک اور متقی ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انسان کے ساتھ عدل کا معاملہ نہیں کیا ہے بلکہ رحم کا معاملہ کیا ہے اور اس کی نجات کے لیے اس نے اپنے محبوب بیٹے کو بھیجا جو سولی پر چڑھ کر تمام انسانوں کے لیے کفارہ ہوگیا۔ اب انسانوں کی نجات کے لیے کسی پرہیزگاری اور تقویٰ، کسی بندگی و اطاعت کی ضرورت نہیں ہے، صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ لوگ خدا کے بیٹے پر ایمان لائیں جو اس پر ایمان لائیگا وہ نجات پائیگا اگرچہ اس سے ایک نیکی بھی صادر نہ ہوئی ہو اور جو شخص اس پر ایمان نہیں لائے گا وہ نجات سے محروم رہے گا اگرچہ اس سے ایک برائی بھی سرزد نہ ہوئی ہو۔ دوسرے بعض ایسے ہیں جو اگرچہ آخرت کے قائل ہیں لیکن اس کو اس قدر دور سمجھتے ہیں کہ اس کے لیے کسی تقویٰ اور پرہیزگاری کا اہتمام بالکل فضول سمجھتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو نجات اپنے گروہ کا حق سمجھتے ہیں۔ جو ان کے اندر شامل ہے اس کی نجات ہوگی خواہ اس کے اعمال کچھ ہوں، جو ان سے باہر ہے وہ نجات سے محروم ہے اگرچہ وہ کتنا ہی نیک ہو۔ ظاہر ہے کہ جو شخص آخرت کا سرے سے قائل ہی نہیں ہے اور اپنے آپ کو بالکل غیر مسئول اور مطلق العنان سمجھ رہا ہے اس سے تقویٰ کا مطالبہ بالکل بے معنی ہے اور اگر آخرت کا تو قائل ہے لیکن غلط شفاعت کے چکر میں پڑا ہوا ہے یا نسب کے غرور اور گروہ کی عصبیت میں مبتلا ہے یا خدا کے رحم اور عدل کا تصور اس کے دماغ میں غلط ہو کے رہ گیا ہے تو اس کو بھی تقویٰ کی دعوت دینا بالکل بے معنی ہے۔ ان میں سے ہر وہم تقویٰ کی جڑ اکھاڑ دینے کے لیے کافی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ایک ایسی شفاعت کا یقین لیے بیٹھا ہے جو باطل کو حق اور حق کو باطل بنادے گی اس کو خدا سے ڈرنے کی کیا ضرورت؟ جو شخص اس خبط میں مبتلا ہے کہ اسے جو کچھ حاصل ہے اس کے نسب اور اس کے استحقاق ذاتی کا کرشمہ ہے۔ دنیا میں بھی حاصل ہے اور آخرت میں بھی حاصل رہے گا اسے خدا کی پرسش کی کیا پروا ہو سکتی ہے؟ اسی طرح اگر کسی کے دماغ میں خدا کے رحم کا ایک غلط تصور پیدا ہوگیا ہے اور وہ خدا کے عدل کو اس کے رحم ہی کا مظہر نہیں سمجھ رہا ہے تو وہ خدا سے ڈرے گا کیوں؟ ایسے لوگوں کے اندر تقویٰ پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے اندر اول تو عقیدۂ آخرت کو راسخ کیا جائے ثانیاً ان تمام رخنوں کو بند کیا جائے جو اس عقیدے کے تمام اثر کو باطل کردینے والے ہیں۔ چنانچہ حضرات انبیائے کرام ان لوگوں کو پہلے ایمان بالآخرت کی دعوت دیتے ہیں اور آخرت کے

قطعی ہونے پر آفاق و انفس سے ایسے دلائل پیش کرتے ہیں جن کا انکار صرف ایک ہٹ دھرم ہی کر سکتا ہے اور ساتھ ہی ان تمام غلط تو ہمات کی ایک ایک کرکے بیخ کنی کرتے ہیں جو انسان میں غلط قسم کی بے پروائی اور جسارت پیدا کرتے ہیں مثلاً شفاعت کے غلط تصور کی پوری وضاحت کے ساتھ تردید کر دیتے ہیں کہ خدا کے ہاں کوئی آدمی یا فرشتہ بغیر اس کی اجازت کے کسی کی شفاعت نہیں کر سکے گا اور جس کو شفاعت کی اجازت دی جائے گی وہ صرف سچی بات کہہ سکے گا کوئی بات خلاف حقیقت نہ کہے گا۔ اور کوئی شفاعت نہ حق کو باطل کر سکے گی نہ باطل کو حق۔ علیٰ ہذا القیاس نسب و حسب خدا کے یہاں کچھ کام نہ آئے گا وہاں صرف عمل و اطاعت کی پوچھ ہوگی۔ جو لوگ عمل کے لحاظ سے بھرپور ہوں گے وہ خدا کے یہاں اسی لحاظ سے اونچے سے اونچا درجہ پائیں گے اگرچہ نسب و خاندان کے اعتبار سے نیچے درجہ میں گنے جاتے ہوں۔ اور جو لوگ عمل سے خالی ہوں گے وہ خدا کے ہاں محروم و نامراد ہوں گے اگرچہ انھیں حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر ہی کی اولاد میں ہونے کا شرف حاصل ہو۔ نیز وہ یہ حقیقت بھی اچھی طرح واضح کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی کا یہ تقاضا ہے کہ وہ ایک انصاف کا دن لائے جس میں مظلوموں کی دادرسی کرے اور ظالموں کو ان کے کیے کا بدلہ دے۔ اس کی رحمت کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ ظالموں اور سرکشوں کو معاف کر دے۔ اگر وہ ایسا کرے تو نعوذ باللہ وہ عادل ہے نہ رحیم ہے۔

---

(۳) ان دونوں کاموں سے فارغ ہونے کے بعد حضرات انبیائے کرام جب اللہ تعالیٰ کے حدود کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حدود و قوانین شریعت کا بڑا حصہ بالکل مٹ چکا ہے۔ اللہ کا حرام کیا ہوا حلال ہے۔ اس کا حلال کیا ہوا حرام ہے۔ جو بات اس کی نظروں میں مبغوض تھی وہ محبوب بن گئی ہے، جو محبوب تھی مبغوض بن چکی ہے۔ زندگی کے ہر گوشہ میں معروف منکر بن چکا ہے اور منکر نے معروف کی جگہ لے رکھی ہے۔ معاش میں، معیشت میں، عدل میں، سیاست میں، تہذیب میں، معاشرت میں، تعلیم میں، تربیت میں، عادات و اخلاق میں، اٹھنے بیٹھنے میں، چلنے پھرنے میں، ہنسنے بولنے میں ہر جگہ شیطان نے گھس کر انڈے بچے دیدیے ہیں اور سارا نظام زندگی فاطر اور فطرت کے منشا کے بالکل خلاف ہو کے رہ گیا ہے۔ چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندگی کے ایک ایک گوشہ کی چھان بین کرتے ہیں اور ہر گوشہ کو غیر فطری اور غیر الٰہی عادات و رسوم سے بالکل پاک کرکے فطرت اور شریعت کے بالکل مطابق کرتے ہیں۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے یہاں تقویٰ پیدا کرنے کا طریقہ یہی ہے۔ آنحضرت صلعم کی بعثت کی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈال کر آدمی اس بات کی تصدیق کر سکتا ہے۔ مکہ کی زندگی میں آپ نے جس طرح لوگوں کو تقویٰ کی تعلیم دی مکی سورتوں میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔ ہر آدمی ان سورتوں کو سرسری طور پر پڑھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ یہ سرتاسر خدا، اس کی توحید، اس کی صفات حسنیٰ اور آخرت کے دلائل و احوال سے لبریز ہیں۔ اور اتنی قوت و شدت اور اتنی گوناگوں شکلوں میں ان سورتوں کے اندر یہ مطالب بیان ہوئے ہیں کہ جن لوگوں کو اول اول یہ سورتیں سنائی گئیں ان کے لیے اس دعوت سے بے پروا رہنا اور اپنی طفل تسلیوں کے فریب میں بدستور غافل پڑے رہنا ناممکن ہو گیا۔ ان کے لیے صرف دو ہی صورتیں

ممکن رہ گئی تھیں یا تو داعی کی دعوت پر لبیک کہیں اور غفلت کے بستروں کو چھوڑ کر خدا کی طرف بھاگیں یا پھر پوری قوت سے اس پر اثر دعوت کو دبا دیں جس نے ان کے لیے چین کی نیند حرام کر دی ہے۔ چنانچہ ان سورتوں کے نزول کے بعد پورے عرب میں ایک شخص بھی اسلامی دعوت کے بارہ میں غیر جانبدار نہیں رہ گیا تھا یا تو اس کا جان و دل سے حلیف بن کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اس کو مٹائے بغیر اس کے لیے خواب و خور حرام تھا یا اتنا شدید حامی کہ سب کچھ گوارا تھا لیکن اگر نہیں گوارا تھی تو یہ بات کہ کوئی قدم بھی تقویٰ کے خلاف اٹھے۔ تقویٰ کا اس درجہ شدید احساس کہ خدا کے حکم کی تعمیل کی راہ میں ہر جوکھم آسان ہو گئی، صرف اس چیز کا نتیجہ تھا کہ خدا اور آخرت کے بارے میں ان کا علم بالکل صاف ہو گیا تھا۔ اتنا صاف کہ اس کے بعد ان کے لیے خدا کی طرف بھاگ کھڑے ہونے کے سوا کوئی صورت باقی ہی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ جس جنت الحمقاء میں اب تک پڑے سو رہے تھے انھیں دفعۃً نظر آیا کہ اس کے گوشہ گوشہ میں آگ لگ چکی ہے اب اگر جان بچانے کی کوئی شکل ہے تو صرف یہی کہ جس دروازہ پر پیغمبر کھڑا بلا رہا ہے اس کا رخ کیا جائے۔ جو لوگ ظاہر مخالفت پر کمربستہ تھے ان کی مخالفت بھی ان گھبرائے ہوئے اور بدحواس لوگوں کی دوڑ دھوپ کے مانند تھی جو آگ کے خطرہ سے تو بچنا چاہتے ہوں لیکن نجات کے جس راستہ کی طرف نبی دعوت دے رہا ہو اس کی طرف جانے سے اس وجہ سے گھبراتے ہوں کہ اس راستہ سے ان کو اس بات کی اجازت تو ہے کہ وہ اپنی جانیں بچا لے جائیں لیکن اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ اپنے سارے اثاث البیت کے ساتھ نکل سکیں۔ چونکہ دنیا کی محبت ان پر غالب تھی اس وجہ سے باوجودیکہ حق ان پر واضح تھا لیکن وہ حق کا ساتھ نہ دے سکے۔

اس ساری تفصیل سے دو باتیں واضح ہوئیں۔ پہلی یہ کہ اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت اور آخرت کا صحیح علم آدمی کے اندر وہ بےچینی پیدا کرتا ہے جس سے وہ خدا کی طرف بھاگتا ہے جو تقویٰ کی اصل حقیقت ہے اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور آخرت کا صحیح علم ہی وہ پاسبان ہے جو آدمی کے دل کے اندر بیٹھ کر اس کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ خدا کے احکام و قوانین کی پوری پابندی کرے اور کسی جگہ بھی سرِمو اس کے حدود سے تجاوز نہ کرے۔ اگرچہ یہ باتیں بالکل واضح ہیں لیکن قرآن مجید سے یہاں ہم بعض آیتیں نقل کیے دیتے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ تقویٰ کے پیدا ہونے اور باقی رہنے کا انحصار سرتاسر اللہ تعالیٰ کی صفات اور آخرت کے صحیح علم و یقین پر ہے۔

پہلے ہم بعض وہ آیتیں نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ تقویٰ کا پیدا ہونا اللہ تعالیٰ کی صحیح صفات کے علم پر منحصر ہے۔ سورہ بقرہ میں طلاق کے احکام و قوانین کے بیان کے بعد فرمایا:-

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (بقرہ ۲۳۱) اور اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ اللہ ہر بات کو جاننے والا ہے۔

اس آیت میں تقویٰ کا حکم دینے کے بعد اللہ تعالیٰ کی صفت علم کی یاد دہانی کی گئی ہے۔ کیونکہ خدا کے حدود کی پوری حفاظت وہی کر سکتا ہے جو یہ مانتا ہو کہ اللہ تعالیٰ ہر بات سے باخبر ہے۔ یہ چیز دو مختلف پہلوؤں سے آدمی کے اندر تقویٰ پیدا کرتی ہے۔ جہاں کہیں انسان کا نفس کسی خیانت یا جسارت پر اکساتا ہے وہاں اللہ تعالیٰ کی صفت علم کا تذکرہ آدمی میں خدا کا

خوف پیدا کرتا ہے اور جہاں کہیں آدمی اللہ تعالیٰ کے حدود کی پابندی کے لیے بازیاں کھیلتا ہے، مصائب جھیلتا ہے، نقصانات گوارا کرتا ہے وہاں یہ یقین کہ اللہ تعالیٰ اس کی ان جاں بازیوں کو دیکھ رہا ہے اس میں اعتماد و قوت پیدا کرتا ہے۔

پھر احکام رضاعت کے ذکر کے بعد فرمایا:-

وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (بقرہ ۲۳۳)

اگر تم چاہو کہ اپنے بچوں کو دودھ پلواؤ تو تم پر کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ ادا کرو جو تم نے دیا ہے دستور کے مطابق اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یاد رکھو کہ اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کو دیکھنے والا ہے۔

اس آیت میں تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے بصیر ہونے کی یاد دہانی کی گئی ہے۔ اس صفت کا علم بھی آدمی میں ان ہی دو پہلوؤں سے تقویٰ پیدا کرتا ہے جن کا ذکر اوپر ہوا۔

وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ

اور چاہیے کہ وہ شخص لکھوائے جس پر حق عائد ہوتا ہے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے۔

اس آیت میں تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت یعنی اس کے مالک و حاکم ہونے کو یاد دلایا گیا ہے۔

فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ (۲۸۳۔ بقرہ)

پس چاہیے کہ جس شخص کے پاس امانت رکھی گئی ہے وہ امانت ادا کرے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے۔

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۷۶۔ آل عمران)

ہاں جس نے اپنے عہد کو پورا کیا اور تقویٰ اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ متقیوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس آیت میں اہل تقویٰ کی حوصلہ افزائی کے لیے اللہ تعالیٰ کی اس صفت کو یاد دلایا گیا ہے کہ وہ متقین سے محبت کرتا ہے۔

يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ (۱۱۴-۱۱۵ آل عمران)

اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، معروف کا حکم دیتے ہیں منکر سے روکتے ہیں، بھلائی کے کاموں میں مسابقت کرتے ہیں، وہی لوگ نیکوکاروں میں سے ہیں اور جو بھلائی کے کام وہ کریں گے اس کا انکار نہ کیا جائے گا اور اللہ متقیوں سے باخبر ہے۔

یہاں تقویٰ کے اصلی کام بھی بتا دیے ہیں اور ان کاموں میں جو جوکھم ہے اس کو برداشت کرنے کے لیے جس اعتماد اور قوت کی ضرورت ہے وہ بھی دو لفظوں میں بخش دی کہ اللہ متقین سے باخبر ہے یعنی جو لوگ تقویٰ کی خاطر قربانیاں کریں گے اللہ تعالیٰ ان سے اچھی طرح باخبر ہے ان کی محنتوں کا پورا صلہ دے گا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا

اے لوگو اپنے اس رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور بنایا اسی سے اس کا جوڑا اور پھیلائے ان دونوں سے بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں اور اس اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے طالب مدد ہوتے ہو اور رحم سے۔ بے شک اللہ تم پر نگراں ہے۔

یہاں تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت 'رقیب' کو یاد دلایا ہے یعنی وہ ہر شخص کی اور اس کے ہر قول

عمل کی نہایت کڑی نگرانی کر رہا ہے۔

وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا (۲۰ - النساء)

اور اگر تم احسان کروگے اور تقویٰ اختیار کروگے تو اللہ تمھارے اعمال کی خبر رکھنے والا ہے۔

وَلَقَدْ وَصَّیْنَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَاِیَّاکُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰہَ وَاِنْ تَکْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ

اور ہم نے وصیت کی ان لوگوں کو جن کو کتاب دی گئی تم سے پہلے اور تم کو کہ اللہ سے ڈرو اور اگر تم کفر کروگے تو یاد رکھو کہ اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔

اس آیت میں تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اس بات کی یاد دہانی کی گئی ہے کہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ (الطلاق)

اور جو اللہ سے ڈرے گا اس کے لیے وہ راہ پیدا کرے گا اور اس کو وہاں سے رزق دے گا جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہوگا۔

تقویٰ پر قائم رہنے کے لیے، بالخصوص ایسے مواقع پر، جہاں آدمی کو مالی و معاشی مشکلات کا سامنا ہو، اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی اس صفت کو یاد دلایا گیا ہے کہ وہ وہاں سے رزق کا سامان کرتا ہے جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا۔

اب ان آیات پر غور فرمایئے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ پیدا کرنے اور تقویٰ پر قائم رکھنے کے لیے آخرت کا صحیح علم و یقین اور اس کا تذکر ضروری ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّکُمْ مُّلٰقُوْہُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ (۲۲۳ بقرہ)

اللہ سے ڈرو، اور یاد رکھو انھیں اس سے ملنا ہے اور مومنین کو خوشخبری دو۔

وَاذْکُرُوا اللّٰہَ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ لِمَنِ اتَّقٰی وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّکُمْ اِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ

اور اللہ کو یاد کرو گنتی کے چند دنوں میں تو جس نے جلدی کی دو دنوں میں تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جس نے تاخیر کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں یہ اس کے لیے ہے جو تقویٰ پر قائم رہے اور تقویٰ اختیار کرو اور یاد رکھو کہ تم خدا کے پاس اکٹھے کیے جاؤ گے۔

وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ (۲ - مائدہ)

اور نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرو اور حق تلفی اور زیادتی کی باتوں میں تعاون نہ کرو اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ سخت پاداش والا ہے۔

فَکُلُوْا مِمَّآ اَمْسَکْنَ عَلَیْکُمْ وَاذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلَیْہِ وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ

پس کھاؤ اس میں سے جو تمھارے لیے روک رکھیں اور اس پر اللہ کا نام لو اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ جلد حساب چکانے والا ہے۔

ان تمام آیات میں تقویٰ کا مطالبہ کیا ہے اور ساتھ ہی یاد دہانی کی ہے کہ "خدا سے ملنا ہے" "اس کے پاس اکٹھے ہونا ہے" "وہ سخت پاداش والا ہے" "جلد حساب چکانے والا ہے" کیونکہ انہی صفات کے یقین اور ان کی یاد دہانی سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔

اس ساری تفصیل سے یہ بات واضح کرنی مقصود ہے کہ حضرات انبیاء کرام جن کا اصلی کام ہی لوگوں میں تقویٰ پیدا [illegible] انھوں نے اپنے اپنے زمانوں میں لوگوں کو آزادی کی دعوت دی وہ تقویٰ ہی تھا۔ لوگ اللہ کے حدود و احکام [illegible] اس کی [illegible] اپنی خواہشوں کی پیروی کریں نہ ان لوگوں کے پیچھے چلیں جو [illegible] پیچھے چلتے ہیں [illegible] اس قانون کی پیروی کریں جو اللہ نے [illegible] زندگی کے بعد ایک اور [illegible] زندگی ہے جس میں ہر شخص کو خدا کے سامنے اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی پڑے گی [illegible] کی بھی [illegible] اس سے [illegible]

اس تقویٰ کو پیدا کرنے کے لیے انھوں نے لوگوں [illegible] آخرت کا [illegible] پیدا کیا۔ خدا اور اس کے اسماء و صفات کی [illegible] جو مشرک تھے ان کے شرک [illegible] زمین کے معاملات کی بابت کوئی خبر تھی نہ ان [illegible] اور عزیز و حکیم خدا ہی کو آسمان و زمین کے سارے معاملات کی [illegible] کہتے تھے کہ اس نے پیدا کیا اور پیدا کرکے اس دنیا کے نیک و بد سے [illegible] اس کائنات پر ہر آن متصرف ہے۔ اس نے جس طرح لوگوں کو پیدا کیا ہے اور ان کی زندگی کے [illegible] کیے ہیں اسی طرح ان کی ہدایت کے لیے انبیاء بھی بھیجے ہیں، اور رہنمائی کے لیے قانون بھی نازل کیا ہے [illegible] سب کا معبود ہے اس طرح وہ سب کا رب، مالک اور بادشاہ بھی ہے۔ اور جس طرح اس نے [illegible] زندگی بخشی ہے اس طرح مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا اور اس زندگی کا حساب لے گا اور وہ دن ایسا ہوگا [illegible] سے کوئی چیز نہ بچا سکے گی، نہ کسی کی دوستی، نہ کسی کی سفارش، نہ کسی کا فدیہ اور معاوضہ۔ وہ تنہا مالک ہوگا اور سب مملوک و محکوم ہوں گے وہی بادشاہ ہوگا اور سب تابعدار اور رعیت ہوں گے۔

[illegible] کو دلوں میں راسخ کرنے کے لیے انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ ایک طرف تو کمال درجہ علمی و استدلالی تھا یعنی [illegible] ہر شبہہ کا جواب، ہر اعتراض کی تردید عقل کی رو سے، تاریخ کے پہلو سے، آفاق [illegible] انفس کی طرف سے اور دوسری طرف کمال درجہ عملی تھا یعنی توحید، معاد، رسالت کے جو حقائق سامنے آئے [illegible] ان کو [illegible] لوگوں نے قبول کر لیا ان کی ساری زندگی انہی اصولوں پر ڈھل گئی۔ اب ان کی زندگی کا کوئی قول، فعل ان اصولوں [illegible] لے کر حقیر سے حقیر جزئیات تک میں مومن بالیوم [illegible] تھے۔ اگر کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ان کی زندگی کے اندر ان حقائق سے متناقض [illegible] ان کے دلوں میں [illegible] کوئی معمولی سے معمولی بات بھی اگر ان کے [illegible] مطابق ہوتی تو وہ اس کو اس طرح لپک کے قبول کرتے گویا وہ [illegible] متاع گم شدہ [illegible] تھے۔

ہمارے سامنے بھی ایک دوسرا باب جو فسق و فجور سے بھری ہوئی ہے جس کے عقائد، نظریات کفر و باطل و عقائد فسق
کفر و نفاق۔ ہندوستان میں خدا پر ایمان اور رسالت پر ایمان موجود ہی نہیں ہے یا موجود ہے تو اس میں عمداً رکھتے ہیں۔ اکثر لوگ
لوگ یا تو سرے سے ان کو تسلیم ہی نہیں کرتے ہیں، یا مانتے ہیں تو اس طرح کہ اس کا ماننا نہ ماننا دونوں برابر ہے۔ خدا،
رسول اور آخرت کا اقرار نہیں بلکہ انکار دین جن کی جماعت ایمان ہے۔ ان کی دعوت پیش ہے۔ نہایت زوردار قسم کا
لٹریچر اس کی ترویج و اشاعت کے لیے بڑے بڑے کالج اور بڑی بڑی یونیورسٹیاں قائم ہیں، ان کے لیے زبردست
پریس ہے اور پھر سب سے بڑھ کر بہت ہی طاقتور سیاسی اقتدار ہے جو تمام امور کا مالک، تمام وسائل و ذرائع
پر متصرف، تمام نفع و ضرر کا خداوند ہے۔ اس دنیا کے اندر کچھ تھوڑے سے مسلمان بھی رہتے ہیں جو اس دین میں
نفس کر خدا کا نام بھی لیتے ہیں، رسول کا نام بھی جانتے ہیں اور آخرت کا بھی ذکر کرتے ہیں لیکن اس اعتبار سے دونوں
برابر ہیں کہ عملی زندگی سے خدا اور رسول کو دونوں نے الگ کر رکھا ہے۔ مسلمان نام خدا اور رسول کا لیتا ہے لیکن پیروی
انہی کی کرتا ہے جو اللہ اور رسول کے باغی ہیں۔ علم انہی کا پڑھتا ہے، فلسفہ انہی کا سیکھتا ہے، تہذیب میں، آداب میں معاشرت
میں تقلید انہی کی کرتا ہے، اپنا مال، اپنا وقت، اپنی قابلیت سب کچھ انہی پر نثار کرتا ہے اور جبراً نہیں بلکہ طوعاً کرتا ہے۔ صرف
اتنا ہی نہیں بلکہ اس پر فخر بھی کرتا ہے اور صرف خود ہی نہیں اس نقش کو پیچھے رکھنا چاہتا بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کی آئندہ
نسلیں بھی اسی نقش پر چلیں۔ یہ خدا کو ماننے کا حق صرف اس طرح ادا کر دیتا ہے کہ سجدے میں اس کی نماز پڑھ
لیتا ہے، اس کے نام پر کچھ زکوٰۃ دے دیتا ہے، مہینہ بھر کے روزے رکھ لیتا ہے۔ باقی اس کے سوا سارے معاملات زندگی میں
وہ جس کسی کی بھی اطاعت کرے اس سے اس کے خدا کو کوئی واسطہ نہیں۔ رسول کے ماننے کا حق یہ صرف اسی طرح ادا
کرتا ہے کہ نمازوں میں ان کی ذات پر درود بھیج دیتا ہے، سال بھر میں عید میلاد کے جلسے کر دیتا ہے۔ اگر ان کی شان میں کوئی
گستاخی کسی سے صادر ہو جائے تو اخباروں میں اور جلسوں میں ہنگامے برپا کر دیتا ہے لیکن یہ بات اس کی زندگی سے
رسول ہی واجب الاطاعت اور انہی کا بتایا ہوا طریقہ واجب الاتباع ہے اور ان کے طریقے کے سوا سب طریقے
شرک اور کفر ہیں، یہ اس کے ایمان بالرسول میں داخل نہیں ہے۔ آخرت کو ماننے کے معنی اس کے نزدیک یہ
کہ لن تمسنا النار الا ایاما معدودۃ، جہنم کی آگ اسے چند دنوں سے زیادہ نہیں چھوئے گی۔ یہ جتنی بداعمالیاں
کرے اور کتنے ہی گناہ دل سے چاہے کرے، یہاں تک کہ اگر ان ناخلفوں ہی کو وہ اپنا اور اپنی آل اولاد کا
دین بنائے اور اسی دین پر وہ اور اس کی نسلیں جییں اور مریں جب بھی جنت کا حقدار ہے۔ نجات اس کا
پیدائشی حق ہے۔ یہاں تک کہ کتنے مسلمان ہیں جو شائد اسلام کے نام ہی سے واقف ہیں اور دین کے واجبات میں
سے شائد ایک فرض کو بھی کبھی ادا کرنے کی انہیں توفیق نہیں ہوئی تاہم وہ مسلمان ہیں۔ ایک ایسی قوم میں
اگر آپ تقویٰ کی تعلیم دینا چاہتے ہیں تو اس کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

ایک طریقہ تو وہ ہے جو ہمارے مخالفوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ اس طریقہ کی تفصیل تو یہ ہے

ان کی خصوصیات کو نمایاں کرنے کے لیے چند باتیں ہم یہاں عرض کریں گے۔ اس طریقہ کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ سب خانقاہیں اس بات کے قائل ہیں کہ چاہے وقت کا سیاسی نظام کچھ ہو، خدائی ہو یا شیطانی، آدمی اس کا دل و زبان سے تسبیح، قرآن خوانی اور خدمت گزاری کر کے تقویٰ حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ ان کے سکھائے ہوئے طریقہ پر کچھ اعمال و وظائف کا پابند ہو جائے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ لوگ تقویٰ کا یہ مفہوم نہیں سمجھتے کہ آدمی زندگی کے تمام شعبوں میں حدود الٰہی کا پابند ہو بلکہ ان کے یہاں تقویٰ کچھ خاص اعمال ہیں اگر آدمی ان کا پابند ہے تو باقی امور میں اس کا جو حال بھی ہو اس سے اس کے تقویٰ میں کچھ فرق نہیں پیدا ہوتا۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ حضرات تقویٰ کی تعلیم کے لیے عقل و استدلال کے راستہ کے قائل نہیں ہیں بلکہ توجہ اور صرف قلب کے قائل ہیں۔ شیخ کا باطنی تصرف ان کے یہاں تقویٰ پیدا کرنے میں اصل عامل ہے۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ یہ حضرات تقویٰ پیدا کرنے کے لیے کتاب و سنت کے طریقہ کے پابند نہیں ہیں بلکہ ان کا زیادہ تر اعتماد اپنے اور اپنے پیشرو حضرات کے تجربات پر ہے۔ جو کچھ انھوں نے سینہ بسینہ وراثت میں پایا ہے یا جو بات ان کے دل میں خطور کر جائے اس کو تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اصلی چیز سمجھتے ہیں۔ پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے تقویٰ میں مقدم و موخر کی ترتیب وہی نہیں ہے جو شریعت میں ہے۔ یہ لوگ بعض چیزوں کو بسا اوقات کوئی اہمیت نہیں دیتے جو دین میں نہایت بنیادی اور اصولی حیثیت رکھتی ہیں اور بعض دوسری چیزوں کو جو اصل دین میں بالکل ثانوی درجہ کی چیزیں ہیں اصل الاصول قرار دیتے ہیں۔ ہماری بہتر سے بہتر خانقاہوں میں تقویٰ کی تعلیم انھی خصوصیات کے ساتھ جاری ہے۔ اسی پر ان خانقاہوں کو قیاس کر لیجیے جو عام طور پر ہر شہر میں پائی جاتی ہیں اور ہر قسم کی بدعات و لغویات کا مرکز ہیں۔

اس کے بالکل برعکس ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اصلی کارفرما طاقت وقت کا سیاسی نظام ہے جب تک اس کی اساس تقویٰ پر نہ ہو اس وقت تک لوگوں میں اولاً تو تقویٰ پیدا ہونا ناممکن ہے اور اگر کسی طرح پیدا ہو جائے تو اس کا قائم رکھنا ناممکن ہے۔ اس وجہ سے ہم سب سے پہلے اس نظام فکر سے پنجہ آزمائی کرنا ضروری سمجھتے ہیں جس پر وقت کا سیاسی نظام قائم ہے۔ اور اس کو توڑ پھوڑ کر ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرت کی اساس پر قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کام کے لیے ہم نے عقل و استدلال کی راہ اختیار کی ہے اور اس ترتیب کے ساتھ جس پر اللہ کا دین اترا ہے دین کی حجت لوگوں پر قائم کر رہے ہیں۔ جن لوگوں پر توحید، معاد اور رسالت کے صحیح مقتضیات واضح ہوتے جاتے ہیں ان لوگوں کو ہم ایک نظام میں منسلک ہونے کی دعوت دے رہے ہیں تاکہ یہ سب مل کر اس اجتماعی تقویٰ کی طرف مارچ کریں جو اصلی تقویٰ ہے اور جس کے لیے جدوجہد کیے بغیر کوئی فرد اپنے تقویٰ میں کامل نہیں ہو سکتا۔ اس طریقہ میں مقدم وہی ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے مقدم کیا ہے اور موخر وہی ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے موخر کیا ہے۔ ہماری جدوجہد یہ ہے کہ وقت کی عقلیت پر اسلام کے عقائد اور اعمال کی برتری ہر پہلو سے اس طرح چھا جائے کہ لوگ اسلام کو وقت کی ساری بیماریوں کا علاج سمجھ کر اس کی طرف بڑھنے

لگیں اور تمام انسانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی اللہ تعالیٰ کے قائم کیے ہوئے حدود کے اندر بسر ہونے لگے۔ ہر شخص اللہ کو حاکم و بادشاہ مانے، ہر شخص اس کے رسول کے طریقہ کو نجات کا طریقہ سمجھے، ہر شخص اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے آگے جوابدہ یقین کرے۔ ہمارے نزدیک تقویٰ پیدا کرنے کا صحیح طریقہ یہی ہے۔ یہی طریقہ ہم نے حضرات انبیائے کرام کی زندگیوں سے سمجھا ہے۔ اور اپنی طاقت کے مطابق اسی پر چل رہے ہیں۔ جو لوگ ہمارے اس طریقہ کو انبیائے کرام کے طریقہ کے مطابق پائیں وہ ہمارے اس کام میں ہماری مدد کریں۔ باقی جو لوگ خانقاہی طریقہ کو طریق انبیاء کے موافق پاتے ہیں وہ اس کو اختیار کر سکتے ہیں۔

ایک ضروری گزارش

ہمارے ہاں جو شعبۂ استفسارات قائم ہے اس کا مقصد دراصل یہ ہے کہ جو لوگ تحریک اسلامی کو سمجھنے اور اس کے نصب العین اور طریق کار کے متعلق اپنے شبہات دور کرانے کے لیے مرکز سے خط و کتابت کریں ان کے خطوط کے جوابات دیے جاتے رہیں، نیز اسلامی نظام حیات کے ان اہم اصولی مسائل کے متعلق لوگوں کو صحیح واقفیت بہم پہنچائی جائے جن پر یا تو پردہ پڑا ہوا ہے یا جنہیں غلط طریق سے سمجھا سمجھایا جاتا ہے۔ رہے چھوٹے چھوٹے فقہی مسائل تو ان میں سے صرف ایسے مسائل کا جواب یہاں سے دیا جا سکتا ہے جنھیں صحیح اسلامی نظریہ سے عام طور پر حل نہ کیا جا رہا ہو۔

لیکن قارئین ترجمان القرآن اور جماعت اسلامی کے متاثرین کی طرف سے جو خطوط روزانہ ڈاک میں موصول ہوتے ہیں ان کے مطالعہ سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید شعبۂ استفسارات کو کوئی "دار الافتاء" سمجھ لیا گیا ہے۔ بس ایک تسلسل سے استفتے پر استفتے چلے آرہے ہیں جن پر ادنیٰ سے ادنیٰ جزئیات پر سوال کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ مسائل مقامی علماء بلکہ معمولی امام مساجد سے بھی حل کرائے جا سکتے ہیں۔ پھر بعض لوگوں کو سوال کرنے کا جنون ہو گیا ہے کہ ایک ایک خط میں بیس بیس اور تیس تیس سوالات لکھ بھیجتے ہیں۔ حالانکہ شریعت میں کثرتِ سوال کو ناپسند کیا گیا ہے، کیونکہ یہ پریشان دماغی کی علامت ہے۔

بہرحال ہم اپنے ہر کرم فرما سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ استفسارات بھیجتے وقت حسب ذیل امور کا لحاظ رکھیں۔

(۱) سوالات لکھنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ ہمارے یہاں کوئی اصطلاحی دار الافتاء نہیں ہے۔

(۲) پوچھنے کے قابل صرف وہ سوالات ہوتے ہیں جو عملی زندگی میں یا دین حق کی دعوت و تبلیغ کے دوران میں پیش آتے ہیں۔ تصنیف کردہ سوالات لکھ بھیجنا ایک فضول حرکت ہے۔

(۳) سرسری سوالات مقامی اہل علم سے، کسی دار الافتاء سے یا کسی علمی ادارے سے پوچھ لیجیے۔ ان کے بعد اگر کوئی اہم اور اصولی مسئلہ یا کوئی پیچیدہ فقہی جزئیہ حل طلب رہ جائے تو اس کا جواب اول تو جماعت کے لٹریچر اور ترجمان القرآن کے فائل سے دریافت کیجیے۔ لیکن اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو ہمیں لکھیے۔ ایسے ہی سوالات کا جواب دینے کے لیے شعبۂ استفسارات قائم کیا گیا ہے۔

(شعبۂ استفسارات)

امامت حاکمیہ کی حقیقت

اور اس کی اقسام

(ماخوذ از منصب امامت مؤلفہ شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ)

از جناب محمد سلیمان صاحب

...امت مسلمہ میں ... امامت موجود ہو ... خلافت ... ہیں ...
گر امامت حکمیہ ... کمالات کی ... ہو ... کا ... ہو ... قوم ... کوشش نہیں
... کر ... دیجیے ... حقیقت امامت کا خواں ... نہیں کر ...
کا حال ... اپنی آنکھوں کو خیرہ کرنے کے لیے موجود ہو گر ... رکھنے ... کمال میں ...
... الفاظ سے امامت حلیہ کا ایک ... تصور ... کیا جا سکتا ہے۔

گزشتہ باب میں امامت حقیقی کی جو قسمیں بیان کی گئی ہیں امامت حکمیہ کی بھی ویسی ہی متعدد قسمیں ہیں ... اس موقع ... سب
کی تفصیل ... ضروری ... یہاں مقصود صرف اس کی سیاسی حیثیت کو بیان کرنا ہے۔ چنانچہ میدان ... امامت
کے حکومت ... کا نظام ... حکومتوں کی طرح ... کا نظام ... خلافت ...
... خدا ... امامت ... حکومت الہیہ کو ...
... اور زیادہ ... تا ... قائم ... نظام ...
... سلطنت ... لیکن ... اخلاقی ...
کسی ... امامت میں ثابت کرنا ... ہے ... اس وجہ سے ... قانونی صورت ...
یہاں اصطلاحاً امامت حکمیہ کا عنوان دیا گیا ہے۔ اخلاقی ضعف کی وجہ سے خود ... قانونی ... زوال پذیر ہو جاتا ہے اور ... کے احکام
کی جگہ امیر وقت کے شخصی ... رعایا پر نافذ پذیر ہونے لگتے ہیں۔ شاہ صاحب نے اس باب میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ... قانونی صداقت
... زوال کی وہ کونسی حد ہے جس پر پہنچنے سے پہلے اسے امامت حکمیہ قرار دینا پڑتا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ شاہ صاحب کی بعض آراء سے ...
۵۵ ... باب ... ترجمان القرآن میں پیش نہیں کیا گیا ہے ... گزشتہ نمبر میں اس کا صرف ایک فصل چھپا ہے۔ اس وجہ سے ... امامت
حقیقی کی اقسام ... ان شاء اللہ کتابی شکل میں یہ تمام مباحث یکجا شائع ہو جائیں گے۔ (ن - س)

حقیقتہً یہ معدوم ہوتے چلے جاتے اور امامتِ حکمیہ کا ابھرتے چلے تو اس وجہ سے ہوتا ہے کہ سیاستِ ایمانی میں عنصرِ حق و عدل سیاستِ سلطانی کا بڑھتا جاتا ہے، اسی تناسب سے امامتِ ضمیہ غالب ہوتی چلی جاتی ہے۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے سیاستِ ایمانی کو آبِ شیریں اور سیاستِ سلطانی کو آبِ شور فرض کر لو۔ ظاہر ہے کہ آبِ شور کی جتنی مقدار آبِ شیریں میں ملائی جاتی رہے گی اسی قدر آبِ شیریں کی لطافت زائل ہوگی اور آبِ شور کی تلخی ابھرے گی، بالفاظِ دیگر دونوں پانیوں کی مقدار کے تناسب کے ساتھ ساتھ لطافت و تلخی کے مدارج بدلتے جائیں گے۔ بالکل اسی طرح سیاستِ ایمانی میں سیاستِ سلطانی کی آمیزش مختلف تناسبوں اور مختلف درجوں کی ہو سکتی ہے اور ان کے تناسبوں اور درجوں کے بدلنے سے خلافتِ راشدہ کے بعد کے ادوار میں فرق آتا جائے گا۔ اسی فرق کی تفصیل کے لیے ہم آبِ شیریں اور آبِ شور کی آمیزش کو حسبِ ذیل چار موٹے موٹے درجوں میں رکھتے ہیں:

(۱) پہلی صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ صاف اور شفاف اور میٹھے پانی کی کثیر مقدار میں ایک ذرا سا کھاری پانی ملا دیا جائے۔ اس صورت میں ذائقہ میں کوئی خاص تلخی اور تیزی محسوس نہیں ہوگی۔ بس ذرا پانی کی نفاست و لطافت میں نقص آ جائے گا اور ایسے پانی کو ضعیف طبع اور نازک مزاج لوگ تو پسند نہ کریں گے، لیکن عام لوگ اس سے سیراب ہو سکیں گے۔ نباتات کو اس سے نشوونما ملے گی۔ ہر طرح کے کام اس سے لیے جا سکیں گے اور مختلف اقسام کے نجاسات کی دھلائی اس سے ہو سکے گی۔ ان وجوہ سے یہ پانی حقیقتہً آبِ خالص نہ ہوتے ہوئے بھی آثار کے لحاظ سے آبِ خالص سے مشابہ اور فوائد کے لحاظ سے اس کی برابری کرتا ہے۔

(۲) دوسرے درجہ کی آمیزش ایسی ہوگی کہ پانی کے ذائقہ میں تیزی و تلخی خوب اچھی طرح نمایاں ہو اور ہر کس و ناکس کے لیے اس کا پینا ناگوار ہو اور اسے پینے میں کراہت ہونے لگے۔ ایسے پانی سے پیاس کی جلن کم ہونے کی بجائے اور زیادہ بھڑکے گی، اور دوسرے فوائد میں بھی فرق آئے گا۔ یعنی جو کھانا اس میں پکے گا اسے کھاتے ہوئے بدرجۂ تلخی محسوس ہوگی۔ کپڑے اس سے دھوئیں گے تو ان سے میل کچیل پوری طرح زائل نہ ہوگا۔ اسی طرح اس سے سیراب ہونے والے پودوں کی سرسبزی میں بھی نکھار نہ آئے گا۔

(۳) تیسرے درجہ کے مرکب میں میٹھے اور کھاری پانی کا تناسب ایسا ہوگا کہ کھاری پانی کی تلخی و حدت خوب زور سے نمایاں ہوگی اور مزہ اتنا بگڑ جائے گا کہ اس مرکب پانی کو بول چال میں آبِ شور ہی کہا جائے گا۔ اسے اگرچہ بضرورت پینے کے لیے استعمال کیا جائے گا، لیکن جس حد تک ممکن ہوگا اس سے اجتناب بھی کریں گے۔ یعنی کھیر اور گاڑھے کو اس میں [illegible] کے گرد دیبا و حریر اور پشمینہ کے لباس نہ دھوئیں گے، ادنیٰ درجہ کی نباتات مثلاً تمباکو وغیرہ کی فصل کو اس سے سیراب کریں گے مگر پھل پھول لانے والے نازک پودوں کی ایسے پانی سے پرورش نہ کی جائے گی۔

(۴) چوتھے درجہ کے مرکب میں میٹھے پانی کی مقدار اتنی کم اور کھاری پانی کی مقدار اتنی زیادہ ہوگی کہ شیرینی و لطافت

سلہ [illegible] سلطنت پر [illegible] بشمول [illegible] ؎ [illegible] یعنی ریاست کا نظم چلانے کے لیے خود ساختہ
[illegible] اصطلاحات [illegible] کا موضوع ہے۔

کا کوئی شائبہ تک اس میں محسوس نہ کیا جا سکے گا۔ یہاں تک کہ اس سے پانی کا کوئی فائدہ بھی حاصل نہ ہوگا اور اگر کوئی شخص مجبوری کی حالت میں اسے استعمال کرے گا بھی تو اس سے ہرگز حاجت پوری نہ ہوگی۔ مثلاً اگر وہ پیاس بجھانے کے لیے اسے پیے تو پیاس کی آگ اور بھی بھڑکے گی، اگر درختوں کو یہ پانی دیا جائے گا تو وہ مرجھا کے رہ جائیں گے اور اگر اس میں کھانا پکایا جائے گا تو وہ بدمزہ اور بدمزہ رہے گا بلکہ مضر صحت بھی! پھر کہیے ان باتوں کے ہوتے ہوئے اس مرکب پانی کو کسی درجہ میں بھی آب شیریں کہا جا سکتا ہے؟۔۔۔ اسے آپ شیریں تو کیا کہیں گے، اس کی بڑی سے بڑی مقدار کے ہوتے ہوئے پانی کے ضرورت مندوں کو کہا جا سکتا ہے کہ یہاں پانی بالکل ہے ہی نہیں! دشت بے آب میں ایسے پانی سے اگر کسی مسافر کا کوزہ لبالب بھرا ہوا ہو تو بھی وہ اپنے آپ کو ترس کی موت مرنے سے نہیں بچا سکتا۔

اب تمثیلی انداز بیان کو چھوڑ کر ہم اصل مدعا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور امامت حکمیہ کے مختلف درجوں پر بحث شروع کرتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ حقیقت سمجھ لیجیے کہ اس خوفناک بیماری کی جڑ یا اس خاردار جھاڑی کا بیج فقط جذبۂ عبودیت کا زوال ہے[1]۔

خود امامتِ حقیقی (خلیفہ راشد) کی اس حیثیت کی بنیاد جذبۂ عبودیت ہی ہوتا ہے۔ اور اسی جذبہ کے صدقے میں اس پر صفاتِ نبوت کا پرتو ڈالا جاتا ہے۔ اس کی ساری مساعی کا قبلۂ مقصود رضائے الٰہی ہوتا ہے جس کی طلب میں وہ اپنی ساری لذتوں کو قربان کر دیتا ہے۔ اس کی ساری چستیاں اور سرگرمیاں اپنے آقا و مولا کی خوشنودی کے لیے ہوتی ہیں اور وہ اپنے نفس کے تقاضوں سے بے پرواہ ہو جاتا ہے۔ اتباع ہوا و ہوس کا اس کے ہاں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ بس وہ حق و عدل کی راہ کو پوری استقامت سے طے کرتا ہے۔ اس کے قدم دوسری راہوں پر حرکت نہیں کر سکتے اور اس کی آنکھیں کسی دوسری منزلِ مقصود پر نہیں جم سکتیں۔ ماسوا اللہ کی ساری محبتوں کے جال توڑ کر وہ بارگاہِ حق تعالیٰ کی دہلیز پر ایسا بیٹھتا ہے کہ مر کر ہی اٹھتا ہے۔ اس کے بلند منصب کا احاطہ ان چند مقدس الفاظ سے ہو سکتا ہے:-

من احب للہ وابغض للہ واعطی للہ ومنع للہ فقد استکمل الایمان۔ — جس نے اللہ کے لیے محبت کی اور اللہ کے لیے عداوت کی اور اللہ کے لیے دیا اور اللہ کے لیے روکا تو اس نے ایمان کی تکمیل کر لی۔

یا ان الفاظ سے:-

من کان اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما — وہ جس کے لیے اللہ اور اس کا رسول محبوب تر ہیں اس سے جو کچھ ان کے سوا ہے

ایسی ہستی جب منصب خلافت پر متمکن ہوتی ہے تو سیاسی میدان میں اس کے مدنظر فقط خدا کے بندوں کی اصلاح کا کام ہوتا ہے اور نیابت رسول اللہ کا حق ادا کرنے کی فکر ہوتی ہے۔ اپنے ذاتی فائدوں کا لالچ اس کے دل کو رام نہیں کر سکتا ہے نہ نقصانات کا اندیشہ اس کی ہمت توڑ سکتا ہے۔ اس کے نزدیک تو اطاعت ربانی کے ساتھ

---

[1] یعنی جب ارباب حکومت میں خدا کی آقائی اور اس کے سامنے اپنی عاجزانہ غلامی کا احساس کمزور ہونے لگتا ہے تو خلافت الٰہی متغیر ہو کر امامت حکمیہ بننے لگتی ہے۔ (ن۔ص)

ہوائے نفسانی کا شریک ہو جانا شرک کا درجہ رکھتا ہے[۱] اور رضائے حق کے سوا کسی اور مقصود کی آرزو کو وہ دل کے لیے غلاظت تصور کرتا ہے۔ بندگانِ الٰہی کی صحیح تربیت کے سوا نہ ظاہراً اس کا کوئی اور مدعا ہوتا ہے۔ نہ اس کے دل کے گوشوں میں کوئی اور تمنا چھپی ہوئی ہوتی ہے! اس وجہ سے کوئی ایسی حرکت اس سے صادر نہیں ہوتی جو سیاست ایمانی سے انحراف کرنے اور سیاستِ سلطانی کی طرف مجاب جانے کا ذریعہ بن جائے، صادر ہونا تو دور رہا، ایسی مکروہ حرکت کا خیال تک اس کے دل میں نہیں گذرتا۔ خلاصہ مطلب یہ کہ فریب نفس کی یہ مجال نہیں کہ اسے صراط مستقیم سے ہٹا سکے۔

بخلاف اس کے "امام حکمی" نہ نفس کے تقاضوں سے پوری طرح بے نیاز ہوتا ہے، نہ ما سوا اللہ کی گرفت سے آزاد ——— چنانچہ مال و منال اور جاہ و جلال کی حرص، معاصرین پر تفوق کی اور اقوام و ممالک پر تسلط کی خواہش، عزیزوں دوستوں کی پاسداری اور مخالف دشمنوں کی بدخواہی، لذتِ جسمانی اور خواہشاتِ نفسانی کی غلامی، یہ سارے فتنے اس کے دل میں ابھرتے رہتے ہیں۔ بات دل ہی تک محدود نہیں رہتی بلکہ دل میں جو کچھ ہے وہ امڈ کے باہر آتا ہے اور اس کی حرکات سے نفس پرستی کا صاف صاف اظہار ہونے لگتا ہے۔ اپنے ان ذاتی مقاصد کے لیے امام حکمی سیاست کی مشین سے خوب مدد لیتا ہے اور نظامِ حکومت کو حکمت عملی سے کام لے کر اپنی نفسانیت کے ڈھب پر لے آتا ہے۔ اسی طرز سیاست کا نام ہے "سیاستِ سلطانی"! اگر ہم اس اصطلاح کی مجمل تعریف کرنا چاہیں تو اس کے لیے یہ الفاظ کافی ہوں گے:

> "سیاسی اختیارات کو ذاتی فوائد حاصل کرنے اور ذاتی تکالیف دور کرنے میں استعمال کا نام سیاستِ سلطانی ہے۔"[۲]

یہ ذاتی لذات کی ہوس جب سیاست ایمانی میں دخیل ہو جاتی ہے تو خلافت راشدہ کا زوال شروع ہو جاتا ہے

---

[۱] کس حقیقت نما انداز میں یہ بات کہی گئی ہے۔ کاش کہ اسے قارئین اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ دین کی سادی منزلوں میں مسلمان کو اس کی فکر رہنی چاہیے کہ کہیں خدا کی حکومت کو، نظام جماعتِ اسلامی کو یا دوسرے الٰہی ادارات کو چلاتے ہوئے وسیع یا محدود پیمانے پر جو نیابتی اقتدار اس کے سپرد کیا گیا ہے، اس سے وہ شخصی و ذاتی انتفاع تو نہیں کر رہا۔ کہیں اس اقتدار کے بل پر کچھ آمدنی تو نہیں بڑھ رہی، کہیں دوسروں سے خدمت تو نہیں لی جا رہی، کہیں ہم چو ما دیگرے نیست کا اعلان تو نہیں ہو رہا، وغیرہ۔ اگر ایسا ہے تو یہ خدا کی سب سے بڑی امانت یعنی نیابتی اقتدار میں خیانت ہے جس کے ڈانڈے شرک سے جا ملتے ہیں کیونکہ حکم و اقتدار کو خدا کیلیے خالص رکھنے کے بجائے جب اس میں اپنا حصہ بھی لگا لیا تو یہ گویا اس امر کا اعلان ہے کہ ہم بھی کچھ تھوڑے سے خدا ہیں۔

[۲] معاشرہ کے "دارالامان" اور "دارالسلام" بننے میں اگر کوئی چیز حائل ہے تو وہ یہی ہے کہ انسان انسان سے مختلف قوتوں کے ذریعہ ناجائز فائدے اٹھانا چاہتا ہے اور ان قوتوں میں سب سے بڑی قوت فاعلہ حکومت ہی کی ہے۔ اس ادارے کی گرفت زندگی کے ایک ایک کونے اور گوشے کو محیط ہوتی ہے، پس اسی کو شخصی اور گروہی نفع اندوزی کا قوی تر ذریعہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ سیاست سلطانی کہ نظام سیاسی کی باگ ڈور جو عوام الناس کی مشترکہ متاع ہے بلکہ ان کو بھی اللہ کی طرف سے امانت کے طور پر ملی ہے، اسے ہاتھ میں لینے کے بعد کوئی شخص عوام الناس کے فائدے کے بجائے اپنی خواہشات کے ماتحت حرکت دے۔ یہ بندوں کی خدا وندی قصر حکومت میں نمودار ہو یا عدالت میں، دکان میں یا کارخانہ میں، مدرسہ میں یا ہسپتال میں، شدید نفرت کے قابل ہے ——— سور کے گوشت اور شراب اور غلاظت سے بھی زیادہ نفرت کے قابل۔ کیونکہ ایک دفعہ اسے اگر سوئی کی نوک جتنا راستہ مل جائے تو پھر یہ اپنا راستہ خود بناتی ہے، حتیٰ کہ سیل بنکر اسلام کے پورے نظام حق و عدل کو

اور سلطنتِ جابرہ ابھرنے لگتی ہے۔ مگر چونکہ یہ ہوس مختلف اشخاص میں کم و بیش ہو سکتی ہے، یعنی بعض اس کے زور کرنے سے دین و ایمان کے دائرہ سے باہر نکل کھڑے ہوتے ہیں، بعض صرف فسق و فجور کی حد تک پہنچ کے رک جاتے ہیں، بعض پر اس سے کم اثر ہوتا ہے، صرف اتنا کہ آرام طلب بن جاتے ہیں۔ پس سیاستِ ربانی میں ہوا و ہوس کی آمیزش کے حسب ذیل مختلف مراتب ہو سکتے ہیں:۔

مرتبۂ اول:۔ امام نفسانیت سے مغلوب تو ہو مگر اس کے ساتھ ظاہر شریعت کا پابند بھی رہے، یعنی فسق و فجور اور ظلم و جبر پر اتر نہ آئے۔ اس کی آرام طلبی شریعت کے اوامر و نواہی سے ظاہراً کوئی تعرض نہ کرے بلکہ وہ صرف گنجائشوں اور رخصتوں کی تلاش میں رہے اور ان سے پورا پورا فائدہ اٹھائے۔ اس صورت کو "سلطنتِ عادلہ" کہا جائے گا۔

مرتبۂ دوم:۔ امام پر نفسانیت کا غلبہ ہو کر وہ کبھی کبھی مطلب برآری کے لیے ظاہر شریعت کے حلقہ کو بھی پھاند جائے اور فسق و فجور، بے باکیوں اور ظالمانہ دراز دستیوں کا مظاہرہ کر گذرے۔ مزید یہ کہ ان حرکات پر اس کی جبین عرقِ ندامت سے آلودہ نہ ہو اور دل توبہ کی طرف مائل نہ ہونے پائے۔ ایسے شخص کا نظامِ حکومت "سلطنتِ جابرہ" کہلائے گا۔

مرتبۂ سوم:۔ امام پر نفس پرستیوں کا غلبہ اتنا بڑھ جائے کہ اسے فسق اور عیاشی میں یکتائے روزگار بنا کے چھوڑے۔ وہ استکبار و استبداد کی جی کھول کر داد دے۔ دین حق اور سنت نبوی کے مقابلہ میں ظالمانہ اور جابرانہ قوانین گھڑ گھڑ کے لائے اور اپنے اس کرتوت کو ہنر و کمال سمجھ کر اس پہ فخر کرے۔ ایسے حاکم کی حکومت کو ہم "سلطنتِ ضلالت" کا عنوان دیتے ہیں۔

مرتبۂ چہارم:۔ نفس پرست امیر خود ساختہ احکام و قوانین کو ضوابط شرعی پر ترجیح دے اور کتاب و سنت کی پیروی کا مضحکہ اڑائے، اس کی اہانت کرے اور اس پہ طرح طرح کے اعتراضات اٹھائے۔ اپنے قوانین کے حق میں تو قصیدہ خوانی کرتا ہو لیکن شرع شریف کو محض لغویت اور ہرزہ گوئی قرار دے۔ اس کے نزدیک بادشاہ کائنات کے احکام اور نبی کریم کے ارشادات (نعوذ باللہ) مزخرفات سے زیادہ وزن نہ رکھتے ہوں جن سے اس کے زعم کے مطابق صرف جہلا اور احمق فریب کھاتے ہیں۔ ایسی امارت الحاد و زندقہ کی عمارت کھڑی کرتی ہے اور ہم اسے اصطلاحاً "سلطنتِ کفر" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

اب امامت حکمیہ کی ان چار قسموں کی تفصیل و توضیح کی جاتی ہے۔

۱۔ سلطنت عادلہ

سلطانِ عادل سے ایک ایسا سیاسی امیر مراد ہے جو ترقی جاہ و جلال اور زیادتِ عز و اقبال کا طلبگار ہو، دوستوں آشناؤں میں ممتاز رہنا چاہے، شہروں اور علاقوں پر ذاتی تسلط رکھنے کا خواہشمند ہو، ملک فتح کرنے اور حکم چلانے کا تمنائی ہو، عوام و خواص کے درمیان اپنا تفوق قائم کرنے کا حریص ہو۔ پھر لشکر اور فوجیں جمع کرنے کا، خزانوں اور دفینوں کی کثرت کا اور اعزہ پروری اور دشمن کشی کا دلدادہ ہو۔ پھر اسے جسمانی لذات کی ایسی چاٹ

پڑی ہو کر پرشوکت محلوں اور دربار چمن زاروں اور لذیذ کھانوں اور بھڑکیلے لباسوں اور تیز رو گھوڑوں اور چمکتے ہتھیاروں اور خوش رنگ پھلوں اور طرحدار معشوقوں اور سرود کے حلقوں اور شراب کی محفلوں اور بذلہ سنج رفیقوں کے پیچھے پڑا رہے۔ اس کی شدید خواہش یہ ہو کر زندگی کا دامن کلفت و رنج کے داغوں سے پاک رہے اور اس خواہش کی گود میں ہوا و ہوس کے گوناگوں فتنے پل پل کے جوان ہوتے رہیں۔ اس کے نزدیک نفسانی لذتوں کی خدمت گزاری ثمرہ سلطنت ہے اور ان کی خاطر وہ ہر گلی کی خاک چھاننے کے لیے پا بہ رکاب کھڑا ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے ــــ مگر ــــ اس کے ساتھ ساتھ اور کسی نہ کسی طرح وہ ظاہر شریعت کا احترام بھی ملحوظ رکھتا ہے اور انتہائی بے ایمان ہونے کے باوجود قوانین کتاب و سنت کے دائرے کو پھاندنے کی جرأت نہیں کرتا۔ یہ اس وجہ سے کہ شریعت کی ظاہری پابندی تک کو ختم کرا دینے کے لیے نفس امارہ کا جتنا زور درکار ہے وہ اس کے اندر پیدا نہیں ہوتا۔ اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ شریعت کی پابندی کے باوجود امام جائر کو نفس کے تقاضے پورے کرنے کا موقع کیسے ملتا ہے۔

نظام قانونی میں رخنے: یہ بات تو واضح ہے کہ بہت سے انتظامی (Executive) اور مالیاتی (Financial) معاملات امام کی رائے پر چھوڑے گئے ہیں جن پر شرع شریف نے تصریح سے حکم نہیں لگایا ہے۔ ایسے مسائل میں وقت کا امام جو فیصلہ دے گا اسی کو شریعت قرار دیا جائے گا۔ مثلاً انتظامی معاملات میں سے ایک معاملہ تعزیر کی مقدار متعین کرنے کا ہے، یعنی جن جرائم کے لیے شریعت نے قطعی حد مقرر نہیں کی ہے، ان کے لیے سزا تجویز کرنا امام وقت کا کام ہے۔ چنانچہ فرض کیجیے کہ ایک ہی جرم مختلف اشخاص سے سرزد ہوتا ہے اور یہ سب امام کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ اب یہ کچھ ضروری نہیں ہے کہ امام ان سب کے لیے ایک ہی سزا تجویز کرے، بلکہ وہ مختار ہے کہ کسی کو قید کر دے کسی کو تازیانہ لگائے، کسی کے لیے تحقیر و تذلیل کی کوئی شکل تجویز کرے، کسی سے عدالت میں[1] کھڑے رہنے کا مطالبہ جائے اور کسی سے صرف بے رخی اور بے اعتنائی کا سلوک کرنے پر اکتفا کرے۔ یہ سب صورتیں جائز اور صحیح ہوں گی (یعنی ظاہر شریعت کے اعتبار سے اس طرح کے جائز فیصلے مسلمانوں کے لیے واجب التعمیل ہوں گے اور ان کی اطاعت سے گریز کرنا ایمان سے محروم کر دے گا۔ پھر اسی سلسلہ میں تفویض خدمات و مناصب کا معاملہ لیجیے۔ ادھر بھی امام کے اختیار تمیزی کو بہت کچھ دخل حاصل ہے۔ وہ کسی کو مرتبہ بلند پر پہنچاتا ہے اور کسی کو ادنیٰ مقام پر چھوڑ دیتا ہے[2]، ایک

[1] جس نظام عدلیہ کا مقصود بندوں کی اخلاقی اصلاح ہو وہ یقیناً امیر اور حکام کو اختیار تمیزی کے استعمال کی گنجائش دے گا کیونکہ مختلف اشخاص کی اصلاح کے لیے مختلف مراتب و مدارج کی سزائیں کارگر ہو سکتی ہیں ــــ ان وہ جرائم مستثنیٰ ہیں جن سے سوسائٹی میں کوئی بہت بڑا بگاڑ اور بہت بڑا فساد رونما ہوتا ہے، مثلاً قتل، چوری، زنا وغیرہ۔

[2] یہاں بھی یہ صورت ہے، یعنی اگر کسی نظام میں سلطنت کے کارکن "سندات" کی بنا پر چھانٹے جاتے ہوں، تو وہاں ہر قسم کا بے وقوف حکومت کی مشین میں نصب ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ موجودہ نظام میں آپ کسی منصب پر اس شخص کو متمکن پاتے ہیں جو اس منصب کے لیے پوری طرح نااہل ہوتا ہے۔ آخر علمی قابلیت ہی دیکھنے کی چیز نہیں ہے آدمی کا تقویٰ، آدمی کی دیانت اور اس کا پورا کیرکٹر، اس کا ذوق، اس کا جبلی رجحان، اس کے خاندانی اور وراثتی تاثرات یہ سب کچھ قابل لحاظ ہوتا ہے اور یہ چیزیں کبھی بھی سند سے نہیں تولی جا سکتیں۔ اسی وجہ سے شریعت اسلام صاحب امر کو اختیار تمیز دیتی ہے۔ (ن - ص)

ایک کو اپنے پہلو میں جگہ دیتا ہے اور دوسرے کو اپنے سے دور۔ کہتا ہے، کوئی اس کے اشارہ سے افسروں کا افسر ہو کے رہ جاتا ہے اور کوئی ادنیٰ درجہ کے چوبداروں اور چپراسیوں کے حلقہ سے آگے نہیں نکل سکتا۔ ان مختلف صورتوں میں قانون شریعت کی طرف سے امام پر کوئی حرف نہیں آتا، بلکہ الٹا جو شخص ایسے معاملات میں امام پر اعتراض کرتا اور اسے برا بھلا کہتا ہے، وہ عاصی و باغی اور مردود و مطرود قرار پائے گا۔

پھر ایسا ہی معاملہ قتل سیاسی کا ہے، یعنی جرائم کی بعض ایسی قسمیں ہیں کہ ان میں سے اگر کوئی جرم کسی شخص سے صادر ہو تو اگرچہ شرعاً وہ مجرم کے قتل کو مقتضی نہیں ہے، لیکن اگر امام کی رائے اس کے قتل کا فیصلہ دے تو یہ قتل بالکل جائز ہوگا۔ ایسے ہی جنگ و صلح کے مسائل و معاملات ہیں[1] کہ امام بعض اوقات جابر و سرکش کفار کی سرکوبی میں قاتل سے کام لیتا ہے اور کبھی مومن و مسلم باغیوں اور مجرموں کے خلاف یکدم برسر پیکار ہو جاتا ہے۔ ان حدود میں امام اپنے اختیارات کو جیسے چاہے استعمال کرے، کسی کو اس سے قیل و قال کی مجال نہیں ہوگی۔

اب رہے وہ شرعی معاملات جو مالیات سے متعلق ہیں، وہ بڑی لمبی چوڑی بحث کے محتاج ہیں، مگر یہاں[2] خلاصۃً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اموال غنیمت کے سوا بیت المال کے دوسرے اموال کی تقسیم میں تمام مسلمانوں سے مساوات کا سلوک کرنا امام پر واجب نہیں ہے۔ وہ چاہے تو کسی کو ہزار ہا روپے یک مشت عطا کر سکتا ہے اور کسی دوسرے کو چاہے تو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ دے۔ اس پر بھی محروم کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کوئی چون و چرا کرے۔ اگر وہ چون و چرا کرتا ہے اور اعتراض اٹھاتا ہے اور اطاعت امیر کے دائرہ سے قدم باہر نکالتا ہے تو وہ بارگاہ حق میں نامقبول اور قرب الٰہی سے محروم ٹھہرتا ہے۔ بہرحال اس نوعیت کے معاملات و مسائل جو امام وقت کی رائے پر چھوڑے گئے ہیں، بے شمار ہیں، ان میں نمونہ کے طور پر بعض کا ذکر کر دیا گیا ہے اور بقیہ مثالوں میں سے بیشتر کا تذکرہ آئندہ ابواب میں دلائل و شواہد کے ساتھ آئے گا۔ انشاء اللہ۔

یہاں مدعائے بیان صرف یہ ہے کہ ان اختیاری معاملات میں خلیفہ راشد بھی حکم لگاتا ہے اور سلطان عادل بھی، لیکن دونوں میں فرق ہوتا ہے۔ خلیفہ راشد کے تصرفات کا مقصود احکام الٰہی کی اطاعت، دنیا کی اصلاح اور نوع انسانی کی صحیح تربیت ہوتا ہے۔ یعنی جتنے گوناگوں معاملات، بوقلموں مقدمات اور رنگا رنگ احکام اس کی طرف سے صادر ہوتے ہیں

[1] یہاں بھی امام کے وسیع اختیارات تیزی کا تذکرہ ہے اور یہاں بھی ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ نفاذ عدل اور تقسیم مناصب کے مسائل کے مقابلہ میں امور سیاسیہ و مسائل صلح و جنگ کے لیے کوئی مستقل حکم متعین کرنا اور بھی زیادہ مشکل ہے، کیونکہ ان امور کے متعلق کوئی حکم لگاتے ہوئے بدلنے والے حالات کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ پس ان مسائل میں بھی امام کو اپنی بصیرت سے کام لینے کے لیے جائز حد تک گنجائش دی گئی ہے۔ (ن۔ص)

[2] بیت المال کے صرف میں بھی بڑی حد تک امیر المومنین کو اپنی حکیمانہ نظر سے کام لینے کا حق حاصل ہے، کیونکہ یہ باتیں ہمیشہ کے لیے طے نہیں کی جا سکتیں کہ کیسے شخص کو کیسے حالات میں کتنا دینا اس شخص کیلیے اور سوسائٹی کے لیے مفید ہے۔ یہ صحیح ہے کہ خلیفہ کی وسعت اختیار مضر بھی ہو سکتی ہے مگر جہاں یہ نہیں ہوتی وہاں نظام "مشینی" اور "دفتری" ہوتا ہے، "انسانی" نہیں ہوتا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مشینی اور دفتری نظاموں کے تحت سوسائٹی کی ظاہری ٹیپ ٹاپ کتنی ہی جاذب نظر ہو انسان کو حقیقی امن اور مسرت نہ حاصل ہو گی۔

وہ صرف مفادِ ملت اور انتظامِ امت کے لیے ہوتے ہیں۔ وہ کسی پر نگاہ کرم سے متوجہ ہوتا ہے تو دوستی اور قرابت کی پاسداری سے نہیں ہوتا، اسی طرح اگر کسی کی تذلیل کرتا ہے تو کسی ذاتی مخالفت و عداوت کے ماتحت انتقاماً نہیں کرتا، بلکہ جب امر کو نظامِ امت اور مفادِ ملت کے لیے مناسب سمجھتا ہے صرف اس کو اختیار کرتا ہے، اور دل و جان سے اختیار کرتا ہے۔ وہ جس شخص کو کسی خدمت کے لیے موزوں سمجھے گا صرف اسی کو وہ خدمت سونپے گا، چاہے وہ اس کا دلی دوست ہو یا جانی دشمن! ——— بخلاف اس کے سلطانِ عادل کا معاملہ دوسرا ہے، یعنی اگرچہ وہ احکامِ دین اور آثارِ سنت میں کوئی مداخلت نہیں کرتا، بلکہ صرف مذکورہ بالا اختیاری امور ہی میں تصرف کرتا ہے، لیکن اس تصرف کی مختلف صورتوں میں وہ اپنے نفس کے تقاضوں کی رعایت ضرور کرتا ہے۔ مثلاً دو آدمیوں سے ایک ہی جرم سرزد ہوتا ہے، ایسا جرم جس کے لیے حدِ شرعی متعین نہیں ہے، بلکہ اس پر امام کو تعزیر اپنی رائے سے قائم کرنی ہے۔ اب یہ ممکن ہے کہ ایک کے لیے قید و تازیانہ کی سزا نافذ ہو جائے اور دوسرے کے لیے صرف نگاہِ لطف کا بچھ لینا مناسب قرار پائے۔ اس امتیازی رویے میں خلیفۂ راشد تو یہ ملحوظ رکھے گا کہ مجرموں کی اصلاح کس طرح ہو سکتی ہے، پھر جس کے متعلق اسے یقین ہو جائے گا کہ یہ قید و تازیانہ کے بغیر راہِ راست پر نہیں آ سکتا، اس پر سخت تعزیر جاری کرے گا اور جس کے متعلق وہ یہ اندازہ کرے گا کہ یہ صرف اظہارِ تغافل سے درست ہو سکتا ہے اور اگر اس کی زیادہ تذلیل کی گئی تو حمیتِ جاہلیہ اس کے اندر اس حد تک ابھرے گی کہ خود کشی کی نوبت آ سکتی ہے تو اس کے لیے ہلکی سزا مقرر کرے گا۔) مگر سلطانِ عادل ایسے موقع پر جو فیصلے دے گا ان میں نفسانیت بھی سرایت کر سکے گی۔ مثلاً اس کے سامنے ایک مجرم آتا ہے جس کے خلاف اس کے دل میں پہلے سے کینہ بھرا ہوا ہے۔ مگر شرعاً کسی جرم کے اثبات کے بغیر سلطان بے بس تھا اور انتقام کی آگ نہ بجھا سکا مگر اب جرم ثابت ہوتے ہی نفس کا تقاضا پورا کرنے کے لیے ادھر حالات سازگار ہوئے اور ادھر وہ مجرم پر جھپٹ پڑا اور کسی سخت سزا کا حکم دے دیا۔[۵۱]

سطورِ بالا میں خلافتِ راشدہ اور سلطنتِ عادلہ کا نازک فرق ضروری حد تک بیان کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اگرچہ سلطنتِ عادلہ[۵۲] کے نظام سے بظاہر شریعت کو فائدہ پہنچتا ہے مگر درحقیقت یہ نظام اس کے لیے مضر ہے۔ اکابرِ امت کو خصوصیت کے ساتھ اس سے ضرر پہنچتا ہے اور تزکیۂ نفس، حسنِ خلق، اخلاصِ عمل، خیر خواہیِ خلق اور تربیتِ عباد اللہ میں سیرتِ پیغمبر اور سنتِ رسول کو جو دخل ہوتا ہے وہ دھیرے دھیرے ختم ہونے لگتا ہے اور علماء و زعمائے امت جو فضائلِ دینی کے لحاظ سے واجب التعظیم ہوتے ہیں، ان کا کوئی وقر نہیں رہتا، کیونکہ سلطنتِ عادلہ کے

---

۵۱ - ایسے مفاسد کی روک تھام کے لیے دنیا کا کوئی قانونی نظام کامیاب تدابیر نہیں اختیار کر سکتا ہے، مگر اسلام نے تو انسانی زندگی کو اخلاقیت کی اساس پر کھڑا کر کے بڑی حد تک رخنہ بندی کر دی ہے۔ اب اگر کوئی اِکا دُکا قانون پرست اس کی گرفت میں آ جاتا ہے تو اس کا کیا علاج؟ ——— یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ اجتہادی تدابیر نظامِ حکومت اور نظامِ عدالت کے خارجی ڈھانچے کی تعمیر میں ایسی اختیار کی جائیں جن سے ایسے مفاسد کا ظہور اور بھی بعید از امکان ہو جائے۔ (ن - ص)

۵۲ - ذرا غور کیجیے کہ "سلطنتِ عادلہ" جو خلافتِ راشدہ سے ایک ہی درجہ فروتر ہوتی ہے وہ تک شریعت کے لیے مضر اور اصلاح و تربیتِ انسانی میں غیر سود مند ہے ——— مگر کجا یہ حال کہ خالص طاغوت کی حکومت، شیطان کی سیاست، فرعون اور نمرود کا اقتدار مسلمانوں کے بارے میں سند جواز حاصل کر لیتا ہے۔ (ن - ص)

دور میں بڑے سے بڑے تیس مار خانوں کا دینی کارنامہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ چند مسائل فقہ کو رٹ لیں[1] اور انہیں ڈھال بنا کر سلطان وقت کے گزند سے محفوظ رہیں یا اگر ضرورت پڑے تو کسی دشمن کو اپنے علم فقہ کے زور سے عدالت کے سامنے مجرم ثابت کرا دیں۔ یہ چیزیں روح شریعت کو بری طرح مجروح کر دیتی ہیں، درانحالیکہ اس کا ظاہر فریب ڈھانچہ جوں کا توں کھڑا نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے ایسے نظام کو حدیث میں "ملک عضوض" (سلطنت مستبد) کی اصطلاح سے موسوم کیا گیا ہے۔ مثلاً خلافت راشدہ کے بعد نمودار ہونے والے نظام کی طرف حسب ذیل اشارہ ملاحظہ ہو:

هذا الامر بدء نبوة ورحمة ثم يكون خلافة ورحمة ثم يكون ملكا عضوضا — یہ نظام نبوت و رحمت کی صورت میں شروع ہوا۔ پھر خلافت اور رحمت کی شکل اختیار کرے گا، پھر مستبد بادشاہی بنے گا۔

اس موقع پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ سلطنت عادلہ اعلیٰ اور ادنیٰ دو قسم کی ہوتی ہے۔ اس تقسیم کا راز یہ ہے کہ ظاہر شرع کی پاسداری جو سلطنت عادلہ کی لازمی علامت ہے، دو وجوہ سے برقرار رہتی ہے، یعنی یا تو خوف خدا اس کا سبب ہوتا ہے یا پاس مخلوق۔ پس اگر خوف خدا والی صورت ہو تو سلطنت عادلہ اعلیٰ ہوگی اور اگر بندوں کے خوف کی صورت ہو تو ادنیٰ۔

سلطنت کاملہ اعلیٰ قسم کی سلطنت عادلہ میں سلطان شریعت کی پاسداری ایمان کی وجہ سے کرتا ہے کہ اس کے نزدیک خدا تعالیٰ بادشاہ مطلق اور مالک برحق ہے اور وہ ناتوانوں، عاجزوں کا سہارا اور کثیر و قلیل پر قادر اور اعلیٰ و ادنیٰ پر غالب ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس کے پنجۂ قدرت میں بے بس محسوس کرتا ہے۔ اس صداقت پر بھی اسے یقین ہوتا ہے کہ ایک دن رب الارباب کی بارگاہ میں محکمۂ احتساب کے سامنے پیش ہونا ہے اور وہاں سے ہر گستاخی و شوخ چشمی کا پورا پورا بدلہ ملنا ہے، نیز یہ کہ اس بارگاہ میں بادشاہ مقتدر اور مسکین بے بس یکساں مسؤل ہوں گے اور انصاف سب پر یکساں نافذ ہوگا۔ پھر وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ وہاں چل کر جبر اور کبر، ظلم اور جور، فسق و فجور وبال جان ہو جائیں گے اور ان کا مرتکب لعنت و عذاب کا مستحق ہوگا۔ وہاں ستم توڑنے والے آگ کے شکنجہ میں کسے جائیں گے اور خود پسند سرکشوں کو ذلت کا طوق پہنایا جائے گا۔

اس حالت میں اگرچہ سلطان کو نفس امارہ گمراہی کی طرف کھینچتا ہے، مگر دوسری طرف سے خوف خدا اسے شتر بے مہار نہیں بننے دیتا۔ چنانچہ اگر بہ تقاضائے بشریت وہ راہ حق سے ذرا ادھر ادھر ہو بھی جاتا ہے تو یہی خوف خدا گھسیٹ کر اسے پھر راہ راست پر لے آتا ہے۔ پس وہ لذات نفسانی کو پورا کرنے کے لیے شریعت کی دی ہوئی رخصتوں اور گنجائشوں کی حد تک ہی ترکتازیاں دکھاتا ہے۔ مثلاً اس کی چشم حسد لاکھ مطالبہ کرے کہ فلاں عاجز پر دست تعدی دراز

[1] کیا بصیرت افروز بات کہی ہے! سبحان اللہ! لیکن "مسائل فقہ کی رٹائی" آغاز انحطاط میں اتنی کہاں ہوگی جتنی آجکل جو آج تقریباً خاتمہ کا کمال یہ ہے کہ صرف پائجاموں اور داڑھیوں کے طول ناپنے کا فن رٹتے رٹتے عمریں گذار دیتے ہیں اور اس کے ذریعہ اپنے تقدس کی دھاک بٹھاتے ہیں اور پھر اس تقدس سے امامت و امارت اور خطابت و صدارت اور کچھ نہ کچھ "آب و نان" بھی حاصل کرتے پھرتے ہیں۔ (ن ۔ ص)

کرنا چاہیے۔ لیکن وہ اس عاجز کے متعینہ شرعی حقوق کی پاسداری میں طوعاً و کرہاً اپنے پنجۂ اقتدار کو سمیٹے رہتا ہے تاوقتیکہ اس پر شرعاً کوئی جرم ثابت نہ ہو جائے۔ جرم اگر ثابت ہو گیا تو اس کا کینہ دیرینہ کھولے گا اور اس کے فیصلہ کو متاثر کریگا اسی طرح کسی حسینۂ دلربا کے اشتیاق میں اسکا دل کتنا ہی پیچ و تاب کیوں نہ کھائے اور شوقِ وصال اسے کتنا ہی بے حال کیوں نہ کر دے۔ لیکن تاوقتیکہ نکاح منعقد نہ ہو جائے، وہ جامِ وصال کو ہونٹوں سے نہ لگائے گا ہاں نکاح کی سعی میں ضرور اپنے قیمتی اوقات اور اپنے بیش بہا اموال صرف کر کے سرگرداں رہے گا۔

اسی طرح اس کا نفس اگرچہ بزور یہ مطالبہ کرے گا کہ طلبِ بڑائی کے لیے اربابِ کبر و جفا کے ہتھکنڈے استعمال کرنے چاہئیں، لیکن وہ حدیث الکبریاء ردائی والعظمۃ ازاری (یعنی خدا نبی کے ذریعے سے فرماتا ہے کہ کبریائی میری چادر ہے اور عظمت میرا تہبند ہے) کو مدنظر رکھتے ہوئے اس مطالبہ کو رد کر دے گا اور اپنے آپ کو نشست و برخاست اور رفتار و گفتار میں صرف اتنے ہی امتیاز کا مستحق سمجھے گا جتنے امتیاز کے لیے شرعاً اجازت ثابت ہو۔ اس کو یہ بھی گوارا نہیں ہوگا کہ قیصروں اور کسراؤں اور دوسرے جبابرہ کے طور طریقے جو شرعاً حرام ہیں، اختیار کرے۔

ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بجا ہوگا کہ اگرچہ سلطانِ عادل کی زندگی پر سیرتِ انبیاء و خلفاء کی قبا درست نہیں بیٹھتی، مگر پھر بھی شریعت کے قانونی نظام کی طرف سے اس پر کوئی الزام وارد نہ ہوگا۔ دراصل اس کے دل میں ایمان کا شعلہ ضرور بھڑک رہا ہوتا ہے مگر ہوا و ہوس کا دھواں اس کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے۔ اس کی روح میں یقین کی تجلی ضرور چمکتی ہے لیکن فسادِ نیت کی تاریکیاں اسے ڈھانپ لیتی ہیں۔ ملاحظہ ہو حذیفہؓ کی روایت۔

قال: قلت یا رسول اللہ! ھل بعد ھذا الخیر من الشر؟ قال نعم! قلت وھل بعد ذلک الشر من الخیر؟ قال نعم، وفیہ دخن! قلت وما دخنہ؟ قال یستنون بغیر سنتی ویھدون بغیر ھدیی!

حذیفہ کہتے ہیں کہ میں نے سوال کیا یا رسول اللہ! کیا اس "خیر" کے بعد کوئی "شر" ہوگا؟ فرمایا ہاں! پھر میں نے پوچھا کیا اس "شر" کے بعد کوئی "خیر" ہوگا؟ فرمایا ہاں اور اس کے ساتھ تیرگی ہوگی۔ میں نے پوچھا کہ اس کی تیرگی کیا ہوگی؟ فرمایا کہ (امراء سلاطین) میری سنت سے ہٹ کر چلیں گے اور میری ہدایت سے ہٹ کر قیادت کریں گے۔

اس روایت میں اول الذکر "خیر" سے مراد نبوت اور خلافتِ راشدہ کا دورِ رحمت ہے، ثانی الذکر "خیر" اشارہ ہے سلطنتِ عادلہ کے قیام کی طرف اور لفظ "دخن" اور اس کے بعد کا توضیحی جملہ یہ واضح کرتا ہے کہ جس دور کی خبر دی جا رہی ہے وہ نظامِ سلطنت کا دور ہوگا، نہ کہ خلافتِ راشدہ کا! یہ خاص طرز کا نظامِ حکومت جس میں خوفِ خدا کی وجہ سے ظاہرِ شرع کا لحاظ کیا جاتا ہے، ہماری اصطلاح میں "سلطنت کاملہ" ہے۔

سلطنتِ ناقصہ اب لیجیے دوسرا پہلو، یعنی سلطانِ عادل کے دل میں خوفِ خدا اس حد تک پہنچا ہوا نہیں ہوتا کہ اس کے نفسِ امارہ کا راستہ روک سکے۔ لیکن بندوں کی شرم اس کا دامن پکڑ لیتی ہے اور نفسانیت کے زور میں اسے احاطۂ شریعت سے باہر نکلنے نہیں دیتی۔ خود اس شرم کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں۔ مثلاً کبھی تو اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ جس ملک میں سلطنتِ عادلہ قائم ہوتی ہے اس کے خواص و اکابر دیندار اور مطیعِ شریعت ہوتے ہیں، یا کم از کم عادۃً

لوگوں کے اندر اتباعِ شریعت برقرار رہتا ہے اور ہر کس و ناکس اور مومن و منافق دین کے بندھن میں کسا رہتا ہے کیونکہ خلافت میں سلطان خوب سمجھتا ہے کہ اگر ظاہر شریعت کی مخالفت کرے گا تو جمہور میں بدنام ہوگا، جس کے نتیجہ میں ممکن ہے کہ اس کے خلاف شورش برپا ہو جائے۔ پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سلطان کے لیے اس کے پیش رو "سلاطینِ کامل" اتباعِ شریعت کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ اس کے آباؤ و اجداد تھے تو وہ اچھی طرح محسوس کرتا ہے کہ ان کا خلف الرشید اور جائز جانشین قرار دئے گئے ہیں، ان کے دستور پر چلنا ہوگا ورنہ وہ ان کا ناخلف سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر سلطان ان کی نسل سے نہ ہو تو بھی وہ یہ کوشش کرے گا کہ ان کے برابر بلکہ ان سے کچھ زیادہ نیک نامی حاصل کرے۔

پھر کبھی یہ صورت پائی جاتی ہے کہ سلطانِ عادل کا دورِ خلافتِ راشدہ کے دور سے بالکل متصل ہوتا ہے، اس وجہ سے اسے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر اس کی روش سیرتِ خلفائے راشدین کے بالکل خلاف ہو گی تو چھوٹے بڑے سبھی اس سے نفرت کریں گے اور یہی زمامِ اختیار اس کے قبضہ میں نہ رہنے دیں گے۔ پس وہ شریعت کی نمائشی پاسداری کرتا ہے اور اس کی حدود کو کھلم کھلا نہیں پھاندتا۔

مگر ان ساری صورتوں میں جاننے والے جان جاتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے کیونکہ اہلِ صدق و اخلاص اور اربابِ تصنع و تکلف کے اعمال میں بہت فرق ہوتا ہے۔ معمولی فراست رکھنے والا بھی یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس شخص کا کردار ایک کھوکھلا قالب ہے، جس میں مطلقاً جان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سلطانِ عادل کی دیانت اور اس کا تشرع سچے مسلمانوں کے نزدیک ایک لحاظ سے مرغوب ہوتا ہے اور ایک لحاظ سے نامرغوب! مرغوب اس لحاظ سے کہ اس کا ڈھانچہ شریعت کے مطابق ہے اور نامرغوب اس وجہ سے کہ اس دیانت و تشرع کا ظہور ایک ریاکار شخص سے ہو رہا ہے۔ اس کے افعال ایک مومنِ مخلص کی نگاہ میں بیک وقت معروف کی تعریف میں بھی آتے ہیں اور منکر کی تعریف میں بھی۔ یہ صورت ذیل کے فرمودۂ نبوت کے عین مطابق ہے۔

یکون علیکم امراء تعرفون وتنکرون — تم پر ایسے امیر ہوں گے جو معروف و منکر دونوں پر چلیں گے۔

سلطنتِ عادلہ کی یہ شکل جس میں خوفِ خدا کی جگہ بندوں کا پاس سلطان کو ظاہر شریعت کا پابند رکھتا ہے، ہماری اصطلاح میں سلطنتِ ناقصہ کہلاتا ہے۔

چند اہم اشارات | ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر گذشتہ بحث (سلطنت کاملہ) سے تعلق رکھنے والے چند اہم نکات کا تذکرہ کر دیا جائے۔

۵ یہ درست ہے کہ احترامِ قانون کے ہوتے ہوئے جو اخلاقی زوال کسی شخص کی سیرت میں آجاتا ہے، اسے قانون کے کانٹے پر تولا نہیں جا سکتا اور نہ اس پر کوئی سزا نافذ ہو سکتی ہے۔ مگر یہ زوال بالکل غیر محسوس بھی نہیں ہوتا۔ عقلِ عامہ تھوڑے سے غور کے بعد معلوم کر سکتی ہے کہ کسی شخص کی حرکات میں اخلاقی جان ہے یا نہیں۔ چنانچہ قانون سے فائدہ اٹھانے والے قانونی "امیر" سے اصحابِ شوریٰ قدم قدم پر تصریح طلب کر سکتے ہیں، پریس اس پر تنقید کرے گا اور محراب و منبر سے اس کی تذکیر کی جائے گی اور اس طرح کے مستقل دباؤ سے اس کی اصلاح کا امکان بھی ہوگا اور رعایا کی سیاسی تربیت بھی ہوتی رہے گی۔ (ن، ص)

اشارہ (۱)۔ سلطان کامل حکماً خلیفہ راشد ہے!

مدعا یہ ہے کہ اگرچہ درحقیقت وہ خلافت راشدہ کے منصب سے محروم ہے۔ لیکن چونکہ اس کے نظم میں خلافت راشدہ کا ایک اعلیٰ ترین وصف موجود ہوتا ہے، یعنی ظاہر شریعت کی خدمت جذبۂ صدق و اخلاص کے ساتھ۔ سلطان [illegible] احکام ونتائج۔ اس لیے اگر اس کے سامنے [illegible] کوئی ایسا امام[1] موجود ہو جو امامت راشدہ کا نظم چلانے کی لیاقت رکھتا ہو تو اس کے لیے کوئی مناسب بھی ہے کہ وہ ایسی غیر سیاسی امامت پر قانع رہے اور اپنی ساری کوششیں ہدایت کو پھیلانے میں صرف کر دے۔ وہ میدان سیاست میں سلطان کامل [illegible] نگہبان [illegible] وسیاہ کو جناب [illegible] کے لیے [illegible] خالی کر دے۔ یہ صحیح ہے کہ اس طرح خلافت راشدہ کا اعلیٰ ترین منصب اس کے ہاتھ سے جاتا ہے، لیکن بندگان خدا کی خیر خواہی میں بطور [illegible] تقاضائے [illegible] اپنے [illegible] صبر کو [illegible] کے لیے ویسی ہی قربانی قرار دینا چاہیے جیسی حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے دی تھی کہ آپ نے سلطان شام کی مزاحمت سے آپ کو روک لیا۔ اسی قربانی کے پیش نظر حضرت موصوف کے لیے رسول مقبول کی زبان سے پیشگی کلمات ستائش وارد ہوئے تھے کہ:

ان ابنی ھذا سید لعل اللہ ان یصلح بہ [illegible] بین فئتین عظیمتین من المسلمین — میرا یہ بیٹا سردار ہوگا، بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرا دے۔

اس حدیث سے یہ بات بھی نکل گئی کہ خدا اور رسول کے نزدیک سلطان کامل کے حق میں "اجتماع کلمہ"[2] پسندیدہ اور اس کی اطاعت بارگاہ حق تعالیٰ میں مقبول ہے۔

اشارہ (۲)۔ سلطان کامل خلفائے راشدین اور عام سلاطین کے درمیان برزخ ہے

یعنی اگر بادشاہوں کے حالات کو دیکھا جائے تو ان کے مقابلہ میں سلطان کامل خلیفہ راشد قرار پاتا ہے۔ لیکن خلفائے راشدین کی طرف نظر کی جائے، تو وہ ان کے مقابلہ میں محض ایک بادشاہ سمجھا جائے گا۔ چنانچہ سلطان شام نے خوب کہا تھا کہ:

لست فیکم مثل ابی بکر وعمر ولکن ستروں [illegible] بعدی — میں تم [illegible] ابوبکر و عمر کی طرح نہیں، مگر ہاں، تم میرے بعد دیکھو گے۔

بہرحال سلطان کامل کا دور اقتدار چونکہ دور نبوت اور دور خلافت راشدہ کے ساتھ ایک گونہ مماثلت رکھتا ہے اس وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آغاز دور نبوت سے لے کر سلطنت کاملہ کے اختتام تک ترقی اسلام کا زمانہ ہے۔ اس مدعا کو یہ حدیث موکد کرتی ہے:۔

تدور رحی الاسلام بخمس وثلاثین او ست وثلاثین او سبع وثلاثین فان یھلکوا — اسلام کی چکی چلتی رہے گی ۳۵، ۳۶ یا ۳۷ سال تک۔ پس اگر ہلاک ہوئے تو ان لوگوں کے طریقہ پر ہلاک ہوں گے جو ہلاک ہو گئے اور اگر ان کا

---

[1] امام کی اصطلاح بہت وسیع الاستعمال ہے یعنی "مقتدر سیاسی امامت" کی طرف بھی اس کا اشارہ ہو سکتا ہے اور غیر سیاسی ذہنی امامت کی طرف بھی جیسا کہ شاہ صاحب نے کتاب کے ابتدائی حصہ میں وضاحت سے حقیقت امامت پر بحث فرمائی ہے۔ پس یہاں "امام" سے مراد ایسی ذات ہے جو وجاہت، سیادت، ہدایت وغیرہ کے مناسب [illegible] مگر سیاست کے نظم میں اسے براہ راست کوئی دخل نہ ہو۔ (ن۔ص)

[2] "اجتماع کلمہ" سے مراد یہ ہے کہ مومنین کو اس کی اطاعت پر متفق ہو جانا چاہیے (ن۔ج)

فیہ من ھذہ ... وان یتم لھم دینھم یقم لھم ... دین ان کے لیے قائم رہا تو ... سال تک قائم رہے گا ....

سبعین عاما

. . . .

کلمۂ ... یہاں ... انتظام خلافت کی برہمی اور دور خلافت کے آخر میں ظہور فتنہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کلمۂ "ان یقم لھم دینھم" سے دور نبوت، دور خلافت اور دور سلطنت کامل کے مجموعی زمانہ کی ترقی اسلام مراد ہے۔ ایک اور حدیث میں وارد ہے کہ:

تعوذوا باللہ من راس السبعین — ستر برس کے سرے سے اللہ کی پناہ مانگو۔

یہاں اشارہ ہے سلطنت کاملہ کے خاتمہ کی طرف جس کو ملحوظ رکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا تینوں دور مل کر ایک زمانۂ برکت قرار پاتے ہیں اور وہ عظیم الشان شر و فساد (ملوکیت) جس سے خدا کی پناہ طلب کرنی چاہیے، اس مجموعی زمانہ کے خاتمہ پر ظہور پائے گا۔

اشارہ (۳) سلطان کامل کو ایک حد تک نیابت پیغمبر بھی حاصل ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اس کی ریاست کو خلافت نبوت نہیں کہہ سکتے، لیکن وہ سلطنت نبوت ضرور ہے۔ بعثت محمدیؐ کے متعلق ایک الہامی پیشینگوئی کے یہ الفاظ اسی مدعا کی طرف اشارہ کرتے ہیں:-

مھاجرہ طیبۃ وملکہ بالشام — اس کا دار الہجرت طیبہ (مدینہ) اور دار السلطنت شام ہوگا۔

پس جس طرح کی اطاعت[۱] کامل نبی کے لیے مطلوب ہے، اسی طرح کی اطاعت کامل کا حق دار سلطان کامل بھی ہے، باوجودیکہ سیرت کی تکمیل، تقرب الی اللہ کے حصول، خلق خدا سے حسن معاملہ اور بندگان خدا کی تربیت کے لیے حدود دیانت کی جو پابندی اور نور ہدایت کی جیسی پیروی ناگزیر ہے اس کا درس اس سے قطعاً نہیں لیا جا سکتا۔

اشارہ (۴) سلطان کامل حسن ظن کا مستحق ہے۔

سلطان کامل کے متعلق یہ تو طے ہے کہ وہ حقیقۃً ایمان و اخلاص کا مالک ہے، پھر بعض قابل قدر کارنامے بھی اس کے ہاتھوں سے انجام پاتے ہیں، نیز یہ کہ اس کے اقتدار سے ظاہر شریعت کو ترقی ملتی ہے۔ ان خوبیوں کے ساتھ اگر بشری تقاضوں کے تحت اصلاح اخلاق کے شعبے میں اس سے کوئی کوتاہی رہ جاتی ہے یا کوئی چیز سنت کے

[۱] اطاعت کامل سے غیر محدود اور غیر مشروط اطاعت ہرگز متصور نہ ہونی چاہیے۔ مدعا یہ ہے کہ لا طاعۃ للمخلوق فی معصیۃ الخالق کی اصل شرط کے ساتھ اس کے احکام کی پوری طرح پیروی کرنی چاہیے۔ علاوہ بریں اطاعت کامل تنقید و تذکیر کے حق کو ہرگز سلب نہیں کرتی۔ آپ سلطان کامل کے تمام جائز احکام کی پابندی بھی کریں اور اگر ساتھ وہ اخلاقیت و روحانیت کی کمزوری کا جہاں جہاں مظاہرہ کرے اور نفس پرستی کے لیے شریعت کی گنجائشوں کو ناپسندیدہ طریق سے استعمال کرے تو اسے روبرو ہو کے نصیحت کیجیے۔ پریس اور منبر و محراب کی طاقت کو تنقید و تذکیر کے لیے استعمال کیجیے اور ارباب شوریٰ کو بھی اس مقصد میں اپنا ہم نوا بنائیے۔ بس بغاوت برپا نہ کیجیے تا وقتیکہ آپ کو ضابطۂ شریعت اس کا حق نہ دیتا ہو۔ (ا۔ ص)

خلاف[سے] سرزد ہو جاتی ہے تو اس سے چشم پوشی ہی مناسب ہے۔ جہاں تک ہو سکے، دل وجان سے اس کی خیرخواہی کی جائے اور اس کے تھوڑے عمل کو بہت، اور اس کی چھوٹی نیکی کو بڑا سمجھا جائے۔ اس رعایت کی وجہ یہ ہے کہ لذت نفسانی کی دارفتگی کے باوجود اس کے دل میں دینِ رب العالمین کی خدمت کا جذبہ کام کر رہا ہے۔

کمال صدق ومحبت بہ بیں نہ نقص گناہ — کہ ہر کہ بے ہنر افتد نظر بعیب کند

۲۔ سلطنت جابرہ

سلطانِ جابر اس امر کو کہیں گے جس پر نفس امارہ کا اتنا زیادہ غلبہ ہو چکا ہو کہ نہ خوفِ خدا سے مانع ہو، نہ شرمِ مخلوق، نہ شرع کی پروا ہو، نہ عرف کا لحاظ! بس نفس کی طرف سے کوئی فرمان صادر ہوا نہیں کہ فوراً اس کی تعمیل ہو گئی، چاہے شریعت موافق ہو چاہے مخالف۔ اس کے نزدیک تو اپنی خواہشات کا پورا کر لینا ہی سلطنت کا منتہائے مقصود ہے۔ ایسے لوگوں کا "نظامِ ملت" سلطنت جابرہ کہلاتا ہے۔

ملحوظ رہے کہ سلاطینِ جابرہ شرع کی مخالفت میں مزاج کی افتاد کے مطابق مختلف مدارج پر فائز ہوتے ہیں۔ کوئی سرشارِ کبر ونخوت ہوتا ہے تو کسی دوسرے کو نازونخرے کے مظاہرہ کا خاص ذوق ہوتا ہے۔ کسی کو جوروتعدی سے اور کسی کو فسق وفجور سے خاص مناسبت ہوتی ہے۔ کوئی صنفی لذات میں سرمست ہے تو کوئی شراب، گلگوں کا رسیا[ہے]۔ ایک چٹ پٹے کھانوں کا شیدا ہے اور دوسرا نفیس پوشاک پر فریفتہ۔ کہیں کھیل تماشہ سے زیادہ دلچسپی ہے اور کہیں نغمہ وسرود سے خاص وابستگی ہے۔ بہرحال ہوا وہوس کے راستے بے شمار ہیں اور نفس پرستی کی شکلیں لاتعداد اور اگر ان کی تفصیل شروع کر دی جائے تو اسے پورا کرنے کے لیے کئی صفحے چاہییں۔ یہاں اس شجرِ خبیث کی چند بڑی بڑی شاخوں کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے، جن سے آگے بے شمار فروع نکلتی ہیں۔

۱۔ **سفاہت** | مخالفتِ شرع کی ایک وجہ سلطانِ جابر کی سفاہت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ نعمتِ عقل وخرد سے جو شخص محروم اور دوراندیشی کے فن سے کورا ہو، وہ کسی اصول ومسلک کی پیروی میں استقامت کیا دکھائے گا اور اس متانت کی توقع کیونکر کی جا سکتی ہے! اس کے نزدیک وفاداستقلال کی صفت کو کوئی قیمت حاصل نہ ہو گی، نہ ننگ وعار کا اسے ذرہ بھر پاس ہو گا۔ اپنی سفاہت کی وجہ سے وہ ہر خواہش کو جس کا گذر آدمی کے دل میں ہو سکتا ہے

سے سلطان کامل کو جو رعایت بڑی سے بڑی رعایت دی جا سکتی ہے وہ یہی ہے کہ مسلمان اس کی اطاعت کریں مگر یہ کہ اس کی کوتاہیوں سے چشم پوشی کی جائے اور اس کے معمولی اعمال کو اصل سے دگنا چوگنا تصور کیا جائے، ایسی رعایت ہمارے نزدیک محض مفاد کے لیے امراء کے متعلق یہ صورت اختیار کرنے کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو گا کہ ہر اگلا قدم زوال کی طرف اٹھے، جیسا کہ خلافتِ راشدہ کے بعد کی سیاسی تاریخ میں ہوا ہے۔ جس نظامِ سیاسی میں فردِ واحد کے بگاڑ پر پوری ریاست کا بگڑ جانا منحصر ہو، اس میں یہ کبھی بھی مناسب نہیں ہے کہ اس فردِ واحد کی ہر حرکت کو حسنِ ظن کی عینک لگا کر خوشنما بنا لیا جائے اور اس کے رائی کے دانہ جتنے کارناموں کو عقیدت کی خوردبین سے [بڑا] کر کے دیکھا جائے۔ جی نہیں! اگر ریاست اور رعایا اور دنیا کے عظیم الشان مفاد کا ہمیں پاس ہو گا تو ہم ادنیٰ سے (بقیہ صفحہ ۲۸ پر)

غور بچار کرنے کی فکر کرے گا نہ یہ ہرگز نہ دیکھے گا کہ اس سے کیا نفع و نقصان ہو سکتا ہے اور اس کا آخری نتیجہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ جو کچھ کرے گا بالکل بچوں کی طرح دیوانہ وار کرے گا اور جہاں جہاں منہ مارے گا ٹھیک شتر بے مہار کی طرح مارے گا۔

اس طرح کا آدمی جب منصب سلطنت پر براجمان ہوتا ہے تو سیاست کا سارا کاروبار چوپٹ ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کے کرتوت نہ قوانین شریعت کے پابند ہوتے ہیں، نہ آئین عرفی کے مطابق۔ ایسے شخص کی سلطنت میں کون ہے جو تالاں نہ ہوگا، چھوٹے بڑے اور خواص و عوام سبھی دکھ پا پاکر فریاد کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسی بلائے عظیم ہے جس کی گرفت سے نادان و دانا اور غافل و ہشیار سبھی چھوٹ بھاگنا چاہتے ہیں۔ ذیل کی حدیث میں اسی بلائے عظیم کی طرف اشارہ ہے:

اعیذک باللّٰہ من امارۃ السفہاء وقال [illegible] میں تمہارے لیے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں بیوقوفوں کی امارت سے اور فرمایا

نعوذ باللّٰہ من رأس السبعین وامارۃ الصبیان کہ اللہ کی پناہ مانگو ستر [illegible] سے اور لونڈوں کی حکومت سے

یوں بھی فرمایا کہ۔

ھلاک امتی علی ایدی غلمۃ من قریش میری امت قریش کے چند چھوکروں کے ہاتھوں تباہ ہوگی۔

ب۔ عیش پرستی: آپ جانتے ہیں کہ بعض لوگ کسی جبلی سبب کے تحت اپنی قوت شہوانیہ سے مغلوب ہو جاتے ہیں ایسے لوگوں کی ساری رغبتیں لذتوں اور راحتوں کے حصول میں صرف ہوتی ہیں اور ان کی عقل عیاشی کی بھول بھلیاں میں گم رہتی ہے۔ دن رات چٹ پٹی غذاؤں، اور دلفریب لباسوں اور سرور بخش شرابوں کے موضوع پر کاوشیں ہونگی۔ شطرنج بازی اور نرد بازی کا مشغلہ ہوگا، رقص و سرود کے چرچے ہوں گے، عورتوں اور لونڈوں میں انہماک ہوگا، محلات تعمیر کرنے اور دلکش باغات لگانے میں خاص توجہ رہتی ہے وغیرہ۔ فکر و تدبر کے گھوڑے ان میدانوں میں خوب دوڑائے جائیں گے اور دل کھول کر داد فسق دی جائے گی۔

اس قماش کے لوگ جب منصب سلطنت پر قابض ہو جاتے ہیں تو بدذوق لوگ ان کے درباروں میں جمع ہونے لگتے ہیں اور خوب اچھی طرح بھانپ لیتے ہیں کہ یہاں رغبت صرف لذتوں اور راحتوں کی طرف ہے۔ پس وہ سب کھیل تماشے اور رنگ رنگ کے نئے نئے ڈھنگ ایجاد کرنے میں لگ جاتے ہیں اور ایک ایک مشغلہ کو بڑا لمبا چوڑا فن لطیف بنا کر چھوڑتے ہیں۔ پھر مدتوں محنت کر کرکے اسے کمال کو پہنچاتے ہیں۔ عیش پسند سلاطین بھی ایسے ہی فنوں کے ماہرین کو اپنا مقرب اور خیرخواہ شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ جو کوئی نامی عیاش ہو یا بے حیا بھانڈ ہو یا چالباز دیوث ہو یا طبلہ سارنگی کا استاد ہو، وہی دربار سلطانی میں مسند آرا ہوگا۔

لیکن فسق و فجور کی یہ گرم بازاری دولت کو پھونکے بغیر کمال کو نہیں پہنچ سکتی۔ اسے جاری رکھنے کے لیے خزانے

(بقیہ حاشیہ صفحہ) ادنیٰ بگاڑ پر ٹوکیں گے اور اس کے ایک ایک فیصلہ پر زبان اور قلم سے بحثیں ہوں گی تاکہ رائے عامہ بھی اپنے سردار کی روش سے پوری طرح خبردار رہے اور ہر صاحب امر بھی چوکنا رہے کہ وہ چاروں طرف سے دیکھنے والی بیدار آنکھوں کے درمیان گھرا ہے!
ہاں البتہ اس امر کا پاس کرتے ہوئے کہ صاحب امر ایمان و اخلاص کا مالک ہے، برضا و رغبت اس کی اطاعت کی جائے گی۔
(ن-ص)

بھرپور رہونے چاہئیں۔ چنانچہ سلاطین جابرہ مجبور ہوتے ہیں کہ مال جمع کرنے کے لیے رعایا پر قسم قسم کے جور و ستم روا رکھیں اور بے دھڑک دست درازی کا مظاہرہ کریں۔ اس سے لازماً ملک میں تباہی پھیلتی ہے، مفلس اور کمزور لوگ بے خانماں ہو جاتے ہیں اور تاجر، زمیندار بدحال۔ اتنا ہی نہیں، یہ طوفان فسق و فجور بعض صورتوں میں آبرو مندوں کی بے آبروئی اور پردہ داروں کی پردہ دری پر منتہی ہوتا ہے۔ اور یہ حالت بھی سلطنت کی تباہی کا سامان مہیا کرتی ہے۔ پھر یہ کہ سلطان جب کھیل تماشوں اور نغموں شرابوں میں مستغرق ہو گیا، تو نظام حفاظت و عدالت کا بگڑ جانا لازمی ہے جس کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ رعایا میں باہم جور و ستم کا بازار گرم ہو۔ الغرض سلاطین کا فسق و فجور رعایا کی بدحالی اور ملک کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔ فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے:۔

ان هذا الامر بدا نبوة ورحمة ثم يكون خلافة ورحمة ثم ملكا عضوضا ثم ملكا جبرية وعتوا وفسادا في الارض يستحلون الحرير والفروج والخمور ويرزقون على ذلك وينصرون حتى يلقوا الله

یہ دین نبوت و رحمت سے شروع ہوا، پھر خلافت و رحمت ہے گا، پھر سلطنت مستبد کی شکل اختیار کرے گا پھر جبر پرستی اور فساد فی الارض کی مملکت بن جائے گا (اس وقت کے سلاطین) ریشم، عورت اور شراب کو بالکل حلال کر لیں گے اور اسی پر ان کو رزق دیا جائے گا اور ان کی مدد کی جائے گی یہاں تک کہ اللہ سے جا ملیں گے۔

اس حدیث میں سلطنت جبر کی مکمل تعریف کی گئی ہے جس سے اس کی ماہیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

فسق و ظلم کی یہ بادشاہت پوری امت کے لیے ایک خوفناک مصیبت ہوتی ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ اہل دین و دانش سلاطین وقت سے دور بھاگتے ہیں اور ان کی مجالس سے کنارہ کشی کرتے ہیں۔ اور ان کا تقرب نہیں چاہتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی معاش میں خلل آ جاتا ہے اور اطمینان قلب سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس حال میں وہ امر معاد کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہو سکتے۔ اور نہ ان کی پوری مساعی جستجوئے راہ حق پر صرف ہو سکتی ہیں۔

لیکن اگر وہ سلاطین وقت کے تقرب کو پسند کریں اور وہی ڈھنگ سیکھیں جو ان کے تقرب کا لازمہ ہیں تو اس صورت میں انھیں سب سے پہلے دین و ایمان سے دست بردار ہونا پڑے گا، پھر عزت و آبرو کو چھوڑنا ہو گا، پھر فحش گوئی کو اپنا خاص کمال اور نغمہ سرائی کو اپنا خاص ہنر قرار دینا ہو گا۔ پس ان کے لیے بہتر یہی ہے کہ سلاطین جبابرہ کی ملازمت اختیار کر کے اپنے دین و ایمان کی جڑ پر کلہاڑا نہ چلائیں۔ انھیں یہ خیال ہرگز دل میں نہ لانا چاہیے کہ اپنا دین بھی بچا لیں گے اور زندگی کے معاشی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے دربار سے کچھ کما بھی لائیں گے۔ ایسا خیال کرنا خوش فہمی اور غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں۔ ؎

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں　　　　این خیال است و محال است و جنوں

ج۔ حب مال | عموماً ایسے اشخاص دنیا میں پائے جاتے ہیں جنھیں پیدائشی طور پر مال کی غیر معمولی حرص ہوتی ہے۔ مگر حرص بھی اس عجیب قسم کی، کہ فقط گوناگوں اموال کے جمع ہو جانے ہی پر اس کی باچھیں کھل جاتی ہیں اور حصول لذت کے لیے کچھ خرچ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یہاں تو نفس اجتماع دولت ہی سب سے بڑی لذت اور اس کی

کثرت سے ہے۔ جب لوگ جب اپنے خزانوں اور دفینوں کی اک جھلک دیکھتے ہیں تو باغ باغ ہو جاتے ہیں اور نفس ترقی دینے کی خواہش دلوں میں اور بھڑک اٹھتی ہے، چنانچہ خزانے سمیٹنے کے لیے سو طرح کے ڈھکوسلے ایجاد کرتے ہیں۔ حد یہ کہ بھوکے ننگے رہ کے عمر گذار دینگے مگر کیا مجال کہ اپنے خزانے میں سے ایک دمڑی بھی خرچ کر ڈالیں۔

یہ بخل و حرص کے ہی نتائج ہیں اگر ایسے لوگ سلطنت پر قابض ہو جائیں تو ان سے بجز اس کے اور کیا توقع ہو سکتی ہے کہ رعایا کی دولت پر ہاتھ صاف کریں۔ چنانچہ یہ لوگ زراعت و تجارت سے کر اعلیٰ و ادنیٰ تک سے نئی حکمرانی (ٹیکس) وصول کرتے ہیں اور اس انتظام سے کہ ہر کھیت کی گھاس سے لیکر چیونٹی کے انڈے تک کوئی چیز حساب سے باہر نہ رہے اور پیسہ پائی کا بھی حساب کیا جائے۔ لیکن ان ظالموں کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ رعایا کے کسی فرد سے کوئی جرم سرزد ہو یا کوئی قصور سرزد ہو جائے تو اس کی پکڑ دھکڑ اور سزا کے بہانے ان ہی اس کے مال و اسباب کو ہتھیا لیں۔ یہ لوگ خود بھی رات دن یہی سوچتے رہتے ہیں کہ رعایا سے کس طرح مال ہتھیایا جائے اور ان کے درباری بھی اسی موضوع پر عقل لڑاتے رہتے ہیں۔ اب جس نے پرایا مال مارنے کے لیے کوئی کارگر ترکیب اور بہانہ ڈھونڈ نکالا، وہی ان کا خاص امیر ہے، وہی خیرخواہ وزیر اور وہی مخلص مشیر! اس طرح سلطانِ جابر اور اس کے درباریوں کی مسلسل کاوشوں سے حیلہ سازی اور فریب بازی کے فنون علیحدہ اپنے کمال کو پہنچتے ہیں اور ان کے اصول و فروع مدون ہو جاتے ہیں۔

بخیل سوسائٹی کے نقشے کے ماتحت ظالم سلاطین اپنے ملازمین سے یہ تو چاہتے ہیں کہ وہ وفاداری سے خدمت کریں اور اس خدمت کو اپنا فخر سمجھیں، مگر یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ خزانہ سے کوئی ایک ٹکا بھی نکالا جائے یا دفینہ میں سے ایک کوڑی بھی کم ہو۔ چنانچہ ان سے خدمت لینے کے لیے کئی ہی چالبازیوں سے کام لیتے ہیں اور ریاست و سیاست کی کاریگری کے لیے خلق اللہ کو بالکل نوعی خلق سے رام کرتے ہیں، نیز جب مناسب سمجھتے ہیں کسی ملازم پر کوئی الزام تھوپ کر اس کی گذشتہ خدمات کو برباد کر دیتے ہیں اور جہاں مناسب سمجھتے ہیں اپنے خدام کو محض تعظیم و تکریم کے نشہ میں مست رکھتے ہیں۔ ان باتوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ خدمت تو لیتے رہیں مگر معاوضہ کچھ نہ دینا پڑے۔ یا اگر دینا ہی پڑے تو ایسے ڈھنگ سے دیا جائے کہ ملازمین کو پورا پورا حق نہ ملنے پائے بلکہ ان کے حق میں سے جتنا ممکن ہو خزانہ میں روک لیا جائے۔ مثلاً سونے چاندی میں سے کھرا مال بچا کے رکھیں گے اور کھوٹی دھات سے معاوضہ ادا کرینگے یا یہ کہ زمانۂ خدمت کا کچھ حصہ حساب سے خارج کر دینگے۔ یا پھر یوں ہوگا کہ ایک عرصہ تک مفت خدمت لینے کے بعد ان کا نام دفتر کے رجسٹروں میں درج کریں گے، وغیرہ!

اس قسم کی بخیل و حریص بادشاہت آخر مملکت کو تہ و بالا کر کے چھوڑے گی اور حکومت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دے گی۔ لیکن پھر بھی رعیت کے لیے یہی مناسب ہوگا کہ سلطانِ بخیل کے افکار و کردار پر صبر کرے اور اس سے تصادم نہ ہو، ورنہ اس کا اندیشہ ہے کہ وہ اب تک جو کچھ چرب زبانی اور فریب کاری کے پس پردہ کر رہا ہے، اسے دھڑلے سے انجام

بنے لگے گا اور خوب کھل کر ستم ڈھانا شروع کردے گا۔ وجہ یہ کہ طمع اس کے خمیر میں شامل ہے اور اگر کسی وقت اس پر [illegible] حاصل کرنے کے دروازے بند ہوجائیں گے تو وہ اپنی جماعت کے تقاضے سے [illegible]

[illegible]

خونِ مردم آزاری و خونریزی | بعض اشخاص اپنی فطرت کے اعتبار سے مغلوب الغضب اور تند مزاج ہوتے ہیں [illegible] کا [illegible] غصہ [illegible] تو خونریزی اور بدکرداری کی حد کردیتے ہیں۔ اور مردم آزاری کے مظاہرہ میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ یہ تو ان سے ممکن ہی نہیں کہ مجرم کے قصور کی نوعیت کا خیال کریں، بلکہ قانونی [illegible] اگر مجرم نے [illegible] معمولی درجہ کی بھی [illegible] غصہ آتا ہے کہ وہ کوئی جرم عظیم کیوں نہ کرکے آیا۔ ایسے ارباب ظلم جرم کو عقل کے کانٹے پر کیوں تولنے لگے بس اندھا دھند ادنیٰ سے ادنیٰ غلطی پر بھی قتل اور قرقی اور تذلیل و تحقیر سے کم درجہ کی سزا تجویز نہ کریں گے، کیونکہ اس کے بغیر ان کو اطمینان قلب اور سکون خاطر حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر کسی گروہ کا محض ایک فرد اگر ان کی مخالفت کر بیٹھا تو سمجھئے کہ اس پورے گروہ کی شامت آئی۔ اچھا برا کوئی نہ بچنے پائے گا۔

(حاشیہ صفحہ ۳۰) کوئی وجہ نہیں کہ جو سلطان اسلامی مالیات کا نظم تہ و بالا کر رہا ہو اور بالواسطہ ریاست کے اندر معاشی و نفسی [illegible] ہو، اس کی کارگزاریوں پر ارباب دین و دانش چپ بیٹھے رہیں۔ حدیث ابی ذر کی رو سے اتنے صبر کا مطالبہ تو کیا جا سکتا ہے کہ تلوار نہ اٹھائی جائے لیکن یہ صرف [illegible] ہوگا کہ زبان اور قلم کو بھی حرکت سے روک رکھا جائے۔ یہ اندیشہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ اگر سلطان کی روک ٹوک ہوتی تو وہ اور زیادہ دنیا [illegible] کرے گا۔ حالانکہ اگر روک ٹوک نہ ہوتی تو مزید زیادتیوں کا امکان زیادہ ہے۔ اور اگر تنقید و تذکیر اسے بھڑکائے بھی تو اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ سلطان ان حدود سے آگے نکل جائے جن کے اندر اس کے خلاف خروج کی اجازت نہیں ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو کچھ برا نہیں۔ انقلاب کا ایک ریلا از سر نو خالص خلافت راشدہ کو ابھار دے گا۔ (ن۔ ص)

ے اس روایت سے کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ اس کا مدعا یہ نہیں ہے کہ اگر تم سے معصیت خالق کا مطالبہ کیا جائے تو بھی اپنے امرا کے غلام رہو۔ ہرگز نہیں۔ اس میں صرف یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر امرا تمہارے حقوق تمہیں نہ دیں تو صبر کرو اور نظام سمع و طاعت کو برقرار رکھو، یعنی خروج و بغاوت سے اجتناب کرو۔ امرا کا بوجھ امرا کے سر اور تمہارا تمہارے سر۔ لیکن اگر حقوق اللہ ہی کو یہ لوگ پی جائیں تو پھر مسلمان کے لیے اطاعت کو برقرار رکھنا ممکن نہیں ہے۔ (ن۔ ص)

اب اگر زمانے کی بدقسمتی سے ایسے ہی لوگ مسندِ سلطنت پر متمکن ہو جائیں تو وہ دادِ ظلم و جور نہ دینگے تو کرینگے کیا؟ یہ ظالم خدا کے بندوں کو طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا کرتے ہیں، عزت داروں کو ذلیل و خوار کرکے چھوڑتے ہیں۔ غلط نہ ہوگا اگر انھیں بنی آدم کے لیے بھیڑیے یا کتے کہہ دیا جائے۔ ان کے شر سے نہ مساکین بچتے ہیں، نہ عزت و اعتبار والے، نہ غریبوں کو ان سے پناہ ملتی ہے نہ امیروں کو۔ [illegible] ان کی [illegible] اس درجہ کی ہے کہ غریب اور بے بس مسلمان ان کی "اسلامی حکومت" سے کفار کی کافرانہ حکومت کو بہتر سمجھنے لگتے ہیں [illegible] ان کے نزدیک خدا کے بندوں کے لیے جائے امن قرار پاتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر رعایا سلطانِ ظالم سے بیزار ہوتی ہے اور سلطانِ ظالم بھی اپنے رعایا سے بیزار ہوتا ہے۔ پس یہ اس کی تباہی میں خوش، وہ اس کے زوال میں راضی۔ اسی حالت کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:-

خیار ائمتکم الذین تحبونھم و یحبونکم و تصلون علیھم و یصلون علیکم و شرار ائمتکم الذین تبغضونھم و یبغضونکم و تلعنونھم و یلعنونکم

تمھارے امام اچھے وہ ہیں کہ تم ان سے محبت کرو، وہ تم سے محبت کریں اور تم ان کے لیے دعائے رحمت کرو، اور وہ تمھارے لیے دعائے رحمت کریں۔ اور تمھارے امام برے وہ ہیں کہ تم ان سے نفرت کرو، وہ تم سے نفرت کریں اور تم ان پر لعنت کرو، وہ تم پر لعنت کریں۔

سلطانِ ظالم جس طرح رفتہ رفتہ رعایا کی معاش کو تباہ و برباد کرکے رکھ دیتے ہیں اسی طرح ان کے شجر ایمان کی جڑیں کھود دیتے ہیں۔ آخر لوگ اقامت دین و ایمان کی فکر کیا کریں گے، جبکہ انھیں سلطانِ ظالم کے خوف سے ایک ساعت بھی مخلصی نہیں ہوتی۔ چنانچہ سلطنتِ ظالم کا قیام کسی مذہبِ باطل کے پھیل نکلنے کے مشابہ ہے جو ملت کے نظام اور سنت کے آئین و حدود کو توڑتا چلا جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-

انما اخاف علی امتی الاستسقاء بالانواء و حیف السلطان والتکذیب بالقدر

مجھے اپنی امت کے بارے میں صرف یہ خوف ہے کہ (۱) وہ نچھتروں سے بارش طلب کریگی (۲) بادشاہ اس پر ظلم ڈھائیگے (۳) اس میں قضا و قدر کا انکار پیدا ہوگا۔

سلطانِ ظالم بعض وجوہ کے ماتحت اگر کسی گروہ سے رنجیدہ ہوتا ہے اور اس سے انتقام لینے پر تل جاتا ہے تو اس کے انتقام کی تلوار مطیع اور غیر مطیع اور گنہ گار و بے گنہ میں ہرگز امتیاز نہیں کرتی بلکہ بے دریغ سروں کو کاٹتی چلی جاتی ہے اور ملکوں اور شہروں کو بے چراغ کرکے چھوڑتی ہے۔ حدیث میں وارد ہے کہ:-

من خرج علی امتی بسیفہ یضرب برھا و فاجرھا و لا یتحاشی من مومنھا و لا یفی لذی عھد عھدہ فلیس منی و لست منہ

جس شخص نے اپنی تلوار لیکر میری امت پر حملہ کیا اور قتل و غارت میں نیک و بد کی تمیز نہ کی اور امت کے مومنوں کو قتل کرنے سے پرہیز نہ کیا اور نہ کسی کے اپنے عہد کا پاس و لحاظ رکھا اس کا نہ مجھ سے کوئی تعلق ہے اور نہ میرا اس سے۔

پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی گروہ کے متعلق سلطانِ ظالم کے دل میں آتش غضب بھڑکتی ہے لیکن حالات ایسے نہیں ہوتے کہ عملاً انتقام لیا جاسکے۔ ایسی حالت میں لامحالہ اس کے سینے میں کینہ پرورش پاتا رہے گا اور وہ اس تاک میں رہے گا کہ اس کینہ کی بھڑاس نکالنے کا کب مناسب موقع پیدا ہوتا ہے۔ نبی صلعم سے روایت ہے:-

ما من وال یلی رعیۃ من المسلمین فیموت وھو غاش لھم الا حرم اللہ علیہ الجنۃ

جو حکمراں بھی اپنی مسلم رعایا پر غدر اور خیانت کے ساتھ حکومت کرتا ہوا مرگیا اس پر اللہ تعالی نے جنت حرام کر دی ہے۔

(باقی)

قانون بقائے انفع

اجتماعیات میں تحفظِ حق و عدل کا فطری اہتمام

(۲)

بحث کا پہلا حصہ انفرادی اخلاق سے متعلق تھا۔ انفرادی اخلاق کی اہمیت اجتماعیات میں اس وجہ سے ہے کہ ہر اجتماعی ہیئت افراد ہی کی اکائیوں کا مجموعہ ہوتی ہے اور ذہن و شعور صرف افراد کو حاصل ہے جس کی وجہ سے تمام ذمہ داریاں بالآخر افراد ہی پر عائد ہوتی ہیں۔ یہ بات اگر نہ ہوتی تو ہم انفرادی اخلاق پر اجتماعیات میں کوئی بحث نہ کرتے اور براہ راست جماعتوں اور اجتماعی نظاموں پر گفتگو چھیڑتے۔ سو افراد کے متعلق جو بحث کرنی تھی وہ ہو چکی۔ اب ہمیں اپنے اصل موضوع کی طرف پلٹنا ہے یعنی یہ کہ قانون بقائے انفع کا عمل جماعتوں کے معاملہ میں کیا ہے؟ جماعتوں کو کیا چیز ابھارتی ہے؟ انھیں انسانی آبادیاں کس بنا پر سند قبولیت دیتی ہیں؟ پھر کیا اسباب انھیں اقتدار سے معزول کرتے ہیں؟ کیا اقتدار ان جماعتوں کے لیے ہے جو ظلم توڑنے کے لیے زیادہ سے زیادہ قوت فراہم کرلیں یا ان کے لیے جو اپنے آپ کو نوع انسانی کی خدمت کے لیے پیش کریں؟

مغرب نے تو ہمیں صرف اتنا بتایا ہے کہ کامیاب صرف وہ گروہ ہوتے ہیں جو "اقوی" ہوں۔ مگر یہ ہمارے سوال کا تسلی بخش جواب نہیں ہے۔ ہمیں تو یہ معلوم کرنا ہے کہ کوئی گروہ اقوی کس بنا پر ہوتا ہے؟ "اظلم" ہونے کی وجہ سے یا "اعدل" ہونے کی بنا پر؟ دوسرے لفظوں میں کیا انتفاع وجہ قوت ہے یا خدمت؟ لوگ اپنی باگ ڈور کیا اس گروہ کے حوالہ کرنا چاہتے ہیں جو ان کا سینہ روندے، ان کا گلا گھونٹے، ان کا چہرہ لہولہان کرے اور عام انسانی آبادی پر ارتقاء کی راہ بند کرکے صرف اپنے آپ کو آگے بڑھانے کی فکر کرے؟ یا پھر کیا وہ گروہ رہنمائے انسانیت حاصل کر سکتا ہے جو کمزوروں اور ضعیفوں اور کچلے جانے والوں کو ظالموں اور متکبروں کے پنجے سے نجات دلا کر اپنے پہلو میں کھڑا کرے اور طاقتور کو کمزور کی دستگیری کا سبق سکھائے؟ بس یہی اصل مرکزی سوال ہے جو اس مضمون میں پیش نظر ہے۔

اجتماعیات میں قوت کی حقیقت اوپر کا سوال حل کرنے سے پہلے یہ طے کرلینا ضروری ہے کہ اجتماعیاتی یا جماعتی قوت کی ماہیت کیا ہے؟ ـــــ وہ قوت جو تمدنی و سیاسی نظاموں کو جوڑتی توڑتی ہے۔ مغربی فلسفہ کی سطح بینی نے زیادہ تر "توپ و تفنگ" کو فیصلہ کن طاقت قرار دیا ہے، جسے حاصل کرلینے والا گروہ زندگی کی مسابقت میں آگے بڑھ سکتا ہے، مگر توپ و تفنگ آسمانوں سے ڈھلے ڈھلائے تو ٹپکتے نہیں، خود انسانوں کو بنانے پڑتے ہیں۔ پس اس قوت کا حصول دو باتوں پر منحصر ہے: ایک تو قدرتی وسائل، دوسرے کسی آبادی کی دماغی ترقی ـــــ اور مغرب ہمیں یہ بتاتا ہے کہ یہ دو سعادتیں جس انسانی جماعت کو

حاصل ہو جاتی ہے۔ پھر یہ ہوتی ہے کہ ہاتھ آتی ہے۔ دماغی ترقی طبیعی قوتوں پر انسان کی دسترس بڑھاتی ہے اور ان قوتوں کی مدد سے جماعتیں انسانی ... کو مسخر کرتی ہیں اور ان کے بعد اپنا اضافہ واستحکام اقتدار میں زیادہ سے زیادہ جو تیسری قوت استعمال ہوتی ہے وہ سیاسی ساحری کا فن ہے جس کے بغیر ... کوئی بڑا نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔ سو مغربی تصور کے مطابق اجتماعی قوت کے اقانیم ثلاثہ یہ ہوئے:-

(ا) علوم طبیعی (ب) قدرتی وسائل (ج) سیاسی ساحری کا فن

مگر ... یہ ناقص تصور ہے۔ علوم طبیعی کا نشو و ارتقا اور قدرتی وسائل سے استفادہ کی صلاحیتیں اور سیاسی حکمت تو افراد انسانی ... میں ہوتی ہیں، اور ان ہی کے اجتماع و تعاون سے اجتماعی قوت کا ظہور ہوتا ہے۔ اب سوچیے کہ یہ اجتماع و تعاون کیسے ظہور میں آتا ہے اور اس کا دائرہ کس طرح پھیلتا ہے؟

فرض کیجیے کہ آپ ایک میدان میں کھڑے ہو کر لوگوں کو یہ دعوت دیتے ہیں کہ آؤ اپنی اپنی صلاحیتوں اور استعدادوں کو ایک جگہ جمع کر دو۔ ماہرین علوم طبیعی اپنی اپنی تحقیقاتیں اور ایجادیں پیش کر دیں، علمائے سیاست اپنے اپنے "جادو" کا مظاہرہ کریں، دولت و سرمایہ کے مالک اپنے مال ڈھیر کر دیں، مزدور اور دہقان اپنی محنت کی متاع پیش بہا لے کر حاضر ہو جائیں۔ کیا یہ آواز سنتے ہی دنیا تعمیل کرے گی؟ نہیں، ہرگز نہیں! وہ آپ سے دریافت کرے گی کہ یہ کام کا ہے کو؟ یہ دعوت کاہے کی ہے؟ نتیجہ آپ کو مقصد بتانا پڑے گا کہ آپ ایک اجتماعی ہیئت کی تشکیل کر کے سیاسی تمکن حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر آپ کا سیاسی تمکن فی نفسہٖ کسی کا مقصود نہیں ہو سکتا، آپ کو یہ بھی بتانا پڑے گا کہ اس تمکن کی غایت کیا ہے۔ چنانچہ آپ بتاتے ہیں کہ ہمارا مقصد نوع انسانی یا کسی ایک نسل و وطن کے فرزندوں کی فلاح و بہبود ہے۔ لیکن صرف اتنی توضیح بھی لوگوں کو آپ کے گرد جمع نہیں کر سکتی۔ آپ کو یہ بھی بتانا پڑے گا کہ فلاح و بہبود سے آپ کی مراد کیا ہے اور وہ کون سے اصول فکر و عمل ہیں جو جمیع بنی آدم یا آپ کی ہم نسل و ہم وطن برادری کی فلاح و بہبود کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ ان سارے پہلوؤں سے اگر آپ خواص و عوام کی "رضا" حاصل کر سکے تو وہ اپنی ساری صلاحیتوں اور ساری مادی قوتوں کے ساتھ آپ کے گرد سمٹ آئیں گے۔ پس مادی قوتیں جماعتی نظام میں خارجی حیثیت رکھتی ہیں اور جماعت کی داخلی قوت وہ اصول و مقاصد ہیں جو انسانی رضا کو اپنی طرف جذب کرتے ہیں۔ پس جماعتی قوت کا شجرۂ نسب مختصراً یہ قرار پائے گا:-

اصول و مقاصد [1] ← انسانی آبادی کی رضا [2] ← مادی قوت [3] ← تمکن فی الارض [4]

انسانی رضا حاصل کر سکنے والے اصول و مقاصد کو جماعت کی ہیئت سے الگ کر دیجیے تو پھر آپ کے پاس نہ مادی قوت فراہم ہو سکے گی، نہ تمکن فی الارض کا کوئی امکان رہے گا، بلکہ خود "جماعت" نام کی کوئی چیز بھی باقی نہ رہے گی، صرف منتشر افراد ہوں گے جن کے پاس ہر طرح کی صلاحیتیں ہوں گی مگر وہ کسی کام نہ آ سکیں گی۔ پس اصول و مقاصد جماعتوں کے لیے اصل قوت ہیں جن سے انسانی رضا ظہور کرتی ہے۔

اصول و مقاصد کی جاذبیت آگے چلنے سے پہلے ہمیں اصول و مقاصد کی جاذبیت کا راز ڈھونڈنا ہے۔ کیونکہ اس کے محور پر ہماری ساری بحث کا پہیہ گھومتا ہے۔ تو اب غور فرمائیے کہ آپ اردگرد کی دنیا کو اگر اس مقصد کی طرف بلائیں کہ لوگو اٹھو اور "زید" کی فلاح و بہبود میں اپنی ساری مساعی صرف کرنے کے لیے جماعت بندی کرو تو زید کے سوا شاید کوئی اور اس پر لبیک کہنے والا

نہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ اپنی بات کی پچ میں شاید آپ خود زید کا ساتھ دے جائیں ـــــ مگر اور کوئی "سرپھرا" ہی کوئی ملے گا۔ اچھا پھر اگر آپ یہ دعوت دیں کہ "بکر" کی برادری کی بھلائی کے لیے جماعت بندی کی جائے تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ بکر کی برادری آپ کے گرد جمع ہو جائے ـــــ مگر "زید" کی "عمر" کی "خالد" کی "فتو" کی برادریاں تو آپ کی دعوت کو کوئی وقعت نہ دیں گی۔ پس معلوم ہوا کہ آپ کی دعوت فلاح کا دائرہ جتنے انسانی افراد کو محیط ہوتا ہے، آپ کی دعوت کی جاذبیت بس انہی تک محدود رہتی ہے اور رضا صرف انہی کی حاصل ہو سکتی ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ اجتماعیات میں جن سیاسی جماعتوں سے ہم بحث کر رہے ہیں وہ تجارتی فرموں کی طرح نہیں ہوتیں بلکہ ان کا خطاب پوری انسانیت یا کم از کم ایک نسل اور ایک وطن کے پورے لوگوں سے ہوتا ہے۔ کیونکہ سیاسی تمکن کا حصول بہت بڑی اجتماعی قوت چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ظاہر ہے کہ مطلوبہ مادی قوت ہر پہلو سے مکمل کرنے کے لیے ہر عنصر کے انسانوں کی رضا مطلوب ہوتی ہے اور قوم یا نسل کا کوئی عنصر ایسا نہیں رہتا جسے قطعی نظر انداز کیا جا سکے۔ اہل مال و منال ہوں یا ارباب علم و فضل، ماہرین سیاست و تمدن ہوں یا مصنفین و اساتذہ، سپاہی اور انجینیر ہوں یا وکیل و اطبا، دہقان اور کسان ہوں یا مزدور اور قلی، تاجر اور سوداگر ہوں یا صناع اور اہل حرفت، سب سے حسب استطاعت مدد اور مادی قوت کا چندہ لینا کسی سیاسی دعوت کے لیے ناگزیر ہے۔ پس کسی بڑے گروہ انسانی کی رضا حاصل کرنے کے لیے لازم ہے کہ من حیث المجموع اس پورے حلقہ کی فلاح و بہبود کو مرکزی مقصد قرار دیا جائے۔ اگر آپ فلاح و بہبود کے انتظامات سے کسی ایک عنصر کو محروم کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اپنی دعوت میں اس کے لیے کوئی جاذبیت نہیں چھوڑتے بلکہ الٹا اس کے خلاف اس عنصر میں منافرت پیدا کرتے ہیں۔ تاہم جس گروہ کو بھی آپ مخاطب کر رہے ہوں اگر اس کے ہر ہر طبقے، ہر ہر عنصر اور ہر ہر فرد کی فلاح و بہبود آپ کا مقصد قرار پاتی ہے تو وہ مطلوبہ جماعت بندی کے قالب میں ڈھل جائے گا۔

اب ہم اس مقصد کے حصول کا اساسی اصول معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات تو روشن ہے کہ فطرت کی "تنوع پسندی" نے کوئی سے دو انسانوں کو بھی مساوی نہیں بنایا ہے بلکہ اس نے اپنے ہمہ گیر مذاق کے ماتحت کسی کو مضبوط بدن دیا ہے کسی کو کمزور، کسی کو سالم الاعضا بنایا ہے کسی کو ناقص الاعضا، کسی کو ذکی و ذہین پیدا کیا ہے کسی کو بلید و احمق، کسی کو کثیر الافراد قبیلہ قسمت کیا ہے کسی کو خاندان سے بالکل محروم کر دیا ہے۔ کسی کو بچپن ہی میں چاق و چوبند بنایا اور کسی کو کامل فرد کا زینہ چھونے بھی نہیں دیا، کسی کا ماحول ہمت افزا ہے اور کسی کا مایوس کن۔ کسی کو علم و فضل حاصل ہے اور کوئی جہل کی وادیوں میں بھٹک رہا ہے۔ کسی کو مال و منال میسر ہے اور کوئی افلاس و تنگ دستی میں گھرا ہوا ہے۔ کوئی طلاقت لسانی میں امام ہے تو کسی کو سیدھی بات کرنی نہیں آتی، کوئی قلم سے دماغوں کو فتح کرتا ہے تو کوئی دوسرا الف بے لکھنا نہیں جانتا۔ پھر اس فرق و اختلاف کے ساتھ انسانی طبائع میں کبر و خود پرستی کے ظہور کے امکانات بھی رکھ دیے ہیں اور عجز و سرافگندگی کے میلانات بھی۔ اب یہ مختلف صلاحیتیں رکھنے والے انسانوں کا انبوہ تمدن کے میدان میں اترتا ہے تو ہر طرف ٹکراؤں اور تصادموں کا ایک طوفان امڈ آتا ہے۔ قوی قوت بازو سے کام لے کر ضعیف کی پیٹھ پر سوار ہو جاتا ہے۔ تونگر مال کے زور

سے غصّہ کا خون پینے لگتا ہے۔ دماغ والا سادہ لوح کو بیچ کھاتا ہے، زبان کا استاد بے زبانوں کو کچل دے جاتا ہے اور انسان [illegible] کی اس کشمکش [illegible] انسانیت دیوالیہ ہو جاتی ہے، یعنی اس کے خزانۂ اجتماعی میں امن و مسرت کا ایک حبہ تک [illegible] نہیں [illegible] "مساوات" کے ان خوفناک نتائج سے بچنے کے لیے انسان کو لازماً "اخلاقی مساوات" کے اصول یا اجتماعی نظم کی [illegible] ہے جسے چلانے کے لیے وہ ریاست کے ادارے کو وجود دیتا ہے۔

اخلاقی مساوات [illegible] ہے کہ من حیث المجموع "انسان" کے فطری اور قانونی اور اخلاقی حقوق [illegible] [illegible] نظیر [illegible] قوت کی دست برد سے بچانے کیلیے ریاست "اجتماعی قوت" کو استعمال کرتی ہے جس کے مظاہر میں نظام عدالت [illegible] وغیرہ شامل ہیں۔ [illegible] کے فراہم کرنے میں نظام حکومت کو یہ ملحوظ رکھنا پڑتا ہے کہ جو زیادہ [illegible] وہ زیادہ [illegible] اور جو کم [illegible] اس سے کم [illegible] صرف کرتے ہوئے یہ مدنظر رکھنا ہوتا ہے کہ [illegible] کم محتاج [illegible] زیادہ ضعیف ہے وہ زیادہ پائے [illegible] تمدن ایک [illegible] میں [illegible] اہل ضعف و احتیاج۔ اب حکومت کا عمل [illegible] ہوتا ہے [illegible] اخلاقی مساوات ہے جس کے ماتحت ذمہ داریاں "قوت" پر عائد ہو جاتی [illegible] [illegible] ہوتا ہے وہ [illegible] کے مفاد کا اتنا ہی زیادہ [illegible] اور جو جتنا ضعیف [illegible] وہ [illegible] حقوق [illegible] وہ مستفید ہوتا ہے۔ پس انسانی ہیئت اجتماعیہ کی مجموعی فلاح و بہبود کے [illegible] کی طرف [illegible] اخلاقی مساوات ناگزیر ہے وہ ترازو کے پلڑوں کو برابر کرنے والے اصول عدل پر قائم ہوتی [illegible] جہاں [illegible] فلاح و بہبود مدنظر ہو [illegible] اس کے لیے اصول عدل پر دعوت دی جائے وہاں انسانی رضا کے لیے جاذبیت پیدا [illegible]

نظامِ عدالت | یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصولِ عدل کی کچھ اور توضیح کر دی جائے۔ عدل کا مفہوم صرف یہی نہیں [illegible] انسانی کے مختلف عناصر میں توازن قائم کر دیا جائے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ انسان جن مختلف تقاضوں [illegible] کا مخاطب ہے ان سب کو پورا کیا جائے۔ ان مختلف حیاتی اور حیوانی اور اخلاقی تقاضوں میں سے کسی ایک [illegible] بھی اصولِ عدل کے منافی ہوگا۔ اسی طرح کسی تقاضے کو اس کی اصل حدود سے بڑھا چڑھا کر دیکھنا اور [illegible] کی اہمیت کو کم کر کے انھیں پیش نظر رکھنا بھی اصولِ عدل کی نفی ہے۔

[illegible] کی گوناگوں اعمال و کردار [illegible] میں روحِ عدل کا ساتھ [illegible] نظریات کے جن اساسی نقاط پر مرتب کیا جائے [illegible] حق اور مطابق واقعہ ہوں۔ [illegible] ہوئے مضمون کے حصہ اول میں واضح [illegible] ہیں عملیۂ عدل کیلیے نظریۂ حق لابدی اساس [illegible] حاصل کرنے کے لیے نظریۂ حق اور عملیۂ عدل دو لازم [illegible] مایوں کی ضرورت [illegible] کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ "نظام خدمت" [illegible] نظام حق و عدل کی علمبرداری ہی سے جماعتوں [illegible] اور [illegible] پاتی ہے جس کی بنا پر وہ تمکن کی مستحق ٹھہرتی ہیں۔ اور نظام خدمت سے [illegible] کھو دیتی ہیں [illegible] فادیت کے سلب ہو جانے کے نتیجے میں انسانی [illegible]

[illegible] کو سیل لگ جاتی ہے، حتیٰ کہ اس کے کھنڈر [illegible] ایک دن نوحہ کرتے نظر آتے ہیں۔ [illegible] نے بھی حق و عدل کی اہمیت [illegible] کوئی [illegible] طریقہ سے ضرور محسوس کیا ہے، کیونکہ اس کی افادیت ایک [illegible] قطعی صداقت ہے جس سے انکار کرنے سے پہلے تاریخ نوع انسانی [illegible] یا رد کر دینے چاہئیں۔ [illegible] جہاں تک [illegible] نظریات اور تعبیرات حقائق کا تعلق ہے ان کا آخری گول [illegible] کیا گیا ہے اور تمام [illegible] فلسفہ [illegible] آخری حقیقت [illegible] دائمی صداقتوں کو کھوج [illegible] حرکت [illegible] یقین [illegible] ہے — کیونکہ [illegible] تعبیرات [illegible] ضوابط کا نام [illegible] ہو سکتا [illegible] ذہن میں [illegible] اپنے [illegible] مسئلہ میں [illegible] تھوڑی [illegible] علم کی [illegible] مشاہدہ [illegible] سے [illegible] میں

[illegible] عملی اجتماعی ضوابط عمل کا تعلق [illegible] نہیں [illegible] کہ انصاف [illegible] جاتا ہے۔ چنانچہ [illegible] اجتماعی عدل کو بڑی اہمیت [illegible] کی توضیح [illegible] معاشرتی [illegible] قانون نہیں [illegible]

[illegible] خلاف و فرق کا معیار [illegible] انصاف [illegible] مخصوص نہیں [illegible]
[illegible] تمام ہے [illegible] انسان [illegible] ساتھ [illegible] عام فہم شرح یوں کی جا سکتی
[illegible] کہ اپنی پوری [illegible] ساتھ سب کے [illegible]

[illegible] بھی کہتا ہے [illegible] اگر [illegible] حکمت ہو تو [illegible] قطعی نفی [illegible] انصاف کی ایک شرط [illegible] کہ قانون [illegible] قانون منصادم [illegible] آگے بڑھ کر دوسری صورت اختیار کی گئی [illegible] کے مشترک [illegible] قانون [illegible] — وغیرہ!

[illegible] اپنی کتاب "مذہب کشادہ [illegible] خدمت ہی در اصل [illegible] اور [illegible] بصیرت [illegible] شخص لاکھ مضبوط ہو، مگر [illegible] حکم اس قدم رکھنے کے لیے [illegible] آبادی [illegible] کو نہ پا سکے [illegible] نے ملایا [illegible] پردہ بزور [illegible] حقیقی [illegible] نئی صورت

[illegible] عدل [illegible] عدل و [illegible] اصل [illegible] کہ نظام [illegible] ضوابط [illegible] کی علمبردار [illegible] کوئی [illegible] موجود ہے [illegible] ان مظلوم [illegible] نہیں [illegible] اقتدار

ہے؟ کیا دو قومی سیاسی تسلط لوگوں کی رضا پر منحصر ہے؟ —— اگر ایسا ہے تو یہ ہندوستان پر برطانیہ کی حکومت کیا معنی؟ مزدوروں پر سرمایہ داروں کا تسلط کیسا؟ کالے ہندیوں اور حبشیوں پر سفید فاموں کی خدائی کیوں؟" —— آپ کا چونک جانا بجا ہے اور آپ کی گھبراہٹ بہت معقول ہے۔ مگر یہ الجھن صاف ہوئی جاتی ہے۔

سب سے پہلے نظامِ انتفاع کی ماہیت سمجھ لیجئے۔ یہ نظام "نظامِ خدمت" کی بالکل ضد ہوتا ہے۔ یعنی اس کی علمبردار جماعتیں سب کے مشترک مفاد کے لیے نہیں، بلکہ ایک حلقۂ انسانی میں سے کسی ایک عنصر کی خدمت کو نصب العین بناتی ہیں اور بقیہ عناصر سے انتفاع کرتی ہیں۔ کچھ لوگوں کو اوپر چڑھانا اور کچھ کو نیچے گرانا اور گرائے رکھنا ان کو مطلوب ہوتا ہے۔ پھر یہ فطرت انسانی کے بعض مطالبات کو تو خوب زور شور سے ابھارنے والی ہوتی ہیں لیکن بعض مطالبات کو سرے سے کوئی وزن ہی نہیں دیتیں۔ یوں ان کے منصوبۂ عمل بالکل "خلافِ وضعِ فطری" ہوتے ہیں، اور ان کی اساس نظریاتِ باطل پر قائم ہوتی ہے۔ ایسی جماعتیں جن لوگوں کے مفاد کی خدمت کرتی ہیں ان کی "رضا" تو انھیں عین قانون بقائے انفع کے تحت حاصل ہوتی ہے مگر جن عناصر سے انھیں انتفاع کرنا ہوتا ہے ان پر اگر ان کی حیثیت آشکارا ہو تو ان کی رضا کبھی بھی حاصل نہیں ہوسکتی۔ پس اپنے نظامِ ظلم و جور کے ساتھ انتفاع پیشہ جماعتیں اگر ابھرتی ہیں تو "ساحری" ان کا خاص طریق کار ہوتا ہے جسے وہ بعض عناصر کے مفاد کے لیے بعض دوسرے عناصر کے خلاف استعمال کرتی ہیں۔ یعنی حقیقتاً تو یہ قاتلِ عالم ہوتی ہیں مگر بظاہر مسیحائی کا دم بھرتی ہیں۔ ظلم کے اسلحہ تو ان کی آستینوں میں پنہاں ہوتے ہیں مگر یہ جبۂ اوڑھتی ہیں نظامِ حق و عدل کا۔ آخر جادو چل جاتا ہے اور انھیں اقتدار مل جاتا ہے مگر جب یہ اقتدار کو استعمال کرنے لگتی ہیں تو ان کی اصل حقیقت فاش ہوجاتی ہے۔ اس مرحلہ پر "مظلوم عناصر" کی رضا کا رخ ان سے پھر جاتا ہے اور وہ مزاحمت کرنے لگتی ہیں۔ اس مزاحمت کو کمزور کرنے کے لیے انتفاع پیشہ جماعتوں کو "قوت" خرچ کرنی پڑتی ہے۔ اب ایک انسانی حلقہ کی "رضا" کی نالی اس کے اقتدار کا حوض بھرتی رہتی ہے مگر دوسری طرف دوسرے حلقۂ انسانی کی نالی اسے خالی بھی کرتی جاتی ہے۔ ابتدا میں حوض بھرنے والی نالی زیادہ کام کرتی ہے اور خالی کرنے والی کم، مگر بعد میں تدریجاً پہلی کی رفتار کار سست اور دوسری کی تیز ہوتی جاتی ہے۔ اسی تدریج کی وجہ سے ایک دفعہ اقتدار پالینے والی جماعت کو مدت تک جمی جانے کا موقع ملتا ہے۔ کیونکہ تدریج کائناتی اور حیاتی اور اخلاقی سبھی قسم کے تغیرات کا مستقل خاصہ ہے۔

پس انتفاع پیشہ جماعت کا اقتدار کچھ اس طرح تحلیل ہوا کرتا ہے:۔

قرن اول:۔	قوت رضا	(۱۰۰)	- قوت مزاحمت	(۱۰)	= حق اقتدار (۹۰)
قرن ثانی:۔	"	(۸۰)	"	(۳۰)	= " " (۵۰)
قرن ثالث:۔	"	(۴۵)	"	(۳۸)	= " " (۷)
قرن رابع:۔	"	(۴۰)	"	(۴۰)	= " " (۰)

قوتِ رضا اور قوتِ مزاحمت جب برابر ہوجاتی ہیں تو کسی جماعت کے لیے اقتدار کا قائم رکھنا ناممکن ہوجاتا ہے۔

اوپر نظامِ انتفاع کی جو ساحرانہ شکل بیان ہوئی ہے وہ اس صورت میں نمودار ہوتی ہے جبکہ ایک جماعت اپنی دعوت کے

مخاطبین ہی کے حلقہ میں ایک طرف "خدمت" کا طریقِ کار اختیار کرے اور دوسری طرف "استفاع" کا۔ اس کی مثال دیکھنے کو سرمایہ دار ممالک کے نظاموں پر نظر ڈالیے۔ انگلستان، امریکہ، فرانس وغیرہ کی سرافتدار اجتماعی ہیئتیں اپنی اپنی جغرافی قوموں کو بحیثیت مجموعی دعوت کا مخاطب بنانے پر مجبور ہیں مگر اپنے جانبدارانہ رجحانات کے ماتحت اپنی پوری قوم کے مفاد کی عادلانہ خدمت کی بجائے وہ اس کے سرمایہ دار عنصر کی خدمت کرتی ہیں اور ان ہی کی خاطر محنت پیشہ عناصر کو استفاع کے شکنجہ میں کستی ہیں۔ اب اس بدعملی کے دوہرے اثرات یوں رونما ہوتے ہیں کہ ادھر سرمایہ دار عنصر اپنی نمائندہ مقتدر جماعت کی پشت پناہی کرتے ہیں اور ادھر محنت پیشہ عناصر اس کے خلاف زور کرتے ہیں۔ قانونِ فطرت کے ماتحت تدریجاً ان ظالمانہ اقتداروں کی پشت پناہی کرنے والی طاقتیں کمزور ہو رہی ہیں اور ان کی مزاحمت کرنے والے عناصر قوت پکڑ رہے ہیں اور اس تغیر کا انجام ایک دن یہ ہوگا کہ جو قوی ہیں وہ کمزور ہو جائیں گے اور جو مظلوم ہیں ابھر کر اوپر آ جائیں گے۔

نظامِ انتفاع سب سے پہلے مخصوص مخاطبین کے حلقہ سے باہر کام کرتا چلا جاتا ہے تو پھر وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ کہاں کس ملک یا قوم میں ایسا اقتدار پایا جاتا ہے جو اخلاقی یا مادی وجوہ سے ضعیف واقع ہوا ہو۔ جب کوئی ایسا شکار نظر پڑ جاتا ہے تو کوئی انتفاع پیشہ قوی ہیئت "ساحری" کا دام بچھاتی ہے اور اس کے ساتھ "قاہری" کے اسلحہ تیز کرتی ہے۔ آخر بدقسمت قومیں بے بس ہو کے رہ جاتی ہیں۔ اسی صورت حال پر اقبال نے کہا تھا:۔

"غضب ہے نوعِ انساں نوعِ انساں کی شکاری ہے"

مگر یہاں بھی مظلوموں کی طرف سے مزاحمت ہونے لگتی ہے اس وقت تک کہ سیاسی ظلم کا خاتمہ ہو جائے۔ اور اس میں جو دیر لگتی ہے وہ قانونِ تدریج ہی کے ماتحت لگتی ہے۔

اس امر کا خیال رہے کہ نظامِ انتفاع کے ماتحت جس عنصر کی خدمت ہوتی ہے وہ بھی دولتوں اور لذتوں کے حصول کے باوجود "اطمینان آمیز مسرت" سے محروم رہتا ہے کیونکہ نظامِ انتفاع کے ماتحت ایک قوم کے طبقات میں یا مختلف اقوام میں جو مزاحمت و کشمکش جاری رہتی ہے وہ اطمینان آمیز مسرت کی دشمن ہے۔ اور پھر آخری انجام تو ہمیشہ آنکھیں دکھا دکھا کر انھیں خوفزدہ رکھتا ہے ـــــ یعنی جنگ یا انقلاب! ـــ جس کا عمل یہ ہے کہ نیچے والوں کو اوپر اور اوپر والوں کو نیچے کر دے!

"رضا" و "مزاحمت" کی آویزش | یہ نتیجہ ہے کہ نظامِ انتفاع کے ماتحت جو غالب فریق نفع میں رہتا ہے اس کے خلاف گھاٹے میں رہنے والے مظلوم عناصر زور کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی ہمارا یہ دعویٰ کہ مظلوم عناصر آخرکار اوپر آ جاتے ہیں، غور طلب ہے کیا تعجب کا مقام نہیں ہے کہ غالب فریق جو سیاسی اقتدار کی پشت پناہی حاصل کیے ہوئے ہوتا ہے وہ ان نہتے گروہوں سے شکست کھا جائے جنھیں نہ اس کی سی علمی برتری حاصل ہے، نہ اس کی سی مالی قوت میسر ہے، نہ اس کی سی مضبوط تنظیم کرنے کا ڈھنگ آتا ہے، نہ اس کی سی سیاسی فوقیت قسمت میں ہوتی ہے۔ لیکن دراصل یہ تعجب کا مقام نہیں ہے، یہ تعجب کا مقام اس لیے بن گیا ہے کہ ہم نے اس غلط فہمی کو حقیقت کا درجہ دے کر حالات کا مطالعہ کیا ہے کہ قوت صرف مادی، سیاسی اور عقلی وسائل کا نام ہے اور اخلاق نہ کوئی قوت ہے، نہ اسے ارتقائے حیات میں کوئی دخل ہے۔

دراصل "ظلم" پر فطرتِ انسانی کبھی مطمئن نہیں ہو سکتی۔ حتیٰ کہ خود ظالم بھی جسے دوسروں کو مظلوم بنا رکھنے سے براہِ راست

فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اس کا ضمیر بھی نظامِ ظلم کے خلاف دبی دبی نفرت کرتا ہے اور اس کی اخلاقیت چاہے کتنی ہی ضعیف ہو رہی ہو، بہرحال ظلم کے خلاف زور کرتی ہے۔ اب جب نظامِ انتفاع کے حامیوں اور اس کے دشمنوں میں تصادم ہوتا ہے تو اول الذکر گروہ کے پاس مادی قوت تو موتی ہوگی اخلاقی قوت صفر ہوتی ہے دوسری طرف موخر الذکر گروہ کے پاس مادی قوت نہیں ہوتی مگر اخلاقی قوت ہوتی ہے۔ مادیت اور اخلاقیت کے اس تصادم میں ظالم طبقہ کے بیدار ضمیر افراد کے دل خود بخود ٹوٹ ٹوٹ کر مظلوموں کے ساتھ ہونے لگتے ہیں اور وہ اخلاقیت کے ہر نئے بار سے مقام کبریائی سے کچھ نہ کچھ پھسل جاتے ہیں۔ اس طرح تاریخ میں تدریجاً عظیم الشان سیاسی تغیرات رونما ہوتے ہیں۔

مادیت اور اخلاقیت کے تصادم کی تاریخ کا کوئی سا صفحہ بھی کھول کر دیکھ لو، اخلاقیت کو اپنے مقام پر اٹل پاؤ گے، چاہے اس کے حامیوں پر کتنے ہی ظلم توڑے جائیں مگر دوسری طرف اخلاقیت کے مقابلہ میں مادی قوت کے علمبرداروں کو ہمیشہ اپنی جگہ سے سرکتا ہوا دیکھو گے، چاہے اس کا اقتدار مظلوموں پر کتنی ہی قاہرانہ گرفت کیوں نہ رکھتا ہو۔

حضرت عیسیٰ اور کبرائے یہود، حضرت موسیٰ اور اقتدار فرعون، محمد صلعم اور قریش، سیدنا حسین اور یزید، خلیفہ منصور اور علمائے حق، ان میں سے کسی کے تصادم کی داستان پڑھ جاؤ، ظلم اربابِ حق کی جان لے سکا ہے مگر انھیں ان کے موقف سے سرکا نہیں سکا، یزید انسانی خون کی ندیاں بہانے کی قدرت رکھنے کے باوجود آخرکار خائب و خاسر ہوکے رہا۔ نہتے اور بے وسیلہ لوگ محض اخلاقیت کے زور سے اوپر ابھر آئے ہیں اور زر و جواہر اور تخت و تاج اور افواج و عساکر رکھنے والے اکابر زمانہ کے پاؤں کے نیچے مسل گئے ہیں۔

یہ تو پرانی کہانیاں ہیں، نئی داستانیں جو آپ کے سامنے لکھی گئیں اور لکھی جا رہی ہیں، یہ سب اخلاقیت اور حق و عدل کی قوت کا راز کھولنے والی ہیں۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ مصر اور برطانیہ کی سیاسی کشمکش میں کمزور مصر کامیاب رہا ہے اور قوی برطانیہ اپنے مقامِ اقتدار سے پسپا ہوا ہے؟ کیا یہ حق نہیں ہے کہ زار روس کی خدائی کا گلا اس بے بس رعایا نے گھونٹ دیا جس کی بے بسی کو انتہا تک پہنچانے کے لیے سائبیریا کی جہنم کی ساری عقوبتیں اس پر حملہ آور ہوگئیں، پھانسیوں کے پھندے اس کی گردنوں میں حمائل ہوگئے۔ زندانوں نے اسے نگلنا شروع کر دیا، زنجیروں کے اژدہاؤں نے اس کی ٹانگوں کو لپٹنے میں پورے کمالات دکھائے مگر پھر بھی یہی بے بس رعایا غالب رہی۔

پھر جہاں اس نوعیت کا تصادم ابھی تک جاری ہے وہاں بھی آپ یہی صورت حالات دیکھیں گے۔ کیا یہ درست نہیں کہ فلسطین کو مغربی قاہری اس کی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں سرکا سکی بلکہ خود اس قاہری کے لیے راتوں کی نیند اور دنوں کا چین حرام ہوگیا ہے؟ کیا یہ حق نہیں کہ ہندوستان کے مطالبۂ آزادی و استقلال کو موت اور قید اور بندوقیں اور سنگینیں اور بھوک اور قرقیاں دبا دینے میں ناکام رہی ہیں، بلکہ الٹا کمزور ہندوستانیوں کو برسرِ حق ہونے کی وجہ سے صاحبِ اقتدار برطانیہ ہر آویزش کے بعد ان کے حق کی کچھ نہ کچھ قسط ادا کرنے پر مجبور ہوا ہے؟

انسانی دنیا کا سراسر مادیت پر انحصار اور اخلاقیت سے قطعی خالی ہوجانا ناممکن التصور ہے۔ اس کی روحانی توجیہ تو یہ ہے کہ اخلاقیت انسانی فطرت کے اٹل مطالبات کا نتیجہ ہے مگر اس کی مادی توجیہ بھی کی جاسکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں اقتدار

ایک ہی ایک نوع نہیں، متعدد اقتدار بہ یک وقت موجود ہیں۔ اس وجہ سے کسی اقتدار کا معاملہ اپنے محکوموں اور مفتوحوں ہی سے نہیں ہے بلکہ اپنے برابر کے اور اپنے سے قوی تر اقتداروں سے بھی ہے اور ان اقتداروں سے معاملہ کرتے ہوئے وہ خود مجبور ہوتا ہے کہ اخلاقیت ہی کے نام پر حریفوں کو اپیل کرے۔ حتیٰ کہ جنگ اور معاشی تصادم جیسے غیر اخلاقی سمجھے جانے والے مسائل میں بھی اسے اخلاقیت کا دامن قطعی طور پر چھوڑ دینے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اب ایک اقتدار جس حق اور جس عدل کا نام لے کر اپنے ہمسر حریفوں سے امور متنازعہ کو طے کرتا ہے، جب اس کے محکوم و مظلوم اسی حق اور اسی عدل کا نام لے کر اس سے اپنے مطالبات منوانا چاہتے ہیں تو وہ اس سے کامل روگردانی نہیں کر سکتا کیونکہ اس روگردانی سے حق اور عدل کی قیمت کو وہ جتنا گرائے گا، اتنا ہی اپنا نقصان کرے گا۔ جس حق کو وہ دوسروں کے سامنے پیش کر کے زیادہ سے زیادہ مطلوبات حاصل کرنا چاہتا ہے، اگر اسی سکہ کو قبول کر کے وہ خود بھی اسی حق و عدل کو ادنیٰ درجہ میں بھی پورا کرنے سے انکار کر دے تو آخر وہ کس منہ سے اور کس امید پر اس سکہ کو [illegible] بلکہ اخلاقیت کے سکوں کی یہ قدر خود اس کی اپنی نظر میں گر جائے گی، پھر [illegible] قیمت متعین کریں گی۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جنگ عالمگیر میں بڑی بڑی سلطنتیں اس دعوے کے ساتھ میدان میں اتریں کہ ہم محکوموں کو حق آزادی دلوانے کے لیے اور جمہوریت و مساوات قائم کرنے کے لیے لڑائی لڑتی ہیں، پھر دوسروں سے امداد کے لیے پورے ذرائع صرف کر دینے چاہئیں۔ کیا ان سلطنتوں سے ان کے ایک ایک مخالف نے ایک ایک معاملے میں یہ سوال پیش نہیں کیا کہ تم جو فلاں ملک کو غلام بنائے ہوئے ہو اور تم جو فلاں قوم کا خون چوس رہے ہو، تم پر کیسے بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ تم آزادی اور مساوات اور جمہوریت کے نفاذ کے لیے تلوار اٹھا رہے ہو؟ ——— اور کیا یہ واقعہ نہیں کہ ان طاقتوں کو اپنے محکوموں کے مقابلہ میں نرم ہونا پڑا؟

نظامِ ظلم و انتفاع کے ماتحت تدریجاً ارباب اقتدار کی رضا میں ضعف اور مظلوموں کی مزاحمت میں شدت پیدا ہونے کی بھی مادی توجیہ ہو سکتی ہے، اور وہ یہ کہ جب کسی سوسائٹی کا مجموعی نظم ظالمانہ ہوتا ہے تو پھر اس کے اندر ایک ایک گوشے میں ظلم ہی کو فروغ ملنے لگتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب انتفاع کو کاروبار مان لیا گیا ہو تو یہ ممکن نہیں کہ اس کا ایک خاص دائرہ متعین رہے۔ یہ دائرہ لازماً پھیلے گا۔ مثلاً کسی مقتدر سرمایہ دار عنصر سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ [illegible] کے محنت پیشہ عنصر کی ایک مقررہ تعداد کا خون نچوڑتا رہے، بلکہ اس کی کوشش یہ رہتی ہے کہ اس ریوڑ میں خوب ترقی ہو اور نئے نئے موٹے تازے جانور اس میں بھرتی ہوتے رہیں۔ چنانچہ بڑے سرمایہ دار چھوٹے سرمایہ داروں کو رفتہ رفتہ اس ریوڑ میں شامل کرتے جاتے ہیں تا آنکہ ایک بالکل قلیل عنصر ظالموں کا رہ جاتا ہے اور مظلوموں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ ظلم کے اسی عمل کو معاشیات میں "تمرکزِ زر" کی اصطلاح سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ اصول صرف معاشیات ہی میں نہیں، ہر دائرہ میں چلتا ہے۔ فرض کیجیے کہ آدم خوری کو جائز قرار دے دیا جائے، اور انسان انسانی گوشت کو غذا میں شامل کر لے اور قانون کی طرف سے عام اجازت ہو کہ آدمی کا شکار کیا جا سکتا ہے۔ اب جن جن لوگوں کو اچھی اچھی رائفلیں حاصل ہیں وہ نعمتوں کو بھون بھون کر کھاتے پھریں گے، مگر بات نعمتوں تک محدود نہیں رہ سکتی،

آخر کار خود ان رائفلوں والوں میں آدم شکاری کا معرکہ شروع ہوگا، اچھی رائفل والا نشانہ کا ماہر ادنیٰ رائفل رکھنے والے اور نشانہ میں کمزور رہنے والے حریف کو بھون بھون کر کھا جائے گا۔ آخر کار سب کا صفایا ہو جائیگا۔ بالکل اسی طرح پوری دنیا کی سیاست چلتی ہے۔ پوری دنیا کی کمزور اقوام کے مقابلہ میں مقتدر اقوام کا ایک گروہ ہے جو ایک دوسرے کی رسمی پاسداری اور باہمی معاہدات وغیرہ کی وجہ سے ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے بنی ہوئی ہیں۔ مگر خود ان کے درمیان بھی ضعف و قوت کی معرکہ آرائی برسرِ کار ہے۔ چنانچہ ان میں سے بعض اقوام سربراہ کاری کرتی ہیں، جیسے آجکل دو بڑی بڑی قوموں کی بڑائی کے مظاہرے ہو رہے ہیں، مگر خود ان سربراہ کاروں میں بھی دبی دبی آویزش موجود ہے۔ اس آویزش میں جب ایک قوم کا پلڑا بھاری قرار دیا جائے اسے اگر گہری نظر سے دیکھیے تو اس کے اندرونی طبقات میں باہمی تصادم موجود ہے، بلکہ ان طبقات کے اندر بھی مختلف پارٹیوں میں رسہ کشی ہوتی ہے، اور پارٹیوں کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ فرد فرد میں بھی باہمی مسابقت ہے اور ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ دوسروں کو نیچا دکھائے۔

پس نظامِ انتفاع کے اندر خود ظالم عنصر کی مختلف پارٹیوں میں اور ان پارٹیوں کے افراد کے درمیان بھی یہی مسابقت جاری رہتی ہے کہ اوپر ہم ہی ہم ہوں، باقی سب نیچے ہو کے رہیں اور اس عمل کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ظالم عنصر کے سکڑتے جانے سے نظامِ انتفاع کو جدھر سے معاونت حاصل تھی اُدھر کمزوری پیدا ہونے لگتی ہے اور مظلوموں کی تعداد میں اضافہ ہونے سے مزاحمت میں شدت آنے لگتی ہے اور اس کے نتیجہ میں کوئی انقلابی تحریک کامیاب ہو نکلتی ہے۔

کیا آپ کے دل میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ مظلوم جب نظامِ انتفاع کے خلاف چیخ پکار کر کے اخلاقی دباؤ پیدا کر لیتے ہیں تو آخر ظالم عناصر بھی کیوں نہیں برسرِعام چیختے کہ دیکھو یہ لوگ ہمیں راحتوں اور آسائشوں سے محروم کرنا چاہتے ہیں اور کیوں اس شور پر انھیں اخلاقی زور نہیں حاصل ہو جاتا؟ اگر ہندوستانی چلا سکتے ہیں کہ انگریز ہمیں لوٹ کر کھا گئے تو انگریز کیوں نہیں چلاتا کہ دیکھو ہندوستانی ہمارا اقتدار ختم کر کے ہمیں ان فائدوں سے محروم کر رہے ہیں جو ان کی غلامی سے ہمیں حاصل ہو رہا تھا؟ ہمارے کارخانے تباہ ہو جائیں گے، ہمارے بہت سے لوگوں کی تنخواہیں اور پنشنیں بند ہو جائیں گی، ہماری تجارت کے لیے منڈیاں نہیں رہیں گی وغیرہ؟ مزدور اگر یہ فریاد کر کے اخلاقی زور پیدا کر لیتا ہے کہ سرمایہ دار میرا مال مار رہا ہے تو سرمایہ دار کیوں نہیں انسانیت سے اپیل کرتا کہ دیکھو مزدور مجھے اپنا خون نہیں چوسنے دیتے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ میری توند اتنی پھولی نہ رہ سکے گی؟ کالی چمڑی والا حبشی اگر گوروں کے مظالم بیان کر کے ہمدردیاں حاصل کر سکتا ہے تو گورے کیوں انسانی جذبات کو اپیل کر کے ہمدردیاں نہیں حاصل کر سکتے کہ دیکھو یہ کالی نسل ہماری برابری کر کے ہمارا رتبہ گھٹا رہی ہے؟ اسی سوال کے حل سے تو وہ عظیم الشان راز کھلتا ہے جس سے مغرب نے چشم پوشی کر لی ہے۔

دراصل "قوت" کے استعمال سے انتفاع کرنے اور دوسروں کو گرا کر خود کو اوپر اٹھانے کے خلاف انسانیت کی مزاحمت بالکل ایک ایسے قانون کے مطابق ہے جو طبیعی قوانین کی طرح اجتماعیات میں نافذ ہے، بلکہ غلط نہ ہوگا اگر اسے "اجتماعی طبیعی قانون" کہا جائے۔ نظامِ انتفاع انسان کی حسِ اخلاقی کو کبھی اپیل نہیں کر سکتا بلکہ وہ فطرتِ انسانی کے خلاف

چلنے کی وجہ سے مجبور ہوتا ہے کہ انسانی اخلاقیت کو دبانے کے لیے مادی قوت کو استعمال کرے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ پانی کو نشیب کی طرف بہنے کے لیے کسی خارجی قوت کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس کی یہ حرکت عین طبیعی قانون کے ماتحت ہے مگر آپ اگر پانی اس قانون کے خلاف بلندی کی طرف لے جانا چاہیں تو آپ مجبور ہوں گے کہ کوئی خارجی قوت اس پر صرف کریں۔ مثلاً کنوئیں سے پانی کھینچنا ہے تو رہٹ یا پمپ یا کوئی اور آلہ یا مشین استعمال کی جائے گی اور اس پر قوت صرف ہوگی۔ جسمانی قوت ہو یا تیل کی قوت، بھاپ کی قوت ہو یا برقی قوت! صرف قوت کے بغیر پانی کو ایک مصنوعی راستہ پر چلانا ممکن نہیں ہے۔

اجتماعیات میں بھی یہی اصول کام کرتا ہے۔ نظام اجتماعی اگر انسانی سوسائٹی کو انسانی فطرت پر برقرار رکھے گا اور اسی کے تقاضے سے نظام حق و عدل کو کارفرما کرے گا تو اس کی مزاحمت نہیں ہوگی اور اس وجہ سے مزاحمت کا انسداد کرنے کے لیے اسے فضول قوت صرف کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے گی لیکن جب وہ خلاف قوانین فطرت حرکت کرے گا تو قوت صرف کیے بغیر کوئی چارہ نہ ہوگا۔

آپ موجودہ سوسائٹیوں پر اگر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انسانی فطرت کی متعینہ راہِ حق و عدل سے اقتداروں کے ہٹ جانے کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ بے شمار انسانی قوت ضائع جاتی ہے۔ مزدور اور سرمایہ دار کا تصادم ہو یا کالی اور سفید نسلوں کی کشمکش، عورتوں اور مردوں کی آویزش ہو یا والدین اور اولادوں کی سرکشی، طبقوں طبقوں کی فساد انگیزیاں ہوں یا قوموں قوموں کی کشت و کشتار، ان سارے دنگلوں پر بے حساب اجتماعی قوت ضائع ہوتی ہے۔ معاشرت میں ظلم کی کارفرمائی ہو تو خاندانی قوت کا ضیاع ناگزیر ہے، کیونکہ ماں باپ اور اولاد، بیویاں اور شوہر ایک دوسرے کے سکون کو تہ و بالا کرنے کے لیے زور کرتے رہیں گے۔ معیشت میں اگر ظلم گھس جائے تو سرمایہ اور محنت دونوں کا بہت بڑا حصہ باہمی آویزش کی وجہ سے ضائع جاتا ہے۔ سیاست میں اگر فساد کا دخل ہو تو جماعتوں اور پارٹیوں اور لیڈروں اور صحافیوں اور مفکروں کی آویزش میں طاقت کی بہت بڑی مقدار رائگاں جاتی ہے۔ عام معاملات میں اگر حق و عدل کی نفی ہونے لگتی ہے تو افراد کی کھینچا تانی میں بہت سی انفرادی قابلیتیں دم توڑ دیتی ہیں۔ اگر آپ کے پاس وسیع ذرائع ہوں اور ایک ہی سے آپ دنیا بھر کی فوجی، عدالتی، تعلیمی، علمی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، اور انفرادی قوتوں کے ضیاع کا کامل اندازہ لگا سکیں تو آپ دیکھیں گے کہ انسانی مساعی کا ننانوے فیصدی حصہ محض ظلم و فساد کے خلاف جو مزاحمت ہوتی ہے اسے روکنے میں ضائع جاتا ہے۔

اب ذرا گذشتہ سطور کا خلاصہ پیش نظر رکھ لیجیے تاکہ آپ بسہولت کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں۔

۱۔ کوئی نظام اجتماعی انسانی رضا کے بغیر نہیں چل سکتا۔

۲۔ نظام خدمت کو انسانی رضا حاصل ہوتی ہے۔

۳۔ نظام انتفاع جس عنصر کی خدمت کرتا ہے اس کی رضا اسے حاصل ہو جاتی ہے ـــــ مگر جس عنصر پر ظلم ہوتا ہے وہ اس کی مزاحمت کرتا ہے۔

۴۔ نظام انتفاع کی تائید میں ارباب ظلم کا زور مادی قوت رکھنے کے باوجود تدریجاً کم ہوتا جاتا ہے اور دوسری طرف مظلوموں کی مزاحمت کا زور مادی قوت سے محروم ہونے کے باوجود تدریجاً بڑھتا جاتا ہے اور آخر نظام انتفاع کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

تو نظامِ انتفاع (ظلم) کو سوسائٹی میں بحال رکھنے کے لیے بہت سی انسانی قوت رائگاں جاتی ہے۔
ان نکات پر غور کرنے کے بعد ہر سلیم الفطرت آدمی لازماً اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ نظامِ انتفاع (ظلم و باطل) انسانی فطرت کے ساتھ کوئی ربط و مطابقت نہیں رکھتا اور برعکس اس کے نظامِ خدمت (حق و عدل) انسانی فطرت و طبیعت سے موافقت رکھنے کی وجہ سے پوری کامیابی سے پروان چڑھ سکتا ہے اور اسی کے اختیار کرنے سے جماعتوں میں انفعیت نمودار ہوتی ہے۔
تو ہمیں ابھی ہمیں اس دعویٰ کے دلائل کو قوی تر کرنا ہے اور جماعات میں فطرت کے جو طبیعی اخلاقی نشو و نما بطور سرعمل ہیں ان کی توضیحات کی ضرورت ہے۔ (باقی آئندہ)

ہماری زیرِ طبع کتب

رسالہ دینیات — مسئلہ جبر و قدر — دینِ حق — مذہب کا انقلابی تصور

مسئلہ قومیت — تنقیحات — روداد جماعت اسلامی حصہ اول

~~~~~~~~

جماعت اسلامی کے کل ہند اجتماع منعقدہ دارالاسلام

(سنہ ۱۹۴۵ء)

کی روداد چھپ کر مکتبہ میں آچکی ہے

قیمت عہ

مکتبہ جماعت اسلامی، دارالاسلام

جمال پور، پٹھان کوٹ
~~~~~~~~

اشتراکی مغالطے

از جناب مولوی محمد مظہر الدین صاحب صدیقی

(یہ ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے جو صاحبِ مضمون کے مفید اضافوں اور نئے نکات کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے)

اشتراکیوں کا خیال ہے کہ کسی نظامِ فکر کے مختلف اجزائے ترکیبی کا باہمی ربط و تطابق اس کی صداقت کا معیار ہوا کرتا ہے۔ انھیں اس بات پر فخر ہے کہ اشتراکیت عقائد و نظریات کا ایک ایسا مربوط نظام ہے جس کا ہر جزو دوسرے جزو سے پیوستہ اور منسلک ہے لیکن جس شخص میں ذکاوتِ طبع کا ذرا سا بھی مادہ موجود ہے، وہ اشتراکی نظامِ فکر میں متعدد رخنوں کا سراغ لگا سکتا ہے بشرطیکہ وہ اشتراکیوں کی طرح معاشرتی اور اقتصادی تعصبات سے مغلوب نہ ہو۔ علاوہ ازیں اگر اس اشتراکی دعوے کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اشتراکی نظامِ فکر کے ترکیبی عناصر ایک داخلی ربط و تسلسل رکھتے ہیں، تب بھی محض یہ چیز اشتراکیت کے برحق ہونے کا کافی ثبوت نہیں ہو سکتی ہے۔ کیونکہ کسی نظام کے اجزائے فکر کی باہمی مطابقت صداقت کا واحد معیار نہیں ہے۔ اگر کسی شخص کی دروغ بیانیوں میں داخلی ربط و تسلسل پایا جائے تو محض اس ربط کی بنا پر اس کی دروغ بیانیاں سچائیاں نہیں بن جائیں گی۔

تاہم جہاں تک داخلی ربط اور تطابقِ فکر کا سوال ہے، اس پہلو سے بھی اشتراکیت علمی تنقید کی متحمل نہیں ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر تاریخ کی مادی تعبیر کو لیجیے، جو قصرِ اشتراکیت کا سنگِ بنیاد ہے۔ اشتراکی کہتے ہیں کہ تمام اخلاقی تصورات اور علمی نظریات زندگی کے معاشرتی ماحول اور خارجی واقعات سے پیدا ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر انسانی افکار اور ذہنی تخیلات ان خارجی حالات سے الگ ہو کر کوئی حیثیت نہیں رکھتے جن میں کہ وہ رونما ہوتے ہیں۔ اس مفروضہ کی بنا پر تمام صداقتیں اپنے اپنے دور کے لحاظ سے اضافی قرار پاتی ہیں۔ یعنی ہر صداقت جس دور کے خارجی حالات سے وجود پذیر ہوتی ہے۔ اس دور کے ختم ہو جانے پر صداقت بھی باطل ہو جاتی ہے۔ ایسی کوئی صداقت نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے جو ہر زمانے کے لیے یکساں طور پر صحیح ہو اور ابدی ہونے کا دعویٰ کر سکے۔ اب اگر اشتراکیوں کا یہ نظریہ تسلیم کر لیا جائے کہ انسانی افکار و تخیلات اور اخلاقی اقدار (Moral Values) خارجی احوال و واقعات کا عکس ہوتے ہیں تو یہ بات مطلق سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ افکار و اقدار پر نیک و بد، محمود و مذموم، حق و باطل ہونے کا اطلاق کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ جو چیز خارجی حالات سے میکانکی طور پر پیدا ہو جائے اور ہمارے ارادہ و اختیار کے بغیر ہم پر زندگی جبراً مسلط ہو، وہ بری یا اچھی کیسے کہلائی جا سکتی ہے۔ روحانی تصورات اور اخلاقی افکار بے نتیجہ اور بے حیثیت ہیں اگر وہ ہماری مادی زندگی اور خارجی ماحول سے میکانکی طریقہ پر وجود میں آتے ہیں۔ کیونکہ ایسی صورت میں ہماری عملی زندگی سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا ہے اور نہ واقعات و حوادث کی تشکیل یا انسانی اعمال کی صورت گری میں ان کا کوئی حصہ ہو سکتا ہے۔ جس طرح ہم اپنے گردوپیش اور اپنے خارجی ماحول کے اثرات سے بچ نہیں سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم اپنے عقائد

و افکار اور اخلاقی تصورات پر عمل پیرا ہونے کے لیے بھی مجبور رہیں۔ کیونکہ وہ بھی ہمارے خارج اور ہمارے گردوپیش سے وجود میں آتے ہیں۔ اس مفروضہ پر اخلاقی تصورات و اقدار کا وجود تو تسلیم کیا جا سکتا ہے لیکن اُن کی افادیت اور عملی قدر و قیمت کا انکار لازم آتا ہے۔ نیز اس استدلال کی بنا پر ہر قسم کے معاشرتی مظالم، سیاسی جبر اور معاشی استحصال کو جائز ٹھیرایا جا سکتا ہے، اگر انسان خارجی احوال اور گردوپیش کے اثرات کا مجبور بندہ ہے اور اس کی ذہنیت و سیرت بالکلیہ خارجی اثرات سے تشکیل پاتی ہے جن پر اسے کسی طرح کا اختیار یا قدرت نہیں ہے تو پھر سرمایہ دار اپنی معاشی لوٹ کھسوٹ، سامراج کے نمائندے اپنے سیاسی ظلم و ستم اور فاسسٹی آمر اپنے جابرانہ طرزِ حکومت پر اسی طرح مطمئن ہیں جس طرح اشتراکی حضرات اپنی انقلاب انگیزی اور مفسدہ پردازی پر اور حیوانات اپنی بہیمانہ سرشت پر۔ کائنات کا ہر ذرہ مجبور و مقہور ہے اور انسانی ارادہ و اختیار ایک زعم باطل ہے۔ جب ہر طبقہ اور ہر گروہ خارج کا بے بس آلۂ کار ٹھیرا تو اس کی برائیوں اور ناانصافیوں کی ذمہ داری اس پر کیونکر عائد کی جا سکتی ہے۔ یہ سارا ظلم و فساد اس عمل ارتقاء (Evolutionary process) اور تاریخی وجوب (Historical Necessity) کے تحت رونما ہو رہا ہے جس کے نام پر اشتراکی حضرات اپنی تحریک چلا رہے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر اشتراکی تحریک کامیاب بھی ہو جائے تو اس کی کامیابی حق و صداقت کی کامیابی نہیں بلکہ زور و قوت کی کامیابی ہو گی۔ کیونکہ حق و صداقت کا اطلاق ان اعمال و افکار پر نہیں کیا جا سکتا ہے جو انسان سے اضطراراً بلا اختیار و ارادہ اور خارجی ماحول کے دباؤ سے سرزد ہوں۔ خیر و شر اور حق و باطل کے تصورات انسانی اختیار و ارادہ کے وجود کو مستلزم ہیں۔ جو انسان خارجی ماحول اور ارتقائی عمل کا غلام ہو اس کے لیے نہ حق و صداقت کوئی چیز ہو سکتی ہے اور نہ عدل و انصاف کوئی معنی رکھتا ہے۔ جو کچھ ہے، ہے، خواہ وہ ظلم ہو یا عدل، مساوات ہو یا نامساوات۔ اس کے سوا نہ کچھ ہو سکتا ہے اور نہ ہو سکتا تھا۔ انسانی تاریخ میں وجوب (necessity) ہی وجوب ہے۔ امکان (possibility) کا نام نہیں ہے۔

اب آیئے ذرا دیر کے لیے ہم اس نظریے کو خود تاریخ کی مادی تعبیر پر چسپاں کر کے دیکھیں۔ دعویٰ یہ ہے کہ انسانی افکار و تخیلات اور علمی نظریات معاشرتی ماحول اور خارجی احوال سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان کی صداقت اس معنی کر کے اضافی ہوتی ہے کہ جب وہ دور ختم ہو جاتا ہے جس کے مادی اور معاشرتی احوال نے ان نظریات و افکار کو پیدا کیا تھا، تو ان افکار و نظریات کی صداقت اور سود مندی بھی ضائع ہو جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ تاریخ کا مادی نظریہ یعنی یہ دعویٰ کہ افکار و نظریات خارجی ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں، کن خارجی حالات اور کس معاشرتی ماحول میں پیدا ہوا تھا۔ مفروضہ بالا کے تحت تاریخ کی مادی تعبیر کا یہ نظریہ اُن احوالِ خارجی اور اس سیاسی اور معاشرتی ماحول سے پیدا ہوا تھا جس میں مارکس اور اینجلس نے زندگی بسر کی اور جس میں اُن کی ذہنی نشوونما ہوئی۔ چونکہ اُس زمانے کے خارجی حالات اِس وقت موجود نہیں ہیں اور کارل مارکس کے عہد سے دو تین صدی پیشتر یقیناً ان حالات کا کوئی وجود نہ تھا۔ اس لیے اس مفروضہ اور اس نظریے کی بنا پر ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ عہد مذکور یعنی انیسویں صدی سے قبل اور اس کے بعد جو واقعات پیش آئے ان کی تعبیر اس طرح نہیں کی جا سکتی ہے جس طرح اِشتراکی حضرات ان کی عموماً تعبیر کیا کرتے ہیں۔ تاریخی واقعات کی توجیہ کا یہ طریقہ صرف انیسویں صدی کے لیے صحیح ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اسی صدی کے سیاسی اور معاشی حالات اس علمی نظریہ کی پیدائش کا سبب ہوئے تھے۔ اور اب جب کہ وہ حالات ختم ہو چکے ہیں، اِس نظریہ کی صداقت بھی ساقط ہو گئی ہے۔ ماضی اور حال کے جملہ واقعات کی تعبیر و توجیہ اس نقطۂ نظر سے کرنا خود مارکس کے اس بنیادی مفروضہ پر ظلم کرنا ہو گا کہ عقلی نظریات اور

اخلاقی تصورات خارجی ماحول کا عکس ہوا کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اشتراکی حضرات قدیم اور جدید تاریخ کی توجیہ اسی مادی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں جو صرف اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے حالات سے وجود پذیر ہوا تھا۔ یہ عقیدہ رکھنے کے باوجود کہ کوئی صداقت ابدی اور عالمگیر نہیں ہے وہ تاریخ کی مادی تعبیر کو ایک عالمگیر اور ابدی صداقت کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں اور تاریخ کے ہر دور پر اس کو بلا تکلف چسپاں کر دیتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر تضادِ خیال کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔

اشتراکیت کے نظریات میں صریح تناقض اور عدم تطابق کا ایک دوسرا ثبوت اس کا وہ رویہ ہے جو اس نے مذہب کے متعلق اختیار کیا ہے۔ اشتراکیت مذہب کی شدید دشمن ہے۔ اشتراکی مفکرین کے نزدیک مذہب ہمیشہ ظالموں اور جفاکاروں کا آلۂ کار رہا ہے۔ اس نے ہمیشہ فرماں روا طبقے کو ظلم و ستم، ناانصافی اور معاشی استحصال میں مدد پہنچائی ہے۔ مذہب ان کے نزدیک عوام الناس کے لیے افیون ہے۔ یہ خیال بنیادی طور پر لغو اور مہمل ہے۔ یا تو اس کے پیش کرنے والے قطعی طور پر مذہب کی تاریخ سے ناواقف ہیں، یا پھر وہ واقعات کی صورت کو اپنی خواہشات کے مطابق عمداً مسخ کرکے غلط طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ یہ اشتراکیت پسندوں کا ایک مرغوب مشغلہ ہے۔ پوری تاریخ ان کی اس غلط بیانی کی تردید کرتی ہے۔ تاریخ میں جہاں کہیں کسی دینی تحریک کی ابتدا ہوئی ہے اس نے ہمیشہ مظلوم انسانوں کا ساتھ دیا ہے۔ ظالم، غاصب اور ذاتی اغراض و منافع کو پیش نظر رکھنے والے ہمیشہ مذہب کے شدید ترین دشمن رہے ہیں۔ انبیاء کو جو کفار کی طرف سے ایک عام طعنہ دیا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ دنیوی وجاہت کا مالک کوئی انسان تمھارے ساتھ نہیں ہے، تمھارے متبعین سب ایسے ہیں جنھیں سوسائٹی میں کوئی قدر و منزلت حاصل نہیں۔ ان کے اندر صحیح قوتِ فیصلہ ہی موجود نہیں ہے۔ قرآن نے انھی کے قول کو اس طرح نقل کیا ہے:۔

مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ۔ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ۔

ہم نہیں پاتے تم کو مگر اپنے ہی جیسا انسان اور ہم نہیں دیکھتے کہ تمھاری پیروی کی ہو مگر ان لوگوں کو جو ہم میں کمینے ہیں بے سمجھے بوجھے اور تم کو ہم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔

قریش اسی لیے آخر دم تک مسلمانوں سے برسرِپیکار رہے کہ اسلام اس معاشرتی اور سیاسی تفوق کو مٹا رہا تھا جو انھیں معاشرے میں حاصل تھا۔ چھٹی صدی عیسوی میں جزیرۃ العرب کے حقوق یافتہ طبقات اسلامی تحریک کی ترقی سے خائف و ہراساں تھے۔ اسلام کی فتح دراصل مساوات کی فتح تھی اور یہی اس کی فوری ترقی اور حیرت انگیز کامرانی کی بہت بڑی وجہ ہے۔ انسان کے لیے افیون ہونا تو درکنار، اسلام تاریخ میں ایک عظیم ترین انقلابی قوت ہے جس کے سامنے فرانسیسی انقلاب یا روس کا اشتراکی انقلاب بالکل ہیچ نظر آتے ہیں۔ روس کا انقلاب ایک ایسے ملک میں برپا ہوا جو آبادی کی کثرت، رقبہ کی وسعت اور قدرتی وسائل کی فراوانی کے لحاظ سے دنیا کے تمام ملکوں پر فائق ہے۔ اس کے باوجود ایک طاقت ور دشمن سے اپنے اولین تصادم کے موقع پر وہ اپنے خول میں سمٹ کر رہ گیا اور اُس کو محض اپنی حفاظت اور بقا کے لیے دوسروں کی مدد کا دست نگر ہونا پڑا لیکن اسلامی تحریک جملہ تمدنی موثرات سے دور، ایک خشک، بنجر، بے برگ و گیاہ اور قلیل آبادی رکھنے والے خطۂ زمین سے اٹھی اور فاتحانہ شان کے ساتھ پھیلتی اور وسیع ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ ہندوستان کی سرحدوں سے لے کر بحرِ اوقیانوس کے سواحل تک، ایشیا اور افریقہ کا بیشتر حصہ اس کے حلقۂ اقتدار میں آ گیا۔ اور یہ سب کچھ اُس زمانہ میں وقوع پذیر ہوا جب کہ ذرائع آمد و رفت کی رفتار نہایت سست

تھی۔ جب کہ اسٹیم انجن اور دخانی جہازوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ موٹر کار اور ہوائی جہاز کا تو ذکر ہی کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ روسی انقلاب کو اسلامی انقلاب کے مقابلہ میں پیش کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے سورج کو چراغ دکھانا۔ اسلام نے اپنے دائرے میں داخل ہونے والی قوموں کی زندگیوں میں جو عظیم الشان تغیر پیدا کیا اس کا اندازہ کیجیے۔ فارس، مصر، شام اور الجیریا کے دور افتادہ خطوں میں رہنے والوں کو ہمیشہ کے لیے اسلام نے ایک مستقل طرز زندگی عطا کیا۔ گذشتہ بارہ صدیوں کے انقلابات، حتیٰ کہ مغرب کی مادی تہذیب کی نظر فریب درخشانی بھی اُن کے اعتقادی، اقدار و دینی نقطۂ نظر کو تبدیل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ اتنے وسیع الاثر اور دور رس نتائج رکھنے والے انقلاب سے اشتراکی انقلاب کو کیا نسبت ہو سکتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بسا اوقات معاشی مقاصد کے لیے مذہب کا ناجائز اور ناروا استعمال ہوتا رہا ہے۔ لیکن اس میں مذہب کا کیا قصور ہے؟ افکار و نظریات کا کوئی سا مجموعہ، خواہ وہ دینی ہو یا غیر دینی، پست اور ذلیل مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہی الزام خود اشتراکیوں کے خلاف عائد کیا جا سکتا ہے۔ سوسائٹی کے وہ تمام عناصر جو سماجی اور مذہبی قیود سے آزاد ہونا چاہتے ہیں جن میں تمول صفوں کے وہ افراد بھی شامل ہیں جو آزادانہ تن پروری اور تعیش پرستی کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اور وہ تعلیم یافتہ نوجوان بھی شامل ہیں جو کہ ناقص تعلیم و تربیت کی وجہ سے ہر قسم کی اخلاقی بندشوں کو توڑ دینا چاہتے ہیں، اشتراکیت کے علمبردار نظر آتے ہیں۔ اور یہ محض اس لیے کہ اشتراکیت تمام مذہبی اور اخلاقی قیود کی نفی کرتی ہے اور اخلاق کی بنیاد محض مصلحت پرستی پر قائم کرتی ہے۔ اور اشتراکی بناء انفرادی اور شخصی اصلاح کی کوششوں اور اس کی لازمی مشقتوں سے انسان کو رہائی دیتا ہے۔ ان اشتراکیوں کا دعویٰ یہ ہے کہ دنیا کے تمام مفاسد سرمایہ داری کی پیداوار ہیں اور اصلاح نفس کی حقیقت ایک خام خیالی یا خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں۔ جب سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ ہو جائے گا اس وقت معجزانہ طور پر تمام افلاس، برائی اور بے انصافی دنیا سے مٹ جائے گی۔ اشتراکی جنت میں اخلاقی قیود کے آثار باقیہ کو مکمل طور پر صفحۂ ہستی سے محو کر دیا جائے گا اور انسان کو آزادی اور بے لگامی کی وہ بہشت حاصل ہو جائے گی جس کی نعمتوں سے جنگل کے شیر اور سمندر کی مچھلیاں لذت اندوز ہیں۔ اس طرح اشتراکیت سے دین اور اخلاق کے وہ دشمن ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں جنھیں نیکی سے اس لیے نفرت ہے کہ ان میں نیک اور شریف بننے کی ہمت اور سکت باقی نہیں ہے۔ جو نظام اخلاق سے اس لیے بیزار ہیں کہ وہ قدم قدم پر ان سے اصلاح اخلاق کی دائمی جدوجہد کا مطالبہ کرتا ہے۔

اشتراکیت کے نظریات میں صرف ایک صداقت ہے جو کہ بیک وقت اس کی زندگی اور قوت کا باعث ہے۔ وہ یہ کہ کوئی معاشرہ زندہ نہیں رہ سکتا، ترقی اور ارتقاء کا تو ذکر کیا ہے، جو اپنے افراد کی ایک کثیر تعداد کو ان وسائل حیات سے محروم رکھے جن سے کم از کم ایک وسط درجے کی آسائش کی زندگی بسر کی جا سکے۔ یعنی کہ اگر سوسائٹی میں آپ مذہب، اخلاق اور دیگر اعلیٰ اقدار کی کارفرمائی چاہتے ہیں تو آپ کو طبقاتی اقتدار ختم کرنا ہوگا اور ایک ایسے اجتماعی نظام کے قیام کی کوشش کرنی ہوگی جو سوسائٹی کے ہر مرد و زن کے لیے کم از کم وہ ضروریات زندگی فراہم کرنے کا ذمہ لے جن سے جسم و جان کا رابطہ باسانی قائم رکھا جا سکے۔ یہ ایک ایسی صداقت ہے جسے ہر صحت مند اور ترقی پذیر معاشرے نے تسلیم کیا ہے۔ جہاں اسے تسلیم نہیں کیا گیا اس کا نتیجہ باہمی استیصال، ہلاکت اور تباہی کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔ سوائے اس ایک نہایت اہم صداقت کے جس کی حامل تنہا اشتراکیت ہی نہیں، تمام فلسفۂ اشتراکیت لغویات کا ایک انبار اور جزوی صداقتوں، غلط بیانیوں اور دروغ گوئیوں کا ایک طوفان ہے جس میں تاریخ انسانی کے واقعات کو مسخ کر کے اور ان میں جا بجا بری طرح قطع و برید کر کے پیش کیا گیا ہے۔

فریضۂ اقامتِ دین

از

جناب مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی

کسی با اصول جماعت کی زندگی اس کے اصولوں کی زندگی پر موقوف ہے، اگر اس کے افراد میں ان اصولوں کا سچا عشق اور یقین موجود ہو تو موت اس کو آنکھ نہیں دکھا سکتی، یہ عشق اور یقین اس امر کی ضمانت ہے کہ وہ جماعت دنیا میں ایک غالب، سربلند اور باعزت جماعت کی حیثیت سے ہی پا کر رہے گی اور پھر اسی عشق و یقین کا فطری تقاضا یہ ہے کہ جماعت کا اجتماعی نظم و نسق اس کے اپنے ہاتھوں میں ہو، وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس صورت حال کو برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی اور اجتماعی نظم اس پر مسلط ہو جو اس کے محبوب اصولوں پر تعمیر نہ کیا گیا ہو اور اگر انقلابی حوادث نے اس کو کبھی یہ دن دکھا دیے تو اس کا ایک ایک فرد اس مچھلی کی طرح بے تاب و بیقرار رہے گا جس کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا گیا ہو۔ اس کو اپنے اصولوں کی محبت موت کی بازی کھیلنے پر مجبور کر دے گی۔ وہ رائج الوقت نظام زندگی کے خلاف سراپا احتجاج اور مجسم اعلان جنگ بن جائے گا اور اس کے ساتھ کسی قسم کے تعاون یا مصالحت یا مداہنت کا تصور تک اس کے لیے ناقابل برداشت ہوگا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میری انفرادی اور جماعتی زندگی بالتخصیص انہی اصولوں سے وابستہ ہے جن کو اس نظام قاہر نے تہ و بالا کر رکھا ہے۔ پھر یقین ہے کہ یہ جماعت کبھی نہ کبھی اس نظام غیر کے حلقۂ غلامی کو اپنی گردن سے نکال پھینکے گی اور اپنے اصولوں کا نظام زندگی قائم کر کے دم لے گی، بشرطیکہ اس کی بہ نسبت اس کے اصول زیادہ طاقت، افادیت اور صداقت کے حامل ہوں اور اس کے پیروؤں کی بہ نسبت اس کے افراد میں اپنے اصولوں کے ساتھ زیادہ گہری شیفتگی و فدائیت ہو۔

لیکن ایک اجتماعی مسلک رکھنے والی اور با اصول جماعت کے افراد میں اگر کسی دوسرے نظام زندگی کے ساتھ جو ان پر کسی طرح مسلط ہو گیا ہو، تعاون یا مصالحت یا مداہنت کا رجحان پیدا ہو گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ متاع حیات قومی کے محافظین نے خزانہ کی کنجیاں دشمنوں کے حوالہ کر دیں اور اب اس متاع کا لٹ جانا چند لمحوں کی بات ہے، جس کو شاید کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہو تو بچا سکے۔

اس کے بعد ایک تیسرا دور بھی آتا ہے جس میں افراد جماعت، مداہنت اور تعاون کی حدود سے تجاوز کر کے اس مقام پر جا پہنچتے ہیں جہاں انھیں اپنا اصولی اور اخلاقی موقف ہی یاد نہیں رہ جاتا ہے اور وہ اپنے اصول و مقاصد سے اتنے بیگانہ ہو جاتے ہیں کہ نہ صرف عملاً، اور بطیب خاطر، ان اصولوں کی بیخ کنی پر اپنی بہترین قوتیں اور صلاحیتیں صرف کرنے لگتے ہیں بلکہ اگر کوئی واقف کار ان کی اس خود فراموشی اور خودکشی پر انھیں متنبہ کرتا ہے اور یہ یاد دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ جن اصولوں کے خلاف تم اس وقت صف آرا ہو، وہی تو تمھاری رگ حیات ہیں، تو وہ اس کی باتوں کو حیرت کے کانوں سے

سنتے اور ناروا تہذیب، طعن و تشنیع اور اختلاف و عناد کی زبانوں سے ان کا جواب دیتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں جماعت بحیثیت ایک اصولی جماعت کے فنا ہوجاتی ہے اور اس کے غدار اور نالائق فرزند اپنے ہی ہاتھوں اسے قبر کی گہرائیوں میں سلا دیتے ہیں۔

دونوں مذکورہ صورتوں میں یہ ضروری نہیں ہے کہ اس جماعت کے افراد بھی ہلاک و برباد ہوجائیں اور دنیا کی دولت اور ریاست میں ان کے لیے کوئی جگہ باقی نہ رہ جائے۔ بلکہ یہ ہر وقت ممکن ہے کہ عام قوانین طبعی پر عمل کر کے وہ اقوام عالم کی صفوں میں ایک نمایاں اور عظیم الشان پوزیشن کے مالک ہوجائیں لیکن اپنی تمام تر شوکتوں اور عظمتوں کے باوجود ان اصول و مقاصد کے نقطۂ نظر سے جن پر اس جماعت کی بنیاد قائم تھی، ان کا وجود و عدم برابر ہے۔ جن اصولوں کی لاش ان کے پیروں تلے روندی جا رہی ہو، ان کو اس سے کیا بحث کہ وہ فرش ذلت پر ہیں یا عرش عظمت پر۔ ان کو اگر بحث ہے تو صرف اس بات سے کہ زندگی کے میدان میں ہم کو قائم و برپا کرنے کی ان کے دلوں میں کتنی لگن ہے اور وہ اس کے لیے اپنی جان، اپنے مال، اپنے ذرائع اور اپنے قوائے ذہنی و دماغی کی کتنی قربانیاں کر رہے ہیں۔ لیکن اگر یہ کچھ نہیں ہے تو یہ اصول ان سے اپنی برأت اور بے تعلقی کا اعلان کر دیں گے اور پھر اخلاق و دیانت کا ابتدائی تقاضا یہ ہے کہ یہ لوگ بھی اپنی طرف سے انقطاع کا اظہار کر دیں۔ اب ان کے لیے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ ان اصولوں کا نام لیں اور اپنے آپ کو اس جماعتی لقب سے موسوم کریں جو ان اصولوں کی صحیح نمائندگی کے سبب انھیں ملا تھا کیونکہ اب وہ ان کے نمائندے رہے نہیں۔

اسلام بھی ایک مکمل ضابطۂ زندگی اور ایک کامل اجتماعی مسلک ہے اور "ملت اسلامیہ" یا "امت مسلمہ" وہ باصول جماعت ہے جس نے اسلام کے دیے ہوئے اصول پر اپنی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کی ہے۔ لیکن زندگی کے دوسرے ضوابط اور اسلام کے ضابطۂ حیات میں ایک فرق ہے۔ اسلام کے علاوہ دنیا میں جتنے ضوابط زندگی پیش کیے گئے ان سب کی بنیاد انسان کے اپنے دماغ کی پیداوار اور تجربات پر ہے۔ اس لیے مزید غور و فکر اور جدید تجربات اور معلومات کی روشنی میں اگر ان الوقت ضابطۂ زندگی کے اندر کسی ترمیم کی ضرورت ہوئی تو کر لی گئی اور بعض نئے اصولوں کا اس میں پیوند لگا لیا گیا جس پر اس ضابطۂ زندگی کے پرجوش نمائندوں اور گہرے سے گہرے عقیدت کیشوں نے بھی بسا اوقات کسی احتجاج کی ضرورت نہیں سمجھی۔ لیکن اسلام کا معاملہ بالکل برعکس ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ میرے اصول اور میرا پیش کردہ مسلک حیات کسی انسان کے ذہن و دماغ کا نتیجہ نہیں بلکہ اس علیم و خبیر کا تجویز کردہ ہے جو واقف اسرار ہے، جو بنی نوع انسان کی تمدنی ضروریات، فطری مطالبات اور انفرادی و اجتماعی مصالح کا صحیح اندازہ داں ہے اور جس کی نگاہ سے انسانی فطرت کا کوئی گوشہ بھی مخفی نہیں۔ اس لیے یہ مسلک حیات، فطرت کے ٹھوس حقائق پر مبنی ہے، عالمگیر اور جاودانی ہے، زمان و مکان کی قیود اور قومی و جغرافیائی حدود سے ماوراء ہے، غیر متبدل ہے اور انسانی علوم و افکار اور تجربات اس کی کسی ایک اصل میں بھی قطع و برید نہیں کر سکتے اور اگر کسی نے اس مسلک کی اطاعت کا دعویٰ کرتے ہوئے بھی یہ جسارت کرنی چاہی تو اس کا شمار اس کے باغیوں میں ہے نہ کہ اطاعت کیشوں میں۔

کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کا یہ رویہ بہت سخت ہے۔ لیکن یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو اسلام کا منکر ہو یا حقیقت اور گمان میں فرق کرنا نہ جانتا ہو اور علم الٰہی کو علم انسانی پر قیاس کرتا ہو۔ اگر وہ اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ اسلام کے پیش کیے ہوئے اصولوں کا سرچشمہ علم الٰہی ہے تو اس کے کسی نقطے میں تغیر و تبدل کی ضرورت محسوس کرنا بدترین سفاہت ہے اور اس مسلک حیات کا ایک جانی دشمن بھی از روئے انصاف اس کو یہ حق دینے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ ایک طرف تو وہ اسلام کی عقیدت اور پیروی کا دم بھرے اور دوسری طرف اس کے اصولوں پر عمل جراحی کرتا پھرے۔ ہاں اس کو یہ آزادی تو حاصل ہے کہ وہ سرے سے اسلام ہی کو نہ مانے اگر اس کے وضع کیے ہوئے اوقات میں اس کو تنگی ہو اور اس کا مسلک زندگی اس کے نزدیک قابل ترمیم و اصلاح یا ناقابل عمل نظر آتا ہو۔

اس فرق کو ذہن نشین کر لینے کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ اگر کسی دوسرے با اصول جماعت کے لیے بالکل متضاد اصول اور طریقۂ زندگی سے تعاون یا مصالحت ممکن ہو تو ہو مگر اسلام کے نام پر اٹھنے والی جماعت کے لیے تو کسی غیر اسلامی نظام زندگی سے مصالحت یا مداہنت کا تصور بھی ممکن نہیں۔ لیکن زمانہ کا انقلاب دیکھیے۔ یہ جماعت بھی آج انحطاط اور تنزل کے دھکے کھاتے کھاتے بالکل اس مقام پر پہنچ گئی ہے جہاں اسے اپنے اجتماعی مقصد زندگی کا نام تک یاد نہیں اور خود فراموشی و خودکشی کے عبرتناک مظاہرہ میں سرگرم عمل ہے۔ ابتدا میں ہر با اصول زندہ جماعت کی طرح یہ جماعت بھی اپنے اصول حیات اور مسلک زندگی کا سچا عشق و یقین اور بے مثل جذبۂ جاں نثاری لے کر اٹھی اور اس طرح اٹھی کہ بڑی سے بڑی جانی و مالی مصیبتیں سامنے آئیں، سخت سے سخت خطرات کا مقابلہ ہوا، رات کی نیند اور دن کا سکون حرام ہو گیا، قید و بند اور دار و رسن کی آزمائشیں عام ہو گئیں، تپتی ہوئی ریت اور دہکتے ہوئے کوئلوں کی سزائیں دی جانے لگیں، گھر چھوڑنا پڑا، عزیز و اقارب سے علیحدہ ہونا پڑا، پیٹوں پر پتھر باندھ باندھ کر بھوک کی آگ دبانی پڑی، تاریخ شاہد ہے اور اس شہادت کی سچائی اور حقانیت کا انکار بڑے سے بڑا دشمن اسلام بھی نہیں کر سکا کہ ہولناک مصائب کے اس امنڈتے ہوئے طوفان میں بھی اس جماعت نے کبھی اپنے ایک اصول کو بھی مجروح نہ ہونے دیا اور نہ وہ اپنے موقف سے ایک انچ ہٹنے پر کبھی راضی ہوئی، حالانکہ اگر یہ ذرا بھی مصالحت اور مداہنت کو راہ دے دیتی تو سارا ہنگامۂ مصائب سرد پڑ جاتا، شب و روز کی بے اطمینانی امن و سکون سے بدل جاتی، معاشی خستہ حالیاں دور ہو جاتیں اور رعب و داب اس کی سیاسی برتری کو بھی بڑی آسانی سے قبول کر لیتا جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے اور قرآن کے اجمالی اشارات سے معلوم ہوتا ہے:-

وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ — وہ چاہتے ہیں کہ کاش تم ذرا مداہنت برتو تو وہ بھی مداہنت کی پالیسی اختیار کریں

لیکن اس کے پیرو جانتے تھے کہ یہ مداہنت ہمیشہ کی موت ہو گی اور اپنے اصولوں کو چھوڑنے کے بعد ہمارا وجود اپنے مقصد کے لحاظ سے بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ اُدھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی بار بار تنبیہ آتی رہتی تھی کہ:-

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ ...... وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ

پس اے پیغمبر! ان کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرو اور اس حق کو چھوڑ کر، جو تمہارے پاس آیا ہے، ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو ...... اور ان کے معاملات میں اس قانون کے

وَاحْذَرْهُمْ أَنْ يَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ إِلَيْكَ (المائدہ - ۷)

مطابق فیصلہ کرو جس کو اللہ نے نازل فرمایا ہے اور ان کی خواہشات نفس کا لحاظ نہ کرو اور دیکھو! ہوشیار رہو کہیں یہ لوگ تم کو اس راہ حق ان قوانین و ہدایات سے ذرہ برابر بھی برگشتہ کر کے فتنہ میں نہ ڈال دیں جن کو اللہ نے تم پر نازل کیا ہے۔

اس لیے اس جماعت کے رہنما اور بانی عزم و یقین سے سرشار سب کے سب آگ و خون کے طوفانوں میں بھی اپنے مرکز پر جمے رہے اور حالات کی کوئی سازگاری یا نامساعدت انھیں اپنے مسلک سے ایک سر مو بھی نہ ہٹا سکی اور نہ اپنے اصول کے بارے میں انھوں نے ذہنی طور پر کسی مداہنت سے کام لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے تمام ہنگامی مسائل، مادی مصالح، ظاہری تدابیر اور دنیوی مفادات سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور ایک جنون ہے جس نے انھیں "عقل و دانش" کا دشمن بنا ڈالا ہے۔ چنانچہ اس زمانہ کے سیاست دانوں اور مدبروں کا متفقہ فیصلہ بھی ان کے بارے میں یہی تھا کہ غَرَّ هٰؤُلَاءِ دِينُهُمْ (انھیں ان کے دین نے فریب میں مبتلا کر رکھا ہے) مگر جلد ہی دنیا نے اس "خود فریبی" کا انجام دیکھ لیا اور سیاسیات عالم میں وہ انقلاب آیا جس کی منطقی توجیہہ کرنے میں عروج و زوال کے فلسفے کے نکتہ دانوں کی عقلیں دنگ ہیں۔ جن کو اپنے گھروں میں بھی سر چھپانے کی جگہ نہ ملتی تھی، قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت ان کے قدموں میں آپڑے اور پوری ایک صدی بھی گزرنے نہ پائی تھی کہ وہ یورپ، ایشیا اور افریقہ کے بڑے عظموں کے بیشتر حصوں پر چھا گئے۔ اور یہ سب کچھ اس یقین و اذعان اور وفاداری و فداکاری کے طفیل ہوا جو ان کے دلوں میں اپنے اصول و مقاصد کے لیے موجود تھی اور جس نے انھیں اپنے مسلک زندگی کے لیے جینا اور مرنا سکھا دیا تھا۔

اس کے بعد اس جماعت پر وہ دور آیا جب اس کے افراد کے ذہنوں میں اصول و مقاصد کے نقوش ماند پڑنے لگے اور مختلف خارجی اسباب کے باعث ان کے اندر مداہنت کی بیماری جڑ پکڑنے لگی جو امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی گئی۔ غیر اسلامی اصول و نظریات مسلمانوں میں کثرت سے پھیلنے لگے جن کی روک تھام کے لیے علماء حق کی طرف سے بہتیری کوششیں بھی ہوتی رہیں مگر نا تربیت یافتہ عوام الناس کی خام مذہبیت اور حکومتوں کی فرض ناشناسی نے ان کوششوں کو پوری طرح کامیاب نہ ہونے دیا اور یہ بیماری آہستہ آہستہ اسلامی اصول کی جڑیں کھوکھلی کرتی رہی۔ لیکن جب تک اس جماعت کا سیاسی اقتدار قائم رہا، ان اصولوں کے بارے میں اس نے بحیثیت مجموعی خود فراموشی اور خودکشی کی راہ نہیں اختیار کی۔ لیکن، جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، یہ مداہنت اور مصالحت کی پالیسی بجائے خود موت کا پیش خیمہ ہے۔ جس سرچشمہ سے جماعت کی سیاسی طاقت کو غذا ملتی تھی، جب اس سے اس نے اعراض برتنا شروع کیا تو اس کا لازمی نتیجہ سیاسی زوال کی شکل میں نمودار ہوا جس کے بعد ہی اس پر تنزل اور انحطاط کا آخری دور شروع ہو گیا اور آہستہ آہستہ اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ یہ جماعت اپنے آپ کو پہچانتی بھی نہیں، اس کے افراد کی غالب ترین اکثریت اپنے اصول و مقاصد، اپنے مسلک اور اپنے وجود کی غرض و غایت کو اس طرح فراموش کر چکی ہے کہ اگر ان چیزوں کو اس کے سامنے رکھا جائے تو نہ صرف ان سے اجنبیت اور بیگانگت محسوس کرتی ہے بلکہ پوری طمانیت قلب اور ادعائے تحقیق کے ساتھ اس کو غیر اسلام ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے اور جو چیز ان اصولوں کی عین ضد ہے اس کو اسلام کا منتہائے مقصود قرار دینے پر مصر ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کی تمام تر جد و جہد اپنے ہی مقصد حیات کی پامالی پر مرکوز ہے اور خوش فہمی یہ ہے کہ یہ اسلام اور جماعت مسلمین کی سرفرازی کا باعث ہو گا۔ وَهُمْ

يَحْسَبُونَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا۔

ایک تھوڑی سی تعداد ایسے لوگوں کی بھی اس جماعت میں موجود ہے جو خود فراموشی اور خود کشی کے اس مقام تک ابھی نہیں پہنچی ہے، اس کی نگاہ اپنے نصب العین کے جلووں سے ابھی تک آشنا ہے، وہ اسلام کے اصول و مقاصد کی یاد اپنے سینوں میں دبائے ہوئے ہے۔ مگر یہ یاد محض ایک متبرک یادگار بن کر رہ گئی ہے جس میں زندگی کی حرارت یا تو مفقود ہو چکی ہے یا اتنی خفیف کہ محسوس نہیں ہوتی۔ الا ماشاء اللہ۔ حالات کی ناسازگاری، مخالف قوتوں کی تیاری اور ماحول کی ناسازگاری نے مسعدت نے ان کے دلوں میں وہ سودا باقی نہیں رہنے دیا جس سے بغیر کسی اصول یا مقصد کا نام لینا ہی حرام ہے۔ ان لوگوں نے مداہنت اور مصالحت کی پالیسی روش اختیار کر رکھی ہے اور اس امر کی پوری احتیاط کرتے رہتے ہیں کہ کہیں ان کی سیاست و تدبیر کی زبان سے [illegible] کی تعبیر نہ دی جائے۔

ان حالات میں یہ جماعت اگر دنیوی جاہ و اقبال کی مالک ہوتی تو بھی اسلام کو اس سے کوئی بحث اور دلچسپی نہ ہوتی اور نہ اس کا مجرد سیاسی اقتدار اس کی نظروں میں کوئی وقعت رکھتا، اس کو تو جو کچھ بحث و دلچسپی ہے صرف اپنے نصب العین کی اقامت سے ہے۔ اس نصب العین کو پس پشت ڈال کر اگر اس کے نام لینے والوں نے دولت کونین بھی حاصل کر لی تو اس کے کس کام کی؟ مگر بدقسمتی سے یہ چیز بھی آج اس جماعت کو حاصل نہیں۔ اس نے اپنے اصول زندگی کو ترک اور فراموش کر کے جو کچھ پایا وہ ذلت اور محکومی کا وہ داغ ہے جو ہر جماعت کی پیشانی پر تو لگ سکتا ہے مگر سلطانِ کائنات کی پارٹی — حزب اللہ — کی پیشانی پر کبھی نہیں لگ سکتا۔

قرآنی فلسفۂ عروج و زوال امم یہاں ایک ایسا سوال پیدا ہوتا ہے جو آج کل عام مسلمانوں کے ذہنوں میں بالعموم اور ان کے لیے بڑی حیرانی کا باعث بنا ہوا ہے، وہ رہ رہ کر یہ سوچتے ہیں کہ آخر ہماری موجودہ زبوں حالی کا سبب کیا ہے؟ یہ ہمیں تسلیم ہے کہ ہم بدعمل ہو گئے ہیں، ہمارے ایمان میں کمزوری آ گئی ہے۔ ہمارے اخلاق تباہ ہو چکے ہیں۔ ہم احکام دین سے غافل ہیں۔ یہ سب کچھ صحیح، مگر پھر بھی ہم ہی توحید کے تنہا علمبردار ہیں، ہم اگر اپنے سر جھکاتے ہیں تو خدا ہی کے سامنے جھکاتے ہیں۔ اس کے رسول کا حلقۂ اطاعت ہے تو صرف ہماری گردن میں ہے، اس کے احکام پر اگر کچھ عمل کرتے ہیں تو ہم ہی کرتے ہیں — اور ہمارے بالمقابل ساری دنیا کافر و مشرک ہے، خدا کی باغی اور توحید کی منکر ہے۔ رسول کی مخالف اور قرآن کی دشمن ہے۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ ہم پست وہ سربلند، ہم مفلس اور وہ دولتمند، ہم ذلیل و خوار اور وہ صاحب اقتدار، ہم غلام و محکوم اور وہ آزاد و حکمراں۔ حالانکہ ہم بہرحال غیروں کی بہ نسبت اللہ سے زیادہ قریب ہیں اس لیے ان کے مقابلہ میں ان الٰہی انعامات کے ہم زیادہ مستحق تھے نہ کہ وہ!

یہ سوال عروج و زوال امم کے اس فلسفہ سے ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوتا ہے جس کو قرآن حکیم نے بیان فرمایا ہے ورنہ طبعی اور اخلاقی، دونوں حیثیتوں سے ہم ٹھیک اسی مقام پر ہیں جہاں ہونا چاہیے تھا۔ اس کشمکش حیات میں دو قسم کے قوانین مصروف عمل ہیں۔ ایک تو قوانین طبعی، دوسرے قوانین اخلاقی[1]۔ قوموں کے ابھارنے اور گرانے میں یہ دونوں

[1] اخلاقی سے ہماری مراد قرآنی اور دینی اخلاق ہیں، نہ کہ افادی و تجربی اخلاق، ورنہ افادی اور تجربی اخلاق سے عاری ہو کر (بقیہ بر صفحہ ۵)

ہی قسم کے قوانین کام کرتے ہیں، مگر دونوں میں ایک فرق ہے، اور وہ یہ کہ تنہا قوانین طبعی ایک قوم کو میدان مقابلہ میں فتح و غلبہ دلا سکتے ہیں لیکن قوانین اخلاقی میں قدرت نے یہ قوت نہیں رکھی کہ وہ تنہا کسی قوم کو اٹھا کر تخت سلطانی پر بٹھا دیں۔ قوانین اخلاقی کو قوموں کی باہمی کشاکش اور جنگی معرکوں میں خصوصی اختیار (Veto Power) کی حیثیت حاصل ہے، یعنی اگر دونوں فریق جنگ صرف مادی تیاریوں کے ساتھ نبرد آزما ہوں تو فتح اس کی ہوگی جو زیادہ اسباب و ذرائع جنگ کے ساتھ میدان مقابلہ میں آیا ہو۔ اور اگر ایک طرف مادی قوتیں ہوں اور دوسری طرف محض اخلاقی اور روحانی قوتیں ہوں تو فریق ثانی کا شکست کھانا یقینی ہے، لیکن اگر مادی قوتوں اور اسباب و ذرائع کے اعتبار سے دونوں فریق برابر ہوں مگر ساتھ ہی ایک فریق اخلاقی آلات سے بھی مسلح ہے تو اس کا غالب ہونا بھی یقینی ہے بلکہ قرآنی تصریحات تو یہ بتاتی ہیں کہ اگر مادی وسائل کے اعتبار سے وہ فروتر بھی ہو حتیٰ کہ اگر فریق مخالف کا دسواں حصہ ہو تو بھی اللہ تعالیٰ کی غیبی ما فوق الفطری اعانتیں اس کو کامرانی اور فتح مندی سے ہمکنار کر دیتی ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ ایک طرف تو اس نے اپنے امکان اور مقدور بھر مادی وسائل اور تدابیر سے کام لینے میں دریغ نہ کیا ہو اور دوسری طرف قرآنی مطالبات کے مطابق اپنے ایمان کو راسخ اور اعمال کو صالح بنا لیا ہو۔ یعنی یہ کہ اس میں اپنے اصولوں کا حقیقی عشق اور اپنے مسلک زندگی کا زندہ جنون موجود ہو۔ تائید غیبی اور اعانت ما فوق الفطری کا یہی وعدہ ہے جو قرآن کی ان آیات میں کیا گیا ہے۔

(۱) وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ (انفال - ۸)

اور کافر ہرگز یہ گمان نہ کریں کہ وہ بازی لے گئے، نہیں وہ ہم کو عاجز نہ کر سکیں گے۔

(۲) كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ

کتنی ہی چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر بحکم خدا غالب ہوئی ہیں۔

(۳) يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (انفال - ۸)

اے نبی تمھارے لیے اللہ کافی ہے اور تمھارے پیرو مسلمانوں کے لیے۔

(۴) وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (آل عمران - ۱۴)

نہ سست پڑو اور نہ غمگین ہو، تم ہی غالب رہو گے بشرطیکہ تم مومن ہو۔

(۵) إِنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ

یقیناً زمین کے وارث میرے صالح بندے ہی ہوں گے۔

(۶) وَمَنْ يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ (مائدہ - ۸)

اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کو اپنا ساتھی بنائے گا (وہ بامراد اور سربلند ہوگا) کیونکہ اللہ ہی کی جماعت غالب رہنے والی ہے۔

اس اعانت غیبی کے ظہور کی مثالیں ہر دور میں پائی جا سکتی ہیں، خود اس امت کی ابتدائی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ بدر و احد اور احزاب و حنین کے معرکوں میں خدا کی "غیر مرئی افواج" نے جو کچھ کیا اس پر قرآن تک کی شہادت

(بقیہ صفحہ ۵۴) محض قوانین طبعی کے بل پر بھی کوئی قوم فتح و غلبہ نہیں حاصل کر سکتی۔ یہاں ہم نے انفرادی اور تجربی اخلاق کو بھی قوانین طبعی کے ضمن میں شمار کیا کیونکہ یہاں عام اقوام کے عروج و زوال سے ہم بحث نہیں کر رہے ہیں بلکہ امت مومنہ کے عروج و زوال تک یہ بحث محدود ہے۔

موجود ہے جس کا انکار کرنے کے لیے پہلے قرآن کا انکار کر لینا ضروری ہے۔

نعمت بقدر رحمت لیکن جہاں اس جماعت کو قدرت کی یہ خصوصی نظرِ عنایت حاصل ہے، وہیں اس کی ذمہ داریاں بھی بہت نازک ہیں، اور اس کو اس وعدۂ خاص کے ساتھ ایک وعید خاص بھی سنا دی گئی ہے جس کی طرف سے اس نے اپنے کان بند کر لیے ہیں لیکن یہی کان بند کر لینا اس کے لیے بڑی غلط فہمیوں اور بداکتوں کا باعث بن گیا اور وہ سوال پیدا کر گیا ہے جس کو ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور نعمتوں اس کی محبوبیت اور مبغوضیت، اور اس کی جزا و سزا کا یہ قانون بیان فرمایا ہے کہ جس فرد یا گروہ پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم جتنا زیادہ ہوتا ہے، اس فضل و کرم کی ناشکری اور احکام الٰہی سے بغاوت کے وقت اس کی گرفت بھی اتنی ہی زیادہ سخت، دردناک ہوتی ہے اور محکومی و نامرادی کی جو سزا وہ دوسری قوموں کو برے اعمال کی پاداش میں دیا کرتا ہے، ٹھیک ان ہی برے اعمال کے ارتکاب پر اس قوم کو اس سے دگنی یا تگنی سزا وہ دیتا ہے جو اس کے انعامات سے سرفراز ہو۔ اس آسمان کے نیچے اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ محبوب اور مقرب بندہ جو عالم وجود میں آیا وہ محمد رسول اللہ صلعم تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ان انعامات سے نوازا جو کسی کو بھی نصیب نہ ہوئے اور جن پر اس نے اپنی نعمت کی تکمیل کر دی، مگر ساتھ ہی انھیں یہ بات بھی سنا دی گئی تھی کہ:

وَلَوْلَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدْتَ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا إِذًا لَأَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيرًا (بنی اسرائیل ۸)

اگر ہم تم کو حق پر ثابت قدم نہ رکھتے تو قریب تھا کہ تم ان کفار کی طرف کچھ نہ کچھ جھک پڑتے (اگر ایسا ہوتا تو) یقیناً ہم اس وقت تم کو زندگی اور موت دونوں میں (یعنی دونوں جہان میں) دوہرا عذاب چکھاتے، پھر تم ہمارے مقابل کسی کو اپنا مددگار نہ پاتے۔

ازواج مطہرات کو جہاں یہ رتبہ بخشا گیا تھا کہ وہ امہات المومنین ہیں اور ان کی حیثیت عام عورتوں جیسی نہیں ہے (يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ) اور یہ کہ اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کی صدق دل سے تابعداری کریں اور اچھے کام کریں تو عام لوگوں کی بہ نسبت ان کو دگنا اجر ملے گا (وَمَنْ يَقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُولِهِ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُؤْتِهَا أَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَأَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيمًا (احزاب - ۴) وہیں اس حقیقت سے بھی انھیں آگاہ کر دیا گیا تھا کہ:

يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ مَنْ يَأْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ يُضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ (احزاب - ۳)

اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو کوئی کسی کھلی ہوئی بے حیائی کی مرتکب ہوگی اس کو دوگنا عذاب دیا جائے گا۔

یہودی قوم وہ قوم ہے جس پر انعامات الٰہی کی بارش ہوتی رہی، جس کو دشمن سے بچانے کے لیے سمندر خشک کر دیا گیا، جس کی معاشی مشکلات کے وقت من وسلویٰ کا نزول ہوتا رہا اور بقول بائبل، جس کی بیاباں نوردی کے وقت خود خداوند عالم بدلیوں کی شکل میں اس پر سایہ کرتا ہوا چلتا، اور جس کو بقول قرآن تمام اقوام عالم پر فضیلت دی گئی تھی لیکن جب اس محبوب اور لاڈلی قوم نے اپنے عہد کو فراموش کر دیا، اپنی ذمہ داریوں کو پس پشت ڈال دیا، احکام الٰہی سے سرتابی کر بیٹھی اور فسق و فجور میں غرق ہو گئی تو اس پر اللہ کا غضب اس طرح ٹوٹ پڑا جس کی نظیر پیش کرنے سے پوری تاریخ انسانی قاصر ہے۔ جتنی یہ قوم سربلند بھی اتنی ہی ذلیل ہو گئی، جس قدر محبوب تھی اسی قدر مغضوب ہو گئی۔

غرض یہ اللہ تعالیٰ کی ایک نہ بدلنے والی سنت ہے کہ اس کی "نعمت بقدر رحمت" ہوا کرتی ہے اور یہ سنت بالکل مطابق فطرت ہے۔ ہم ایک اجنبی سے اس حسن سلوک کے امیدوار نہیں ہوتے جس کی امید ہمیں اپنے اعزہ سے ہوتی ہے، ایک غیر شخص اگر ہماری بات کو نہیں مانتا یا اس کی تکذیب اور مخالفت کرتا ہے تو ہم اس پر زیادہ رنجیدہ یا مشتعل نہیں ہوتے لیکن یہی بات اگر اپنی کسی ایک خود مقدم یا ناز پروردہ بیٹے کی طرف سے وجود میں آئے تو اس وقت ہمارے غم وغصہ کی انتہا نہیں رہتی اور ہم اس کی اس حرکت کا وہ جواب دیتے ہیں جو ایک غیر آدمی کو کبھی نہیں دے سکتے۔ کیونکہ غیر کی مخالفت کا مطلب زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ وہ ایک سچی بات کا منکر اور دشمن ہے۔ لیکن اس یگانے کی مخالفت کا مطلب یہ ہے کہ اس میں مخالفت حق کے ساتھ ساتھ نمک حرامی بھی ہے جو محض ایک سچائی کی تکذیبی اور گھناؤنی ذلالت ہے۔ بالکل یہی اصول اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے بارے میں برتتا ہے۔ افراد ہوں یا اقوام کو جو اس کی عنایات اور افضال کا مورد ہونے کے باوجود اس کے احکام کی مخالفت پر اتر آتی ہیں، عام حالات کی بہ نسبت دگنی سزائیں دیتا ہے کیونکہ وہ بیک وقت دو جرموں کی مرتکب ہوتی ہیں ایک تو مخالفت حق کی، دوسرے نمک حرامی کی۔

ہماری موجودہ حالت امت مسلمہ کو اسی سنت الٰہی کی روشنی میں اپنے ماضی اور حال کا جائزہ لینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا اس امت کے ساتھ کیا معاملہ رہا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اس نے اس امت کو وہ ساری نعمتیں بخشیں جو اس سے پہلے دوسری تمام اقوام کو دی گئی تھیں اور اس کے علاوہ وہ نعمتیں بھی جو اب تک کسی قوم کو نہیں ملی تھیں؟ آخر یہ سارے عالم کی امامت کا منصب[۵۱] اور خیر الامم[۵۲] کا خطاب، یہ امت وسط[۵۳] اور شہداء علی الناس[۵۴] کے القاب، یہ اکمال دین[۵۵] اور اتمام نعمت[۵۶] کے انعامات اس سے پہلے بھی کسی امت کو ملے تھے؟ یقیناً نہیں۔ پھر غور کیجیے کہ اس امت کی ذمہ داریاں کتنی بھاری ہیں اور ان ذمہ داریوں کو پس پشت ڈالنے کے نتائج کتنے خطرناک ہو سکتے ہیں۔ جو قانون خداوندی اپنے محبوب پیغمبر اور اس کی محترم ازواج کے لیے اس طرح تیغ بے نیام تھا وہ دوسروں کے بارے میں کب کوئی نرمی دکھا سکتا ہے۔ پس یہ امت آج اپنے کو جس حال میں پا رہی ہے وہ اسی اصول کے مطابق ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے ایک نصب العین اور ایک ضابطہ حیات عطا فرمایا تھا اس ضابطہ کا نام دین الحق ہے اور اس کی تفصیلات کے مجموعہ کا نام قرآن ہے۔ یہ قرآن اپنے کو اس میثاق کی دستاویز قرار دیتا ہے جو اللہ نے اپنے بندوں سے لیا ہے اور جس کی پابندی کا ہر مسلمان نے اپنے رب سے معاہدہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میثاق کو بندوں کے لیے ایک نعمت قرار دے کر اور یہ بتا کر کہ تمہاری کامیابی و ناکامی کا انحصار اسی میثاق کی پابندی پر ہے، فرمایا ہے کہ:۔

---

[۵۱] كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ الخ (تم وہ بہترین امت ہو جو تمام لوگوں (کی امامت و رہنمائی) کے لیے معرض وجود میں لائی گئی ہے۔ تم کو نیکی کا حکم دینا چاہیے الخ۔) [۵۳] وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک عادل اور درمیانی امت بنایا تاکہ تم سب لوگوں کے لیے حق کے گواہ بنو) اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتیں تمام کر دیں۔)

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (مائدہ - ۲)
اور اللہ نے تم کو جو نعمت عطا کی ہے اس کو یاد رکھو اور اس میثاق کو نہ بھولو جس کو اس نے تم سے باندھا ہے جبکہ تم نے اقرار کیا تھا کہ ہم نے سنا اور مانا۔

تمام احکام قرآنی اسی میثاق عبد و معبود کی دفعات ہیں جن میں سے ہر ایک کے متعلق حکم ہے کہ اس کو پورا کیا جائے اور ہر حال میں ٹھیک ٹھیک اس کی پابندی کی جائے۔ یا ایھا الذین آمنوا اوفوا بالعقود (اے ایمان لانے والو! اپنے عقود کو پورا کرو) پھر اس بات کی ہدایت بھی کر دی گئی کہ:

اِتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ (اعراف - ۱)
تمہارے رب کی طرف سے جو کچھ نازل ہوا ہے اسی کی پیروی کرو اور اس کو چھوڑ کر دوسرے چھوٹے چھوٹے خداوندوں کا اتباع نہ کرو (خواہ وہ معبودان باطل اصنام ہوں، خواہ امراء و ملوک، خواہ آبا و اجداد ہوں خواہ اپنا نفس)۔

قرآن کے اس مطالبہ کو سننے کے بعد دو ہی راستے اختیار کئے جا سکتے ہیں، یا تو اس کا انکار کر دیا جائے یا پھر بشرح صدر و طمانیت پر سر تسلیم خم کر دیا جائے اور پھر اس پابندی کو علماً و عملاً قبول کر لیا جائے جو رب کائنات کی طرف سے نازل اور عائد کی گئی ہے۔ ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی اس واضح حقیقت کے ادراک سے عاجز نہیں رہ سکتا۔ اس لیے وہ شخص بدترین جہالت اور سفاہت کا ثبوت دے گا جو بعض پابندیوں کو تو مانے اور بعض سے گریز کرے۔ یہ طرز عمل عقل انسانی کے نزدیک بھی بالکل مضحکہ خیز اور ناقابل تسلیم ہے اور قرآن کے نزدیک بھی۔ چنانچہ قرآن اپنے اس مطالبہ کے ساتھ ہی ان لوگوں کو جو یہ بین بین کی روش اختیار کرتے ہیں، ان لفظوں میں زجر و ملامت کرتا اور اس کے خوفناک نتائج سے یوں متنبہ کرتا ہے:

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (بقرہ - ۱۰)
کیا تم کتاب الٰہی کے بعض حصوں کو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے؟ جو ایسا کرنے والوں کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہوں اور آخرت میں ایسے لوگوں کو شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیا جائے گا۔ اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

بنی اسرائیل کی تاریخ اس قانون جزائی کی زندہ شہادت ہے۔ ان کو خدا نے ایک کتاب دی تھی اور اس لیے دی تھی کہ اس کے احکام کی پابندی کریں اور اس کے بتائے ہوئے طریقہ پر اپنی زندگی کا نظام چلائیں۔ مگر انہوں نے اس کتاب کے ساتھ سلوک یہ کیا کہ ایک طرف تو اس میں تحریف کرنے لگے۔ دوسری طرف جو کچھ بھی اصل تعلیم باقی رکھ چھوڑی تھی اس کے بھی ایک بڑے حصہ کو اپنی دنیائے عمل سے خارج کر دیا۔ جیسا کہ قرآن بتاتا ہے:

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ (مائدہ - ۳)
یہ لوگ الفاظ کا الٹ پھیر کر کے بات کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں اور جو تعلیم انہیں دی گئی تھی اس کا ایک حصہ بھلا چکے ہیں۔

بھلا دینے کا یہ مطلب نہیں کہ کتاب کا یہ حصہ ان کے حافظہ سے محو ہو گیا تھا، نہیں، وہ تو تحریری شکل میں موجود تھا، اور کتاب الٰہی ہدایت حاصل کرنے کے لیے آتی ہے، نہ کہ حافظ کرنے کے لیے، سو اصل مقصود اس کتاب سے وہ بخوبی حاصل کر سکتے تھے لیکن اس کتاب کے اجارہ دار فریسیوں نے کیا یہ کہ مختلف سیاسی، معاشی اور دوسری اغراض و مصالح کے

پیش نظر... احکام کو معطل کر دیا ، کتنے ہی قوانین تھے جن کو فاسق امراء کی خاطر بدل کر نرم بنا ڈالا اور کتنی ہی آیتیں تھیں جن کے مطالب متعین کو دوسروں سے چھپا رکھتے اور معاملات زندگی میں ان کو زیر بحث آنے ہی نہ دیتے ۔ قرآن مجید نے ان کی اس حرکت ... کو ... کی ... نے کہا :

تَجْعَلُونَهُ قَرَاطِيسَ تُبْدُونَهَا وَتُخْفُونَ كَثِيرًا (الانعام - ۹۱)

جس (توراۃ) کو تم متفرق اوراق میں لکھ کر لوگوں کو دکھاتے ہو اور (اس کے مطالب و احکام کا) بڑا حصہ چھپا جاتے ہو ۔

... بھی ... اسی ... میں یوں کہا گیا :

وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۚ (آل عمران - ۱۹)

اور یاد دلاؤ اس وقت کو جب اللہ نے اہل کتاب سے عہد لیا تھا کہ دیکھو تمہیں اس کتاب کو لوگوں کے سامنے کھول کھول کر بیان کرنا ہوگا اور اسے چھپا کر نہ رکھنا ، مگر انھوں نے اس کو پس پشت ڈال دیا اور تھوڑی سی قیمت پر اسے بیچ ڈالا ۔

ان آیات ... کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اللہ کی کتاب ان کے پاس موجود تھی مگر جب زندگی کے معاملات سامنے آئے تو اس ... (رہنمائی حاصل) کرنے کی بجائے جز دانوں میں لپیٹ کر کہیں حفاظت سے رکھے رہتے ۔

کتاب الٰہی کے ساتھ ان کا یہی طرز عمل تھا جس کو فَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ کے جامع الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور جس کی عملی تفسیر ... کے ان اخلاقی جرائم اور شیطانی اعمال سے ہوتی ہے جن کی تفصیل سے قرآن بھرا پڑا ہے ، گویا عملی طور پر وہ توراۃ کے ایک حصہ کے انکاری بن چکے تھے جس کا انجام اس ذلت و مسکنت کی صورت میں نمودار ہوا جو خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کی سب سے نمایاں مثال ہے ۔

خاص قرآن کا مطالبہ کامل حوالگی کا ہے یعنی جو کچھ بھی وہ کہے اس پر اور صرف اسی پر عمل ہونا چاہیے ۔ اس نے اپنے متبعین کے لیے جو حدیں ، زندگی کے مختلف شعبہ جات میں قائم کر دی ہیں ، ان سے آگے قدم اٹھانے کی سرے سے کوئی گنجائش نہیں ، ایسا ... والوں کو وہ ظالم قرار دیتا ہے ۔ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُونَ ۔ اس لیے قرآن پر ایمان لانے ... ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے اندر جو کچھ ہے اس کو یا اس کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ جزو کو کبھی ترک نہیں کیا جا سکتا ۔ لیکن آج صورت واقعہ کیا ہے ؟ دماغ کو تمام خارجی تاثرات سے آزاد کر کے مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ پر اول سے آخر تک نظر ڈال جائیے اور اس کے بعد اپنی روزمرہ کی زندگی کا گہرا جائزہ لیجیے اور پھر اندازہ کیجیے کہ قرآن کے کتنے احکام پر عمل ہو رہا ہے ؟ چھوڑ دیجیے ان لوگوں کو جو "مسلمان" ہوتے ہوئے بھی اسلام کے علانیہ باغی اور اس کے اصولوں کی مبادی کے منکر ہیں یا جن کی زندگی کے لمحات ایک ایک کر کے اسلامی قوانین کے توڑنے اور ہوائے نفس کے اتباع میں صرف ہوتے ہیں اور جن کو فقہی اصطلاح میں فاسق و فاجر کہا جاتا ہے ۔ ان افراد اور حلقوں کی طرف نگاہ دوڑائیے جو نیکی اور تقویٰ اور ایمان و عمل کے لحاظ سے مردان کامل کہے جاتے ہیں ۔ یہاں بھی آپ کو جو کچھ دکھائی دے سکتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ ان لوگوں کی زندگی ان احکام الٰہی کے ... ہے جن کا تعلق انفرادی زندگی سے ہے ، نماز اور روزوں کی پوری پوری پابندی ہوتی ہے ، اوراد و وظائف کی کثرت ہے ، زکوٰۃ و صدقات بھی

ادا ہو رہے ہیں، جھوٹ، غیبت، بدگوئی اور بہتان تراشی سے زبان آلودہ نہیں ہونے پاتی، کبر و غرور، نمود و ریا، خیانت، بدعہدی، ظلم و غضب، رشوت و حرام خوری، اور فتنہ و فساد کے دھبوں سے ان کے ایمان کا دامن پاک رہتا ہے۔ باقی رہے اجتماعی احکام و مسائل، سو یہاں بھی ان سے غفلت اور بے اعتنائی کا وہی حال ہے جو غیر متقی مسلمانوں میں نظر آتا ہے۔ قرآن نے اگر زندگی کے صرف انفرادی پہلو سے ہی بحث کی ہوتی تب تو بلاشبہ اس طرح اتباع قرآن کا حق ادا ہو جاتا۔ مگر وہ تو زندگی کے اجتماعی مسائل کو بھی اتنی ہی اہمیت کے ساتھ لیتا ہے جتنی اہمیت انفرادی مسائل کو۔ اس نے نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ کے فرائض ادا کرنے، اور دیانت، امانت، اخلاص، وفا، حسن سلوک، اکل حلال اور صدق مقال وغیرہ اخلاق فاضلہ پر کاربند ہونے کی ہدایتیں دینے کے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق اور حاکمیت و فرمانروائی کا مستحق نہیں اس لیے اسی کو اپنا آقا اور سلطان مانو۔ (اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ... اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ) (اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ) خدا ہی کی بندگی کرو اور تمام باطل معبودوں کو چھوڑ دو)۔ خدا کی اور فرمانروائی کے ان تمام جھوٹے مدعیوں کے دعاوی تسلیم کرنے سے انکار کر دو جو خدا کی بادشاہت کے باغی ہو کر اس کی رعایا پر اپنا حکم چلانا چاہتے ہیں۔ (وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ) ان لوگوں کا کہنا نہ مانو جو اللہ کے شریعت سے فاسق اور اس کی حدود کو توڑنے والے ہیں۔ (وَلَا تُطِيْعُوْا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ) جب فیصلہ کرو تو احکام الٰہی کے مطابق کرو۔ (فَاحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ) اور جب اپنا فیصلہ کراؤ تو انہی احکام کے ماتحت کراؤ، ورنہ غیر الٰہی قوانین کی عدالت میں اپنا معاملہ لیجانے والا منافق ہے (يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ) اور قوانین الٰہی کو چھوڑ کر دوسرے قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے والا ظالم، فاسق، اور کافر ہے (وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ... الْفٰسِقُوْنَ ... الْكٰفِرُوْنَ)۔ کسی برائی، کسی ظلم اور کسی عدوان کے پروان چڑھانے میں کسی طرح کا تعاون نہ کرو (لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ) کفر کے علمبرداروں سے لڑو یہاں تک کہ کفر کا علم سرنگوں ہو جائے اور اللہ ہی کی طاعت رہ جائے (وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ) تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے وہ اللہ اور اس کے رسول کا محارب ہے، اس کو قتل کر دو (اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا الخ) جو چوری کرے اس کے ... ہاتھ کاٹ دو (وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا)۔ جو بدکاری کرے اس کو سو کوڑوں کی سزا دو (اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ) جو کوئی کسی پاکدامن پر زنا کا جھوٹا الزام لگائے اس کو اسی درے لگاؤ (وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً) جو کوئی کسی کو عمداً قتل کر دے، اس کی بھی گردن اڑا دو (يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِى الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ الخ)۔

یہ ان بہت سے احکام میں سے چند ہیں جو ہماری اجتماعی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کو بطور مثال بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ سب کے سب اسی قرآن میں موجود ہیں جس میں نماز روزے کے احکام درج ہیں، اس لیے اس جماعت کے لیے جس نے اللہ کی کتاب پر پورا پورا عمل کرنے کا اقرار کیا ہے، یہ سارے احکام بھی اسی طرح واجب التعمیل ہیں جس طرح وہ دوسرے احکام

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دینی اعتبار سے آپ کے پیش نظر ان میں سے اکثر احکام تو ایسے ہیں جو مدار ایمان اور شرط نجات ہیں اور ایک مسلمان کے لیے اولین توجہ کے مستحق لیکن خالص "دینی اور متقی" حلقوں میں بھی ان پر عمل کا سراغ ملنا تو درکنار عمل کی خواہش کا وجود بھی مفقود ہے۔ [illegible] بس مسجد کی چہار دیواری یہاں اس کی معبودیت اور حاکمیت کی آخری حدیں ہیں اور مسجد سے باہر [illegible] ارباب امر و حکم وہ لوگ ہیں جو ہماری ہی طرح مخلوق ہیں اور خود بھی اسی ایک آقا کی غلامی اور اسی ایک مالک علی الاطلاق کے قانون کی پیروی کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر تو وہ ہیں جو اللہ اور رسول سے علانیہ باغی اور کفر و ضلال کے امام ہیں۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جو "مسلمان" ہیں لیکن ایسے مسلمان جنھوں نے اللہ کے ان حقوق و اختیارات کو جن کا تعلق دنیا میں انسانوں کی اجتماعی زندگی سے ہے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے قریب قریب پوری امت مسلمہ اسی قسم کے ارباب من دون اللہ کو اپنا صاحب امر و حکم بنائے ہوئے ہے۔ اب ان کے یہاں قانون وہ ہے جو یہ خداوندان ارضی نافذ کریں نہ کہ وہ جو کتاب و سنت میں ہے۔ پھر جب انسانی زندگی کے بنیادی مسائل میں سے اس مرکزی مسئلہ ہی کو کہ انسان کا اصل حاکم اور قانون ساز کون ہے، اس امت نے پہلے [illegible] اور بادشاہوں کی پالیسی [illegible] اختیار کر کے اور اپنے ہی جیسے انسانوں کے ہاتھوں میں اپنے نظام سیاست کی باگیں دے کر انہی کو اپنا اصل آمر و ناہی تسلیم کر لیا تو اس کے وہ بہت سے مسائل زندگی جن کا تعلق براہ راست حکومت سے ہوا کرتا ہے آپ سے آپ غیر قرآنی بنیادوں پر طے ہونے لگے، اب اس کے اصول زندگی، اس کے نظریات سیاسی، اس کے تصورات معاشی اور اس کے افکار عمرانی کی بنیاد ہی بدل گئی اور اس کی زندگی کا پورا ڈھانچہ اور مسائل زندگی پر غور و فکر کرنے کا طرز ہی کچھ اور ہو گیا۔ اب اسے اگر اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی غیر منقسم حاکمیت کے بجائے انسانوں کی حاکمیت میں اعتقاد ہے اب وہ اس نظام زندگی کو جو اپنے اصول و فروع میں سرتاپا غیر اسلامی، غیر قرآنی بلکہ کافرانہ ہے، نہ صرف انگیز کر رہی ہے بلکہ اس کی مشین چلانے میں مساعدت دکھا رہی ہے۔ اب اس کے افراد نہایت اطمینان کے ساتھ اللہ کے نازل کردہ قوانین کو چھوڑ کر انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق فیصلہ کرتے اور کراتے ہیں حالانکہ انھیں علم ہے کہ اس معاملہ میں اللہ کا حکم یہ نہیں ہے۔ اب ارتداد، سرقہ، زنا، قذف اور قتل کے جرائم کی پاداش کہیں بھی قتل، قطع ید، جلد اور قصاص و دیت کی شکل میں نہیں دی جاتی حالانکہ انھوں نے اپنے فرمانروائے حقیقی سے عہد کیا تھا اور حلف وفاداری اٹھایا تھا کہ ہم ان تعزیرات اور حدود کو قائم کریں گے۔ اس طرح قرآن کا ایک بڑا حصہ صرف کتابت اور تلاوت کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے جس کا اس کے ماننے والوں کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر انسان کے اندر تعلیمات قرآنی کا حقیقی فہم اور اسلام کی صحیح بصیرت موجود ہو اور تاویلات و تسویلات نفس نے اس کی روح ایمانی کو تھپکیاں دے کر سلا نہ دیا ہو تو وہ بیک نظر محسوس کر سکتا ہے کہ قرآن کے ساتھ بڑی حد تک وہی سلوک کیا جا رہا ہے جو اہل کتاب نے توراۃ اور انجیل کے ساتھ کیا تھا۔ چونکہ قرآن اللہ تعالیٰ کا آخری ہدایت نامہ تھا جس کے باعث اس نے خود اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، اس لیے یہ تو ممکن نہیں کہ گزشتہ صحف سماوی کی طرح اس کتاب میں بھی لفظی تحریفات ہو جائیں لیکن اس کے علاوہ اور کوئی ظلم اور خیانت ایسی نہیں ہے جو دوسری امتوں نے اپنے صحیفوں کے ساتھ روا رکھی ہو

اور مسلمان اس سے باز رہے ہوں۔ عملی طور پر انھوں نے قرآن کے ایک حصہ کو فراموش کر دیا ہے، دراصل زندگی میں اس کو آگے رکھنے کے بجائے پیٹھ پیچھے رکھ چھوڑا ہے اور کچھ اقرار اور کچھ انکار کی روش پر پورے اطمینان کے ساتھ چلے جا رہے ہیں۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ قدرت فَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ اور فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ نیز أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ کا الزام ایک مرتبہ دورِ ثانی میں بھی ان پر عائد نہ کرے اور اس انجام بد تک نہ پہنچائے جو اس کا قانونی نتیجہ ہے۔

<u>شاہراہِ نجات</u> اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس صورتِ حال کا علاج کیا ہے اور اس آنے والی آفت کو آگے کے بڑھنے سے کس طرح روکا جا سکتا ہے، اس سے نکلنے کی سبیل کونسی ہے؟ اس سوال کا حل بھی ہم کو اسی کتاب میں تلاش کرنا چاہیے جس کو ہم آسمانی ہدایت اور حقیقی علوم کا تنہا منبع قرار دیتے ہیں اور جس کی ہر بات کو بلا چون و چرا تسلیم کرنے کا ہم نے عہد کیا ہے۔ جس وقت یہ کتاب نازل ہو رہی تھی اس وقت پرانی آسمانی کتابوں کے پیرو یہود و نصاریٰ کچھ اسی قسم کے حالات سے دوچار تھے جیسا کہ اوپر کے اجمالی اشارات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جب اس نے ان کی گمراہیوں اور اعتقادی و عملی بے عنوانیوں پر، اور ان کے نتائج بد کا تفصیلی ذکر کیا تو ان کی رگوں میں جاہلی حمیت کی آگ بھڑک اٹھی اور وہ ضد میں آکر انھوں نے صدائے حق کے استیصال و ابطال کی کوششیں شروع کر دیں۔ سیاسی اور جنگی کوششوں کے علاوہ مناظروں اور مجادلوں کے معرکے بھی گرم کرنے لگے۔ ان تمام ہنگاموں کے پیچھے کچھ تو جاہلی عصبیت اور حرص عناد کا زور تھا اور کچھ آسمانی مذاہب رکھنے کا ناز بیجا اور ابناء اللہ اور احباءہ ہونے کا فریب نفس۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بے اصل دعاوی اور ان کی کٹ حجتیوں کے جواب میں فرمایا:۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ (مائدہ - ۱۰)

اے پیغمبر ان لوگوں سے صاف کہدو کہ اے اہل کتاب تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تم توراۃ اور انجیل کو اور جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے اترا ہے قائم نہ کرو

یعنی تم اپنی موجودہ پوزیشن میں رہتے ہوئے ہرگز اس امر کے مستحق نہیں ہو کہ دلیل و برہان کے ساتھ دعوتِ حق کے بارے میں کلام کر سکو، تم نے وہ بنیاد ہی کھود کر پھینک رکھی ہے جس پر تمہارے وجود ملی کی عمارت کھڑی تھی۔ اس معاملہ میں تم بحث و جدال کے حقدار اسی وقت ہو سکتے ہو جب تم ان تمام ہدایات پر کاربند ہو جاؤ اور اپنی زندگیوں کو ان تمام احکام کا پابند بنا دو جو سلطانِ حقیقی کی جانب سے تم پر مختلف وقتوں میں نازل ہوتے رہے ہیں۔ تم نے کتاب الٰہی کے جن حصوں کو اپنی دنیائے عمل سے خارج کر رکھا ہے ان کو نافذ کرو، جن اصول و مقاصد کو تمہارے سامنے رکھا گیا تھا ان پر جم جاؤ، اور دین کی جن صداقتوں کا تمہیں علم دیا گیا تھا ان کی حفاظت و بقا اور تبیین و اشاعت کا بھولا ہوا فریضہ یاد کر لو۔

پھر اس دینی و دنیوی ہلاکت سے جس کو ان لوگوں نے اپنی بدکرداریوں اور غلط کاریوں کے عوض خرید رکھا تھا، نجات کی جو شاہراہ قرآن نے تجویز کی وہ یہ تھی:۔

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ

اگر یہ اہل کتاب ایمان رکھتے اور خدا ترسی کی راہ چلتے تو ہم ان کی

سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (المائدہ: ۶۵-۶۶)

برائیاں ان سے دور کر دیتے اور نعمت بھری جنتوں میں ان کو داخل کرتے اور اگر وہ توراۃ اور انجیل اور ان (دوسری کتابوں) کو جو ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی تھیں، قائم رکھتے تو ضرور ایسا ہوتا کہ ان کے اوپر سے بھی رزق برستا اور نیچے سے بھی ابلتا۔

مرض کی یکسانی چاہتی ہے کہ علاج بھی ایک ہی ہو۔ ہلاکت و نامرادی جس راہ سے اہل کتاب کے یہاں آئی تھی، آپ نے دیکھا کہ اہل قرآن کے یہاں بھی اسی راستے آئی۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس سے نجات بھی اسی طریقہ سے حاصل کی جائے جس کی اہل کتاب کو نصیحت کی گئی تھی۔ قرآن کہتا ہے — اور ظاہر ہے کہ اس کی بات کے سامنے کسی اور کی بات سننے اور ماننے کے ہم مجاز نہیں — کہ اہل کتاب نے کتب الٰہی کے کچھ حصوں کو ترک اور فراموش کر دیا جس کا نتیجہ رحمت الٰہی سے بُعد اور غضب الٰہی کے نزول کی شکل میں ہوا اور اس سے بچاؤ کی واحد شاہراہ انھی کتابوں کا ''قائم'' کرنا تھا اور اب اس قرآن کو ماننے اور قائم کرنے میں ہے۔ اگر ہمارے دل و دماغ قرآن حکیم کے اشارات سمجھنے کی صلاحیتوں سے بالکل محروم نہیں ہو چکے ہیں تو ہمارے لیے اس پیغام کا سمجھ لینا چنداں دشوار نہیں جو اس کے ان کھلے ہوئے اشارات میں موجود ہے۔ جس کسی کو اللہ تعالیٰ نے گوش عبرت بخشا ہے وہ قرآن کے انھی لفظوں میں سے یہ آواز بھی سن سکتا ہے کہ:

''اگر قرآن کے پیروایمان رکھتے اور خدا ترسی کی راہ چلتے تو ہم ان کی برائیاں ان سے محو کر دیتے اور نعمت بھری جنتوں میں ان کو داخل کرتے۔ اور اگر وہ قرآن کو قائم کرتے تو ضرور ایسا ہوتا کہ ان کے اوپر سے بھی رزق برستا اور نیچے سے بھی ابلتا۔''

نیز:

''اے اہل قرآن! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ قرآن کو قائم نہ کرو''

''قائم کر دینے'' یا ''اقامت'' کے لفظی معنی ہیں سیدھا کرنے اور کھڑا کرنے کے۔ جب مجسم اشیا کے لیے اس لفظ کا استعمال ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کی کجی دور کر کے اس کو سیدھا بنا دیا یا اس کو کھڑا کر دیا۔ لیکن جب معانی کے لیے اس کا استعمال ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس چیز کو کامل اعتنا کے ساتھ اس کی مکمل ترین اور حسین ترین شکل میں اس طرح پورا کر دیا جائے جیسا کہ اس کا حق ہے۔ بازار کی ''اقامت'' کا مفہوم یہ ہے کہ اس کو اس تمام ضروری ساز و سامان اور حسن انتظام سے مالا مال کر دیا جائے جس کا بازار میں ہونا ممکن ہے۔ نماز کی اقامت کا مطلب یہ ہے کہ دوام اس کو ظاہری آداب اور باطنی محاسن سے اس طرح آراستہ رکھا جائے کہ کہیں کوئی نقص نہ باقی رہے اور نماز کا جو مقصود ہے وہ پورا پورا حاصل ہو جائے۔ پس اقامت قرآن کا مدعا یہ ہوا کہ اس کے جتنے احکام ہیں، سب کے سب نافذ ہوں، اس کے جتنے قوانین ہیں ان سب کو اور صرف انھی کو مدار زندگی بنا لیا جائے، اس کی کسی ہدایت سے بال برابر بھی انحراف نہ کیا جائے، زندگی کے ہر مرحلہ میں، ہر شعبہ میں، ہر معاملہ میں صرف وہی نقطۂ نظر اختیار کیا جائے جو اس نے دیا ہے۔ اور پوری سوسائٹی پر وہ رنگ چھا جائے جو وہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس طرح پر کہ دیکھنے والوں کو یہ پورا ماحول قرآنی اور یہ پوری سوسائٹی ایک متحرک قرآن کی صورت میں نظر آئے۔ اسی کا نام اقامت قرآن ہے جس کو ہم اقامت دین بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ

جو کچھ قرآن میں ہے اسی کے مجموعہ کا نام دین ہے۔ اس لیے اقامتِ قرآن اور اقامتِ دین دراصل ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔

پس اقامتِ قرآن یا اقامتِ دین ہی وہ واحد نسخۂ شفا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس امت کے آنے والے امراض کو دور کرنے کی خاطر پہلے ہی سے تجویز فرما دیا تھا، اور یہ بتا دیا تھا کہ یہی وہ شے ہے جس پر تمہاری دنیوی فلاح، تمہاری اخروی سعادت اور تمہارے ملی تشخص، ان تینوں چیزوں کا انحصار ہے۔ تم کو جب بھی ان چیزوں کی تلاش ہو، اس کے لیے یہی راستہ اختیار کرنا، ورنہ باقی ہر طرف سراب ہی سراب ہے، جہاں سوائے حیرانی اور سرگشتگی کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ گویا پھر اسی مقام پر واپس جانے کا حکم دیا ہے جہاں سے تم ہٹ آئے ہو۔ اس لیے کہ پہلے بھی تو یہی اقامتِ دین ہماری زندگی کا تنہا وظیفہ تھا، چنانچہ کہا گیا تھا کہ:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ... ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (روم ۴) — تو اپنے رخ کو یکسو ہو کر دینِ اسلام کی طرف سیدھا رکھو ... یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

یعنی مطالبہ پیغمبر کی طرف اور اس کے توسط سے ایک ایک شخص کی طرف ہے۔ اس میں واضح طور پر مطالبہ کیا گیا ہے کہ ہر باطل قانون، ہر ایک فلسفہ اور ہر ایک طرزِ زندگی سے منہ موڑ کر اپنی تمام اطاعتوں کو اسی ایک طریقِ حیات یعنی دینِ اسلام کے لیے مخصوص کر دو اور دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرو کہ ہر لمحہ تمہاری نگاہیں اسی دین کے اشاروں پر لگی رہیں اور تمہارا رخ اسی دین کے احکام و مطالبات کی طرف متوجہ رہے۔

پھر اس امت کے وجود کی غایت، جو ایسے افراد پر مشتمل ہو، یہ بتائی گئی تھی کہ:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (بقرہ ــ ۱۷) — اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک عادل اور متوسط امت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں کے لیے (حق کے) گواہ بنو۔

یعنی اس حق پر جو پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے، صرف اپنے طور پر عمل کر لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ تمام دنیا کے سامنے اپنی زبان اور اپنے عمل اور بوقتِ ضرورت اپنے مال و جان سے اس حق کی گواہی دینا تمہارا فرضِ منصبی ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا گیا ہے کہ:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ — تم وہ بہترین امت ہو جو تمام نوعِ انسانی کے لیے ظہور میں لائی گئی ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

معلوم ہوا کہ اس امت کا مقصدِ حیات اور اس کا نصب العین صرف یہی متعین کیا گیا تھا کہ وہ تمام اقوامِ عالم کو حق کی طرف بلائے، معروف کو پھیلائے، نہ صرف پھیلائے بلکہ بزورِ حکم اسے نافذ کرے اور بدی کے خلاف نہ صرف وعظ و تلقین کرے بلکہ اسے طاقت سے روک دے۔ جس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ زمین پر خدا کے دین کو قائم اور سب کو اسی کا محکوم بنا دے۔ کیونکہ جس "حق" کا گواہ بنا کر اسے بھیجا گیا ہے وہ اسی "دینِ حق" کا نام ہے اور جس "معروف" کے نافذ کرنے کا اس کو حکم دیا گیا ہے وہ انہی اوامر کا نام ہے جو قرآن و سنت میں مذکور ہیں یا ان کے الفاظ سے مستنبط ہوتے ہیں اور جس منکر کے استیصال

کی اصلاح ... اور ... سب ... اس میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو احکام و شرائع دینی کے خلاف اور مزاج شریعت سے ناموافق ہیں۔

مقصد حیات اور منصب امت کی اس تعیین کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس امت کو جو عروج و اقبال بھی نصیب ہوا وہ اسی منصب امامت سے وفاداری کا صلہ تھا، اور اس سے اللہ تعالیٰ نے فتح و نصرت کے جتنے وعدے کیے تھے وہ سب اسی اقامت دین کی شرط سے مشروط تھے۔ چنانچہ جب مسلمانوں کو یہ بشارت دی گئی کہ تم ہی سربلند ہو گے اور تمہارے مقابلے میں تمہارے اعداء کا انجام شکست اور محکومیت ہو گا تو اسی کے ساتھ اِن کنتم مؤمنین کی شرط بھی لگا دی گئی تھی۔ پھر یہ وعدہ ہنگامی نہیں بلکہ دائمی تھا جس کی شہادت اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے متعلق پیشینگوئی فرماتے ہوئے کہا تھا کہ الائمۃ من القریش ما اقاموا الدین (امام قریش ہی میں سے ہوتے رہیں گے جب تک کہ وہ دین کو قائم رکھنے کا فرض ادا کرتے رہیں)۔

اس ساری بحث سے چند باتیں ثابت ہوتی ہیں:۔

اولاً یہ کہ اس امت کا نصب العین اللہ کے دین کی اقامت تھا۔ ثانیاً یہ کہ اس فریضہ کو انجام دینے پر اللہ تعالیٰ کی جتنی عنایتیں اس پر مبذول رہیں اور وہ دنیا میں بے مثل قوت و اقبال سے سرفراز ہوئی۔ ثالثاً یہ کہ اس امت کے عروج و زوال کا انحصار محض طبعی اسباب و قوانین پر نہیں ہے، بلکہ اخلاقی قوانین پر، یعنی اس فرض ہی کے بجا لانے پر ہے جو اس کے وجود کا اصل مقصود ہے۔ اگر اس نے اس فرض سے بیوفائی کی تو دوسری اقوام کی بہ نسبت اللہ کے دربار سے دوگنی سزا کی مستحق ہو گی۔ رابعاً یہ کہ اس امت کے موجودہ حالات، کتاب اللہ کو عملاً ترک اور فراموش کر دینے اور اقامت دین کے فرض سے بالکل غافل ہو جانے پر دلالت کرتے ہیں۔ خامساً یہ کہ از روئے قرآن اس امت کی موجودہ ذلت و نکبت کا علاج اپنے فرض کو دوبارہ پہچان لینے اور اللہ کی کتاب یعنی اللہ کے دین کو از سر نو قائم کر دینے میں ہے۔ سادساً یہ کہ اگر یہ امت اپنی موجودہ شکست و ہزیمت اور ذلت و محکومی کو دور کرنے کے لیے اقامت دین کی راہ سے الگ کوئی راہ اختیار کرے گی تو اس کی تمام تدبیریں اور کوششیں نہ صرف یہ کہ ضائع جائیں گی بلکہ اس کو زندگی کی نعمتوں اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے اور دور پھینک دیں گی اور وہ دوسری اقوام کے مقابلے میں، دین کو چھوڑ کر اور اس کی اقامت کا فریضہ فراموش کر کے، کبھی بھی گوئے سبقت نہیں لے جا سکتی۔ اور اگر بالفرض یہ کوئی ... اس کو ملے گی بھی تو دوسروں کا عطیہ ہو گی جس کا وجود بھی غیروں کے رحم و کرم پر ہو گا اور یہ بجائے خود ایک بڑی ذلت ہے۔

فرض ناشناسی اور حقائق سے چشم پوشی

ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ایسے شخص کے لیے جو اللہ اور اس کے رسول اور قرآن پر ایمان رکھتا ہو، جو مسلمان جینا اور مسلمان ہی مرنا چاہتا ہو اور جس کو قیامت کے دن اپنے اعمال کی جوابدہی کا پورا احساس ہو، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ ہر طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر ہر آواز کے لیے اپنے کان بند کر کے، ہر تسویل نفس اور ہر وسوسۂ شیطانی سے دل کو پاک کر کے اور سود و زیاں کے اندیشوں سے بے پروا ہو کر اسی صراط مستقیم اور اسی شاہراہ نجات پر اپنے قدم مضبوطی سے جما لے اور اپنے جسم و دماغ کی ساری قوتیں اس

دین حق کے قائم کر دینے میں لگا دے۔ وہ اپنے فہم و تدبر سے کام لے کر اس کے لیے مناسب وقت تدبیریں سوچ سکتا ہے، حالات زمانہ کے لحاظ سے ایک خاص طریقۂ عمل اختیار کر سکتا ہے، احوال کے تقاضے سے کوئی مخصوص پالیسی مرتب کر سکتا ہے لیکن اپنے اس نصب العین اور مقصد زندگی میں ترمیم کرنا یا اس کو ملتوی کر دینا اس کے اختیار سے باہر ہے۔ وہ اس سے ہٹ کر اور اس نصب العین کو چھوڑ کر جو قدم بھی اٹھائے گا وہ اللہ اور اس کے رسول سے بغاوت کا قدم ہوگا۔ اس وقت اس کی مثال اس نادان اندھے کی سی ہوگی جو کسی گہرے گڑھے کی طرف بڑھ رہا ہو اور اس کا بہی خواہ اس کو ادھر جانے سے منع کر رہا اور صحیح راہ پر لانے کی کوشش کر رہا ہو مگر وہ ہٹ کر رہا ہو کہ ایک طرف تو وہ اپنے اس رہبر کی ناصحانہ راست گوئی، اس کی خیر خواہی اور اس کے خلوص و تقصیح پر شکر ادا کر رہا ہے اور ساتھ ہی دوسری طرف اسی سمت بڑھے جانے پر اصرار کر رہا ہے۔ محض اس بنا پر کہ اس سمت کی زمین اسے کچھ ڈھلوان معلوم ہو رہی ہے جس پر قدم آسانی کے ساتھ بڑھتے جا رہے ہیں اور دوسری طرف سمت کی زمین کچھ بلند ہوتی ہے جس پر قدم رکھنے میں چڑھائی کی دقتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔

لیکن بدقسمتی سے آج یہ پوری امت بالکل اسی اندھے کا پارٹ ادا کر رہی ہے۔ وہ صرف اس سمت دوڑ پڑنے پر تیار ہے جدھر کسی قوم کو سرگرم سفر دیکھ پاتی ہے صرف اس وجہ سے کہ اس کو یہ راہ بظاہر سہل اور ہموار اور دلکش نظر آتی ہے گو یہ راہ ٹھیک ہلاکت و نامرادی کی جہنم تک منتہی ہوتی ہو۔ اگر کسی سمت اس کے قدم اٹھنے سے انکار کرتے ہیں تو وہ وہی سمت ہے جو اقامت دین کی سمت کہلاتی ہے۔ اس لیے کہ یہ راہ مشکلات کے کانٹوں سے بھری ہوئی دکھائی پڑتی ہے۔ قرآن اس کو ہلاکت کی تمام راہوں سے روک کر اسی ایک راہ کی طرف بلاتا ہے مگر وہ سنی ان سنی کر دیتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ میں ہی تیرا بہی خواہ ہوں، وہ جواب دیتی ہے کہ یہی تو ہمارا ایمان ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ میں ہی تیرا ہادی اور نجات دہندہ ہوں، وہ جواب دیتی ہے۔ اس سے کس کو انکار ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا، کبھی غلط بات نہیں کہتا، کبھی اپنے دعاوی کی بنیاد وہم و گمان اور خرص و تخمین پر نہیں رکھتا، وہ جواب دیتی ہے کہ لا ریب! قرآن کہتا ہے کہ میرے پاس اور صرف میرے ہی پاس علم حقیقت ہے۔ میں ہمیشہ صحیح راہ بتاتا ہوں، نجات انسانی کا راز صرف میری تعلیمات میں مضمر ہے، وہ جواب دیتی ہے کہ بلاشبہ! قرآن کہتا ہے کہ جو کچھ میرے سوا ہے، وہ سب باطل ہے، جو میرے خلاف ہے وہ سراسر جہل ہے، جو مجھ سے الگ ہے اس میں تباہی و نامرادی کے علاوہ کچھ نہیں، وہ جواب دیتی ہے کہ بالیقین! ــــ لیکن جب وہ کہتا ہے کہ تیرے لیے میرا صرف ایک پیام ہے، اقامت دین کا پیام، تو اس کی زبان، جو اب تک اس کے ہر دعوے کی تصدیق کرنے میں اتنی تیز تھی، معاً بند ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جگہ اس کا دماغ حیلوں اور تاویلوں کا ایک لشکر تیار کر کے سامنے آ جاتا ہے۔ تاکہ اس اضطراب کو کچل ڈالے جو اس منافقانہ خاموشی کے باعث اس کی روح کی گہرائیوں میں رونما ہوتا ہے۔ مجرم انسان، اگر اس کے اندر غیرت اور عزت نفس کی کوئی رمق باقی ہو، لوگوں کے سامنے مجرم کی حیثیت سے آنا کبھی گوارا نہیں کرتا۔ یا تو اس غیرت اور عزت نفس کی بیدار حس اس کو مجبور کر دیتی ہے کہ اپنے اس جرم کا کفارہ ادا

درست اپنے عمل کے ذریعہ اپنے دامن سے اس داغ کو دھو دے، یا پھر اس حس کے کمزور ہونے کی شکل میں، اس کی تمام دماغی قابلیتیں اس بات پر صرف ہونے لگتی ہیں کہ کسی طرح اس جرم کو عین حق اور صواب ثابت کر دے۔ اس وقت اس کا نفس اس کو بے گناہی کا فریب دینے میں ہمہ تن مشغول ہو جاتا ہے اور اس کے حکم سے اس کا دماغ تاویلوں کا ایک خوشنما نقاب تیار کر دیتا ہے جس کو وہ اپنے چہرے پر ڈال کر اپنے آپ کو یہ محسوس کرا لیتا ہے کہ میں برسرِ حق ہوں۔ اس کے بعد اس کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ ساری دنیا کو ایسا ہی محسوس کرا دے، تاکہ اس کے داغِ گناہ کی طرف کوئی انگلی اٹھانے والا نہ رہ جائے۔

قرآن کی علم بردار اور دینِ اسلام کی پیروی کا دم بھرنے والی امت اپنے فریضۂ ملی اور مقصدِ زندگی کی بجا آوری میں کچھ اسی قسم کے خیالات اور عاملے بیگناہی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ صدیوں کے انحطاط اور زوال نے اس کے احساسِ خودی کو بری طرح مجروح کر ڈالا اور ان جذباتِ عزم و ہمت سے سینوں کو ویران کر دیا ہے جو ایک نصب العین کی اقامت کے لیے ضروری ہیں۔ اور نصب العین بھی اقامتِ دین کا نصب العین، جو کبھی بھی آسان نہ تھا اور جس میں جان و مال کی بازی، عیش و آرام کی قربانی اور امیدوں اور تمناؤں کی پامالی شرطِ اول قدم ہے۔ اس لیے بجائے اس کے کہ وہ اپنے جرم کو تسلیم کر کے تلافی مافات کی کوشش کرتی اور اپنی ذمہ داریوں کا بار اٹھا لیتی، سرے سے اپنی کسی ذمہ داری ہی کو نہیں تسلیم کرنا چاہتی، اور طرح طرح کی دوراز کار تاویلوں سے اپنے رہے سہے احساسِ فرض کو دبا رہی ہے۔

گریز کی راہیں! آئیے ان تاویلوں کی، ان کے پیش کرنے والوں کے بقول ان محکم دلائل کی حیثیت اور نفسیت پر غور کریں جو اس ترکِ فرض کے جواز میں پیش کی جاتی ہیں۔

ایک گروہ کا کہنا یہ ہے کہ ایک ایماندار اور صداقت شعار انسان کے لیے پورے قرآن پر عمل کرنا کسی حال میں بھی ناممکن نہیں، اور جن کو اللہ نے حسنِ عمل اور خشیت و انابت کی توفیق بخشی ہے وہ آج بھی پورے دین پر عامل ہیں اور دوسروں کو بھی "امر بالمعروف" کرتے رہتے ہیں۔ رہ گئے قرآن کے وہ احکام جن کا تم نے اوپر حوالہ دیا ہے، ان کا تعلق حکومتِ اسلامی سے ہے اور ان کے مخاطب مسلمانوں کے اولو الامر ہیں، عوام نہیں ہیں، اس وقت چونکہ اسلامی حکومت قائم نہیں اس لیے ان احکام کے اجرا و نفاذ کی ذمہ داریوں کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اور اگر کچھ اوامر ایسے ہیں بھی جن کا تعلق براہِ راست عامۃ المسلمین سے ہے، لیکن جن پر عمل نہیں ہو رہا ہے مثلاً تحاکم الی الطاغوت اور حلم بامر الطاغوت وغیرہ سے اجتناب تو ایسا وہ اضطراراً کر رہے ہیں اور بحالتِ اضطرار ممنوعات بھی مباح ہو جاتے ہیں۔ اس لیے قرآن کے ایک حصہ کو ترک یا فراموش کر دینے کا الزام سراپا بہتان ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ بلاشبہ از روئے کتاب و سنت ملتِ اسلامیہ کا فرض یہی ہے، لیکن موجودہ ناسازگار حالات میں اس نصب العین کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ اس لیے اس وقت اس کے لیے جد و جہد کرنا وقت اور قوت کو

ضائع کرنا ہے۔ اور اس کا اعلان و اظہار کرنا نہ صرف مصلحت کے خلاف اور عدم تدبر کی دلیل ہے بلکہ مفاد ملت کے لیے سخت مضر اور مہلک ہے۔ اس لیے سردست کچھ ایسی دوسری تجاویز اختیار کی جائیں جو ممکن العمل ہوں اور تجربات سے مفید ثابت ہو چکی ہوں اور جو ساتھ ہی آگے چل کر ہمارے اصلی مشن کے لیے حالات نسبتاً کچھ زیادہ سازگار کر دیں اس وقت اس کے لیے براہ راست جدوجہد شروع کی جائے گی۔

ایک اچھی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو صفائی کے ساتھ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ نصب العین بالکل برحق ہے مگر ہم صدیقؓ اور فاروقؓ نہیں ہو سکتے۔ ہم جیسے کمزور لوگوں کے بس کا یہ کام نہیں ہے۔ جس مشن کو سرور کائنات کی جماعت بھی تیس برس سے زیادہ نہ چلا سکی اس کے لیے ہم جیسے ضعیف الایمان لوگوں کا دم خم دکھانا ناممکن ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں آسکتا جو تیرہ سو برس پہلے گزر چکا۔

کچھ لوگ ایسے ہیں جو تربیت کی راہ پر گامزن ہیں۔ ان کو دعوت کی [illegible] اجتماعی معصیت اور اس کے [illegible] نصب العین سے انکار نہیں مگر پہلے وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس نصب العین کے داعی اپنے عمل کے میدان میں کتنی تیزگامی اور ثبات قدمی دکھاتے ہیں۔ چونکہ انہیں اس امر میں شک ہے کہ آزمائشوں کے وقت یہ اقامت دین کے مدعی میدان میں جمے رہیں گے، اس لیے ان کے لیے اس جدوجہد میں شریک ہونے کا ابھی کوئی سوال نہیں۔

ایک بہت بڑا گروہ حضرت امام مہدی کے ظہور کا منتظر ہے۔ اس کو اس نصب العین کے برحق ہونے کا پورا یقین ہے مگر اس کا خیال یہ ہے کہ اس کے مکلف ہم نہیں ہیں۔ اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے امام مہدی کے بھیجنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس لیے ہم کو خواہ مخواہ یہ دردسر نہیں خریدنا چاہیے۔

یہ سارے گروہ اور ان کے یہ خیالات مسلمانوں کے ان طبقوں اور حلقوں سے تعلق رکھتے ہیں، جو مذہبی اور دینی حلقے کہے جاتے ہیں۔ رہ گیا وہ گروہ جو دین کے حلقہ کو اپنی گردن سے اتار کر پھینک چکا ہے اور جو اپنے مسائل زندگی میں قرآن و سنت کو راہنمائی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں، تو اس کے خیالات سے ہم اس وقت تعرض نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارے مخاطب اس وقت صرف وہ لوگ ہیں جو کتاب اللہ اور سنت رسول کے فیصلہ کو آخری فیصلہ مانتے ہیں اور جن کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنے معاملات و مسائل میں شریعت کی ہدایات اور احکام کے سوا کسی اور حجت اور سند کے محتاج نہیں [illegible] کے ساتھ

اسلام کا طرزِ عمل

لیکن اس لمبی بحث کو شروع کرنے اور ان افکار پر فرداً فرداً تبصرہ کرنے سے پہلے اسلام کی ایک اصولی ہدایت ذہن نشین کر لینی چاہیے جو ہماری زندگی کے ہر مرحلہ اور ہر موڑ پر دلیل راہ کا کام دیتی ہے اور التباسِ حق و باطل کے تاریک سے تاریک مواقع میں بھی اسلام کی صراط مستقیم آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی۔ اس اصولی ہدایت کو سمجھ لینے سے اس بحث کی بے شمار الجھنیں خود بخود دور ہو جائیں گی۔ اسلام نے ہم کو حق کی پیروی اور باطل سے اجتناب کا حکم دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ہمارے فرائض میں یہ چیز بھی شامل کی ہے کہ:

لتأمرن بالمعروف ولتنهون عن المنكر ولتأخذن على يد المسيء ولتأطرنه على الحق

تم ضرور معروف کا حکم دیتے رہنا اور بدی سے روکتے رہنا [illegible] پکڑ لینا اور اس کو حق کی طرف موڑ دینا۔

اور اگر اس فریضہ کو نہ ادا کیا گیا تو اس کا انجام کیا ہوگا، اس سے بھی خبردار کر دیا گیا ہے۔

او لیضربن اللہ قلوب بعضکم علی بعض ولیلعننکم کما لعنہم (ترمذی) ورنہ اللہ تعالیٰ باطل پرستوں اور بدکاروں کے دلوں کا زنگِ معصیت حق پرستوں کے دلوں پر بھی چڑھا دے گا یا تم پر اسی طرح لعنت کر دے گا

ایک دوسری حدیث میں اس نہی عن المنکر کے طریق کار کی تشریح اس طرح کی گئی ہے۔

من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ ولیس وراء ذالک حبۃ خردل من الایمان۔ تم میں جو کوئی بدی کو دیکھے تو چاہیے کہ اسے ہاتھ سے مٹا دے اور اگر ایسا نہ کر سکتا ہو تو زبان سے، اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو دل سے۔ اس کے بعد ذرہ برابر بھی ایمان کا درجہ نہیں۔

ان ارشادات میں ہم کو اپنی حیاتِ ایمانی کے چند اساسی اصول ملتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ منکر سے بچنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کا استیصال کیے رہنا بھی ایک فریضۂ دائمی ہے۔ دوسرے یہ کہ منکر کو برداشت کرنا ـــــ اس سے رغبت رکھنا نہیں بلکہ اس کو برداشت کر لینا ہی اجتماعی ہلاکت کے خطرہ کا لازم ہے۔ تیسرے یہ کہ اگر کسی شخص کے دل میں منکر سے نفرت اور اس کو حق سے بدل ڈالنے کی تڑپ نہیں تو وہ ایمان سے بے بہرہ ہے۔

اب ہم ترتیب وار ہر گروہ کے خیالات اور دلائل کو اصول و نصوص کی میزان میں تولنا چاہتے ہیں تاکہ ان کا صحیح وزن معلوم ہو سکے اور نگاہوں کے سامنے سے وہ پردہ اٹھ جائے جس کو سہولت پسندی اور ضعفِ عزم اور قلتِ احساسِ فرض کے ہاتھوں نے حقیقت کے چہرے پر ڈال رکھا ہے۔

(۱) **کیا موجودہ عمل بالقرآن کافی ہے؟** اس امر کا دعویٰ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ قرآن و سنت میں صرف نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ ہی کے فرائض کا ذکر ہے اور مومن سے انہی احکام کی بجا آوری کا مطالبہ کیا گیا ہے یا ان کے ماسوا جو احکام ہیں وہ نعوذ باللہ محض "تبرکات کے مضامین" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ ان میں علمی طور پر جو فرق مراتب چاہیں قائم کر لیں اور ان کے اجر و ثواب میں بھی باہم جو نسبت چاہیں متعین کر لیں، لیکن عملی طور پر کسی تفریق کے نہ آپ حقدار ہیں اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔ ایک غلام کا فرض اپنے آقا کے ہر چھوٹے بڑے حکم کی تعمیل ہے۔ اس کو یہ حق کبھی نہیں پہنچتا کہ ضروری اور غیر ضروری کی بحثیں پیدا کر کے بعض احکام کو تو مانے اور بعض سے اغماض کر جائے۔ آقا کا حکم بہرحال حکم ہے جو ہر صورت میں پورا ہونا چاہیے۔ آپ نے بھی اللہ تعالیٰ کی کامل بندگی اور ہمہ وقتی غلامی کا عہد کیا ہے۔ اب (بطورِ مثال) اس آقا کی طرف سے دو حکم آتے ہیں ایک تو یہ کہ نماز پڑھو، دوسرے یہ کہ چور کا ہاتھ کاٹ دو۔ اگر آپ ان میں سے پہلے حکم پر عمل کرتے ہیں اور دوسرے کو سن کر خاموش ہو رہتے ہیں تو آپ اپنے اس طرزِ عمل کو آقا کی کامل اطاعت اور اس کی کتاب الاحکام ـــــ قرآن ـــــ کی پوری پابندی کہہ سکتے ہیں؟ پھر یہ کیا ستم ہے کہ قرآن کے ایک دو نہیں بیسیوں احکام بالکلیہ متروک و مہجور ہو کر رہ گئے ہیں اور پھر بھی آپ کو خوش فہمی ہے کہ ہم عمل بالقرآن کے مطالبہ سے پوری طرح عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ آخر ایک مومن کا ضمیر اپنے فرض کی ادائگی پر کس طرح مطمئن ہو جاتا ہے جبکہ وہ اپنے اوپر اور اپنے گرد و پیش طاغوت کا تختِ خداوندی بچھا ہوا پاتا ہے اور معبودِ حقیقی کے بے شمار احکام کو معطل اور اس کی قائم کی

ہوئی حدود کو ٹوٹتے ہوئے دیکھتا ہے لیکن اس طاغوتی خداوندی کے تخت کو الٹ دینے، معطل شدہ احکامِ الٰہی کو نافذ کر دینے اور حدود اللہ کے توڑنے والوں پر ان تعزیرات کے جاری کرنے کا عزم اس کو ادائے فرض پر آمادہ یا کم از کم بے چین نہیں کر دیتا جن کے جاری کرنے کا حکم اسے ملا ہے۔

عذرِ گناہ اس کے جواب میں جو عذر پیش کیے جاتے ہیں وہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ کے شاہکار ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہم تو ان احکام کے سرے سے مکلف و مخاطب ہی نہیں، ان کے نفاذ کی ذمہ داری تو مسلمانوں کے اولوالامر پر ہے۔ آج چونکہ اسلامی حکومت موجود نہیں اس لیے ان احکام کی تکلیف ہی ساقط ہو گئی ہے۔ حالانکہ قرآن میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اے مسلمانوں کے اولوالامر! تم چور کے ہاتھ کاٹ دو یا زانی کو کوڑے مارو بلکہ فَاقْطَعُوْا، فَاجْلِدُوْا وغیرہ کے الفاظ آتے ہیں جن کے مخاطب سارے اہلِ ایمان ہیں۔[1] ان پر عمل کرنے کی اصل ذمہ داری پوری امتِ مسلمہ پر ہے نہ کسی خاص فرد یا چند افراد پر۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ ان قوانین کا اجرا اولوالامر ہی کریں گے کیونکہ نظمِ مملکت کا تقاضا یہی ہے۔ اس کے بغیر حکومت کا کاروبار چل ہی نہیں سکتا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہی اولوالامر ان احکام کے مخاطبِ اول ہیں۔ نہیں، مخاطبِ اول تو پوری جماعت ہے اور یہ اولوالامر جماعت کے نمائندوں کی حیثیت سے ان کا نفاذ کرتے ہیں۔ پس جب جماعت کے نمائندے موجود نہ ہوں تو اس ذمہ داری کا رخ آپ سے آپ اپنے مخاطبِ اول یعنی جماعت کی طرف ہو جاتا ہے۔ گویا ان احکام کی نوعیت فرضِ کفایہ کی سی ہے کہ اگر اولوالامر کے گروہ نے ان پر عمل کر دیا تو ساری امت کی طرف سے یہ فرض ادا ہو جاتے ہیں۔ ورنہ بصورتِ دگر پوری جماعت کے سر یہ فرائض رہ جاتے ہیں اور ایک ایک فرد اس ترکِ امرِ الٰہی کی پاداش میں ماخوذ ہوگا۔

اس بارے میں اگر کوئی وزنی بات کہی جا سکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ ہمارے پاس وہ سیاسی اقتدار کہاں ہے جو ان احکام کے نفاذ کے لیے ضروری ہے۔ یقیناً یہ بات سنجیدہ غور و فکر کی محتاج ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ایسے احکام کے نفاذ کے سلسلہ میں گرچہ اصل مخاطب اور ذمہ دار پوری جماعت ہے، مگر ان کا نفاذ جب ہوگا تو ایک قوتِ قاہرہ یعنی حکومت ہی کے ذریعہ ہوگا۔ افراد کو اس کا اختیار نہیں دیا جا سکتا ورنہ اگر ہر فرد بجائے خود اس فرض کو ذاتی طور پر انجام دینے لگے تو زمین فتنہ و فساد سے بھر جائے اور اجتماعی زندگی تباہ اور نظمِ جماعت پارہ پارہ ہو جائے۔ اس لیے ایسے احکام کے اجرا یا یوں کہیے کہ قرآن کے ایک بڑے حصہ پر عمل کے لیے سیاسی اقتدار کا وجود ضروری ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس سیاسی اقتدار کے نہ ہونے کی صورت میں ہماری اور آپ کی ذمہ داریوں میں کمی آجاتی ہے یا وہ اور زیادہ سخت اور گراں ہو جاتی ہیں؟ آیا ہم کو خدا کا "شکر" ادا کر کے اس امر پر اظہارِ اطمینان کرنا چاہیے کہ

[1] چنانچہ اہلِ تفسیر آیتِ سرقہ کی تاویل میں فرماتے ہیں:۔ یقول جل ثناؤہ من سرق من رجل او امرأۃ فاقطعوا ایھا الناس یدہ ...... فلا تفرطوا ایھا المؤمنون فی اقامۃ حکمی علی السراق وغیرھم من اھل الجرائم الذین اوجبت علیھم حدودًا فی الدنیا۔ یعنی اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ "اے لوگو! جو مرد یا عورت چوری کرے اس کے ہاتھ کاٹ دو ...... اے مومنو! چوروں اور ان تمام مجرموں پر جن کے لیے میں نے دنیا میں سزائیں مقرر کر دی ہیں، میرے احکام جاری کرنے میں ذرا بھی کوتاہی نہ کرنا۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۰ پر)

پیوقرآن کے ایک حصہ پر تو عمل کرنے سے آزادی ہوگئی یا اس اقتدار کے حاصل کرنے کی سعی کرنی چاہیے جس کے نہ ہونے کی وجہ سے ہم اپنے پروردگار کے کتنے ہی احکام پر عمل پیرا ہونے کی سعادت سے محروم ہیں؟ نہ صرف سعادت سے محروم ہیں بلکہ اس کی بندگی کا حق ادا کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور کتاب الٰہی کو ترک اور فراموش کرنے کی قدیم سنت ضلال دہرائی جا رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اپنے دماغ کو منطقیانہ قیل و قال سے پاک کر لیجیے اور اپنے قلب اور ضمیر کی آواز پر کان لگا کر سنیے کہ وہ ان سوالوں کا کیا جواب دے رہے ہیں، یقین جانیے جس قلب میں بھی ایمان کی حرارت موجود ہو گی وہ کبھی سکون اور اطمینان کے ساتھ اس صورت حال کو برداشت کرنے کی اجازت نہ دے گا۔ اس لیے ان احکام کو نافذ کرنے والی قوت کے حاصل نہ ہونے کی شکل میں اگر امت پر صرف یہ ایک فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ان کو نافذ کرے تو اس کے حاصل نہ ہونے کی صورت میں اس کی ذمہ داریاں دو چند ہو جاتی ہیں پہلے تو اس قوت کو حاصل کرنا اور پھر ان احکام کو نافذ کرنا۔ یہ اصول کسی بحث کا محتاج نہیں کہ جو چیز کسی فرض کی ادائیگی کا ذریعہ یا موقوف علیہ ہوتی ہے اس کی ادائیگی خود فرض ہوتی ہے۔ آپ اس شخص کو ملامت کرنے میں شاید ایک لمحہ بھی توقف نہ کریں گے جو نماز اس عذر سے نہیں پڑھتا کہ اسے قرآن یاد نہیں یا جائے نماز ناپاک ہے، اور فوراً اس پر یہ الزام عائد کر دیں گے کہ یہ اپنے فرض ادا کرنے سے جی چرا رہا ہے اور اس کے دل میں نماز کی کوئی اہمیت اور محبت نہیں، ورنہ ایسا عذر لنگ اور مضحکہ خیز بہانہ نہ کرتا اور دنیا کے سارے کاروبار چھوڑ کر سب سے پہلے قرآن یاد کرنے کی کوشش یا جائے نماز پاک کرنے کی تدبیر کرتا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اوامر قرآنی کے ایک بڑے حصہ کو معطل کر کے آپ صرف اس بنا پر مطمئن بیٹھے ہیں کہ اس کے لیے جس سروسامان کی ضرورت ہے، وہ میسر نہیں۔ اور پھر بھی آپ کی معصومیت اور آپ کے تقویٰ پر آپ کی نگہ احتساب کوئی حرف نہیں رکھتی اور آپ کو اپنے اس عذر میں کوئی بے وقعتی اور اس بہانہ میں کوئی مضحکہ خیزی نظر نہیں آتی۔ اگر یہ سروسامان میسر نہیں تو کیا آپ پر — بشرطیکہ اپنے عہد کا پاس اور اپنے فرض کا صحیح احساس موجود ہو — یہ لازم نہیں ہو جاتا کہ اپنی ساری قوتیں اور تدبیریں صرف کر کے اس سروسامان کو حاصل کریں؟ خواہ اس کوشش میں آپ کو کیسی ہی مالی اور جانی قربانیاں کیوں نہ دینی پڑیں، اس لیے کہ یہ جان اور یہ مال آپ کی ملکیت نہیں کہ انھیں سینت کر رکھا جائے بلکہ جس روز آپ نے ایمان کا اقرار کیا اسی روز یہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے آپ سے اپنی رضا کے عوض خرید لیں اور اب وہ آپ کے پاس اسی آقائے دوجہاں اور مالک جسم و جاں کی امانت ہیں جس نے اپنے اوامر کی بجا آوری کا عہد آپ سے میثاق لیا ہے اور یہ امانتیں ہمارے پاس صرف اس غرض سے رکھی ہیں کہ ان اوامر کی بجا آوری میں حسب ضرورت صرف کر دی جائیں۔ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (اللہ نے مومنوں کی جان اور مال کو جنت کے عوض خرید لیا ہے) پس جو چیز خدا کی خریدی ہوئی اور آپ کے پاس بطور امانت رکھی ہوئی ہے اس کو عند المطالبہ اس کی راہ میں خرچ کرنے سے گریز کرنا بدترین قسم کا کمینہ پن اور خیانت ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۹) دیکھیے ایک جگہ "فاقطعوا" کے مخاطب حقیقی کی تصریح 'ایہا الناس' کے لفظ سے کی ہے، اور دوسری جگہ 'ایہا المومنون' کے لفظ سے۔ 'یا اولی الامر' کہیں نہیں کہا گیا۔ پھر مزید وضاحت یہ کر دی کہ یہ مخاطبت صرف اسی آیت سرقہ میں نہیں ہے بلکہ تمام تعزیرات اسلامی میں یہی اصول کارفرما ہے۔

اور نہیں کہا جا سکتا کہ وہ شخص اپنے اوپر کتنا بڑا ظلم کر رہا ہے جس کے پاس خدا نے اپنی چند امانتیں اس لیے رکھ چھوڑی ہیں کہ جب اس کی اطاعت امر کی راہ میں کوئی مانع پیش آئے تو وہ ان کے ذریعہ اس مانع کو دور کرنے کی سعی و جہد کرے لیکن اس کا حال یہ ہے کہ موانع پیش آنے کی صورت میں بجائے اس کے کہ وہ ان امانتوں سے کام لے کر انہیں دور کرے اور اپنے آقا کا حکم بجا لائے، کرتا یہ ہے کہ موانع کی شکایت کر کے اس حکم ہی سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے لیتا ہے اور ان امانتوں کو غاصبانہ طور پر اپنی خواہشوں کی چاکری میں لگا لیتا ہے۔

قانونِ اضطرار کی غلط تطبیق | یہ عذر تو ان احکام کے متعلق تھا جن پر کافی اقتدار بالائے طاقت عمل ہو ہی نہیں سکتا، رہ گئے بعض وہ احکام جن پر عمل کرنے سے یہ اقتدار کفر بھی مانع نہیں ہے لیکن جو عمل بالقرآن کے ادعا کے باوجود بالکلیہ متروک ہیں مثلاً تحاکم الی الطاغوت اور حکم بامر الطاغوت سے اجتناب وغیرہ، تو ان کا ترک کر دینا بھی اس وجہ سے کامل عمل بالقرآن میں مانع نہیں تصور کیا جاتا کہ ایسا اضطراراً کیا جاتا ہے؛ اور اضطرار کی حالت میں ارتکاب حرام گناہ نہیں۔ لیکن ایسا یا تو اپنی اجتماعی ذہنیت کے غلط مطالعہ کی بنا پر کہا جا سکتا ہے یا پھر رخصتِ اضطرار کی لازمی حدود و قیود سے انتہائی ناواقفیت کی بنا پر۔ قانونِ اضطرار کے الفاظ یہ ہیں:-

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (بقرہ ۲۱)

البتہ جو شخص مجبور ہو جائے (اور بحالت مجبوری حرام کھا کر اپنی جان بچالے) بشرطیکہ اس حرام شے کے کھانے کی رغبت نہ رکھتا ہو اور نہ اس عذر سے زیادہ کھانا چاہتا ہو جتنی کہ زندگی بچانے کے لیے ضرورت ہے، تو اس پر کوئی گناہ نہیں (اللہ اس کو معاف کر دے گا کیونکہ) وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

ان الفاظ سے جہاں بحالت مجبوری ایک ممنوع فعل کے ارتکاب کی رخصت معلوم ہوتی ہے، وہیں اس رخصت کے لیے تین شرطوں کی قید بھی ثابت ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ مجبوری واقعی ہو اور طلب و جستجوئے حلال کی تمام تدبیریں اس حد تک بیکار ہو چکی ہوں کہ بس لقمۂ حرام کے سوا اب جان بچانے کا اور کوئی ممکن ذریعہ رہ نہ گیا ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ یہ استعمال حرام "غیر باغ" ہو یعنی دل میں اس کی کوئی رغبت نہ ہو بلکہ جو ارتکاب حرام کیا جائے پورے احساس ناگواری اور شدید جذبۂ نفرت و کراہت کے ساتھ کیا جائے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ یہ ارتکاب حرام بھی بس اسی حد تک کیا جائے جس حد تک جان بچانے کے لیے ناگزیر ہو۔ اگر ان تین شرطوں کے ساتھ کوئی شخص ایک فعل حرام کا مرتکب ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو قابل معافی قرار دیتا ہے۔ لیکن اگر ان تینوں شرطوں میں سے ایک شرط بھی تشنۂ تکمیل رہ گئی تو پھر یہ وعدۂ عفو و درگذر بھی شرمندۂ ایفا نہ ہوگا۔ شریعت اس وقت اپنی یہ رخصت واپس لے لے گی اور ایسا کرنے والا اس کی نگاہ میں نافرمان اور قابل مواخذہ قرار پائے گا۔

قانونِ اضطرار کی اس توضیح کی روشنی میں اپنے اجتماعی طرز عمل کا ٹھیک ٹھیک جائزہ لیجیے، اور پھر اپنی ملت کے ان خدا پرستوں کی تعداد بتائیے جو خداوندان باطل کے عرش فرمانروائی کے زیر سایہ رہنے، مسرفین کی اطاعت کرنے، طاغوت کا حق غلامی تسلیم کرنے، اسمبلیوں میں جا کر قانون ساز اور شارع دین بننے، طاغوتی عدالتوں میں اپنے معاملات

لے جانے یا طاغوتی قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے میں وہی مجبوری، وہی احساسِ ناگواری اور وہی جذبۂ کراہت محسوس کرتے ہوں جو ایک مومن کو سور کی بوٹی حلق سے نیچے اتارنے میں محسوس ہو سکتی ہے۔ آخر کروڑوں انسانوں کا یہ انبوہِ گراں غیر اللہ کی حاکمیت اور مسرفین کی اطاعت کو حقیقتاً اسی اضطرار کے ساتھ برداشت کر رہا ہے جس کا قرآن میں ذکر ہے؟ کیا مسلمانوں کے یہ غول در غول جو صبح سے شام تک طاغوتی عدالتوں کا طواف کیا کرتے ہیں، یہ سب واقعۃً اپنے اس فعل کو حرام ہی سمجھتے ہیں اور اس کو محض انتہائی مجبوری کے وقت ہی اختیار کرتے ہیں اور ان میں اتباعِ اغراضِ نفس کی پیروی، حدود اللہ سے بے اعتنائی اور احکامِ شریعت سے سرتابی کا کوئی داعیہ پنہاں نہیں ہوتا؟ اور وہاں صرف اس لیے جاتے ہیں کہ ان کی جان و مال کی حفاظت کا کوئی امکانی راستہ باوجود جستجو کے نہیں ملتا؟ اور پھر یہ جج اور مجسٹریٹ صاحبان جو اپنی زندگیاں آئینِ طاغوت کے "مطابق" "دادِ انصاف" دینے میں گزار دیتے ہیں۔ درحقیقت نفس کے تقاضے اور کسی مجبوری کے مارے ہوئے ہیں؟ اور جس وقت وہ اللہ عزوجل کے قوانین پسِ پشت ڈال کر شیاطینِ انس کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق معاملات کا فیصلہ کرتے ہیں تو کیا ان کا دل اس فعل کی حرمت کا مقر اور اپنی اس فاسقانہ روش پر متنفر ہوتا ہے اور وہ بالکل غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ ہو کر بادلِ ناخواستہ اور بصد استکراہ اس ظلم و فسق کے اسٹیج پر بیٹھتے ہیں جس کو کرسیِ عدالت کہا جاتا ہے اور جہنم کے ان دہکتے ہوئے انگاروں کو ہاتھ میں لیتے ہیں جن کو روپے کے نام سے اس کارگزاری کے عوض انھیں دیا جاتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو یقیناً یہ سب لوگ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ کی رخصت اور آمرزش کے مستحق ہیں اور ملت کو ترکِ کتابِ الٰہی کا ملزم گرداننا سراپا ظلم و بہتان ہے۔ کاش ایسا ہی ہوتا، مگر حقائق کا کیا کیا جائے کہ وہ ہماری اس خواہش سے ایک فی صدی بھی موافقت نہیں کرتے۔ اک ذرا انصاف سے کام لے کر واقعات پر نگاہ ڈالیے، تو مشاہدہ آپ کو اس حقیقت کے ماننے پر مجبور کر دے گا کہ اب تو ان عدالتوں میں جاتے وقت یا ان کی کرسیوں پر بیٹھتے وقت شرطِ اضطرار کی ضرورت کا تصور تک نہیں پیدا ہوتا، ان کرسیوں تک وہ مسلمان پہنچتا ہی کب ہے جو معاشی خستہ حالیوں کے باعث جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھ سکتا ہو اور اب اس کے سوا اس کے لیے اور کوئی چارہ کار ہی نہ رہ گیا ہو کہ بقائے حیات کے لیے یہ رزقِ خبیث قبول کر لے۔ ان جگہوں تک تو وہی پہنچ پاتے ہیں جو پہلے ہی سے آسودہ حال ہوں یا کم از کم یہ کہ اس مہلک افلاس میں مبتلا نہ ہوں جس کو مخمصہ کہا جا سکے۔ اس لیے از روئے واقعہ یہ سب کچھ نہایت ٹھنڈے دل سے اور بالکل جائز سمجھ کر کیا جا رہا ہے۔ اولاد کو تعلیم دے کر تیار ہی اسی لیے کیا جاتا ہے کہ ان کرسیوں تک پہنچ سکیں اور جو پہنچ جاتا ہے وہ ترقیِ درجات کی کوششوں میں مصروف رہتا ہے۔ حالانکہ اگر واقعی اضطراری حالت کی وجہ سے اس نے یہ ذریعۂ معاش اختیار کیا ہوتا تو اس کے ایمان کا طبعی اقتضاء یہ تھا کہ اس میں ترقی کرنے کی جدوجہد کرنے یا اس پر مطمئن ہونے کے بجائے اسے چھوڑ دینے اور کوئی جائز وسیلۂ رزق اختیار کرنے کے لیے بے چین رہتا مگر ایسے لوگ چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی شاید نہ مل سکیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کھلی ہوئی طاغوت نوازی کو اضطرار کا نام کس طرح دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر فی الحقیقت ہم غیر اللہ کی حاکمیت کو حرام سمجھتے اور ہماری غیرتِ ایمانی اس سے متنفر ہوتی تو یوں گھروں کے عیش اور مدرسوں کی قیل و قال اور حجروں کی ہائے وہو میں

سکون قلب کے ساتھ مشغول نہ رہتے۔ اگر ہم سے کچھ نہ بن پڑتا تو کم سے کم یہ تو ہونا چاہیے تھا کہ اس منکر اعظم کے ساتھ کسی قسم کا تعاون یا مداہنت کرنے کے بجائے اس کے خلاف زبان اور دل سے انتہائی نفرت کا اظہار کرتے، کہ بقول رسولؐ یہ ایمان کی آخری حد ہے مگر یہاں حال یہ ہے کہ نہ صرف اس سے کسی نفرت اور کراہت کی ضرورت نہیں محسوس کی جا رہی ہے بلکہ اس کو برا ہی نہیں سمجھا جاتا اور اس کے قیام کے لیے حلف وفاداری اٹھائی جاتی ہے اور اس کی بقا کے لیے جسم و دماغ کی ساری قوتیں نثار کی جا رہی ہیں۔ کیا ایک مومن صفت شخص سے یہی برتاؤ کیا جا سکتا ہے؟ آخر اتنی بڑی عظیم الشان برائی کے ساتھ ایمان کے اس کم سے کم مقتضا کا تو اظہار ہونا چاہیے جس کی حدیث بالا میں وضاحت کی گئی ہے؟ یا اس سے بھی کم ایمان کا کوئی اور درجہ ہے؟ اضطرار کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے، ورنہ اگر اس کے دامن میں اتنی وسعت ہے جتنی آپ نے سمجھ رکھی ہے تو یقین رکھنا چاہیے کہ دنیا کی کوئی برائی اور قرآن کی کوئی قانون شکنی بھی اس کے دائرہ سے باہر نہیں رہ سکتی اور ایک متبع قرآن اپنے نفس کی پیروی بالکل اسی بے باکی سے کر سکتا ہے جس بے باکی سے ایک منکر آخرت کرتا ہے اور اخلاق و خدا پرستی کے وہ سارے اصول و ضوابط بیکار ہو کر رہ جائیں گے جن کی تعلیم و تبیین کے لیے قرآن کا نزول اور صاحب قرآن صلعم کی بعثت ہوئی ہے۔ لیکن یاد رہے اضطرار کی یہ وہ تاویل ہے جس سے اللہ اور رسول بالکل بری ہیں۔

اصل یہ ہے کہ جب ایک برائی کسی سوسائٹی میں نمودار ہوتی ہے تو ابتدا میں سوسائٹی کا اجتماعی ضمیر اس پر نفرت اور ملامت کا اظہار کرتا ہے، اگر یہ جذبۂ نفرت و ملامت قوی ہو تو وہ برائی دب جاتی ہے، اور اگر یہ جذبہ اتنا کمزور ہو کہ اس برائی کو برگ و بار لانے سے نہ روک سکے تو اس کے جراثیم تیزی سے پھیلنے لگتے ہیں۔ اب اگر اس سوسائٹی کے خواص اپنے امکان بھر اس برائی کا استیصال نہ کریں بلکہ اس کے خلاف صرف اظہار خیال کر دینے ہی کو کافی سمجھیں تو رفتہ رفتہ ان کی نگاہیں بھی اس سے مانوس ہوتی چلی جاتی ہیں، اور زیادہ دن نہیں گزرنے پاتے کہ وہ برائی برائی نہیں رہ جاتی اور خاص و عام سب اسی کے رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں۔ اس وقت وہ معاشرہ کا جزو لاینفک بن جاتی ہے اور اس پر استحسان یا کم از کم اباحت کا ٹھپہ لگا دیا جاتا ہے اور اس کے لیے اپنے مسلم اصول اخلاق میں ترمیم و تنسیخ اور تغیر تک گوارا کر لی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو جہاں اس بات کی ہدایت کر دی گئی تھی کہ نیکی کو پھیلاتے اور برائی کو مٹاتے رہنا، وہیں اس خطرہ سے بھی آگاہ کر دیا گیا تھا کہ اگر تم نے منکرات اور فواحش کی روک تھام نہ کی تو تمہارے دل تک وہ اپنے جراثیم پہنچا دیں گے اور تم خدا کی عنایات سے محروم اور اس کی لعنتوں کے مستحق ہو کر رہ جاؤ گے لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں نے اس زریں ہدایت کو اپنے دماغوں میں محفوظ نہ رکھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ان کے دل، ان کے دماغ، ان کے نقطہ ہائے نظر اور ان کے انداز فکر بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں اور جس چیز سے نفرت ہونی چاہیے تھی اس سے رغبت کی جا رہی ہے، جس چیز سے بھاگنا چاہیے تھا اس کی طلب میں دوڑ لگائی جا رہی ہے، جس چیز کو پیروں تلے روند ڈالنا چاہیے تھا وہ دانتوں سے پکڑی جا رہی ہے۔ ان کے پیغمبر نے یہ بتلا دیا تھا کہ ایمان کی آخری حد یہ ہے کہ ہر برائی سے دل میں نفرت رکھی جائے، ایسی نفرت جو اس برائی کو مٹا دینے کے لیے اکساتی رہے۔ ورنہ اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں یعنی کسی برائی کو نہ صرف برضا و رغبت قبول کرنے ہی کو منافی ایمان قرار دیا ہے بلکہ اس کو دیکھ کر اپنے اندر جذبۂ نفرت کا نہ محسوس کرنا بھی ویرانی قلب اور محرومی ایمان کی یقینی علامت بنایا ہے۔ مگر اب

یعنی مقتدیوں کے سمبر داروں کو اس امر پر بڑا اصرار ہے کہ ہم بلا اظہار کراہت اور بغیر کسی احساس نفرت کے غیر اللہ کی غلامی، جو اپنی گردنوں پر رکھیں گے، خود قانون ساز اور شارع دین بنیں گے، طاغوت کو اپنا حکم بنائیں گے طاغوت کے قوانین کے مطابق معاملات کا فیصلہ کریں گے اور پھر بھی ہمارا دین جائے گا، نہ ایمان خراب ہوگا، نہ ہماری توحید پرستی و عبودیت میں فرق آئے گا، نہ اتباع قرآن میں فتنہ واقع ہوگا، نہ ہم پر کتاب الٰہی کے ترک و نسیان کا الزام وارد ہوگا، نہ ہم نقض میثاق کے مجرم ہوں گے، کیونکہ ہم حالت "اضطرار" میں ہیں۔ ع وائے گر پس امروز بود فردائے

اس بیان غلط اور فریب نفس کے مفاسد کا پورا پورا اندازہ آپ کو اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ ان مذکورہ بالا احکام قرآنی کے ترک کے نتیجے میں ان دور رس نتائج کو سامنے رکھیں جو ہمارے انفرادی اور اجتماعی مسائل زندگی کے بارے میں رونما ہوتے ہیں۔ غیر اللہ کی حاکمیت میں ایک وفادار رعایا بن کر رہنے کے معنی یہی نہیں ہیں کہ ہم نے ایک صریح حکم قرآنی کی خلاف ورزی کی بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اب ہماری زندگی شعوری یا غیر شعوری طور پر ایسے سانچے میں ڈھلتی چلی جائے گی جو اسلام کے مطلوبہ قالب سے بالکل مختلف ہوگا، اب ہمارے معاشرہ کی تاسیس ہمارے تمدن کی تشکیل ہمارے نظام تعلیم کی تعمیر اور ہمارے مسائل معاش یا اقتصاد کی تنظیم ایسی بنیادوں پر ہوگی، جو ہماری خواہش اور ارادے کے علی الرغم، ہم کو اپنے اجتماعی مسلک اور اپنے تصورات زندگی سے دور کھینچتی چلی جائیں گی۔ غیر الٰہی قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے اور کرانے کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ بس ایک گناہ سرزد ہو رہا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان بیشتر احکام اسلامی کو لپیٹ کر رکھ دیا جائے اور ان کی وقعت دلوں سے محو ہو جائے جو ہمارے معاملات زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور ہم اپنے دین اور قرآن کو سمیٹ کر مسجدوں اور حجروں میں بند کر دیں اور دین کے صرف اتنے حصہ پر قناعت کر لیں جس کا تعلق چند مخصوص مذہبی رسوم و شعائر اور عبادات سے ہے۔ چنانچہ اب یہ سارے نتائج قیاس کے دائرہ سے نکل کر واقعات کے عالم میں آچکے ہیں۔ اس ملت کے علمبرداروں نے قرآن کے ایک بڑے حصہ کو حکومت اور اولوالامر کے نام پر ترک کر دیا اور عدم استطاعت اور اضطرار کے بہانے پیدا کر کے جن کارہائے ناکردنی کو اختیار کیا ان کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کے بے شمار احکام اور اصول زندگی سے ان کا رشتہ کٹ گیا اور دین کے صرف ایک محدود حصہ پر عمل کر سکنے کے قابل رہ گئے۔ ابتداءً میں دین کے ان بنیادی اصولوں اور اس کے مقتضیات سے اس جبری علیحدگی پر خود دین داران مضطرب ہوئی مگر امتداد زمانہ نے اس اضطراب کو سکون و اطمینان سے بدل دیا، اور اب انجام کار ماحول غیر شعوری طور سے یہ ذہن مستولی ہو گیا ہے کہ دین انہی چند عبادات کا نام ہے جن کو ہم ادا کر رہے ہیں اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس کا تعلق دنیا اور دنیاداری سے ہے۔ اس لیے اس قسم کے احکام و اصول قرآنی کے متروک ہو جانے کے باوجود ہمارا دین غیر مشکوک اور ہمارا اتباع قرآن کامل ہے۔ دراصل یہی تصور دین ہے جس نے ان احکام متروکہ کی اہمیت ہماری نگاہوں میں گھٹا دی ہے اور اس حد تک گھٹا دی ہے کہ دلوں میں ان کے لیے کوئی اضطراب، کوئی تمنا اور کوئی حسرت باقی نہیں رہنے دی۔ مسجد کی ایک اینٹ بھی اگر کھود کر پھینک دی جائے تو اس گئی گزری حالت میں بھی مسلمانوں کی گردنیں خون کے دریا بہانے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں مگر اللہ کی بے شمار حدود کی بے حرمتی کو دیکھ کر تڑپنے کے لیے

ایک دن اور رہنے کے لیے ایک قطرۂ اشک بھی تیار نہیں۔ اس فرق کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ دین کو [illegible] سمجھا جاتا ہے اور یہ دنیا کا۔ لیکن چونکہ ان حدود و احکام کا ذکر بھی اسی قرآن میں موجود ہے جس میں اُن چند مخصوص عبادات کا اور اس خدا کے اتباع کا عہد کیا گیا ہے جو قرآن میں ہے، اس لیے زبان سے یہ کہنے کی جرأت تو نہیں ہوتی کہ یہ حدود و احکام دین سے خارج ہیں لیکن جب اطاعتِ امر اور دائمی فرض کا سوال پیدا ہوتا ہے تو غیر شعوری طور پر دین کا وہی محدود تصور [illegible] پسندی کا تقاضا کرتا ہے، کبھی تو قانونِ اضطرار کی آڑ لینے پر مجبور کرتا ہے اور کبھی [illegible] کی ذمہ داری سے [illegible] بیان [illegible]۔

غرض غیرت ایمانی کی کمی [illegible] کی پژمردگی اور سہل پسندی نے تیار رستی نے کا [illegible] افتدار کا فرائض سے نظر پھیر کر سہولتیں ڈھونڈنے پر آمادہ کیا، اس آوارگی نے قرآن کے ایک بڑے حصے کو چھوڑنے پر مجبور کیا، اس مجبوری نے یوں کہنا [illegible] دے اپنی خدا پرستی اور بے گناہی کا بھرم رکھنے اور اپنی نگاہوں سے آپ اپنی [illegible] کا صورت چھپانے کے لیے دین کا تصور محدود ہو جانے، درج کر دیا، ایسا محدود کر دیں [illegible] پر عمل نہیں ہو رہا ہے ان کو دین ہی سے خارج کرنے اور [illegible] زندگی کے میدان وہ کہیں، ہماری اغراض کے خلاف، مزاحم نہ ہو سکے۔ [illegible] دین نے ملت کی تمام فرض ناشناسیوں، کمزوریوں اور بے عملیوں کی شناعت کا احساس فراموش کرا دیا ہے۔ آخر میں [illegible] اور اضطرار کے حیلے آئے اور انھوں نے اس پورے سلسلۂ اوہام پر حقانیت کا پردہ ڈال دیا۔ اب یہ [illegible] خیالات ایک دوسرے سے غذا حاصل کر رہے ہیں اور سب نے مل کر غلط فہمیوں کا ایسا جال تیار کر دیا ہے جس کے گھیرے میں حقائق جکڑے رہی ہیں، اور ان کے سامنے اصلیت اس طرح مستور ہو چکی ہے کہ اب ان میں [illegible] تجربات بھی دم توڑ رہے ہیں۔ اگر انسان میں اپنی غلطی کا احساس زندہ ہو تو امید کی جاسکتی ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن اپنی اصلاح کرے گا لیکن اگر یہ احساس مردہ ہو گیا اور اس کی نظر میں غلطی غلطی نہ رہ گئی تو پھر اس کے تائب ہونے کی تمام توقعات ختم ہو جاتی ہیں۔ اس لیے اگر اس ملت نے اپنی کامل تباہی اور دین و دنیا دونوں کی رسوائی کا فیصلہ نہیں کیا ہے تو اپنی بے گناہی کے زعمِ باطل سے اس کو جلد از جلد باز آجانا اور اپنا جرم تسلیم کر لینا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا قانونِ ہدایت بھی عجیب شان بے نیازی رکھتا ہے۔ ایک ہی چیز ہوتی ہے جس سے کچھ لوگوں کے سامنے ہدایت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور وہ حقیقت کو پا لیتا ہے، مگر وہی چیز دوسروں کو ضلالت کے فتنے میں مبتلا کر دیتی ہے اور وہ راہِ راست سے اور دور ہو جاتے ہیں۔ اس قانون کا راز اللہ جل مجدہٗ کی اس صفتِ عدل میں ہے کہ جو حق کی سچی طلب رکھتا ہے اسی کے سامنے راہِ حق باز کی جاتی ہے اور جو حق سے بے اعتنائی برتتا ہے، اس کے سامنے حق کی تجلی کبھی نہیں آتی۔ آفتاب کی شعاعیں ایک عالم کو منور کر دیتی ہیں مگر چشمِ بوم اپنی کور نگاہی کی بنا پر اس کے فیضان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتی۔ یہی حال آفتابِ ہدایت کی شعاعوں کا بھی ہے۔ قرآن نے اپنی صفت جہاں یہ بتائی ہے کہ میں لوگوں کے لیے مشعلِ ہدایت ہوں، وہیں یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ بہتوں کے لیے وسیلۂ غوایت بھی ہوں۔ اس کے اس قول میں اسی قانونِ ہدایت کی طرف اشارہ ہے جس کے متعلق ہم یہاں گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ اسی شخص کو راہِ راست دکھاتا ہے جو دیکھنا چاہے اور اسی وقت دکھاتا ہے جب دیکھنے کی حقیقی آرزو ہو۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس کا یہ قانون صرف کفار کے لیے ہے اور مومن

چونکہ اس پر ایمان لا چکے ہیں، اس لیے اب وہ اس قانون سے آزاد ہیں۔ نہیں، یہ کافر اور مومن سب کے لیے عام ہے۔ ایک مومن بھی قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود اصل زندگی میں اس قرآن سے اسی وقت کسب ہدایت کر سکتا ہے جب وہ پورے اخلاص قلب کے ساتھ اس کی طلب بھی کرے۔ ورنہ جس وقت بھی، اور زندگی کے جس معاملہ میں بھی، اس نے اس سے رہنمائی کی خواہش نہ کی اور غیر مشروط طور پر اس کی اقتدا کرنے اور اس غرض سے اس کا زاویۂ نگاہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی، وہاں یقیناً وہ اس کو گمراہی کی تاریکیوں میں بھٹکتا چھوڑ دے گا، اور اس امر کا کوئی لحاظ نہ کرے گا کہ وہ میرا منکر نہیں بلکہ ماننے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کو اس امر کی تلقین کی گئی ہے کہ ایمان لانے اور ہدایت یاب ہونے کے بعد بھی اپنے قلب و نظر کو کجروی سے مامون نہ سمجھے اور ہر وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے کہ خدایا میرے سامنے سے ہدایت کی روشنی گم نہ ہونے پائے۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا۔

قرآن کے ان احکام و فرامین کے بارے میں جو اس وقت زیر بحث ہیں، بالکل اسی مجرمانہ بے اعتنائی سے کام لیا جا رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں سے سمت منزل کی رہنمائی ہو رہی تھی، ٹھیک اسی جگہ سے بھٹکنے کا سامان فراہم کر لیا گیا۔ قرآن میں جو یہ الفاظ آئے ہیں کہ اے مومنو! ایک خدا کی فرمانروائی کے آگے خود جھکو اور سارے عالم کو جھکا دو۔ اے ایمان لانے والو! کفر کے علمبرداروں سے لڑ کر فتنہ کا سر کچل دو، اے ایمان رکھنے والو! معروف کا حکم دو اور منکر سے روک دو، اے مسلمانو! چور کا ہاتھ کاٹ دو اور زانی کو درے لگاؤ، وغیر ذالک، تو اس انداز خطاب کی اصل بنیاد ایک ایسی عظیم الشان حقیقت پر تھی کہ اس کا صحیح تصور ہی اس کارگہ حیات میں مومن کا مقام متعین کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اگر ہم طلب حق لے کر قرآن پر نگاہ ڈالتے تو پاتے کہ یہ طرز خطاب اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں اس امت کی حیثیت ایک حکمراں پارٹی کی ہے اور اس کا مقام رہبانیت کے حجروں میں یا محکومی کے جوے تلے نہیں ہے بلکہ امامت جہانبانی کے تخت پر ہے اور اس مسند امامت سے نیچے وہ اس کی حیثیت کو فرض ہی نہیں کرتا، نہ اس سے کم پوزیشن میں کبھی اس کو دیکھنا چاہتا ہے۔ سوچیے تو سہی زندگی کا کتنا بلند، حریت آموز اور جاں بخش تصور تھا جو اس اسلوب بیان میں موجود تھا اور قلب مسلم کو کیسے پاکیزہ اور عالی عزائم سے معمور کر دینے والا سبق تھا جو اس اشارۂ قرآنی میں چھپا فکر و نظر کا منتظر ہے۔ مگر قصور نظر کا برا ہو، زندگی کا پیغام بھی ہمارے لیے موت کا پروانہ بن گیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اللہ رب العزۃ کے اس طرز خطاب کے راز کو سمجھ کر اپنا کھویا ہوا مقام اور بھولا ہوا فریضہ یاد کیا جاتا اور اپنی کوتاہیوں پر نادم ہو کر ان کی تلافی کی سعی کی جاتی اور پھر اس مقام کی بازیافت کی سرفروشانہ جدوجہد کی جاتی جہاں ہمارا شہنشاہ مطلق ہم کو دیکھنا چاہتا ہے۔ مگر ہوا یہ کہ یہی انداز خطاب ہمارے لیے بے عملی کے جواز کی سند اور اقامت حق کی راہ کا روڑا بن گیا۔ اور یہ کہہ کر کہ چونکہ ان احکام کے مخاطب حکام خلافت ہیں اور اس وقت ہم کو خلافت کا اقتدار حاصل نہیں، ہم نے اپنی ذمہ داری کا بوجھ اتار کر پھینک دیا۔ یہ طرز فکر و عمل بالکل ایسا ہی ہے کہ ایک مسلمان جب قرآن و سنت پر نظر ڈالے اور دیکھے کہ مسلمان کی تعریف اور اسلام کا معیار یہ ہے کہ وہ متقی اور صالح ہو، متواضع اور مجاہد ہو، تمام اخلاق حسنہ سے متصف اور خصائل بد سے مجتنب ہو، حدود اللہ کا پابند اور تمام حقوق کا پورا کرنے والا ہو، یہ دیکھ کر وہ اس معیار تک پہنچنے کی اس بنا پر کوشش نہ کرے کہ میں ضعیف الایمان بھلا اس مقام تک کب پہنچ سکتا ہوں، ایمان کا یہ معیار تو بلند تر

تو بس صحابہ ہی کے لیے مخصوص تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ طرز فکر کتنا غلط ہے۔ اگر کوئی مسلمان قرآنی معیار ایمان سے فروتر ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس معیار تک پہنچنے کی ہر ممکن سعی کرے نہ کہ مشکلات کی فہرست سنا کر مطمئن ہو رہے۔

بالکل یہی روش آیت اضطرار کے بارے میں بھی اختیار کی گئی۔ غیر باغ ولا عاد کی شرط لازم میں غیرت حق کے تحفظ کا جو راز پنہاں تھا اور زندگی کے نازک سے نازک اور ناموافق سے ناموافق مواقع میں بھی اپنے مقام کی عظمت برقرار رکھنے اور اپنے مطمح نظر کا پاس رکھنے کا جو اصول پوشیدہ تھا اس کی طرف تو نظر نہیں گئی یا پہنچی ہوئی نظر کو بند کر لیا گیا لیکن فلا اثم علیہ کی آڑ لے کر اباحت کا دروازہ کھول لیا گیا۔ بلاشبہ اس آیت میں بحالت مجبوری ایک فعل حرام کے ارتکاب کی گنجائش عطا کی گئی ہے لیکن یہ اس آیت کا صرف ایک پہلو ہے اور اس کا دوسرا پہلو تو اپنی اہمیت کے لحاظ سے پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ لائق اعتنا ہے۔ نظر اس سے بالکل اوجھل ہے جس کا مدعا یہ ہے کہ تم کبھی، کسی حال میں بھی، کسی امر منکر پر قلب کی ادنیٰ سے ادنیٰ رضامندی کے ساتھ نہیں جم سکتے۔ بلکہ اگر کبھی ایسی صورت پیش آ جائے تو اپنے تمام افکار کو اسی ایک فکر میں مشغول کر دینا کہ کسی طرح اس دام بلا سے نجات مل جائے جس میں سوء اتفاق نے لا پھنسایا ہے اور جب تک یہ نجات نہ مل سکے بس یوں سمجھنا کہ مردار کا سڑا ہوا گوشت ہے جس کو دانتوں سے نوچ رہا ہوں یا خنزیر کی بوٹیاں ہیں جن کو نگل رہا ہوں، یا عفونت بھری غلاظت ہے جس میں جسم اور کپڑے لت پت ہو گئے ہیں۔ اس احساس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اس حرام سے دور ہو جانے کی بالکل اسی طرح بے تابانہ کوشش کرو گے جس طرح کسی آدمی کا پاؤں نکیلے اور تپتے ہوئے سنگریزوں پر پڑ جاتا ہے تو وہ تلملا کر فوراً ہی اس کو اٹھا لیتا اور کسی نرم اور ہموار زمین پر رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس آیت کا دیا ہوا یہ درس اگر ہم کو یاد ہوتا تو اس وقت ہماری دنیا یہ دنیا نہ ہوتی اور وہ شکست خوردہ ذہنیت، وہ پست نقطۂ نگاہ اور وہ ایمان سوز طرز فکر ہماری قوتوں کو اس طرح مفلوج نہ کر دیتا جسے ہمارا ناعاقبت اندیش نفس نے کلام الٰہی کو اپنا آلۂ کار بنا کر ہمارے اندر پیدا کر دیا ہے۔ اور کروڑوں انسانوں کی اتنی بھاری جمعیت، اضطرار کے نام پر قرنوں تک منکرات و خبائث کے ساتھ اس طرح کی قابل شرم سازگاری نہ کھاتی کہ اتباع قرآن کا دعویٰ رکھنے کے باوجود اس کا قافلہ کفر و فسق کی بنائی ہوئی روش پر پورے ذوق و شوق کے ساتھ چلا جا رہا ہے، اور اس کے دل میں کبھی کوئی غیرت، کوئی نفرت اور کوئی بے چینی انھیں محسوس ہوتی۔ منکرات کے ساتھ سازگاری دکھانے کے بجائے ہم ان کے خلاف مجسم احتجاج ہوتے، ہمارا ذوق ایمانی ہماری زندگی کو تلخ بنا دیتا اور ہماری غیرت اسلامی ہم کو مجبور کر دیتی کہ اس غلاظت کفر کو جس طرح بھی ہو سکے، اپنے دامن سے دھو کر دم لیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہم کو اضطرار کی رخصت تو یاد رہ گئی مگر غیر باغ ولا عاد کی شرط اور اس شرط کے لوازم اور مقتضیات کو دانستہ یا نادانستہ بالکل نظر انداز کر دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تریاق زہر کا کام دینے لگا۔

پس اس امت کے لیے ترک کتاب الٰہی کے جرم اور اس جرم کی رسوا کن سزاؤں سے نجات پانے کی اگر کوئی راہ ہے تو صرف یہ کہ وہ اپنی تمام تر کوششوں کو اس صورت حال کے بدل ڈالنے پر مرتکز کر دے جس میں وہ اپنے حاکم اعلیٰ کے فرامین سنتی ہے مگر عمل نہیں کرتی یا نہیں کر سکتی، نہ یہ کہ اضطرار اور عدم استطاعت کا بہانہ کر کے اور اپنے جرم پر پردہ ڈال کر مطمئن ہو رہے۔ یہ اطمینان دراصل ایمان کے کھوکھلے ہونے یا دین کی بصیرت سے محروم ہونے کی دلیل ہے اور فریب نفس کا ایسا خطرناک طلسم ہے جو اگر پوری قوت سے نہ توڑا گیا تو قلب مومن کی وہ ضعیف ترین دھڑکنیں بھی ختم ہو جائیں گی جو ابھی تک کبھی کبھی محسوس ہو جاتی ہیں۔

(باقی)

رسائل و مسائل

علمبرداران حق کا قافلہ کس منزل میں

ذیل کے چند خطوط کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ تحریک اسلامی کو قبول کر لینے کی وجہ سے ہمارے رفقا کن کن مشکلات میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ جس زمانہ میں کوئی سلیم الفطرت انسان خلوص و دیانت کے ساتھ خدا کا کام کرنے اٹھا، خود اسکے بندے اس کے راستہ میں طرح طرح سے حائل ہونے لگے۔ طرفہ تماشا یہ کہ اس انسان کا آغاز بالعموم گھر کی چاردیواری سے ہوا، جب ماں اور باپ بہن اور بھائی ہی اعلان جنگ کرنے میں سبقت کرتے ہیں۔

مگر یہ سب کچھ توقع کے خلاف نہیں ہے۔ اس راہ میں ہمیشہ یہی پیش آیا ہے اور آج بھی یہی پیش آسکتا ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو ہر مرحلہ کے مظاہرۂ غیظ و غضب کا مقابلہ کرنے کے لیے خدا سے استقامت کی توفیق پائیں۔

سوال:۔ میں اپنے حالات مختصراً پیش کرتا ہوں۔ مجھے بتلائیے کہ کونسا طریق کار اختیار کروں کہ میرے اسلام میں فرق نہ آئے:

(۱) والدین اٹھتے بیٹھتے اصرار کر رہے ہیں کہ ملازمت پر واپس چلا جاؤں۔ بحالت موجودہ وہ مذمت اپنے لیے خدا کا [illegible] ہی گردانتے ہیں۔ ان کا منشا یہ ہے کہ صرف ایسے وقت پر والدین کی نافرمانی جائز ہے جب وہ یہ کہیں کہ خدا کو نہ مانو۔ باقی تمام امور میں والدین کا حکم شرعی طور پر واجب التعمیل ہے۔ عنقریب وہ اعلان کرنے والے ہیں کہ نوکری پر چلا جاؤں تو بہتر ورنہ میرا ان سے کوئی تعلق نہ رہ سکے گا۔ بس وہ اتنی رعایت مجھے دیتے ہیں کہ اگر میں مستقل طور پر ملازمت اختیار کرنا نہیں چاہتا تو کم از کم سال ڈیڑھ سال اور اختیار کیے رکھوں، حتی کہ میرے چھوٹے بھائی بی۔ اے کرلیں اور میری خالی جگہ کو پر کرسکیں۔ اس سلسلہ میں کن [illegible]

(۲) ادھر عوام میں میری بے اثری بڑھ رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس ذوق و شوق سے دوران ملازمت میں لوگ میری بات سنا کرتے تھے یا حمایت کا دم بھرا کرتے تھے اب وہ ختم ہو رہا ہے بلکہ میری باتوں کا ان پر الٹا اثر ہوتا ہے۔

(۳) بڑے بھائی بتلاتے ہیں کہ اگر نوکری حرام ہے تو زمینداری کونسی حلال ہے۔ ہماری زمین سرکار ــــ (ایک ریاست) نے ہمارے آباؤاجداد کو بخشش کے طور پر دی تھی وہ تو تمہارے نظریہ کی رو سے حلال آمدنی قطعاً نہیں دے سکتی۔ علاوہ بریں اسلام میں زمیندارہ سسٹم سرے سے ناجائز ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمارے دادا نے اپنی جائداد بروئے شریعت تقسیم نہیں کی تھی۔ ان کی وراثت صرف نرینہ اولاد میں چلی ہے اور مستورات کو محروم رکھا گیا ہے۔ پھر نوکری کو حرام کہنے کے بعد ایسی جائداد پر کوئی شخص کیسے بسر اوقات کرسکتا ہے؟

(۴) مسلمانوں کی اکثریت جہالت اور شرک میں مبتلا ہے۔ قبروں پر حاجات لے کر جانے اور نہ جانے کا سوال بہت اہمیت اختیار کئے ہوئے ہے۔ اس معاملہ میں اگر مصلحتہ سکوت کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حق کو قبول کرنے کے ساتھ لوگ شرک کرنے کی گنجائش کو بھی بحال رکھیں۔ یوں مخالفت نہ ہو [illegible] آخر ہمارا [illegible] ہوتا ہے اور لوگوں کو معلوم ہو کہ یہ بات کہ ہم قبروں پر جا کر حاجات طلب کرنے کے خلاف ہیں۔ جہاں بات کہی [illegible] اس کو [illegible] اس کی بات پر آمادہ ہی نہیں ہوتے بلکہ اس سے بدکنے لگتے ہیں [illegible] آباؤ اجداد نے پسینے بہائے ہیں اور جن کی حفاظت میں [illegible] ہوں۔

جواب: آپ کا عنایت نامہ ملا۔ آپ اب اسی مرحلہ پر پہنچ گئے ہیں جس سے میں نے آپ کو پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ میں اس معاملہ میں آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ آپ کیا رویہ اختیار کریں۔ اس کا فیصلہ آپ کو بالکل اپنے قلب و ضمیر کی آواز پر کرنا چاہیے اور اپنی ہمت کا جائزہ لے لینا چاہیے۔ حالات زندگی اپ کے ہیں۔ ٹھنڈے دل سے کریں اور خدا سے دعا مانگتے رہیں کہ آپ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جس کے بعد پسپائی کی نوبت آئے۔ پسپا ہونے سے اقدام نہ کرنا زیادہ بہتر ہے۔

فیصلہ کو اپنے ضمیر پر چھوڑنے کے بعد میں صرف ان دلائل کا جواب دیئے دیتا ہوں جو آپ کے مقابلہ میں پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) عذاب و ثواب کوئی کسی کا دنیا میں نہیں اٹھا سکتا۔ ہر شخص اپنے عذاب و ثواب کا خود حامل ہے۔ میرے کہنے سے اگر آپ کوئی گناہ کریں تو میں کہنے کا گنہگار ہوں گا اور آپ کرنے کے گنہگار ہوں گے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کے کرنے کا گناہ بھی کہنے والے کی طرف منتقل ہو جائے۔

(۲) والدین کی فرمانبرداری صرف اسی حد تک ہے جس حد تک ان کی فرمانبرداری سے خالق کی نافرمانی لازم نہ آتی ہو۔ اگر وہ کسی معصیت کا حکم دیں تو ان کی اطاعت کرنا صرف یہی نہیں کہ فرض نہیں ہے بلکہ الٹا گناہ ہے۔

(۳) جس فعل کو آپ خود معصیت سمجھتے ہوں اسے ڈیڑھ یا دو سال تک [illegible] (۲) مت کرنے رہنا کر خاندان کا ایک اور فرد آپ کے بجائے اس معصیت کے لیے تیار ہو جائے، بالکل ایک غلط فعل ہے۔ اگر آپ اپنے حقیقی دین عاقل ہیں تو آپ کی یہ دلی خواہش ہونی چاہیے کہ نہ صرف آپ خود اس سے بچیں بلکہ خدا کا ہر بندہ اس سے محفوظ رہے۔

(۴) یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام میں زمینداری سرے سے ناجائز ہے۔ زمین کی شخصی ملکیت کو اسلام تسلیم کرتا ہے اور اگر کوئی شخص خود کاشت نہ کر سکتا ہو تو بٹائی پر دوسرے کو دینا جائز ہے۔ البتہ ہندوستان میں زمینداری کی بعض شکلیں ایسی ضرور رائج ہو گئی ہیں جو جائز نہیں ہیں۔ اگر شرعی طریقہ پر آپ زمینداری کریں اور ناجائز نا [illegible] ہٹانے سے بچیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

(۵) جو جائداد کسی شخص کو آباؤ اجداد سے ملی ہو اس کی سابق تاریخ دیکھنے کا شریعت نے اسے مکلف نہیں کیا۔ اس معاملہ میں قرآن کا قانون گذشتہ پر گرفت نہیں کرتا بلکہ حال اور مستقبل کی اصلاح ہی پر اکتفا کرتا ہے۔ اس کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ جب وہ جائداد اس کی ملکیت میں آئے اس وقت سے وہ اس میں شرعی طریقہ پر تصرف کرے اور سابق میں جن

لوگوں نے اس کو غلط طریقہ سے حاصل کیا تھا اور اس میں غلط تصرفات کیے تھے ان کے معاملہ کو خدا پر چھوڑ دے۔ البتہ اگر کوئی چیز آپ کے قبضہ میں ایسی ہو جس کے بارے میں آپ کو متعین طور پر معلوم ہو کہ اس میں فلاں فلاں لوگوں کے غصب شدہ حقوق شامل ہیں اور وہ لوگ بھی موجود ہوں، نیز ان کا حصہ بھی متعین طور پر معلوم ہو تو اپنی حد تک ان کے حقوق واپس کر دیجیے۔

(۶) ملازمت کے زمانہ میں آپ کے ذاتی اور خاندانی اثر کی بدولت جو لوگ آپ کا اثر قبول کر رہے تھے وہ حقیقت میں دین کی دعوت سے متاثر نہیں ہو رہے تھے، جاہ و مال کے بت کی پوجا کر رہے تھے اور آئندہ بھی اگر آپ اس پوزیشن پر رہیں تو یہ دھوکا کھائیے گا کہ لوگوں کو آپ خدا پرست بنا رہے ہیں۔ سچے خدا پرست تو وہی لوگ ہوں گے جو آپ کی دنیوی پوزیشن کو دیکھ کر نہیں بلکہ آپ کی دعوت کی سچائی اور آپ کے تقویٰ کو دیکھ کر متاثر ہوں۔ میرے نزدیک تو آپ صحیح معنوں میں دعوت حق کے داعی اسی وقت بنیں گے جب تمام اعزازات آپ سے چھن جائیں، زمین آپ کو جگہ دینے سے انکار کر دے اور وہ سب جو کل تک آپ کے سامنے جھکے پڑتے تھے، آپ کو رد کرنے اور آپ سے منہ پھیرنے پر اتر آئیں۔ یہ صورت حال ہے تو بہت خطرناک لیکن اس راہ میں یہی کچھ مفید ہے۔ اگر خدا نے آپ کو اتنی طاقت دی کہ آپ اسے برداشت کر لینے کے قابل ہو جائیں تو اس کا حقیقی فائدہ آپ کو آگے چل کر معلوم ہوگا اور اسی وقت آپ کو اللہ تعالیٰ جھوٹے رفیقوں کی رفاقت سے بچا کر سچے رفیق بہم پہنچائے گا۔

(۷) عوام کے عقائد پر خواہ مخواہ با دل دہلا ضرب لگانے سے پرہیز کرنا چاہیے لیکن اپنے عقائد پر پردہ ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ "وہابیت" کے الزام سے بچنے کا اہتمام نہ کیجیے۔ لوگوں نے درحقیقت مسلمان کے لیے یہ دوسرا نام تجویز کیا ہے۔ وہ گالی مسلمان کو دینا چاہتے ہیں لیکن مسلمان کہہ کر گالی دیں تو اپنا اسلام خطرہ میں پڑتا ہے اس لیے وہابی کہہ کر گالی دیتے ہیں۔ اس حقیقت کو جب آپ سمجھ جائیں گے تو پھر وہابی کے خطاب سے آپ کو کوئی رنج نہ ہوگا۔ جو عقائد اور جو اعمال مشرکانہ ہیں ان سے بہرحال پرہیز کیجیے اور توحید کو اس کے اصلی تقاضوں کے ساتھ بے تکلف بیان کیجیے۔ شرک اور مشرکانہ باتوں سے پرہیز اور توحید اور مقتضیاتِ توحید کی پابندی اگر وہابیت ہے تو خدا اپنے ہر بندے کو وہابی ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور غیر وہابی ہونے سے بچائے۔

سوال:۔ صوبجاتی اجتماع سے واپس آنے پر میں یکایک ان پریشانیوں میں مبتلا ہو گیا ہوں جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھیں۔ آپ کی شدید مصروفیات کا علم رکھنے کے باوجود ان احوال کا تفصیلی تذکرہ آپ ہی کے اس ارشاد کی بنا پر کر رہا ہوں کہ اس نوعیت کے امور سے آپ کو پوری طرح مطلع رکھنا ضروری ہے۔ خیر تو ۱۹ اکتوبر کو والد مکرم کا جو گرامی نامہ موصول ہوا ہے وہ لفظاً بلفظاً درج ذیل ہے:۔

"برخوردار نور چشم ——— بعد دعائے ترقیٔ درجات کے واضح ہو کہ اب تم خود مختار ہو گئے ہو، ہماری سرپرستی کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہم مکان پر بیار پڑے ہیں اور تم کو جلسوں کی شرکت لازم اور ضروری۔ اب اللہ کے فضل سے نوکر ہو گئے۔ ہم نے اپنی تمام کوشش سے تعلیم میں کامیاب کرایا اور اس کا نتیجہ پا لیا۔ عالم باعمل ہو گئے کہ باپ کا حکم ماننا ظلم اور حکم خدا کے خلاف قرار پایا۔ اوروں کا حکم ماں باپ

زیادہ افضل! خیر تمہاری کمائی سے ہم نے اپنی ضعیفی میں بڑا آرام پایا۔ آئندہ ایک پیسہ بھی ہم لینا نہیں چاہتے۔ تم تمہارا جو جی چاہے کرو اور جہاں چاہے رہو، خواہ سسرال میں یا کسی اور جگہ۔ البتہ ہم [illegible] اس وقت تک نہیں دکھانا چاہتے جب تک جماعت سے استعفا نہ دے دو۔ تم نے برابر اس مرات میں (یعنی تحریک [illegible]) [illegible] کا کام خراب کر دیا۔ مگر ہوا یہ [illegible] کرنا بیکار ہے کیا یہ واضح رہے کہ [illegible]

والد محترم کے اس خط [illegible] راقم الحروف نے لکھ دیا۔

[illegible]

بڑا افسوس ہوا۔ [illegible] کہ آپ بیمار ہیں [illegible]

ہو اور میں یقیناً [illegible] ایک عذر تھا جس کی بنا پر [illegible]

والدین کے احسانات [illegible] ان کی [illegible] جو [illegible]

سے آراستہ کیا۔ اسی تعلیم سے مجھے یہ یقین حاصل ہوا [illegible] دنیا میں [illegible] کرتا خدا کے [illegible]

اور دین کے لیے کوشش کرنا ہر [illegible] ان کا فرض ہے۔ [illegible] اور مجھے [illegible]

مقصد کے لیے صحیح طریقہ اور اصلی اور بہترین ذریعہ [illegible] جماعت اسلامی [illegible]

اگر مجھے دین کو دنیا میں غالب کرنے کے لیے کوشش کرنی ہے [illegible] نہیں سمجھتا کہ دین کے

غلبہ کی کوشش اگر مسلمان کی زندگی کا مقصد نہیں تو پھر اور کیا مقصد ہے؟

والدین کا حکم ماننا ضروری، ان کی اطاعت فرض، لیکن کہاں تک؟ جب تک خدا اور رسول کے حکم کے خلاف [illegible]

اگر دین کو غالب کرنا ضروری ہے تو وہ کیا یونہی آرام سے بیٹھے ہوئے [illegible] کوشش [illegible]

یہ کوئی بہت سہل کام ہے؟ [illegible] کے لیے اپنی قوت اور اپنا وقت بھی صرف نہیں کرنا چاہیے [illegible]

کیا یہ کام تنہا ایک آدمی کے کرنے کا ہے؟ بہرحال دین کے لیے جس جماعت میں [illegible] یہ کام کیا جائے گا اس میں وقت بھی

صرف ہوگا، مال بھی خرچ کرنا پڑے گا، تکلیف بھی ہوگی، کچھ دنیاوی کاموں کا حرج بھی ہوگا، اور کسی [illegible] قوت [illegible]

[illegible] بھی ہوگا اور آپ مجھے منع فرماتے ہیں [illegible] آپ ہی بتائیے کہ اس کام کی [illegible]

میری انتہائی بدنصیبی ہے۔ لیکن یہ خیال فرمائیے کہ آپ کس چیز سے مجھے منع فرما رہے ہیں۔ ذرا غور تو کیجیے کہیں یہ حکم خدا کے خلاف تو نہیں؟

قل ان کان آباءکم وابناءکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال اقترفتموها وتجارة تخشون کسادها ومسٰکن ترضونها احب الیکم من الله ورسوله وجهاد فی سبیله فتربصوا حتی یاتی الله بامره والله لا یهدی القوم الفاسقین (سورہ توبہ) ترجمہ: اے نبی فرما دیجیے کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارے خاندان، تمہارے وہ اموال جو تم نے محنت سے کمائے ہیں اور تمہاری وہ سوداگری جس کے ماند پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو اور تمہاری مرغوب آرام گاہیں تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں سرفروشانہ کوشش کرنے کے مقابلہ میں محبوب تر ہیں تو انتظار کرو اس گھڑی کا کہ اللہ کا فیصلہ صادر ہو جائے۔ اور یاد رکھو کہ اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں بخشتا۔

میں سخت حیرت اور انتہائی افسوس کے ساتھ دیکھ رہا ہوں کہ دین کے غلبہ کے لیے جو کوشش میں کر رہا ہوں اس پر آپ ناراض ہیں۔ آخر آپ ہی فرمائیے کہ اس صورت میں میرا فرض کیا ہے؟ مندرجہ بالا آیت کو ملحوظ رکھ کر سوچیے۔

والد صاحب کو تو یہ جواب دیا ہے مگر آپ کے عتاب سے خائف ہوں۔ دیکھیے آپ کیا اجازت عنایت فرماتے ہیں؟

یہ جواب اس لیے سطر بند کر رکھا گیا تھا کہ والد صاحب وقت کی اطاعت، خوف مال اور خوف قوت تسلط کی بنا پر جماعت میں کام کرنے سے منع کرتے ہیں نیز یہ کہ ان کے اشارے پر ...... سے ایک بہت مدلل قسم کا طویل و عریض خط آیا تھا جس کا ماحصل یہ تھا کہ حق و اسلام جماعت اسلامی میں منحصر نہیں، تنہا کام کیجیے یا کسی اور جماعت میں رہ کر۔

والد محترم کی طرف سے مجھے ابھی تک مذکورہ بالا مراسلہ کا جواب نہیں ملا ہے۔ اندریں حالات مناسب ہدایات سے مستفید فرمائیے۔

جواب: آپ نے والدین کے عتاب پر جو جواب دیا ہے وہ بہت معقول ہے۔ مسلمان کی زندگی ایک نہایت متوازن زندگی ہونی چاہیے جس میں تمام حقوق اور فرائض کا مناسب لحاظ ہونا چاہیے اور کسی حق یا فرض کی اضاعت نہ ہونی چاہیے، اور ایک حق کو دوسرے حق پر اس حد تک قربان کیا جانا چاہیے جس حد تک ایسا کرنا ناگزیر ہو۔ والدین کا حق خدا کے حق کے بعد سب سے بڑا ہے لیکن بہرحال خدا کے حقوق کے بعد ہی ہے، اس پر مقدم کسی طرح نہیں ہے۔ پس جہاں خدا کا حق ادا کرنے کے لیے والدین کے حق میں کوئی کمی کرنا بالکل ناگزیر ہو وہاں موقع و محل کو ٹھیک ٹھیک ملحوظ رکھتے ہوئے صرف اس حد تک کمی کی جائے اور ساتھ ساتھ ان کے عتاب اور خفگی کو نہایت تحمل اور تواضع کے ساتھ برداشت کیا جائے۔ ان کی سختی کے مقابلہ میں اف تک نہ کیجیے۔ مگر جس چیز کو آپ اپنی رائے میں حق کے مطابق درست سمجھتے ہیں اس سے والدین کو خوش کرنے کے لیے بال برابر بھی نہ ہٹیے۔ اولاد پر والدین کی خدمت و اطاعت بلاشبہ واجب فرض ہے لیکن ان کی خاطر ضمیر کی قربانی فرض نہیں ہے، خصوصاً اس ضمیر کی جو دین کی روشنی سے منور ہو چکا ہو۔

اس معاملہ میں آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کرنی چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی متعدد صحابہ کرام کو یہ مشکل پیش آئی ہے۔ اس وقت حضور کی رہنمائی میں صحابہ کرام نے اپنے ان والدین کے ساتھ جو راہ حق میں کسی نہ کسی طرح مزاحم ہو رہے تھے، جو طرز عمل اختیار کیا، اس کو ملحوظ رکھیے۔

سوال: ہمارے ہاں کے ایک نوجوان رکن جماعت ...... میں اپنے بڑے بھائی کی زیر سرپرستی تجارت کر رہے ہیں لیکن دین میں احکام شریعت کی پابندی اور وقت پر نماز پڑھنے کے لیے چلے جانے کی بنا پر ان کے بڑے بھائی سخت برہم ہیں اور ان پر سختی کر رہے ہیں۔ اب تک ان کے کئی خطوط میرے نام آ چکے ہیں جن میں انھوں نے لکھا ہے کہ تیری (یعنی راقم الحروف کی) وجہ سے میرا بھائی خراب ہو گیا ہے، اس پر دیوانگی طاری ہے۔ کاروبار سے اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی، رات دن تیرا وظیفہ پڑھتا ہے۔ تو شیطان ہے، انسان کی شکل میں ابلیس ہے، ماں باپ اور اولاد میں اور بھائیوں میں جدائی ڈالتا ہے۔ میرے بھائی سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھ، اس کے نام نہ خط لکھ، نہ اسے کسی اجتماع میں شرکت کی دعوت دے، بلکہ اس کو جماعت سے خارج کر دے ورنہ ——— !

اس سلسلے میں مناسب ہدایات سے ہماری رہنمائی کیجیے۔

جواب:۔ جہاں خاندان کے لوگ جاہلیت میں مبتلا ہوں اور راہ راست پر چلنے میں اپنے بھائی بندوں کی مزاحمت کرتے ہوں وہاں [illegible] جدائی ڈالنا ہی ہمارا کام ہے۔ ایسے اعزہ و اقربا اور دوستوں سے اہل ایمان کو ملانا نہیں، بلکہ توڑنا اور کاٹنا ہی ہمارے پیش نظر ہے۔ لہٰذا جو الزام ہمارے رفیق کے بھائی نے آپ پر لگایا ہے اس کی تردید کی ضرورت نہیں بلکہ صاف صاف اعتراف کی ضرورت ہے اور بہت نرمی کے ساتھ ان کو اس بات سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے کہ اگر وہ ہم جیسا عمل اور رفاقت میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو [illegible] اور ساتھی بننے کی کوشش کریں ورنہ ہم اور ہمارا رفیق، اپنے طرز عمل پر قائم رہیں گے اور آپ کو اختیار ہے کہ جو سلوک آپ کا نفس چاہے ہمارے ساتھ [illegible]۔ البتہ یہ خیال رکھیے کہ آپ کی طرف سے کوئی بات ضد یا اشتعال دلانے والی نہ ہو۔ بلکہ صبر و تحمل کے ساتھ اس شخص کے نفس کی اصلاح کرنے کی کوشش کیجیے جس کو جاہلیت کے غلبے نے [illegible] کہ وہ اس آیت کا مصداق بن گیا: ارایت الذی ینھیٰ عبداً اذا صلّیٰ۔

درحقیقت یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے گروہ میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن کو نماز کی پابندی تک گوارا نہیں۔ خود پابندی کرنا تو درکنار دوسرا اگر کرنا چاہے تو اس پر بھی کڑھتے ہیں۔ اپنے مسلمانوں کی حالت پر اگر کبھی ہم تنقید کرتے ہیں تو ہمیں خارجیت کا طعنہ دیا جاتا ہے۔

سوال:۔ میں بغرض تعلیم اسی سال ...... چلا گیا تھا۔ داڑھی رکھ کر گھر واپس آیا تو دوست و احباب نے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ حتی کہ خود والد کرم بھی بہ شدت مجبور کر رہے ہیں کہ "داڑھی صاف کرا دو کیونکہ اس کی وجہ سے تم بڑے بوڑھے معلوم ہوتے ہو۔ اگر ہمارا کہا نہ مانو گے تو ہم تم سے کوئی تعلق نہ رکھیں گے"۔ گھر سے نکلنے پر دوست بہت تنگ کرتے ہیں اس لیے مجبوراً خانہ نشینی اختیار کر لی ہے۔ لیکن ستم تو یہ ہے کہ اب چند اصحاب کی طرف سے یہ پیغام ملا ہے کہ "اگر آٹھ یوم تک ہمارا مطالبہ پورا نہ کیا گیا یعنی داڑھی نہ منڈوائی گئی تو تمام برادری سے متفقہ بائیکاٹ کرایا جائے گا۔ نیز عمر میں یہ شوق رکھ لینا مگر اب اگر رکھو گے تو زبردستی سے کام لیا جائے گا"۔ میں داڑھی کو پابندی احکام شریعت میں بہت مدد پاتا ہوں۔ مثلاً مجھے سینما بینی کا شوق تھا مگر اب داڑھی رکھنے کے بعد سینما ہال میں جانے سے شرم معلوم ہوتی ہے لیکن جب مخالفین کے دلائل سنتا ہوں تو کبھی کبھی یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہی لوگ ٹھیک کہتے ہیں مگر پھر یہ جذبہ کام کرنے لگ جاتا ہے کہ چاہے پوری دنیا میری مخالفت پر اتر آئے، میرے رویہ میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔ آپ میری رہنمائی کیجیے تاکہ مجھے اطمینان نصیب ہو۔

جواب:۔ جب آپ نے سنت رسول سمجھ کر یہ کام کیا ہے تو پھر کسی کے اعتراض و مخالفت کی پروا نہ کیجیے اور صاف کہہ دیجیے کہ یہ داڑھی رہنے کے لیے آئی ہے، جانے کے لیے نہیں آئی۔ اس کے ہوتے ہوئے اگر آپ میرے ساتھ تعلقات رکھ سکتے ہیں تو رکھیے اور اگر آپ کے لیے سنت رسولؐ اس قدر ناقابل برداشت ہے کہ اس کی وجہ سے میرے ساتھ تعلق رکھنا ناگوار ہے تو بخوشی قطع تعلق کر لیجیے، میرے لیے خدا اور رسول کافی ہیں۔

اختلافی مسائل پر امت سازی کا فتنہ

سوال :۔ مجھے مذہبی تنازعات اور تفرقہ سے فطری بُعد ہے اور وہ تمام جزئی مسائل جن میں اختلاف کرنے کی گنجائش خود شریعت میں موجود ہے ان میں انسان کو عامل کو جائز سمجھتا ہوں۔ اسی طرح اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی معاملہ میں دو یا تین طریقہ ہائے عمل ثابت ہوں تو ان سب کو معیار درستی کی حد کے اندر شمار کرتا ہوں۔ مثلاً نماز میں رفع یدین کرنا اور نہ کرنا میرے نزدیک دونوں برابر ہیں۔ چنانچہ میں ان دونوں صورتوں پر عمل کرتا ہوں۔ کبھی اس پر اور کبھی اس پر۔ مجھے اپنے اس مسلک پر پورا اطمینان ہے۔ میں نے اسے سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ لیکن والد صاحب جو رکن جماعت بھی ہیں محض نماز میں رفع یدین کا التزام چھوڑ دینے کی وجہ سے مجھ پر ناراض ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر تم نے رفع یدین ترک کیا تو پھر ہمارے تمہارے درمیان سلام کلام تک برقرار نہیں رہ سکتا۔ میں نے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئی۔ اب یہ قضیہ میرے اور والد کریم کے حلقۂ تعارف میں بحث کا موضوع بن گیا ہے اور دونوں کی تائید اور تردید میں لوگ زور استدلال صرف کر رہے ہیں۔ مجھ پر جو بے سروپا اعتراضات ہو رہے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ تو حنفی ہو گیا ہے، تیرا دو طریقوں پر عمل کرنا دو عملی اور نفاق ہے، تو جماعت کی اکثریت سے مرعوب ہو گیا ہے، تمہارا اصل مقصود طلب زر اور حصول عزت ہے۔ تمہیں احناف نے یہ پٹی پڑھائی ہے، تو مودودی صاحب کا مقلد ہے، وغیرہ۔ ان اعتراضات میں سب سے عجیب ترین تو یہ تھا کہ ہمیں پہلے ہی مودودی صاحب سے یہ اندیشہ تھا کہ وہ جماعت اسلامی کے نام پر اہل حدیث کو حنفی بنا کر رہیں گے، چنانچہ یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا، یعنی پہلے پہل تو اس جماعت میں آنے والے سے کہا جاتا ہے کہ تمہارا فقہی مسلک جماعت میں آنے کے بعد بھی برقرار رہے گا، مگر جماعت میں آنے کے بعد ایسے طریقوں سے کام لیا جاتا ہے کہ کسی شخص کو خود بھی احساس بھی نہیں ہوتا اور اس کا مسلک سراسر بدل جاتا ہے۔ میں حسب موقع ان سب اعتراضات کے جواب دیتا رہا ہوں، لیکن پھر بھی اپنے اطمینان کے لیے حسب ذیل امور کی وضاحت چاہتا ہوں :۔

۱۔ والدین کے حقوق کا دائرہ کتنا وسیع ہے؟ کیا وہ اولاد سے مسائل کی تحقیق کا اور اپنی تحقیق کے مطابق عمل کرنے کا حق بھی سلب کر سکتے ہیں؟ کیا والدین کی مرضی کے خلاف مسلک اہل حدیث کی خلاف ورزی (یعنی ترک رفع یدین) کرنے پر "سخط الرب فی سخط الوالدین" کی وعید کا مستوجب ہو جاؤں گا؟

۲۔ از روئے شریعت نماز میں رفع یدین کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ کیا حیثیت رکھتا ہے؟ کیا ترک رفع سے آدمی دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے؟

۳۔ کیا ایک رکن جماعت دوسرے رکن سے اس بنا پر مقاطعہ کر سکتا ہے کہ اس نے مزعومہ مسلک اہل حدیث کی خلاف ورزی کی ہے؟

جواب :۔ جس نزاع کا آپ نے ذکر کیا ہے، اس کا حال پڑھ کر مجھے بہت رنج ہوا۔ مجھ کو اس بات کی ہرگز توقع نہ تھی کہ ہماری جماعت میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہوں گے جو فقہی مسائل میں تعصب و تشدد کی اس حد کو پہنچے ہوئے ہوں گے۔ اگر آپ جیسا معتبر علیہ آدمی ان حالات کا راوی نہ ہوتا اور ایک دوسری اطلاع سے آپ کی تائید نہ ہو گئی ہوتی تو شاید

میں اس بات کو باور کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا کہ واقعی ہماری جماعت میں ایسی صورت حال پیدا ہوئی ہوگی۔ بہرحال اب کہ اس نزاع نے سر اٹھا ہی لیا ہے میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ کی اصولی اور فقہی اور جماعتی حیثیت کو صاف صاف واضح کردوں۔

۱۔ اصولی حیثیت سے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ شرعی مسائل میں کسی شخص یا گروہ علماء کی خاص طریق تحقیق و استنباط یا کسی فقہی مذہب (مثلاً حنفی) کی پیروی کرنا اور چیز ہے، اور اس طریقے یا اس خاص فقہی مذہب کے لیے متعصب ہونا اور اس کی بنا پر تفریق پیدا کرنا اور اس سے مختلف مذہب رکھنے والوں یا اس سے مختلف روایات قبول کرنے والوں یا اس کی پابندی ترک کرنے والوں کو امت سے خارج قرار دینا گویا ان سے دین میں کوئی نقص آگیا ہے، بالکل ایک دوسری چیز ہے۔ پہلی چیز کے لیے تو شریعت میں پوری پوری گنجائش ہے۔ لیکن دوسری چیز کی ہمیں صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ دوسری چیز وہ تفرق ہے جس کی قرآن میں مذمت کی گئی ہے اور اس طرز فکر کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ فقہی مسائل ہی کو اصل دین سمجھ بیٹھتے ہیں، پھر ان مسائل میں فروعی اختلافات پر ان کے درمیان الگ الگ امتیں بنتی ہیں، پھر ان فروعی بحثوں میں وہ اس قدر الجھتے اور ایک دوسرے سے بیگانہ ہوجاتے ہیں کہ ان کے سامنے سلف کی زندگی کے اصل مقصد (یعنی اعلاء کلمۃ اللہ اور اقامت دین) کی خاطر مل کر جدوجہد کرنا غیر ممکن ہوجاتا ہے۔ مسلک فقہی کے اعتبار سے کسی کا طریق اہل حدیث یا طریق حنفی یا طریق شافعی وغیرہ پر چلنا بجائے خود کسی قباحت کا موجب نہیں، لیکن اگر یہ چیز آگے بڑھ کر یہ صورت اختیار کرلے کہ مسلمان فی الحقیقت ایک امت نہ رہیں بلکہ اہل حدیث، احناف، شوافع وغیرہ ناموں کے ساتھ الگ الگ مستقل امتیں بن جائیں اور شرعی اعمال کی جو خاص صورتیں ان مختلف گروہوں نے اختیار کی ہیں وہ ہر ایک گروہ کے مخصوص نشانات قرار پاجائیں جن کی بنا پر ان گروہوں میں معاشرت اور امتیاز واقع ہو، تو یہ یقیناً دین کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے اور میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ دین اسلام میں اس تقسیم و تعصب کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ رفع یدین کرنا یا نہ کرنا، آمین زور سے کہنا یا آہستہ کہنا، اور ایسے ہی دوسرے امور صرف اس وقت تک شرعی اعمال ہیں جب تک کوئی شخص ان کے ترک یا فعل کو اس بنا پر اختیار کرے کہ اس کی تحقیق میں سنت سے یہی ثابت ہے، یا یہ کہ ایسا کرنا دلائل شرعیہ کی بنا پر راجح اور اولیٰ ہے۔ مگر جب یہی اعمال کسی مخصوص فرقے کے نشانات بن جائیں اور ان کا ترک یا فعل وہ علامت قرار پائے جس کی بنا پر یہ فیصلہ کیا جانے لگے کہ آپ کس فرقے میں داخل اور کس سے خارج ہیں اور انہی علامتوں کے لحاظ سے یہ طے ہونے لگے کہ کون اپنا ہے اور کون غیر، تو اس صورت میں رفع یدین کرنا یا نہ کرنا، آمین زور سے کہنا یا آہستہ کہنا یا ایسے ہی دوسرے امور کا ترک اور فعل دونوں یکساں بدعت ہیں، اور میں ان کو اسی قسم کی بدعت سمجھتا ہوں۔ اس لیے کہ سنت رسول اللہ میں بجائے خود ان اعمال کا ثبوت ملتا ہے، لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ ان اعمال کو مسلمانوں کے اندر گروہ بندیوں اور فرقہ سازیوں کے لیے علامات اور شعائر بنایا جائے۔ ایسا کرنا اہل حدیث کا نام لے کر صاحب حدیث علیہ السلام کے منشا کے بالکل برعکس کام کرنا ہے اور اس اصل کام کو غارت کرنا ہے جس کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے تھے۔

۲۔ اب اس سلسلہ کی فقہی حیثیت کو لیجیے۔ رفع یدین کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ مختلف طرزِ عمل منقول ہیں:

ا۔ ابن عمرؓ کی روایت جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ تین مواقع پر رفع یدین کرتے تھے۔ افتتاحِ صلوٰۃ کے وقت، رکوع میں جاتے ہوئے، اور رکوع سے اٹھ کر۔

ب۔ مالک بن حویرث کی روایت جس میں دو موقعوں پر رفع یدین کا ذکر ملتا ہے۔ افتتاحِ صلوٰۃ کے وقت اور رکوع سے اٹھ کر۔

ج۔ وائل بن حجرؓ کی روایت جس میں چار مواقع پر اس کا ہونا مذکور ہے۔ افتتاحِ صلوٰۃ کے وقت۔ رکوع میں جاتے ہوئے۔ رکوع سے اٹھتے ہوئے۔ سجدہ کے موقع پر۔

د۔ ابو حُمید ساعدی کی روایت، اس میں بھی چار مواقع پر رفع یدین کا ذکر ہے، مگر چوتھا موقع سجدہ کی بجائے تیسری رکعت میں قعدہ سے اٹھتے پر بیان کیا گیا ہے۔

س۔ عبداللہ ابن مسعود اور براء ابن عازب کی روایت جس میں صرف ایک مرتبہ رفع یدین کرنے کا ذکر ہے، یعنی افتتاحِ صلوٰۃ کے موقع پر۔

ان مختلف روایات میں سے (ا) کو امام شافعی، احمد، اور ابو ثور نے، نیز اہل الحدیث اور اہل الظاہر کی اکثریت نے اختیار کیا اور ایک روایت امام مالک سے بھی یہی ہے کہ وہ اس کو ترجیح دیتے تھے۔ (د) کو اہل الحدیث کے ایک گروہ نے مرجح ٹھہرایا۔ اور (س) کو ابراہیم نخعی، شعبی، سفیان ثوری، ابو حنیفہ اور تمام فقہائے کوفہ نے ترجیح دی۔ لیکن یہ واضح رہے کہ سوال صرف ترجیح کا ہے نہ کہ رد و قبول کا۔ ائمہ سلف میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ جن مختلف طریقوں کا ذکر مذکورہ بالا احادیث میں آیا ہے ان میں سے کسی پر حضورؐ نے عمل نہیں کیا تھا، بلکہ کہتے صرف یہ ہیں کہ جس خاص طریقہ کو ہم نے مرجح قرار دیا ہے، حضورؐ کا عام معمول تھا اور دوسرے طریقوں پر آپ کبھی کبھی عمل کر لیتے تھے۔ پس جب معاملہ کی حقیقت یہ ہے تو ان طریقوں میں سے جس پر بھی کوئی عمل کر رہا ہے، حدیث ہی کی پیروی کر رہا ہے اور اس پر نکیر کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ اتباعِ پیغمبر پر نکیر کی جاتی ہے جس کی جرأت مقلدین کو بھی زیبا نہیں کجا کہ اہل حدیث اس کا ارتکاب کریں۔ پھر اگر کوئی شخص ان طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ پر جامد ہونے کے بجائے وقتاً فوقتاً ان سب طریقوں پر عمل کرتا رہے جو حدیث میں مذکور ہیں تو یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ صحیح و مکمل پیروی ہوگی، اور لفظ عمل بالحدیث کا اطلاق اس طرزِ عمل پر زیادہ صحیح معنی میں ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ابتدا ہی میں ایک طریقہ کو ترجیح دینے اور باقی سب طریقوں کو ترک کر دینے کے بجائے ان سب طریقوں کو نماز میں اختیار کرنے کی گنجائش رکھی جاتی تو شاید بعد کے ادوار میں وہ جمود و تعصب پیدا ہی نہ ہوتا جس کی بدولت نوبت یہ آگئی ہے کہ لوگ نماز کی جس صورت کے عادی ہیں اس سے ذرا سی مختلف صورت بھی جہاں انھوں نے دیکھی اور بس وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس شخص کا دین بدل گیا ہے۔ اور یہ ہماری امت سے نکل کر دوسری امت میں جا ملا ہے۔

یہ رائے جو میں عرض کر رہا ہوں یہ صرف میری انفرادی رائے ہی نہیں ہے بلکہ پہلے بھی متعدد اہلِ تحقیق اسی خیال کا اظہار کر چکے ہیں۔ اس وقت میرے پاس سفر[۱] میں کتابیں موجود نہیں ہیں۔ . . . . اس بیے میں زیادہ وسیع

۱؎ اس خط کا جواب دہلی میں لکھا گیا تھا۔

پیمانہ پر شواہد پیش نہیں کر سکتا، لیکن حجۃ اللہ البالغہ خوش قسمتی سے مل گئی ہے اس سے چند حوالے یہاں نقل کرتا ہوں۔ شاہ صاحب پہلے تو یہ اصولی بات ارشاد فرماتے ہیں کہ:-

الاصل ان یعمل بکل حدیث الا ان یمتنع العمل بالجمیع للتناقض (باب القضاء فی الاحادیث المختلفة)

اصولی بات یہ ہے کہ آدمی ہر حدیث پر عمل کرے، الا یہ کہ کسی مسئلہ میں سب حدیثوں پر عمل کرنا تناقض کی وجہ سے غیر ممکن ہو۔

پھر آگے چل کر فصل فی مسائل امور مشکلة من التقلید واختلاف المذاهب میں فرماتے ہیں:-

ان اکثر صور الاختلاف بین الفقهاء لا سیما فی المسائل التی ظهر فیها اقوال الصحابة فی الجانبین کتکبیرات التشریق وتکبیرات العیدین ونکاح المحرم وتشهد ابن عباس وابن مسعود والاخفاء بالبسملة وبآمین والاشفاع والایتار فی الاقامة ونحو ذلك انما هو فی ترجیح احد القولین وکان السلف لا یختلفون فی اصل المشروعیة وانما کان خلافهم فی اولی الامرین ونظیره اختلاف القراء فی وجوه القراءة وقد عللوا کثیرا من هذا الباب بان الصحابة مختلفون وانهم جمیعا علی الهدی۔

واقعہ یہ ہے کہ فقہاء کے درمیان اختلاف کی اکثر صورتیں، بالخصوص ان مسائل میں جن میں صحابہ کے اقوال دونوں طرف پائے جاتے ہیں، مثلاً تکبیرات تشریق، تکبیرات عیدین، نکاح محرم، تشہد ابن عباس و ابن مسعود، بسم اللہ اور آمین کا اخفاء، تکبیرات اقامت میں کلمات کو ایک ایک مرتبہ یا دو دو مرتبہ پڑھنا وغیرہ، ان میں اختلاف دراصل اس امر میں ہے کہ دو اقوال میں سے کس کو کس پر ترجیح ہے ورنہ ان مختلف طریقوں کے بجائے خود مشروع ہونے میں سلف کے درمیان کوئی اختلاف نہ تھا۔ ان کا اختلاف تو صرف اس اعتبار سے تھا کہ دو مختلف امور میں سے اولیٰ کونسا ہے، اور یہ اختلاف ایسا ہی ہے جیسے قرأت کی مختلف صورتوں میں قاریوں کے درمیان اختلاف ہے۔ اس معاملہ میں بیشتر امور کے اختلاف کی وجہ سلف نے یہ بیان کی ہے کہ صحابہ کرام خود ان میں مختلف تھے اور ظاہر ہے کہ صحابہ سب کے سب ہدایت پر تھے۔

پھر باب اذکار الصلوٰة وهیئاتها المندوب الیها میں فرماتے ہیں:-

وهو (ای رفع الیدین) من الهیئات فعله النبی صلی اللہ علیہ وسلم مرة وترکه مرة والکل سنة واخذ بکل واحد جماعة من الصحابة والتابعین ومن بعدهم وهذا احد المواضع التی اختلف فیها الفریقان اهل المدینة والکوفة ولکل واحد اصل اصیل والحق عندی فی مثل ذلك ان الکل سنة

اور وہ (یعنی رفع یدین) نماز کی ان ہیئتوں میں سے ہے جن کو نبی صلعم نے کبھی کیا ہے اور کبھی نہیں کیا۔ اور یہ دونوں طریقے سنت ہیں۔ صحابہ اور تابعین اور ان کے بعد کے لوگوں میں سے ایک ایک جماعت نے ان میں سے ایک ایک طریقے کو اختیار کیا ہے، اور یہ من جملہ ان معاملات کے ہے جن میں اہل مدینہ اور اہل کوفہ کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے، لیکن ہر ایک کے لیے ایک ثابت شدہ اصل شریعت میں موجود ہے اور ایسے مسائل میں میرے نزدیک حق یہ ہے کہ سب مختلف طریقے یکساں سنت ہیں۔

شاہ صاحب کی ان تصریحات کے بعد اس امر کی ضرورت نہیں رہتی کہ میں آمین کے مسئلہ کے متعلق الگ بحث کروں۔ تاہم اس معاملہ میں صاحب الجوہر النقی کا یہ قول نقل کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ:-

والصواب ان الحدیثین بالجهر بها والمخافتة صحیحان ویعمل بکل من فعلیه جماعة من العلماء

اور صحیح یہ ہے کہ آمین زور سے کہنے اور آہستہ کہنے، دونوں کی روایتیں صحیح ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر علماء کی ایک ایک جماعت نے عمل کیا ہے۔

۳۔ ہماری جماعت کا ان اختلافی معاملات میں جو مسلک ہے اس کی توضیح اس سے پہلے بارہا کی جا چکی ہے، اور میں ایک مرتبہ پھر اسے صاف صاف الفاظ میں بیان کیے دیتا ہوں۔ اس جماعت میں اہل حدیث، احناف، شوافع اور سب ہی دوسرے فقہی طریقوں پر چلنے والے مسلمانوں کے لیے اپنے اپنے فقہی مسلک پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہے، بشرطیکہ وہ ان مسلکوں میں سے کسی کے لیے متعصب نہ ہوں اور ان اختلافات کو مغایرت اور حلقہ بندی کا ذریعہ نہ بنائیں۔ جماعت کے اندر جو لوگ بھی شامل ہوں انھیں اسلامی عصبیت کے سوا اور ساری عصبیتیں اپنے اندر سے نکالنی ہوں گی خواہ وہ عصبیتیں ملکی ہوں، طبقاتی ہوں یا گروہی۔ ان کو محبت اور دوستی کے رشتے میں جوڑنے والی چیز اسلام کے سوا اور کوئی نہ ہو، اور ان کے اندر غصہ و نفرت کو ابھارنے والی بھی اسلام سے دوری کے سوا کوئی دوسری چیز نہ ہو۔ کسی رکن جماعت کے لیے کسی دوسرے شخص کا اہل حدیث یا حنفی یا شافعی مسلک پر ہونا یا اختیار کر لینا نہ تو سبب محبت ہی ہو اور نہ سبب نفرت۔ اس لازمی و ضروری شرط کے ساتھ اہل حدیث اہل حدیث رہتے ہوئے اور حنفی حنفی رہتے ہوئے اور شافعی شافعی رہتے ہوئے جماعت اسلامی کا رکن ہو سکتا ہے۔ لیکن جو شخص کسی مخصوص فقہی مذہب کے لیے متعصب ہو، اور اپنے مذہب کے پیروؤں سے محبت اور دوسرے طریقے والوں سے نفرت رکھتا ہو، اور حنفی، شافعی یا اہل حدیث ہو جانے کو جرم سمجھتا ہو اس کے لیے ہماری اس جماعت میں کوئی جگہ نہیں۔

۴۔ میرے متعلق اس نزاع کے سلسلہ میں جو کچھ کہا گیا ہے اس پر میں صبر کرتا ہوں اور ان لوگوں کا معاملہ خدا پر چھوڑتا ہوں جنھوں نے بغیر علم و تحقیق کے یہ بدگمانی لوگوں میں پھیلائی کہ میں اہل حدیث کو حنفی بنانے کی سازش کر رہا ہوں۔ کاش وہ لوگ جو فقہی جزئیات میں کتاب و سنت کی پیروی پر بڑا زور دیا کرتے ہیں، اخلاقی معاملات میں بھی کتاب و سنت کی کچھ پیروی کر لیا کریں۔

۵۔ آپ کے والد ماجد نے اس قضیہ میں جو رویہ اختیار کیا ہے اس کی دو حیثیتیں ہیں، ایک رکن جماعت ہونے کی حیثیت سے اور ایک آپ کے والد ہونے کی حیثیت سے۔ جہاں تک پہلی حیثیت کا تعلق ہے اس پر میں نمبر ۳ میں روشنی ڈال چکا ہوں لہٰذا وہ براہ کرم اپنے متعلق فیصلہ کر لیں کہ آیا وہ اپنے رویہ کو بدلنا پسند فرماتے ہیں یا جماعت سے علیحدگی۔ رہی دوسری حیثیت تو اس کے متعلق میں مختصر طور پر صرف یہ کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ جہاں تک اصول دین کا تعلق ہے، والدین کو نہ صرف یہ حق بلکہ یہ ان کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اعتقادی ضلالت یا اخلاقی فساد سے روکنے کی کوشش کریں لیکن جہاں تک فقہی معاملات کا تعلق ہے، والدین کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اولاد کو اپنے مسلک خاص کی پیروی پر مجبور کریں۔ خصوصاً جبکہ اولاد صاحب علم ہو اور تحقیق کی بنا پر والدین سے مختلف کسی دوسرے مسلک فقہی کو اختیار کرنا چاہے تو والدین کے لیے یہ مطالبہ کرنا کسی طرح درست نہیں ہے کہ وہ اپنی تحقیق کے خلاف عمل کرے۔ اس معاملہ میں سلف کا صحیح تابع یہ ہے کہ والدین اور اولاد دونوں کو تحقیق کی آزادی اور اپنی تحقیق پر عمل کرنے کا حق ہونا چاہیے۔ اس حق کو سلب کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر ایک شخص اہل حدیث یا حنفی یا شافعی ہو تو وہ اپنی آئندہ نسل کو بھی اہل حدیث، حنفی، یا شافعی بنانے پر اصرار کرے گا اور دو چار پشتیں گزر جانے کے بعد

یہ طریقے محض فقہی مسالک نہ رہیں گے، بلکہ نسلی امتیں بن جائیں گی جن میں تعصب ہوگا، جمود ہوگا اور آبائی مسلک سے ہٹنا ارتداد کا ہم معنی قرار پائے گا۔ آپ خود ہی اپنے والد ماجد سے دریافت فرمالیں کہ آیا وہ اپنی آئندہ نسل کو اس فتنہ میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں؟

سفر میں قصر صلوٰۃ

سوال: (۱) قصر صلوٰۃ اگر [illegible]

(۲) [illegible]

(۳) کیا [illegible] علاقہ میں [illegible] حاصل ہوگی؟

جواب: (۱) [illegible] معاملہ میں [illegible] قصر [illegible] اختلاف [illegible] کوئی [illegible] نہیں [illegible] صحیح [illegible] ایک نقطہ خاص [illegible] سفر مفہوم کو عام پر چھوڑ دیا ہے، اور یہ بات ہر شخص خود باآسانی جان سکتا ہے کہ آیا وہ سفر میں ہے یا سفر میں نہیں ہے [illegible] کے لیے [illegible] کسی بھی مسافر [illegible] اس کے [illegible] شریعت [illegible] اسی احساس کے مطابق [illegible] کیا جا سکتا ہے [illegible] سمجھ لینا چاہیے کہ شرعی معاملات میں صرف اس شخص کی [illegible] معتبر ہے جو شریعت کی پابندی [illegible] کرنا چاہتا ہو۔

(۲) اس حصہ کا جواب [illegible] موجود ہے۔ [illegible] فقہا نے مقدار سفر مقرر کرنے کی کوشش کی ہے، [illegible] مسافت تھی۔

(۳) [illegible] علاقہ میں سفر کرنے کی شکل میں بھی قصر ہونا چاہیے جس طرح اس علاقہ سے باہر کے سفروں کے دوران میں۔

ہندوستان میں گائے کی قربانی کا مسئلہ

سوال: مسلمان قوم اگر ہندوستان میں گائے کی قربانی کرنا چھوڑ دے تو اسلام کی نگاہ میں کون سی قباحت نہیں آجاتی خصوصاً جب کہ اس فعل میں نفع کم اور نقصان زیادہ ہے۔ پھر کیوں نہ ایک ہمسایہ قوم کا اتحاد حاصل کرنے کے لیے رعایت سے کام لیا جائے؟ اکبر اعظم، جہانگیر، شاہ جہاں اور موجودہ نظام حیدرآباد نے عملی مثالیں اس سلسلہ میں قائم کی ہیں۔

[illegible] ناموں کا نام لیا ہے۔ افسوس ہے کہ مجھے ان میں سے کسی کی تقلید کا شرف حاصل [illegible] ہندوؤں کو راضی کرنے کے لیے اگر گائے کی قربانی ترک کی تو چاہے [illegible] پایا ہے لیکن ہندوستان کی حد تک اسلام پر واقعی قیامت تو ضرور آجائے [illegible] مسئلہ میں اسلام کے نقطۂ نظر کی غلط ترجمانی ہے۔ آپ کے نزدیک اہمیت صرف [illegible] انقلابات [illegible] اسباب دور ہو جائیں، لیکن اسلام کے نزدیک اصل [illegible] نے والوں کو ترک سے ہر ممکن خطرے سے بچایا جائے۔

[illegible] کو معبودوں میں شامل نہ کیا گیا ہو اور اس کے تقدس کا بھی عقیدہ نہ پایا جاتا [illegible] کو ترک کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن جہاں گائے معبود [illegible] کی قربانی کا حکم ہے، جیسا کہ بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا۔ اگر ایسے ملک میں [illegible] گائے کی قربانی ترک کر دیں اور گائے کا گوشت کھانا چھوڑ دیں تو بہ یقینی خطرہ ہے کہ آگے چل کر اپنی [illegible] اعتقادات سے متاثر ہو جائیں گے اور گائے کے تقدس کا اثر ان کے قلوب میں اسی طرح [illegible] بنی اسرائیل کا حال یہ تھا کہ "اشربوا فی قلوبھم العجل" [illegible] قبول کر لیں۔ لیکن گائے کی تقدیس [illegible] ہندوستان میں گائے کی قربانی کو واجب سمجھتا ہوں اور اس کے [illegible] اسلام [illegible] وقت [illegible] کم از کم ایک مرتبہ گائے [illegible] حدیث [illegible] کرتی ہے جس میں حضور نے فرمایا کہ جس نے نماز پڑھی جیسی ہم پڑھتے [illegible] اور جس نے ہمارا ذبیحہ کھایا [illegible] ہمارا ذبیحہ کھایا" [illegible] میں شامل ہونے کے لیے ان اوہام و عقائد اور [illegible] کا توڑنا بھی ضروری [illegible] کوئی حصہ باقی نہ رہا ہو۔

غیر محرم قریبی اعزہ سے پردہ کی صورت

سوال: کیا شوہر بیوی کو کسی ایسے رشتہ دار یا عزیز کے سامنے بے پردہ آنے کے لیے مجبور کر سکتا ہے جو شرعاً بیوی کے لیے غیر محرم ہو؟ نیز یہ بھی واضح فرمائیے کہ سسرال یا میکے کے ایسے غیر محرم قریبی رشتہ دار جن سے ہندوستانی نظام معاشرت کے [illegible] میں پردہ کرنے کا رواج نہیں، ان سے پردہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ اور اگر کرنا چاہیے تو کن حدود کے ساتھ؟

جواب: شوہر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ خدا کے احکام کی خلاف ورزی پر بیوی کو مجبور کرے اور اگر وہ ایسا کرے تو مسلمان عورت کا فرض ہے کہ ایسے مطالبات پورے کرنے سے انکار کر دے۔

سسرال اور میکے میں عورتوں کا عموماً جن غیر محرم رشتہ داروں [illegible] ہوتا ہے ان سے پردے کی نوعیت وہ نہیں ہے جو بالکل غیر مردوں کے سامنے ہوتی ہے۔ عورتیں ان کے سامنے [illegible] سادہ لباس میں پورے ستر کے ساتھ آ سکتی ہیں، مگر صرف اس حد تک ان کے سامنے رہنا چاہیے جس حد تک معاشرتی ضروریات کے لحاظ سے ناگزیر ہو۔ خلا ملا رہنے، بے تکلفی اور ایک مجلس میں بیٹھ کر [illegible] اس قسم کے رشتہ داروں کے ساتھ جائز نہیں ہے۔

اس معاملہ میں فی الواقع ہماری معاشرت میں بڑی [illegible] ہیں [illegible] لیکن [illegible] میں آج سے جو غیر شرعی حالات پیدا ہو گئے ہیں [illegible] ایک طرف مسلمان غیروں سے اتنے پردے کا اہتمام کرتے ہیں [illegible] دوسری طرف رشتہ داروں کے معاملہ میں انہوں نے تمام [illegible] طرز عمل اختیار کرنا پڑے گا جس سے [illegible]

تزکیۂ نفس کی حقیقت

سوال: - یہاں کی ستوی نفد تصوف [illegible] رہتے ہیں اس وقت دو باتیں دریافت طلب ہیں:

(الف) تزکیۂ نفس کی صحیح تعریف کیا ہے؟ اس بارے میں رسول اللہ کی تعلیم کیا تھی؟ [illegible] حل کیا ہے؟ ایک مسلمان کو اپنی زندگی میں اس قسم کی [illegible] اختیار کرنی چاہیے؟

(ب) کیا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی آج کل کے [illegible] ہوتے رہتے تھے؟

جواب: - سوال کے پہلے جزو کے جواب میں یہ ذہن نشین کر لیجیے کہ [illegible] تزکیہ کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک پاک صاف کرنا، دوسرے بڑھانا اور نشو و نما دینا [illegible] دونوں معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ پس تزکیۂ نفس دو اجزاء سے مرکب ہے۔ ایک یہ کہ نفس انسانی کو [illegible] اجتماعی طور پر ناپسندیدہ صفات اور بری رسوم و عادات سے پاک کیا جائے [illegible] اس کو نشو و نما دیا جائے۔

اگر آپ قرآن مجید کو اس نقطۂ نظر سے دیکھیں اور حدیث میں صرف مشکوٰۃ ہی پر اس خیال سے نظر ڈالیں تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ [illegible] اور اجتماعی زندگی میں وہ کونسی ناپسندیدہ صفات ہیں جن کو [illegible] کرنا چاہتے ہیں اور وہ کونسی پسندیدہ صفات ہیں جن کو وہ افراد اور سوسائٹی میں ترقی دینا چاہتے ہیں۔ نیز قرآن و حدیث کے مطالعہ ہی سے آپ کو ان تدابیر کی بھی پوری تفصیل معلوم [illegible] کے لیے اللہ تعالیٰ نے بتائی ہیں اور ان کے رسول نے استعمال

میں ترجمان القرآن میں اس مسئلہ پر بہت تفصیل سے لکھ رہا ہوں۔ کچھ حصہ لکھ چکا ہوں اور کچھ حصہ آئندہ لکھنے والا ہوں۔ آپ اس سلسلہ کو غور سے مطالعہ کریں تو آپ کو سوال کا پورا جواب مل جائے گا۔ یہاں اشارۃً یہی بتا سکتا ہوں کہ اہل تصوف میں ایک مدت سے تزکیۂ نفس کا جو مفہوم رائج ہو گیا ہے اور اس کے جو طریقے ان میں چل پڑے ہیں وہ قرآن و سنت کی تعلیم سے بہت ہٹے ہوئے ہیں۔

دوسرے جزو کا جواب یہ ہے کہ صحابہ کرام نے تو عالمِ بالا کے معاملہ میں صرف رسول کے اعتماد پر غیب کی ساری حقیقتوں کو مان لیا تھا اس لیے مشاہدے کی نہ ان کو طلب تھی اور نہ اس کے لیے انھوں نے کوئی سعی کی۔ وہ بجائے اس کے کہ پردۂ غیب کے پیچھے جھانکنے کی کوشش کرتے، اپنی ساری قوتیں اس جد و جہد میں صرف کرتے تھے کہ پہلے اپنے آپ کو اور پھر ساری دنیا کو خدائے واحد کا مطیع بنائیں۔

فہرست کتب مکتبہ جماعت اسلامی

تفہیمات	ہے	اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	عہ	سلامتی کا راستہ	۶ر	اسلام اور جاہلیت	۴ر
خطبات قسم اول	۱۲	تجدید و احیائے دین	عہ	اسلام کا نظریہ سیاسی	۶ر	نشانِ راہ	۶ر
مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش	عہ	پردہ غیر مجلد	عہ	اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے	۶ر	جہاد فی سبیل اللہ	۶ر
" " حصہ دوم	عہ	" مجلد	ہے			نیا نظام تعلیم	۴ر
" " حصہ سوم	۱۲	روداد جماعت اسلامی حصہ دوم	۹ر	انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	۶ر	دستور جماعت اسلامی	۲ر
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	عہ	" " حصہ سوم	عہ			ایک نہایت ہی اہم استفتا	۲
حقیقت توحید	ہے	دینیات (انگریزی) مجلد	ہے	اسلام کیا ہے (انگریزی)	ہے	نیشنلزم اینڈ انڈیا (انگریزی)	۹

دیگر اداروں کی کتابیں

جو

مکتبہ جماعت اسلامی، دار الاسلام میں موجود ہیں

عبادات	۲ر	اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	۶ر	اسلام کا سیاسی نظریہ اور فلاحِ عام	۸ر	تفسیر سورہ قیامہ	۸ر
خدا کی اطاعت کس لیے	۲ر	ایمان کی کسوٹی	۲ر	علما اور اسلام	۱۲ر	" سورہ لہب	۶ر
مسلمان کا بنیادی عقیدہ (بڑا چارٹ)	۲ر	کلمہ طیبہ کے معنی	۲ر	مسلمان کی پہچان	۵ر	" سورہ مرسلات	۵ر
" " (چھوٹا)	ار	حقیقت شرک	۸ر	نظام اطاعت کی تین کڑیاں	۴ر	" سورہ والتین	۶ر
خطبہ تقسیم اسناد	۲ر	اسلام اور اشتراکیت	عہ	مولانا سندھی کے افکار پر ایک نظر	۱۲	" سورہ شمس	۶ر
راہ عمل	۶ر	اسلامی نظام	عہ	ذہنی زلزلے	۱۲	" سورہ عبس	۶ر

اقسام القرآن ۸ر

مطبوعات

براہین وحی | مرتبہ محمد اقبال سلیانی صاحب، ۱۰۴ صفحات چھوٹا سائز، قیمت مجلد عا ملنے کا پتہ: مکتبہ امت مسلمہ (ہند) امرتسر

یہ کتاب چند مختلف اہل قلم کے مضامین کا مجموعہ ہے جو نیاز صاحب فتحپوری مدیر "نگار" کے جواب میں لکھے گئے ہیں، نیاز صاحب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول اور ایک کبھی نہ جھوٹ بولنے والا بلند اخلاق انسان سمجھنے کے باوجود قرآن کو کلام الٰہی نہیں تسلیم کرتے اور اس کو رسول اللہ صلعم کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ نیاز صاحب جیسے "روشن خیال" اور "عقلیت پرست" انسان کے منہ سے، جو اپنی فکری تیز گامیوں کے سامنے خدا کی خداوندی سے بھی مرعوب نہیں ہوتا، اتنی مہمل اور غیر معقول بات کا نکلنا انتہائی حیرت کا موجب ہے۔ آپ رسول کو رسول اور بلند اخلاق اور صادق و مصدوق بھی قرار دیتے ہیں اور ساتھ ہی اس امر کا بھی یقین رکھتے ہیں کہ قرآن کلام خداوندی نہیں بلکہ رسول کے اپنے ذہن و دماغ کا نتیجہ ہے، حالانکہ قرآن میں جو چیز سب سے زیادہ واضح ہے وہ یہی ہے کہ رسول جو کچھ بھی قرآن کے نام سے لوگوں تک پہنچاتا ہے وہ اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا پیغام اور اسی کا اتارا ہوا کلام ہے۔ تو گویا آپ نعوذ باللہ زندگی بھر خدا پر افترا کرتے رہے اور ہر روز یہ جھوٹ بول کر لوگوں کو فریب دیتے رہے کہ یہ سب فرمودہ خدا ہے، درانحالیکہ وہ سب اپنے ذہن و دماغ کا نتیجہ ہوتا تھا؛ کیا ایک بلند اخلاق اور سچے انسان کا یہی کیرکٹر ہوتا ہے؟

یہ ہے "عقلیت" اور "روشن خیالی" ہے کہ ایک چیز کی صداقت پر آپ کا دل بھی نہیں ٹھکتا لیکن اس کے باوجود اس سے چمٹے رہنا آپ ضروری سمجھتے ہیں۔ موجودہ مادی تہذیب کی پیدا کی ہوئی ذہنی آثار کی میں اگر کوئی شے قابل ستائش تھی تو صرف یہ کہ انسان اسی بات کو اپنائے جس پر اس کا ضمیر مطمئن ہو اور ان چیزوں کو علانیہ رد کر دے جن پر اس کو اطمینان نہ ہو۔ مگر اس تہذیب کے ہندوستانی پیروؤں کا باطن اس ایک شئے سے بھی محروم ہے۔ اسلام کے مسلمہ اصولوں پر انھیں یقین نہیں مگر اس کے باوجود کچھ سیاسی، معاشرتی اور معاشی اغراض ہیں، جن کی خاطر وہ اپنی پیشانیوں پر اسلام کا لیبل چپکائے رہنے پر مجبور ہیں، اور ان میں اتنی جرأت نہیں کہ اسلام سے اپنے انقطاع کا اعلان کر دیں۔

اس کتاب کے شروع میں خود نیاز صاحب کے اقوال و دلائل بھی درج ہیں، ان کو پڑھ کر کوئی صاحب علم نیاز صاحب کی علمیت پر ماتم کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جو شخص "مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوىٰ" میں "ھوىٰ" کا ترجمہ ہوائی باتیں کرے، "بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا" میں "بِاَنَّ" کے معنی "جیسے" بتائے۔ "فِي لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ" کا ترجمہ "ایک تختی میں محفوظ ہے" کرے، اس کو قرآن حکیم کے اعجازی کلام پر رائے زنی کرنے کا کیا حق ہے؟ منافقین کے جس استدلال بالقرآن سے رسول نے امت کے لیے پناہ مانگی تھی، نیاز صاحب نے اس کی یہ ایک نمایاں اور تازہ مثال پیش کی ہے۔

اگرچہ ان مضامین میں ان کی ہفوات کا مکمل جواب موجود ہے مگر پھر بھی ضرورت ہے کہ اس کتاب کو نقلی اور عقلی وجوہ

اعتبار سے اور زیادہ مدلل کرکے ان حلقوں میں پہنچانے کی سعی کی جائے جو نیاز صاحب کی خاص صیدگاہ ہیں، یعنی کالجوں میں اور نئے تعلیم یافتہ مگر دین کی فہم سے محروم حلقوں میں۔

مولانا سید سلیمان صاحب کا مقالہ اپنے دائرہ بحث کے لحاظ سے باعتبار نقل مفصل اور جامع ہے مگر ہم کو ان کی اس بات سے اتفاق نہیں کہ "إِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ میں "ایحا" " کا لفظ بطور طنز کے آیا ہے۔ نہیں ہے بلکہ لفظ اپنے معنی کے بعض پہلوؤں سے مجرد کرکے خفیہ مشو‍ ... معنی میں بولا گیا ہے۔ ڈاکٹر تاثیر صاحب کا مضمون باوجود مختصر ہونے کے بہت پر مغز اور مفید ہے، مگر انھوں نے آخر میں "نئی روشنی کے علمبرداروں" کو جو مشورہ دیا ہے وہ بنیادی طور پر غلط ہے۔ یورپین مصنفین کے "افکار" اور "مذہبی تعلیمات" دونوں کو یکساں تنقید کا مستحق قرار دینا سخت ناانصافی ہے اور اس کے مشورے دینے کا مطلب یہ ہے کہ دین میں ایسا رخنہ پیدا کرنے کا سامان بہم پہنچایا جائے جس سے آئے دن نئے نئے نیاز نکلتے رہیں۔ دین کی تعلیم پر جرح و تعدیل اور بحث و تنقید ضرور کی جا سکتی ہے مگر اس کا مقام دائرۂ اسلام سے باہر ہے، اندر نہیں۔ اسلام کے اندر آنے کا مطلب تو یہ ہے کہ آدمی نے رسول کی تعلیمات کو بالکل برحق اور تنقید سے یکسر بالاتر تسلیم کر لیا ہے۔ اب اگر وہ ان میں غور و فکر کرے گا تو صرف مزید اطمینان قلب اور شرح صدر کے لیے، نہ کہ ان کی صحت اور سقم معلوم کرنے کے لیے۔ جس کسی کو ان کی صحت جانچنی ہو وہ اسلام کے دائرے سے باہر رہ کر اچھی طرح جانچ لے، پھر اگر اس کو ان کی صحت اور صداقت کا اطمینان ہو جائے تو اندر آئے۔ ورنہ باہر کا باہر ہی رہے۔

کتاب کے آخر میں ایک مضمون "مدیر البیان" کا بھی ہے جس میں حسب توقع لیکن بلاضرورت احادیث پر ... کی گئی ہے۔ احادیث کے بارے میں جماعت "امت مسلمہ" اور مدیر البیان کے خیالات کسی تعارف کے محتاج نہیں اور نہ ہی ترجمان کا مسلک اور اس کے دلائل کسی پر مخفی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر یہ مضمون اس کتاب میں شامل نہ ہوتا یا وہ حصہ ... اس میں سے حذف کر دیا جاتا جس میں روایات پر رد و قدح کی گئی ہے، تو اچھا ہوتا۔ اس طرح کتاب کی افادیت بے آمیز اور اس کی اشاعت وسیع تر ہوتی۔

علما اور اسلام | تصنیف مولوی مظہر الدین صاحب صدیقی بی۔ اے، ۸۲ صفحات۔ قیمت ۱۲؍
ملنے کا پتہ:۔ دار الاشاعت نشأۃ ثانیہ۔ جدید ملے پلی۔ حیدرآباد، دکن۔

یہ مختصر رسالہ اس سے پہلے "علمائے کرام کا مستقبل" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ جس کو اب نئی ترتیب اور ترمیم و اضافہ کے بعد دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ مولف کے طرز نگارش اور ان کی اسلامی فہم و بصیرت سے ناظرین ترجمان القرآن ناواقف نہیں ہیں۔ موصوف نے اس رسالہ میں اختصار کے ساتھ یہ بتلایا ہے کہ علمائے اسلام کا حقیقی منصب کیا ہے اور ایک ایسے دین کے علمبردار ہونے کی حیثیت سے، جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے، ان کا مقام کتنا بلند، ان کی ذمہ داریاں کتنی گراں اور ان کے فرائض کتنے متنوع ہیں۔ اس کے بعد مسلمانوں اور اسلام کی تاریخ کے مختلف ادوار پر ایک اجمالی تبصرہ کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ علما کس طرح بتدریج اپنے اس مقام سے علیحدہ اور اپنی ذمہ داریوں

سے غافل ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ آج ان کا قدم اپنی منزل اور شاہراہ منزل سے بالکل نا آشنا ہو کے رہ گیا ہے۔ حالانکہ نہ صرف اپنا فرض منصبی ہونے کی وجہ سے ان کو دین کی اقامت کی طرف متوجہ ہونا چاہیے بلکہ اس لیے بھی کہ اس دین ـــــ یعنی اس نظام زندگی کے سوا اور کوئی دوسرا انتظام، پریشانیوں کی ماری ہوئی دنیا اور مظلوم انسانیت کے درد کا درماں نہیں ہو سکتا۔

امید ہے کہ عام خوانندہ حضرات اور علمائے دین، سب کے لیے یہ چھوٹی سی کتاب مفید ثابت ہوگی۔ (ص - ا)

اسلام اور سود | از جناب ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی، ایم اے صدر شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد۔ دکن۔

شائع کردہ: ادارۂ معاشیات۔ فاطمہ منزل، حمایت نگر، حیدرآباد، دکن۔ صفحات ۲۰۰ - قیمت مجلد تین روپے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی آنکھیں جو جدید مغربی علوم کے اولین مشاہدہ سے خیرہ ہوگئی تھیں، کہیں کہیں اب اپنی اصل فطری حالت کی طرف لوٹ رہی ہیں۔ چنانچہ زیر نظر کتاب "اسلام اور سود" میں مرعوب ذہنیت کے آثار نہیں پائے جاتے یعنی ڈاکٹر قریشی صاحب نے سود کی حرمت کو اسلام کے اصول و ضوابط کی کھینچ تان کرکے "کار خیر" ثابت کرنے کے بجائے خود معاشیات مغرب کی روشنی میں انسانیت کے لیے وجہ فساد ثابت کیا ہے۔ جناب مؤلف چونکہ معاشیات دور حاضر کے مختلف مدارس فکر سے اچھی طرح روشناس ہیں اس وجہ سے وہ اپنے مقالہ کو نباہنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ادھر "اسلامیات" سے بھی قابل قدر حد تک واقفیت کا ثبوت دیا گیا ہے۔ اور کتاب کا دوسرا باب اس کی شہادت دیتا ہے۔ مگر درحقیقت موضوع جس محققانہ و مجتہدانہ دینی بصیرت کا متقاضی تھا۔ وہ اگر استعمال میں آئی ہوتی تو اس موضوع سے تعلق رکھنے والے متعدد سوالات زیادہ اطمینان بخش استدلال کے ساتھ حل ہو سکتے۔ تاہم پھر بھی ہمارے نزدیک اس کتاب کی بہت قدر و قیمت ہے، اس وجہ سے کہ اس نے اسلامی معاشیات کے دائرہ میں "علمی تجدید" کا راستہ کھول کر ارباب تجدد کو بتا دیا ہے کہ مسلمانوں کی پیش قدمی کس سمت میں ہونی چاہیے۔ علاوہ بریں معاشی مسائل سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو اس کے مطالعہ سے مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

مجموعہ مقالات علمیہ | مرتبہ و شائع کردہ، مجلس ادارت، حیدرآباد اکاڈمی، حیدرآباد، دکن۔ قیمت درج نہیں

حیدرآباد اکاڈمی کی طرف سے علمی مقالات کے چند مجموعے پہلے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اور اس وقت ساتواں مجموعہ ہمارے سامنے ہے جس میں پانچ مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین میں کوئی ایسا نہیں جو معلومات افزا نہ ہو۔ مگر کھری بات کہہ دینی ضروری ہے کہ لکھنے والوں کے خیالات کے گھوڑے کسی خاص مقصدی نقطۂ نظر کے کھونٹے سے بندھے ہوئے نہیں ہیں، اس لیے ہر طرف منہ مار لیتے ہیں۔ اس مجموعہ کے سب سے اہم مضمون "حقائق حیات انسانی" کو ہم نے کچھ زیادہ توجہ سے پڑھا اور اس میں یہ دیکھا کہ کہیں تو اس میں مادیت نمودار ہو جاتی ہے اور کسی موقع پر "اسلام" کی خفیف سی جھلک ظاہر ہو جاتی ہے اور کہیں دونوں خلط ملط نظر آتے ہیں۔ دیانتدار اہل قلم کو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ وہ اپنے متعلق خوب سوچ کر یہ فیصلہ کر لیں کہ وہ مسلمان ہیں یا کچھ اور۔ پھر اگر وہ اپنی نظر میں مسلمان ثابت ہوں اور مسلمان ہی رہنا چاہیں تو براہ کرم اپنے "قلم" کو بھی مسلمان بنائیں!

ناصر جنگ شہید | از جناب رہبر صاحب فاروقی، صفحات ۱۸۷، قیمت ۲ ۸ ؍ ملنے کا پتہ :- بیرون یاقوت پورہ، املی بن، مکان ۲۵۳/۱۳۵، حیدرآباد۔ دکن۔

یہ کتاب نظام الملک آصف جاہ بانی سلطنت آصفیہ کے جانشین نواب میر احمد خاں نظام الدولہ کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ واضح رہے کہ دکن کی سیاسی تاریخ کو جو اہمیت تاریخ ہند میں حاصل ہے، کچھ ویسی ہی اہمیت تاریخ دکن میں ناصر جنگ کے دور کی ہے۔ لیکن اس دور کے بہت مجمل حالات تاریخوں میں ملتے ہیں۔ اچھا ہوا کہ اب جناب رہبر فاروقی نے مطالعہ و تحقیق کے بعد اس دور کے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کر دی ہیں۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات یقیناً مؤلف کی کاوشش کی داد دیں گے۔

آثار اقبال | مرتبہ جناب غلام دستگیر صاحب رشید، ایم۔ اے۔ عثمانیہ۔ شائع کردہ :- ادارۂ اشاعت اردو، حیدرآباد دکن

قیمت : مجلد تین روپے ۱۲ آنے

علامہ اقبال کی شخصیت اور ان کے کلام کو مختلف اہل قلم مختلف پہلوؤں سے نمایاں کرنے میں مصروف ہیں اور آئے دن اس سلسلہ میں تشریحی اور تنقیدی مقالات شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اخبارات اور رسائل کے فائلوں سے ایسے ہی کچھ دلچسپ اور معلومات افزا مقالات کو اس کتاب میں جمع کیا گیا ہے۔ ان مقالات کے لکھنے والوں میں نواب محمد بہادر خاں مرحوم، ڈاکٹر خلیفہ عبدالکریم، پروفیسر خواجہ عبدالحمید، مولانا اسلم جیراجپوری، ڈاکٹر میر ولی الدین، مولانا محمد علی مرحوم، پروفیسر رشید احمد صدیقی، مولانا نذیر الحق میرٹھی اور دوسرے ممتاز اصحاب شامل ہیں۔

جن لوگوں کو اقبال مرحوم سے دلچسپی ہے، ان کے لیے یہ کتاب قابل مطالعہ ہے۔

تعارف قرآنی | از جناب ایم عبدالرحمن خاں صاحب، چیلیک، ملتان شہر۔

ناشر :- ایم ثناء اللہ خاں پبلشر اینڈ بک سیلر، ۲۶، ریلوے روڈ لاہور، قیمت مجلد عہ ۱۲ ؍

یہ کتاب اگرچہ کوئی اونچے درجہ کی محققانہ تالیف نہیں ہے، لیکن بہرحال چونکہ اس کا موضوع قرآن ہے اور قرآن کی بعض بصیرت افروز آیات کو اس میں ایک خاص نظم سے مرتب کر کے پیش کیا گیا ہے، اس وجہ سے کون مسلمان ہوگا جو اس کی پسندیدگی کا اظہار نہ کرے۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، یہ کتاب خود قرآن کی آیات کے حوالہ سے قرآن کی مختلف حیثیتوں کو متعین کر کے پیش کرتی ہے۔ مثلاً اس کے چند عنوان ملاحظہ ہوں :- قرآن نے اپنے لیے کونسے نام استعمال کیے؛ قرآن کب اور کس طرح اتارا گیا؟ قرآن کس زبان میں نازل ہوا؟ کیا قرآن پر ایمان لانا ضروری ہے؟ قرآن کے منکر کون ہیں؟ وغیرہ۔ ایسے اہم استفہامی عنوانات کے ماتحت توضیحی آیتیں مع ترجمہ مرتب کی گئی ہیں۔ کتاب عام خواندہ طبقہ کے لیے مناسب ہے۔ (ن۔ ص)

اعلان

رسالہ ترجمان القرآن کے مندرجہ ذیل رسائل ہمارے دفتر میں موجود ہیں۔ جن اصحاب کو ضرورت ہو منگوا سکتے ہیں۔ قیمت فی پرچہ ۸ ؍

سنہ ۵۲ھ :- صفر، جمادی الآخر، رجب، شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ۔ سنہ ۵۳ھ صفر، رجب، شعبان، رمضان۔ سنہ ۵۴ھ :- شعبان۔ سنہ ۵۵ھ :- ربیع الثانی، رجب۔ سنہ ۵۶ھ شوال۔ سنہ ۶۰ھ شوال۔ ذی القعدہ، ذی الحجہ۔ سنہ ۶۱ھ رمضان، شوال۔ ذی القعدہ، ذی الحجہ۔ سنہ ۶۲ھ جمادی الاول، جمادی الآخر، رجب، شعبان، رمضان، شوال۔ سنہ ۶۳ھ ذی القعدہ، ذی الحجہ

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصّہ اوّل

اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ موجودہ حالت اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے اِس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے

حصّہ دوم

اِس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کرکے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اِس وقت تک ملک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصولِ اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ اِس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے۔

حصّہ سوم

مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش کا عملی حل کیا ہے۔ اسلامی حکومت کن اُصولوں پر قائم کیجا سکتی ہے۔ ایسا اقدام کرنے والے گروہ کو کن اُصولوں پر منظم کیا جا سکتا ہے، اور اِن اصولوں پر جس قدر اعتراضات و شبہات کئے جا سکتے ہیں، اُن کا جواب کیا ہے؛ یہ تمام باتیں اِس حصّہ میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کردی گئی ہیں۔

قیمت حصہ اول ۰۰-۳-۱ حصہ دوم ۰۰-۸-۲ حصہ سوم ۰۰-۱۲-۱

علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ :- مکتبہ جماعت اسلامی دارالاسلام جمالپور۔ پٹھانکوٹ (پنجاب)۔

Registered No. L. 4186

رمضان ۱۳۶۴ | شوال ۱۳۶۴

جلد ۲۷
عدد ۳، ۴

۹۱ء

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

تالیف

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

دارالاسلام جمال پور۔ پٹھانکوٹ

قیمت سالانہ پانچ روپے

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

تفہیمات

بعض معرکۃ الآراء مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے اُن مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کے متعلق آجکل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں مثلاً توحید، ہدایت و ضلالت، عبادت، جہاد، آزادی، رواداری، قومیت اسلامی، عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسُول کی صحیح حیثیت، رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت، قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔ حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔ قیمت مجلد (تین روپے) علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات یہ مؤلف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب ان سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان الجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہوگئی ہیں۔

ضخامت ۴۰۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے علاوہ محصولڈاک

فہرست مضامین

| جلد ۲۷ | بابت ماہ رمضان و شوال ۱۳۶۴ھ مطابق ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۵ء | عدد ۳، ۴ |

سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دارالاسلام متصل پٹھان کوٹ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ترجمان کے پچھلے دو پرچوں میں تقویٰ پر ہم نے جو بحث کی ہے ناتمام رہے گی اگر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں بھی یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ تقویٰ کی حقیقت کیا ہے؟ لیکن احادیث پر غور کرنے سے پہلے احادیث کے متعلق ایک اصولی حقیقت پیش نظر رکھ لینی چاہیے۔ وہ یہ کہ جس طرح اللہ کے رسولوں کے درمیان تفریق ناجائز ہے، ہم یہ نہیں کر سکتے کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض کا انکار کر دیں۔ جس طرح قرآن کی آیتوں کو آپس میں ٹکرانا حرام ہے، ہم یہ نہیں کر سکتے کہ بعض کو حجت واستدلال کے لیے اختیار کریں اور بعض کو چھوڑ دیں، اسی طرح یہ بات بھی بالکل ناجائز ہے کہ رسول کے اقوال وارشادات میں سے کچھ کو ہم اپنے عمل یا استدلال کے لیے اختیار کر لیں اور کچھ کو نظر انداز کر دیں۔ ان تمام صورتوں میں بعض کو چھوڑنا سب کو چھوڑنے کے ہم معنی ہے اور نہایت بیوقوف ہے وہ مسلمان جو اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات میں اس طرح کی تقسیم کرتا ہے۔ لیکن اس طرح کی تفریق وتقسیم کا فتنہ آج عام ہے۔ کتنے مسلمان ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں اسی طرح کی تفریق کر کے اپنے زعم میں نہایت متقی بنے پھرتے ہیں حالانکہ وہ اگر آپ کی تعلیمات پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالیں تو انھیں معلوم ہو کہ تقویٰ تو درکنار ان کا ایمان واسلام بھی معرض خطر میں ہے۔ اس بات کو مثال سے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے بعض دعائیں صحابہ کو سکھائیں یا بعض نوافل کی تلقین کی اور ان پر کوئی غیر معمولی اجر وثواب بیان فرمایا تو بعض لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ جو شخص بھی اس دعا یا نفل کا التزام کر لے اس کے لیے یہ اجر وثواب اور یہ درجہ اور مقام ہے اگرچہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں اس کا رویہ رسول کی ہدایات کے موافق ہو یا نہ ہو۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ بعض نوافل اور بعض اوراد پر جو بڑی بڑی برکتوں کا احادیث میں ذکر آیا ہے یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ساری زندگی کو حدود شریعت کے اندر رکھتے ہوئے ان اوراد ونوافل کا التزام کرتے ہیں۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ ایک طرف کوئی شخص کسی وظیفہ اور نفل کا پابند ہو اور دوسری طرف اس کی کمائی حرام کی ہو۔ ایک طرف تو وہ رات رات بھر نفلیں پڑھتا ہو اور تسبیحیں گردانتا ہو لیکن دوسری طرف وہ سارا دن کسی نظام باطل کی خدمت واطاعت میں بسر کرتا ہو، ایک طرف تو نمازوں میں اس کی پنڈلیاں سوج سوج جاتی ہوں لیکن دوسری طرف اس کے پڑوسیوں اور اس کے اقربا کو اس کے فتنوں سے کسی وقت امان حاصل نہ ہو۔ ایسے شخص کے لیے اپنے اوراد ووظائف سے تقویٰ کا درجہ حاصل کرنا تو الگ رہا، احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ایمان بھی معتبر نہیں ہے، کیونکہ نبی صلعم نے اگر ایک طرف یہ فرمایا ہے کہ فلاں دعا سے آدمی کے اتنے گناہ معاف ہو جاتے ہیں یا اس کے مدارج اتنے بلند ہوتے ہیں تو دوسری طرف یہ بھی فرمایا ہے کہ حرام خور کی کوئی دعا بھی قبول نہیں ہوتی، اگر ایک طرف یہ ارشاد فرمایا ہے کہ راتوں کو جگ کر نفلیں پڑھنے کا

بڑا اجر و ثواب ہے تو دوسری طرف یہ بھی فرمایا ہے کہ یتیم کا حق ہڑپ کرنے والا اپنا ایمان بھی ضائع کر دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے رسول کے احکام و ہدایات میں سے کچھ باتیں منتخب کر لی ہیں اور ان پر عمل کر کے مطمئن ہیں کہ وہ متقی بن گئے ہیں وہ سخت مغالطہ اور فتنہ میں مبتلا ہیں۔ اللہ کا رسول کوئی دوکاندار بن کر نہیں آتا کہ آپ کو اس کی دوکان کا جو مال پسند آئے وہ دام دے کر خرید لیجیے بلکہ وہ آپ کی ساری زندگی کے لیے واجب الاطاعت ہادی بن کر آتا ہے کہ نقد دل و نقد جان دونوں اس کی نذر کیجیے اور زندگی کے ہر گوشہ میں اس کے نمونہ کی پیروی کیجیے۔

اور یہ بات بالکل عقل و فطرت کے مطابق ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ جو کسان ایک دانہ زمین میں ڈالتا ہے وہ دس پاتا ہے تو اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ یہی نتیجہ اس صورت میں بھی برآمد ہوگا کہ بیج سڑا ہوا ہو یا زرخیز اور تیار کی ہوئی زمین کے بجائے کسی بنجر زمین میں ہی ڈال دیا گیا ہو، یا تخم ریزی کے موسم کے بجائے بالکل بے وقت اور بالکل خلاف موسم بیج پھینک دیا گیا ہو، یا بیج ڈالنے کے بعد ارضی و سماوی آفتوں سے اس کے بچانے کی کوشش بھی نہ کی گئی ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو کسان کھیتی کی ساری شرطیں پوری کرتا ہے اس کے لیے قانون قدرت نے یہ برکت رکھی ہے کہ وہ ایک دانہ پر جو محنت صرف کرتا ہے اس کے صلہ میں دس پاتا ہے باقی رہا وہ احمق دہقان جو صبح کو تخم ریزی کرتا ہے اور شام کو جا کر اس پر ہل چلا دیتا ہے تو کچھ ہونا تو الگ رہا وہ اپنی محنت اور اپنا سرمایہ بھی برباد کرتا ہے اور پڑوسیوں کے طعنے بھی سنتا ہے۔ یہی حال ان مسلمانوں کا ہے جو کسی نیکی کے کلمہ یا تسبیح کے کام کو زہد و تقویٰ کا اصل مقام سمجھے بیٹھے ہیں اور اس امر کی انھیں بالکل خبر نہیں ہے کہ اپنی بعض نیکیوں سے اپنے تقویٰ کی عمارت شب میں جتنی اونچی کرتے ہیں دن میں اپنے اعمال کے ہاتھوں اسے اس سے زیادہ ڈھا دیتے ہیں۔ یہ سادہ لوح یہ تو جانتے ہیں کہ فلاں کلمہ کو اتنی بار پڑھ لینے سے یہ درجہ حاصل ہو جاتا ہے اور فلاں وقت اتنی رکعتیں نفل کی ادا کر لینے سے یہ ثواب ملتا ہے لیکن یہ نہیں جانتے کہ جس رسول نے یہ باتیں بتائی ہیں اسی نے یہ بھی بتایا ہے کہ فلاں فلاں باتیں کرنے سے آدمی کی یہ ساری کمائی اکارت جاتی ہے۔

احادیث کے متعلق یہ اصولی حقیقت پیش نظر رکھ کر اگر آپ حدیثوں پر غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تقویٰ کی جو حقیقت ہم نے قرآن مجید سے متعین کی ہے اسی کی تائید نبی صلعم کے ارشادات سے بھی ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ تقویٰ اللہ تعالیٰ کے حدود کی کامل نگہداشت کا نام ہے۔ یہ زندگی کی عام شاہراہ سے کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ زندگی کو خدا کے قائم کیے ہوئے حدود کے اندر بسر کرنے ہی کا نام تقویٰ ہے۔ یہ کسی درجہ میں بھی زندگی کے مطالبات و مقتضیات کی نہ تو نفی کرتا نہ ان میں مزاحم ہوتا البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ زندگی کے کسی مطالبہ کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنی فطری یا اخلاقی حدود سے متجاوز ہو کر فرد یا معاشرے کو کسی مادی یا اخلاقی ہلاکت میں ڈال دے۔ یہ فطری تقاضوں کی راہ میں کوئی عائق، نفس کی خواہشوں کی راہ میں کوئی روک، دل و دماغ اور سمع و بصر کی جولانیوں اور بلند پروازیوں کے لیے کوئی مانع نہیں ہے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ ان کی کارفرمائی کے لیے ایک صراط مستقیم سامنے کر دے اور اس کے ہر طرف نشانات راہ قائم کر دے تاکہ کسی منزل میں انسان بے راہ روی میں پڑ کر اپنے نفس پر یا دوسروں پر ظلم نہ کر سکے۔ چنانچہ آنحضرت صلعم نے احادیث میں جس قوت و شدت کے ساتھ لوگوں کو تقویٰ کی تلقین فرمائی ہے اسی قوت کے ساتھ تقویٰ کے ان غلط رجحانات کو روکا ہے جو کسی نوعیت سے فطرت

انسانی کی ترقیوں کی راہ میں مزاحم ہو سکتے تھے۔ حضور نے اس بات کو بھی کبھی پسند نہیں فرمایا کہ حدود الٰہی کی حفاظت و نگہداشت کے سوا اس کی کوئی خاص صورت دینیت قرار پائے اور لوگ باسم تقویٰ اس کو بت بنا کر پوجنے لگیں۔ نیز اس بات کی بھی نہایت واضح الفاظ میں تصریح فرمائی کہ تقویٰ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کو زہد و انقطاع سے کوئی خاص لگاؤ ہو بلکہ اللہ کے دین پر چلنے اور چلانے کی ہر جد و جہد۔ خدائی شریعت کو سمجھنے اور سمجھانے کی ہر کوشش تقویٰ ہی کی راہ میں جدوجہد ہے اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تقویٰ کے سب سے بڑے عامل بھی تھے اور سب سے بڑے عامل بھی، عملاً زہاد و عباد کے حلقوں پر ان لوگوں کی مجلس کو ترجیح دی جو اوراد و نوافل کے بجائے خدا کے حدود و محارم کو سمجھنے اور سمجھانے میں اپنا وقت صرف کر رہے تھے۔ یہ اجمال ہے۔ اب اس کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ ملاحظہ فرمائیے۔

سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تقویٰ کی حد کیا بیان فرمائی ہے۔ نعمان بن بشیر سے روایت ہے:۔

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الحلال بین والحرام بین وبینهما مشتبهات لا یعلمهن کثیر من الناس فمن اتقی الشبهات استبرأ لدینه وعرضه ومن وقع فی الشبهات وقع فی الحرام کالراعی یرعی حول الحمی یوشک ان یرتع فیه الا وان لکل ملک حمی الا وان حمی اللہ محارمه (متفق علیہ)

کہا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے اور ان کے درمیان کچھ چیزیں مشتبہ ہیں جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے پس جو شبہات سے بچا وہ اپنے دین اور اپنی آبرو کو بچا لے گیا اور جو شبہات میں پڑا وہ حرام میں مبتلا ہوا۔ جس طرح وہ چرواہا جو چراگاہ کے پاس اپنا گلہ چراتا ہے اغلب ہے کہ اس کا گلہ چراگاہ میں پڑ جائے۔ آگاہ ہو بادشاہ کے پاس محفوظ علاقہ ہوتا ہے اور اللہ کا محفوظ علاقہ اس کے محارم ہیں۔

اس حدیث میں حضور نے یہ حقیقت سمجھائی ہے کہ جو چیزیں حلال ہیں وہ واضح طور پر معلوم ہیں اور جو چیزیں حرام ہیں ان کی بھی اللہ کی کتاب اور سنت میں تصریح کر دی گئی ہے پس ایک مسلمان کا فرض ہے کہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو حلال اور اس کی حرام کی ہوئی چیز کو حرام قرار دے۔ یہ ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ لیکن حلال ظاہر اور حرام ظاہر کے درمیان کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کی نسبت قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ حرام ہیں یا حلال۔ ایسی صورتوں میں جو شخص احتیاط کے پہلو کو اختیار کرے اور مشتبہ میں نہ پڑے وہ متقی مسلمان ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو لوگ اونٹ کو نگلنے کے بعد مچھر کو چھان کر تقویٰ کی نمائش کرتے ہیں ان کا تقویٰ محض فریب ہے تقویٰ یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے احکام و حدود کا پورا پابند ہو اور جب اس کے سامنے کوئی ایسی چیز آئے جس میں جانب حق اس پر پوری طرح واضح نہ ہو تو وہ اشتباہ کے پہلو کو چھوڑ کر طمانیت کے پہلو کو اختیار کرے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ متقی ہے اور اس کا دین اور اس کی آبرو ہر تہمت اور اشتباہ سے محفوظ ہے۔ اسی حقیقت کو حضور نے مختلف طریقوں سے بیان فرمایا ہے۔ اور چونکہ تقویٰ کی اصلی حد متعین کرنے میں ان احادیث سے خاص مدد مل سکتی ہے اس وجہ سے ہم ان میں سے بعض یہاں نقل کیے دیتے ہیں۔

عن وابصة بن معبد ان رسول اللہ صلعم قال یا وابصة جئت تسأل عن البر والاثم قلت نعم قال فجمع اصابعه فضرب بها صدره وقال استفت

وابصہ بن معبد سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا اے وابصہ تم نیکی اور اثم کی حقیقت پوچھنے آئے ہو؟ میں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ۔ آپ نے اپنا پنجہ برابر کیا اور اس کو میرے سینے پر مارا اور

نفسك استفت قلبك ثلاثاً البر ما اطمأنت اليه النفس واطمأن اليه القلب والاثم ما حاك في النفس وتردد في الصدر وان افتاك الناس (رواه احمد والدارمی)

فرمایا اپنے نفس سے پوچھو، اپنے دل سے سوال کرو (تین مرتبہ فرمایا) بِرّ وہ ہے جس پر تمہارا دل مطمئن ہو جائے اور اثم وہ ہے جو دل میں کھٹکے اگرچہ لوگوں نے اس کا فتویٰ دیدیا ہو۔

وابصہ بن معبد کا یہ سوال بھی اس حالت سے تعلق رکھتا ہے جبکہ آدمی کے سامنے حق کا پہلو واضح نہ ہو۔ ایسی صورت میں تقویٰ یہ ہے کہ آدمی اس پہلو کو اختیار کرے جس میں دل طمانیت محسوس کرے اور جس بات میں خلش محسوس کرے اس سے احتیاط کرے۔

ایک دوسری روایت میں اسی مضمون کی مزید شرح ہے کہ متقی کے لیے بسا اوقات اندیشۂ معصیت سے بچنے کے لیے اس چیز سے احتیاط کرنی پڑتی ہے جس میں بظاہر کوئی ہرج نہیں ہوتا۔

لا یبلغ العبد ان یکون من المتقین حتی یدع ما لا باس به حذراً لما به باس (رواہ الترمذی و ابن ماجہ)

کوئی بندہ متقیوں میں سے نہیں ہو سکتا جب تک اس چیز کی وجہ سے جس میں اس کو اندیشہ ہے بعض ان چیزوں سے احتراز نہ کرے جن میں بظاہر اندیشہ نہیں ہے۔

عن الحسن بن علی قال حفظت من رسول الله صلی الله علیه وسلم دع ما یریبك الی ما لا یریبك فان الصدق طمانینة وان الکذب ریبة (رواہ احمد والترمذی)

حسن بن علیؓ سے روایت ہے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات محفوظ کی ہے کہ اس پہلو کو چھوڑ دو جو خلجان میں ڈالتا ہے اور اس پہلو کو اختیار کرو جو خلجان میں نہیں ڈالتا۔ صحیح چیز طمانیت بخشتی ہے اور غلط چیز خلجان میں ڈالتی ہے۔

ان ساری حدیثوں میں ایک ہی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ ان پر غور کیجیے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ تقویٰ یہ ہے کہ ہر گوشۂ زندگی میں اللہ تعالیٰ کے احکام و حدود کی پوری پابندی کرے اور جہاں کہیں اس کے سامنے کوئی ایسا موقع آئے جس پر شریعت الٰہی کا کوئی واضح نشان راہنمائی کے لیے نہ ہو تو اپنے دل سے استفتا کرے اور اس پہلو کو اختیار کرے جس میں اس کا دل طمانیت محسوس کرے۔ اس پہلو کو نہ اختیار کرے جو اس کے دل میں کھٹکے۔ جو شخص اس احتیاط کے ساتھ اپنی زندگی میں حدود الٰہی کی نگرانی کر رہا ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق متقی ہے۔

لیکن گناہ سے بچنے کے لیے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احتیاط کے پہلو پر اس حد تک زور دیا وہیں تقویٰ کا صحیح توازن قائم رکھنے کے لیے اس امر کی بھی تصریح فرما دی کہ یہ احتیاط کہیں وسوسہ کی شکل نہ اختیار کرلے اور اس کے ڈانڈے نصاریٰ کی رہبانیت سے نہ مل جائیں۔ چنانچہ قبیصہ بن ہلب سے روایت ہے۔

عن قبیصة بن هلب عن ابیه قال سألت النبی صلی الله علیه وسلم عن طعام النصاری وفی روایة سأله رجل فقال ان من الطعام طعاماً اتحرج منه فقال لا یتخلجن فی صدرك شیء ضارعت فیه النصرانیة (رواہ الترمذی وابوداؤد)

قبیصہ بن ہلب اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نصاریٰ کے کھانوں کے متعلق دریافت کیا۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ سے کسی اور شخص نے پوچھا کہ کھانوں میں سے بعض ایسے ہیں جن سے میرے دل میں کھٹک پیدا ہوتی ہے آپ نے فرمایا تمہارے دل میں کوئی ایسی کھٹک نہ پیدا ہو جو نصاریٰ کی رہبانیت سے مشابہ ہو۔

اس حدیث کو اوپر کی احادیث سے ملا کر دیکھیے تو وہ صحیح اور متوازن تقویٰ بالکل ممیز ہو کر سامنے آجاتا ہے جس میں نہ تو اشتباہ

کی صورت میں میلان الی المعصیۃ کا شائبہ ہے اور نہ احتیاط کی بے اعتدالی اور متقشفانہ وہمی پن کی کوئی آمیزش ہے بلکہ تقویٰ کی جو اصل حقیقت ہے بالکل تول کر سامنے رکھ دی گئی ہے۔ یہی تقویٰ اللہ اور اس کے رسول کو مطلوب ہے ورنہ احتیاط میں جب وسوسہ کو دخل ہو جاتا ہے تو اسی سے وہ راہبانہ تقویٰ وجود میں آتا ہے جو اللہ و رسول کو اسی طرح ناپسند ہے جس طرح حدود الٰہی کے احترام میں رخصت پسندی اور سہل انگاری۔

اب ان احادیث پر غور فرمایئے جن سے اس بات کی نہایت واضح تردید ہوتی ہے کہ تقویٰ کسی نوعیت سے بھی زندگی کے مطالبات و مقتضیات کی نفی کرتا ہے۔

عن عثمان بن مظعون قال یا رسول اللہ ائذن لنا فی الاختصاء فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس منا من خصی ولا اختصی ان خصاء امتی الصیام فقال ائذن لنا فی السیاحۃ فقال ان سیاحۃ امتی الجہاد فی سبیل اللہ فقال ائذن لنا فی الترھب فقال ان ترھب امتی الجلوس فی المساجد انتظار الصلوٰۃ (رواہ فی شرح السنۃ)

عثمان ابن مظعون سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ یا رسول اللہ ہم کو خصی ہو جانے کی اجازت دیجیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے خصی کیا اور جو خصی ہوا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ میری امت کا خصی ہونا روزہ رکھنا ہے۔ کہا تو اچھا بن باس ہونے کی اجازت دیجیے فرمایا میری امت کا بن باس ہونا یہ ہے کہ وہ راہ خدا میں جہاد کرے کہا اچھا تو ترک دنیا کی اجازت دیجیے فرمایا میری امت کے لیے نماز کے انتظار میں مسجد میں بیٹھنا ترک دنیا ہے۔

بعض لوگ جنھوں نے تقویٰ کے غلط تصور میں مبتلا ہو کر زندگی کے مطالبات و ضروریات میں عدم توازن پیدا کر دیا تھا اور زہد و عبادت کی طرف جھک پڑے تھے حضور نے ان کو نہایت سختی کے ساتھ ٹوکا اور ان کو متوازن زندگی بسر کرنے کی ہدایت فرمائی۔

عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص قال قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا عبد اللہ الم اخبر انک تصوم النہار وتقوم اللیل فقلت بلی یا رسول اللہ قال فلا تفعل صم وافطر وقم ونم فان لجسدک علیک حقا وان لعینک علیک حقا وان لزوجک علیک حقا وان لزورک علیک حقا

عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ تم دن کو روزے رکھتے ہو اور رات بھر نماز پڑھا کرتے ہو، میں نے عرض کیا کہ صحیح ہے یا رسول اللہ آپ نے فرمایا ایسا نہ کرو۔ کبھی روزہ رکھو کبھی افطار کرو، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی۔ کیونکہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری جورو کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے۔

بعض لوگ مباحات[1] اور رخصتوں سے مستفید ہونا شان تقویٰ کے منافی سمجھتے ہیں اور ہر منزل میں اپنا ڈیرہ سنگلاخ زمین

[1] اوپر ایک روایت ہم نے نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ کے لیے اندیشہ معصیت سے بعض بعض ایسی چیزیں بھی چھوڑنی پڑتی ہیں جن میں بظاہر کوئی ہرج نہیں ہے لیکن یہ اس صورت میں ہے جب امر حق مشتبہ ہو۔ ایسی صورت میں بلاشبہ تقویٰ یہی ہے کہ آدمی احتیاط کا پہلو اختیار کرے اور مباح مشتبہ سے فائدہ نہ اٹھائے لیکن جس مباح یا جس رخصت پر قلب مطمئن ہے محض اس خیال سے اس کو چھوڑنا کہ اصلی دینداری سخت راہ اختیار کرنے ہی میں ہے یہ تقویٰ نہیں ہے بلکہ تقویٰ سے دھینگا مشتی ہے۔ (امین احسن)

میں ہی ڈالنا کمال دینداری سمجھتے ہیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلط فہمی کا بھی ازالہ فرمایا:-

عن عائشة قالت صنع رسول الله صلى الله عليه وسلم شيئا فرخص فيه فتنزه عنه قوم فبلغ ذلك رسول الله صلى الله عليه وسلم فخطب فحمد الله ثم قال ما بال اقوام يتنزهون عن الشئ اصنعه فوالله انى لاعلمهم بالله واشدهم له خشية (متفق عليه)........................

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی کام کیا پھر اس میں رخصت دیدی تو بعض لوگ اس رخصت سے فائدہ اٹھانے میں احتراز کرنے لگے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے خطبہ دیا، اللہ تعالیٰ کی حمد کی پھر فرمایا بعض لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ بچتے ہیں ایسی باتوں سے احتراز کرتے ہیں جن کو میں کرتا ہوں۔ خدا کی قسم میں ان سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو جاننے والا ہوں اور ان سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں۔

ابوداؤد میں ایک روایت اس سے بھی زیادہ واضح ہے:-

عن انس ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يقول لا تشددوا على انفسكم فيشدد الله عليكم فان قوما شددوا على انفسهم فشدد الله عليهم فتلك بقاياهم فى الصوامع والديار رهبانية ابتدعوها ما كتبناها عليهم

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ اپنے اوپر سختی مت کرو کہ اللہ بھی تم پر سختی کرنے لگے۔ ایک قوم نے اپنے اوپر سختی کی تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی۔ انہی کی یادگاریں کلیساؤں اور گرجوں میں دیکھ رہے ہو۔ یہ ان کی گھڑی ہوئی رہبانیت ہے جس کو اللہ نے ان کے اوپر فرض نہیں کیا۔

یہ حدیثیں اس بات کا صاف ثبوت ہیں کہ جس طرح رخصتوں کی تلاش اور مباحات سے فائدہ اٹھانے میں جانب حق کی رعایت سے بے پروائی تقویٰ کے خلاف ہے اسی طرح دین میں خواہ مخواہ سختی اور تشدد کے پہلو کا التزام بھی تقویٰ کے منافی ہے۔ تقویٰ کی راہ اس سہل انکاری اور اس تشدد پسندی کے بیچ سے ہو کے نکلی ہے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تقویٰ کا اصلی کام زہد و عبادت ہے۔ آدمی کسی گوشہ میں بیٹھ کر ذکر اللہ کرے، نمازیں پڑھے، روزے رکھے اور اوراد و نوافل میں مشغول رہے بس یہ کام اصلی تقویٰ کے کام ہیں۔ اس کے علاوہ جو کام ہیں، اگرچہ وہ دین کے کام ہوں، لیکن موجودہ زمانہ کے ارباب تقویٰ ان کو تقویٰ کے کام نہیں سمجھتے۔ تقویٰ کا جزو اعظم ان کے ہاں عبادت ہے۔ جو شخص اس چیز میں جتنا ہی اضافہ کرتا جائے وہ تقویٰ میں اسی قدر مدارج طے کرتا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت واضح الفاظ میں اس غلط رجحان کی بھی تردید فرمائی ہے۔

عن انس قال جاء ثلثة رهط الى ازواج النبى صلى الله عليه وسلم يسألون عن عبادته فلما اخبروا بها كانهم تقالوها فقالوا اين نحن من النبى صلى الله عليه وسلم وقد غفر الله له ما تقدم من ذنبه وما تاخر فقال احدهم اما انا فاصلى الليل ابدا

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے پاس تین جماعتیں آپ کی عبادت کا حال پوچھنے آئیں۔ جب ان کو آپ کی عبادت کا پورا پورا حال بتایا گیا تو کچھ ایسا ظاہر ہوا کہ ان کی نظر میں یہ بہت کم ہے۔ پھر وہ بولے کہ ہمارا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا مقابلہ! آپ کے تو تمام اگلے اور پچھلے گناہ بخش دیے جا چکے ہیں۔ پھر ان لوگوں میں سے ایک شخص بولا

وقال الآخر انا اصوم النهار ولا افطر، وقال الآخر انا اعتزل النساء فلا اتزوج ابدا، فجاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم الیهم فقال انتم الذین قلتم کذا وکذا اما واللہ انی لاخشاکم للہ واتقاکم لہ لکنی اصوم وافطر واصلی وارقد واتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی (متفق علیہ)

میں ہمیشہ رات بھر عبادت کیا کروں گا، ایک دوسرا بولا میں ہمیشہ روزے رکھا کروں گا کبھی ناغہ نہ ہونے دوں گا، ایک تیسرے نے کہا میں عورتوں سے بالکل قطع تعلق کروں گا اور کبھی نکاح نہ کروں گا۔ اتنے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم آگئے، آپ نے فرمایا تمہی لوگ یہ کہہ رہے تھے؟ خدا کی قسم میں تم سے کہیں زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اس سے تقویٰ اختیار کرنے والا ہوں لیکن اس کے باوجود روزے بھی رکھتا ہوں، ناغہ بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں، آرام بھی کرتا ہوں، اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ جس نے میرے طریقہ سے انحراف کیا وہ میری امت میں نہیں ہے۔

ایک دوسری حدیث ملاحظہ ہو۔

عن الحسن قال سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن رجلین کانا فی بنی اسرائیل احدهما کان عالما یصلی المکتوبة ثم یجلس فیعلم الناس الخیر والآخر یصوم النهار ویقوم اللیل ایهما افضل قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فضل هذا العالم الذی یصلی المکتوبة ثم یجلس فیعلم الناس الخیر علی العابد الذی یصوم النهار ویقوم اللیل کفضلی علی ادناکم

حضرت حسن سے روایت ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بنی اسرائیل کے دو شخصوں کی بابت دریافت کیا گیا (ایک عالم تھا جو فرض نماز پڑھ کر بیٹھ جاتا اور لوگوں کو بھلائی کی تعلیم دیتا اور دوسرا دن بھر روزے رکھتا اور شب بھر نمازیں پڑھا کرتا) ان میں سے کون افضل ہے؟ حضور نے فرمایا عالم جو فرض پڑھ کر لوگوں کی تعلیم میں مشغول ہو جاتا ہے، اس عابد پر جو دن بھر روزے رکھتا اور شب میں عبادت کرتا ہے، وہی فضیلت رکھتا ہے جو میں تم میں سے ایک ادنیٰ ترین فرد پر رکھتا ہوں۔

عن ابن عباس قال تدارس العلم ساعة من اللیل خیر من احیائها (رواہ الدارمی)

ابن عباس سے مروی ہے کہ شب میں ایک گھڑی علم کا مذاکرہ شب زندہ داری سے بہتر ہے۔

عن عبد اللہ بن عمرو ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مر بمجلسین فی مسجدہ فقال کلاهما علی خیر واحدهما افضل من صاحبہ اما هؤلاء فیدعون اللہ ویرغبون الیہ فان شاء اعطاهم وان شاء منعهم واما هؤلاء فیتعلمون الفقہ والعلم ویعلمون الجاهل فهم افضل وانما بعثت معلما فجلس فیهم

عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مسجد میں دو جماعتیں دیکھیں اور فرمایا دونوں اچھے کام کر رہی ہیں لیکن ایک دوسری سے افضل ہے۔ یہ لوگ اللہ کو یاد کر رہے ہیں اور اس کی طلب میں لگے ہیں اگر اللہ چاہے گا انھیں بامراد کرے گا اور اگر چاہے گا تو محروم کر دے گا۔ رہے دوسرے لوگ تو یہ علم دین کے سیکھنے میں لگے ہیں یا علم دین حاصل کر رہے ہیں اور جاہلوں کو تعلیم دے رہے ہیں، یہ لوگ ان سے افضل ہیں اور میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں اور یہ کہہ کر انہی کے ساتھ بیٹھ گئے۔

ان تمام روایات سے ثابت ہے کہ زندگی کو ایک توازن کے ساتھ اللہ کے حدود کے اندر بسر کرنے کا نام تقویٰ ہے۔ ایک شخص اگر فرائض ادا کر کے اپنا بقیہ سارا وقت دین کے سیکھنے سکھانے اور اس کی اقامت کی جد و جہد میں صرف کر رہا ہے تو وہ ان لوگوں سے کہیں زیادہ متقی ہے جو رات رات بھر نمازیں پڑھتے ہیں، اوراد و وظائف میں مشغول رہتے ہیں لیکن تعلیم دین یا اقامت دین

کی جدوجہد میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

ایک اور غلط فہمی تقویٰ کے متعلق یہ بھی لوگوں میں پیدا ہو گیا ہے کہ محرمات سے اجتناب اور ترک تعلق کے لیے اسا [illegible] کو [illegible] سمجھتے [illegible] زیادتی کو سمجھتے ہیں۔ [illegible] وقت [illegible] ہے۔ تقویٰ اس اصل سے جس کا [illegible] اہتمام [illegible] ہے [illegible] ثابت ہے۔ اس کے بغیر کوئی شخص [illegible] نہیں [illegible] تقویٰ [illegible] تعبیر حاصل [illegible] اس زمانہ میں ہم [illegible] دیکھ رہے ہیں [illegible] کرنے والے [illegible] اپنی [illegible] طاعت [illegible] کے لیے تیار کرنے والے [illegible] بہت [illegible] سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اوراد و نوافل کا اہتمام کر رکھا ہے [illegible] ہاتھوں میں تسبیحیں لٹکائے پھرتے [illegible] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلط فہمی کی [illegible] ہے۔

عن ابی ھریرة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من یاخذ عنی ھؤلاء الکلمات فیعمل بھن او [illegible] قال [illegible] یا رسول اللہ فاخذ [illegible] فعد خمسا فقال اتق المحارم تکن اعبد [illegible] الحدیث

[illegible] ابو ہریرہ سے روایت ہے [illegible] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے [illegible] باتیں [illegible] عمل کرے [illegible] سکھائے [illegible] کیا [illegible] ہاتھ [illegible] اور پانچ [illegible] باتیں [illegible] حرام [illegible] سب [illegible] عابد بن جاؤ گے [illegible]

[illegible] ذکر رجل عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ [illegible] واجتھاد [illegible] فقال النبی [illegible] لا تعدل بالرعة یعنی الورع (رواہ الترمذی)

[illegible] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک شخص کی عبادت اور ذکر [illegible] میں سرگرمی کا ذکر کیا گیا [illegible] دوسرے شخص کے محرمات سے اجتناب [illegible] آپ نے فرمایا کہ [illegible] کے برابر [illegible]

عن ابی ھریرة قال قال رجل یا رسول اللہ ان فلانة [illegible] کثرة صلوتھا وصیامھا وصدقتھا غیر انھا تؤذی جیرانھا بلسانھا قال ھی فی النار قال یا رسول اللہ فان فلانة [illegible] قلة صیامھا [illegible] وانھا تصدق بالاثوار [illegible] ولا تؤذی بلسانھا جیرانھا قال ھی فی الجنة (رواہ احمد والبیہقی)

ابو ہریرہ سے روایت ہے [illegible] نے [illegible] اس کی نماز اور روزے اور صدقہ [illegible] ہے [illegible] اپنے پڑوسیوں کے ساتھ بدزبانی کرتی ہے حضور نے فرمایا وہ جہنم میں [illegible] اس نے [illegible] رسول اللہ فلاں عورت کے روزے صدقہ اور نماز کی کمی [illegible] ہے [illegible] کے ٹکڑے صدقہ کر دیتی ہے لیکن پڑوسیوں کے ساتھ بدزبانی نہیں کرتی حضور نے فرمایا وہ جنت میں داخل ہو گی۔

بعض لوگ بعض مظاہر تقویٰ کو عین تقویٰ سمجھ بیٹھتے ہیں اور اپنا سارا زور انہی چیزوں پر صرف کرتے ہیں، مثلاً ازار کا ٹخنوں سے اونچا ہونا، داڑھی کا لمبا ہونا، لبوں کا تراشا ہوا ہونا۔ پھر اس فہرست میں اپنے جی سے کچھ اس کے اور مناسبات جمع کر لیتے ہیں، مثلاً صورت کی خستہ حالی، لباس کی بدوضعی، لب و لہجہ کی مصنوعی مسکینی، ملنے جلنے میں اظہار تذلل، اٹھنے بیٹھنے میں

نہ نفس تقویٰ اور قبا و قعود میں تکلف اظہار خشیت۔ ان کا تقویٰ بس انھی چیزوں سے عبارت ہوتا ہے اور انھی چیزوں کو تقویٰ کا پیمانہ بنا کر اسی سے دوسروں کو ناپتے ہیں اور جن کے اندر یہ باتیں اپنے معیار کے مطابق نہیں پاتے ان کو حقیر خیال کرنے لگتے ہیں حالانکہ بسا اوقات ان لوگوں کی زندگی جن کو یہ حقیر سمجھتے ہیں، حدود الٰہی کے احترام میں ان سے زیادہ متوازن ہوتی ہے لیکن چونکہ تقویٰ کی بعض اشکال میں یہ ان کے معیار پر نہیں ہوتے اس وجہ سے وہ لوگ ان کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک شخص اپنے گھر کے چراغ کو اس کی مرکزی جگہ سے اتار کر کسی ایک گوشہ میں رکھ دے اس کا نتیجہ یہ تو ضرور ہوگا کہ گھر کا وہ گوشہ زیادہ روشن ہو جائے گا لیکن دوسرا نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ بقیہ گھر بالکل تاریک ہو جائے گا۔ برعکس اس کے دوسرا شخص جو اپنے گھر کے چراغ کو اس کی مرکزی جگہ ہی پر رکھتا ہے اگرچہ اس کے گھر کا کوئی خاص گوشہ زیادہ منور نہیں ہوتا لیکن اس کے گھر کے تمام اطراف میں، روشنی ایک موزوں مقدار میں پہنچتی ہے۔ پس جو لوگ بعض ظاہر تقویٰ کو عین تقویٰ سمجھ بیٹھتے ہیں وہ اپنے تقویٰ کے چراغ کو اپنے دل کے طاق سے، جو مرکز ہے، اتار کر اپنے جسم کے اطراف میں سے کسی گوشہ میں رکھ دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا وہ خاص گوشہ تو روشن ہو جاتا ہے لیکن بقیہ سارے اطراف میں وہی تاریکی ہوتی ہے جو ایک بے چراغ گھر میں ہوتی ہے۔ جو لوگ اس طرح کی غلط فہمی میں مبتلا تھے ان کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متنبہ فرمایا کہ وہ تقویٰ کا مرکز اطراف و اعضا کو نہیں بلکہ دل کو بنائیں تاکہ تمام اطراف روشن ہوں اور ان لوگوں کو حقیر نہ خیال کریں جن کا کوئی ایک گوشہ ہر چند ان کی طرح روشن نہیں لیکن ان کے کسی گوشۂ زندگی میں ظلمت اور فساد نہیں ہے۔ اس روشنی میں حدیث ذیل پر غور فرمائیے۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المسلم اخو المسلم لا یظلمہ ولا یخذلہ ولا یحقرہ، التقوی ھھنا ویشیر الی صدرہ ثلاث مرار بحسب امری من الشر ان یحقر اخاہ المسلم کل المسلم علی المسلم حرام دمہ ومالہ وعرضہ

(رواہ مسلم)

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرے، نہ اسے چھوڑے، نہ حقیر جانے، تقویٰ یہاں ہے (حضور نے دل کی طرف اشارہ فرمایا اور تین بار فرمایا) کسی شخص کی برائی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانتا ہے۔ مسلمان کی ہر چیز مسلمان پر حرام ہے، اس کا خون بھی، اس کا مال بھی، اس کا ناموس بھی

یہ تقویٰ جس کا مرکز دل ہو، جو انسان کی زندگی کے تمام اطراف کو روشن کرے، جو ہر شعبۂ زندگی میں اس کو اللہ کے حدود کا پابند بنائے جس میں کامل توافق ہو، کامل اعتدال ہو، پوری ہمہ گیری ہو، جو نہ ایک قدم اللہ کی حد سے آگے بڑھنے دے، نہ ایک قدم اس سے پیچھے ہٹنے پر راضی ہو، جو دل کو مجبور کرے کہ وہی سوچے جو سوچنا چاہیے، آنکھوں کو مجبور کرے کہ وہی دیکھیں جو دیکھنا چاہیے، کانوں کی نگرانی کرے کہ وہی سنیں جو سننا چاہیے، زبان کی حفاظت

کرے کر وہی بولے جو حق ہے، اور ہاتھ پاؤں کی دیکھ بھال کرے کہ اسی کام کے لیے اور اسی راہ میں انھیں جو اللہ نے
انسان کے لیے کھولی ہے۔ بطن و فرج پر پہرہ بٹھا دے کہ یہ کسی حرام کو حلال یا کسی حلال کو حرام نہ کریں۔ جو خدا کی صحیح
معرفت، آخرت کے سچے خوف، احکام الٰہی کے سچے جذبۂ احترام کے ساتھ ہو، جو انسان کے ظاہر میں بھی ہو اور
اس کے باطن میں بھی ہو، خلوت میں بھی ہو اور جلوت میں بھی ہو۔ یہ تقویٰ ہے جس کی تعلیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ یہی تقویٰ ہے
جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو رونق و جمال بخشتا ہے (اوصیک بتقوی اللہ فانہ ازین لامرک کلہ)
یہی تقویٰ ہے جس کو قرآن میں لباس سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ جس طرح لباس زندگی کو سردی و گرمی کے ناموافق اثرات و
خطرات سے بچاتا ہے اسی طرح یہ بھی انسان کو مادی و روحانی مہالک سے بچاتا ہے۔ جس طرح لباس انسان کی ستر پوشی
کرتا ہے اسی طرح یہ بھی انسان کو معاصی سے بچا کر اس کی پردہ پوشی کرتا ہے اور جس طرح لباس انسان کو زینت و
جمال بخشتا ہے اسی طرح تقویٰ بھی انسان کی ساری زندگی کو سنوار دیتا ہے۔ یہی وہ تقویٰ ہے جس کی تعلیم دینے کے لیے
نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوذرؓ کو برابر چھ روز تک متنبہ کرتے رہے کہ غور سے سننا کچھ باتیں کہنی ہیں اور چھ روز کے
بعد زبان حق ترجمان جو گویا ہوئی تو پہلی بات یہ ارشاد ہوئی کہ اوصیک بتقوی اللہ فی سر امرک و علانیتہ۔

تفہیم القرآن

(۳۰)

التوبہ

(از رکوع ۶)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو تمہیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کے لیے کہا گیا تو تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے[۱]؟ کیا تم نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا؟ ایسا ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ دنیوی زندگی کا یہ سب سروسامان آخرت میں بہت تھوڑا نکلے گا[۲]۔ تم نہ اٹھو گے تو خدا تمہیں دردناک سزا دے گا[۳] اور تمہاری جگہ کسی اور گروہ کو اٹھائے گا[۴] اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔

---

[۱] سورۂ توبہ کا یہ حصہ اس زمانہ میں نازل ہوا تھا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کی تیاری فرما رہے تھے۔

[۲] اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ عالم آخرت کی بے پایاں زندگی اور وہاں کے بے حد و حساب ساز و سامان کو جب تم دیکھو گے تب تمہیں معلوم ہوگا کہ دنیا کے تھوڑے سے عرصۂ حیات میں لطف اندوزی کے جو امکانات تم کو حاصل تھے اور زیادہ سے زیادہ جو اسباب عیش تم کو میسر تھے وہ ان غیر محدود امکانات اور اس نعیم و ملک کبیر کے مقابلہ میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتے، اور اس وقت تم کو اپنی اس ناعاقبت اندیشی و کم نگاہی پر افسوس ہوگا کہ تم نے کیوں ہمارے سمجھانے کے باوجود دنیا کے عارضی اور قلیل منافع کی خاطر اپنے آپ کو ان ابدی اور کثیر منافع سے محروم کر لیا۔ دوسرے یہ کہ متاع حیات دنیا آخرت میں کام آنے والی چیز نہیں ہے۔ یہاں تم خواہ کتنا ہی سروسامان مہیا کر لو، موت کی آخری ہچکی کے ساتھ ہر چیز سے تم کو دست بردار ہونا پڑے گا اور سرحد موت کے دوسری جانب جو عالم ہے وہاں ان میں سے کوئی چیز بھی تمہارے ساتھ منتقل نہ ہوگی۔ وہاں اس کا کوئی حصہ اگر تم پا سکتے ہو تو صرف وہی جسے تم نے خدا کی رضا پر قربان کیا ہو اور جس کی محبت پر تم نے خدا اور اس کے دین کی محبت کو ترجیح دی ہو۔

[۳] اسی سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ جب تک نفیر عام (جنگی خدمت کے لیے عام بلاوا) نہ ہو، یا جب تک کسی علاقے کی مسلم آبادی یا مسلمانوں کے کسی گروہ کو جہاد کے لیے نکلنے کا حکم نہ دیا جائے اس وقت تک تو جہاد فرض کفایہ رہتا ہے، یعنی اگر کچھ لوگ اسے ادا کرتے رہیں تو باقی لوگوں پر سے اس کی فرضیت ساقط ہے۔ لیکن جب امام مسلمین کی طرف سے مسلمانوں کو جہاد کا عام بلاوا ہو جائے، یا کسی خاص گروہ یا خاص علاقے کی آبادی کو بلاوا دے دیا جائے تو پھر جنہیں بلاوا دیا گیا ہو ان پر جہاد فرض عین ہے، حتیٰ کہ جو شخص کسی حقیقی معذوری کے بغیر نہ نکلے اس کا ایمان تک معتبر نہیں ہے۔

[۴] یعنی خدا کا کام کچھ تم پر منحصر نہیں ہے کہ تم کرو گے تو وہ ہوگا ورنہ نہ ہوگا۔ درحقیقت یہ تو خدا کا فضل و احسان ہے کہ وہ تمہیں اپنے دین کی خدمت کا زریں موقع دے رہا ہے۔ اگر تم اپنی نادانی سے اس موقع کو کھو دو گے تو خدا کسی اور قوم کو اس کی توفیق بخش دے گا اور تم نامراد رہ جاؤ گے۔

وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ تم نے اگر نبی کی مدد نہ کی تو کچھ پروا نہیں، اللہ اس کی مدد اس وقت کر چکا ہے جب کافروں نے اسے نکال دیا تھا، جب وہ صرف دو میں کا دوسرا تھا، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا "غم نہ کر، اللہ ہمارے ساتھ ہے"۔[۱] اس وقت اللہ نے اس پر اپنی طرف سے سکونِ قلب نازل کیا اور اس کی مدد ایسے لشکروں سے کی جو تم کو نظر نہ آتے تھے، اور کافروں کا بول نیچا کر دیا۔ اور اللہ کا بول تو اونچا ہی ہے، اللہ زبردست اور دانا و بینا ہے۔ —— نکلو خواہ ہلکے ہو یا بوجھل،[۲] اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ، یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔

اے نبی! اگر فائدہ سہل الحصول ہوتا اور سفر ہلکا ہوتا تو وہ ضرور تمہارے پیچھے چلنے پر آمادہ ہو جاتے، مگر ان پر تو یہ راستہ بہت کٹھن ہو گیا۔[۳] اب وہ خدا کی قسم کھا کھا کر کہیں گے کہ اگر ہم چل سکتے تو یقیناً تمہارے ساتھ چلتے۔ وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

اے نبی! اللہ تمہیں معاف کرے، تم نے کیوں انہیں رخصت دے دی؟[۴] (تمہیں چاہیے تھا کہ خود رخصت نہ دیتے) تاکہ تم پر کھل جاتا کہ کون لوگ سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی تم جان لیتے۔ جو لوگ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ کبھی تم سے

۱ــ اس موقع کا ذکر ہے جب کفارِ مکہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا تہیہ کر لیا تھا اور آپ عین اس رات کو جو قتل کے لیے مقرر کی گئی تھی، مکہ سے نکل کر مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ مسلمانوں کی بڑی تعداد دو دو چار چار کر کے پہلے ہی مدینہ جا چکی تھی۔ مکہ میں صرف وہی مسلمان رہ گئے تھے جو بالکل بے بس تھے یا منافقانہ ایمان رکھتے تھے اور ان پر کوئی بھروسہ نہ کیا جا سکتا تھا۔ اس حالت میں جب آپ کو معلوم ہوا کہ آپ کے قتل کا فیصلہ ہو چکا ہے تو آپ صرف ایک رفیق حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر مکہ سے نکلے، اور اس خیال سے کہ آپ کا تعاقب ضرور کیا جائے گا، آپ نے مدینہ کی راہ چھوڑ کر، جو شمال کی جانب تھی، جنوب کی راہ اختیار کی۔ یہاں تین دن تک آپ غارِ ثور میں چھپے رہے۔ خون کے پیاسے دشمن آپ کو ہر طرف ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ اطرافِ مکہ کی وادیوں کا کوئی گوشہ انہوں نے ایسا نہ چھوڑا جہاں آپ کو تلاش نہ کیا ہو۔ اسی سلسلہ میں ایک مرتبہ ان میں سے چند لوگ عین اس غار کے دہانے پر بھی پہنچ گئے جس میں آپ چھپے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کو سخت خوف لاحق ہوا کہ اگر ان لوگوں میں سے کسی نے ذرا آگے بڑھ کر غار میں جھانک لیا تو وہ ہمیں دیکھ لے گا۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اطمینان میں ذرا فرق نہ آیا اور آپ نے یہ کہہ کر حضرت ابوبکرؓ کو تسکین دی کہ "غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے"۔

۲ــ ہلکے اور بوجھل کے الفاظ بہت وسیع مفہوم رکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب نکلنے کا حکم ہو چکا ہے تو بہر حال تم کو نکلنا چاہیے خواہ رضا و رغبت سے خواہ بکراہت، خواہ خوشحالی میں خواہ تنگ دستی میں، خواہ ساز و سامان کی کثرت کے ساتھ خواہ بے سروسامانی کے ساتھ، خواہ موافق حالات میں خواہ ناموافق حالات میں، خواہ جوان و تندرست خواہ ضعیف و کمزور۔

۳ــ یعنی یہ دیکھ کر کہ مقابلہ روم جیسی طاقت سے ہے اور زمانہ شدید گرمی کا ہے اور ملک میں قحط برپا ہے اور نئے سال کی فصلیں جن سے آس لگی ہوئی تھی، کٹنے کے قریب ہیں، ان کو تبوک کا سفر بہت ہی گراں محسوس ہونے لگا۔

۴ــ بعض منافقین نے بناوٹی عذرات پیش کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رخصت مانگی تھی، اور حضورؐ نے بھی اپنے طبعی حلم کی بنا پر یہ جاننے کے باوجود کہ وہ محض بہانے کر رہے ہیں، ان کو رخصت عطا فرما دی تھی۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے پسند نہیں فرمایا اور آپ کو تنبیہ کی کہ ایسی نرمی مناسب نہیں ہے۔ رخصت دے دینے کی وجہ سے ان منافقوں کو اپنے نفاق پر پردہ ڈالنے کا موقع مل گیا۔ اگر انہیں رخصت نہ دی جاتی اور پھر یہ گھر بیٹھے رہتے تو ان کا جھوٹا دعوائے ایمان بے نقاب ہو جاتا۔

یہ درخواست نہ کریں گے کہ انہیں اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد کرنے سے معاف رکھا جائے، اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے۔ ایسی درخواستیں تو صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے جن کے دلوں میں شک ہے اور وہ اپنے شک ہی میں متردد ہو رہے ہیں۔[۵۱]

اگر واقعی ان کا ارادہ نکلنے کا ہوتا تو وہ اس کے لیے کچھ تیاری کرتے۔[۵۲] لیکن اللہ کو ان کا اٹھنا پسند ہی نہ تھا اس لیے اس نے انہیں سست کر دیا اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھ رہو بیٹھنے والوں کے ساتھ۔ اگر وہ تمہارے ساتھ نکلتے تو تمہارے اندر خرابی کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے۔ وہ تمہارے درمیان فتنہ پردازی کے لیے دوڑ دھوپ کرتے اور تمہارے گروہ کا حال یہ ہے کہ ابھی اس میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو ان کی باتیں کان لگا کر سنتے ہیں، اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ اس سے پہلے بھی ان لوگوں نے فتنہ انگیزی کی کوششیں کی ہیں اور تمہیں ناکام کرنے کے لیے یہ ہر طرح کی تدبیروں کا الٹ پھیر کر چکے ہیں یہاں تک کہ ان کی مرضی کے خلاف حق آ گیا اور اللہ کا کام ہو کر رہا۔

ان میں سے کوئی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے رخصت دے دیجیے اور مجھ کو فتنہ میں نہ ڈالیے۔[۵۳] سن رکھو! فتنے ہی میں تو یہ لوگ پڑے ہوئے ہیں[۵۴] اور جہنم نے ان کافروں کو گھیر رکھا ہے۔[۵۵]

تمہارا بھلا ہوتا ہے تو انہیں رنج ہوتا ہے اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ منہ پھیر کر خوش خوش پلٹتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ اچھا ہوا ہم نے پہلے ہی اپنا معاملہ ٹھیک کر لیا تھا۔ ان سے کہو ہمیں ہرگز کوئی (برائی یا بھلائی) نہیں پہنچتی مگر وہ جو اللہ نے ہمارے

---

[۵۱] اس سے معلوم ہوا کہ کفر و اسلام کی کشمکش ایک کسوٹی ہے جو کھرے مومن اور کھوٹے مدعی ایمان کے فرق کو صاف کھول کر رکھ دیتی ہے۔ جو شخص اس کشمکش میں دل و جان سے اسلام کی حمایت کرے اور اپنی ساری طاقت اور تمام ذرائع اس کو بلند کرنے کی سعی میں کھپا دے اور کسی قربانی سے دریغ نہ کرے وہی سچا مومن ہے۔ بخلاف اس کے جو اس کشمکش میں اسلام کا ساتھ دینے سے جی چرائے اور کفر کی سربلندی کا خطرہ سامنے دیکھتے ہوئے بھی اسلام کی سربلندی کے لیے جان و مال کی بازی کھیلنے سے پہلو تہی کرے، اس کی یہ روش خود اس حقیقت کو واضح کر دیتی ہے کہ اس کے دل میں ایمان نہیں ہے۔

[۵۲] یعنی بادل ناخواستہ اٹھنا اللہ کو پسند نہ تھا۔ کیونکہ جب وہ شرکت جہاد کے جذبے اور نیت سے خالی تھے اور ان کے اندر دین کی سربلندی کے لیے جانفشانی کرنے کی کوئی خواہش نہ تھی، تو وہ صرف مسلمانوں کی شرما شرمی سے بد دلی کے ساتھ یا کسی شرارت کی نیت سے مستعدی کے ساتھ اٹھتے اور یہ چیز ہزار خرابیوں کی موجب ہوتی جیسا کہ بعد والی آیت میں بتصریح فرمایا گیا ہے۔ [۵۳] جو منافق بہانے کر کر کے پیچھے ٹھیر جانے کی اجازت مانگ رہے تھے ان میں سے بعض ایسے بیباک بھی تھے جو راہ خدا سے قدم پیچھے ہٹانے کے لیے مذہبی و اخلاقی نوعیت کے بہانے تراشتے تھے۔ چنانچہ ان میں سے ایک شخص جد بن قیس کے متعلق روایات میں آیا ہے کہ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ میں ایک حسن پرست آدمی ہوں، میری قوم کے لوگ میری اس کمزوری سے واقف ہیں کہ عورت کے معاملہ میں مجھ سے صبر نہیں ہو سکتا۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں رومی عورتوں کو دیکھ کر میرا قدم پھسل نہ جائے۔ لہٰذا آپ مجھے فتنہ میں نہ ڈالیں اور اس جہاد کی شرکت سے مجھ کو معذور رکھیں۔

[۵۴] یعنی نام تو فتنے سے بچنے کا لیتے ہیں مگر درحقیقت نفاق اور جھوٹ اور ریاکاری کا فتنہ بری طرح ان پر مسلط ہے۔ اپنے نزدیک یہ سمجھتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے فتنوں کے امکان سے پریشانی و خوف کا اظہار کر کے یہ بڑے متقی ثابت ہوئے جا رہے ہیں، حالانکہ فی الواقع کفر و اسلام کی فیصلہ کن کشمکش کے موقع پر اسلام کی حمایت سے پہلو تہی کر کے یہ اتنے بڑے فتنے میں مبتلا ہو رہے ہیں جس سے بڑھ کر کسی فتنہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ [۵۵] یعنی تقویٰ کی اس نمائش نے ان کو جہنم سے دور نہیں کیا بلکہ نفاق کی اس لعنت نے انہیں جہنم کے چنگل میں الٹا پھنسا دیا۔

لیے لکھ دی ہے۔ اللہ ہی ہمارا مولیٰ ہے اور اہل ایمان کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے[51]۔"
ان سے کہو، "تم ہمارے معاملہ میں جس چیز کے منتظر ہو وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی ہے[52]۔ اور ہم تمہارے معاملہ میں جس چیز کے منتظر ہیں وہ یہ ہے کہ اللہ خود تم کو سزا دیتا ہے یا ہمارے ہاتھوں دلواتا ہے؟ اچھا تو اب تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی تمہارے ساتھ منتظر ہیں۔"

---

[51] یہاں دنیا پرست اور خدا پرست کی ذہنیت کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ دنیا پرست جو کچھ کرتا ہے اپنے نفس کی خوشنودی کے لیے کرتا ہے اور اس کے نفس کی خوشی بعض دنیوی مقاصد کے حصول پر منحصر ہوتی ہے۔ یہ مقاصد اسے حاصل ہو جائیں تو وہ پھول جاتا ہے اور حاصل نہ ہوں تو اس پر مردنی چھا جاتی ہے۔ پھر اس کا سہارا تمام تر مادی اسباب پر ہوتا ہے۔ وہ سازگار ہوں تو اس کا دل بڑھنے لگتا ہے اور ناسازگار ہوتے نظر آئیں تو اس کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ بخلاف اس کے خدا پرست انسان جو کچھ کرتا ہے اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے اور اس کام میں اس کا بھروسہ اپنی قوت یا مادی اسباب پر نہیں بلکہ اللہ کی ذات پر ہوتا ہے۔ راہ حق میں کام کرتے ہوئے اس پر مصائب نازل ہوں یا کامرانیوں کی بارش ہو، دونوں صورتوں میں وہ یہی سمجھتا ہے کہ جو کچھ اللہ کی مرضی ہے وہ پوری ہو رہی ہے۔ مصائب اس کا دل نہیں توڑ سکتے اور کامیابیاں اس کو اترانے میں مبتلا نہیں کر سکتیں، کیونکہ اول تو دونوں کو وہ اپنے حق میں خدا کی طرف سے ایک آزمائش سمجھتا ہے اور اسے ہر حال میں یہ فکر رہتی ہے کہ خدا کی ڈالی ہوئی اس آزمائش سے بخیریت گزر جاؤں۔ دوسرے اس کے پیش نظر دنیوی مقاصد نہیں ہوتے کہ ان کے لحاظ سے وہ اپنی کامیابی یا ناکامی کا اندازہ کرے۔ بلکہ اس کے سامنے رضائے الٰہی کا مقصد وحید ہوتا ہے اور اس مقصد سے اس کے قریب یا دور ہونے کا پیمانہ کسی دنیوی کامیابی کا حصول یا عدم حصول نہیں ہے بلکہ صرف یہ امر ہے کہ راہ خدا میں جان و مال کی بازی لگانے کا جو فرض اس پر عائد ہوتا تھا اسے اس نے کہاں تک انجام دیا۔ اگر یہ فرض اس نے ادا کر دیا ہو تو خواہ دنیا میں اس کی بازی بالکل ہی ہر گئی ہو لیکن اسے پورا بھروسہ رہتا ہے کہ جس خدا کے لیے اس نے مال کھپایا اور جان دی ہے وہ اس کے اجر کو ضائع کرنے والا نہیں ہے۔ پھر دنیوی اسباب سے وہ آس ہی نہیں لگاتا کہ ان کی سازگاری یا ناسازگاری اس کو خوش یا رنجیدہ کرے۔ بلکہ اس کا سارا اعتماد خدا پر ہوتا ہے جو عالم اسباب کا حاکم ہے، اور اس کے اعتماد پر وہ ناسازگار حالات میں بھی اسی عزم و ہمت کے ساتھ کام کیے جاتا ہے جس کا اظہار اہل دنیا سے صرف سازگار حالات ہی میں ہوا کرتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان دنیا پرست منافقین سے کہہ دو کہ ہمارا معاملہ تمہارے معاملہ سے بنیادی طور پر مختلف ہے، تمہاری خوشی و رنج کے قوانین کچھ اور ہیں اور ہمارے کچھ اور۔ تم اطمینان اور بے اطمینانی کسی اور ماخذ سے لیتے ہو اور ہم کسی اور ماخذ سے۔

[52] منافقین حسب عادت اس موقع پر بھی کفر و اسلام کی اس کشمکش میں حصہ لینے کے بجائے اپنی دانست میں کمال دانشمندی کے ساتھ دور بیٹھے ہوئے یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ اس کشمکش کا انجام کیا ہوتا ہے۔ رسول اور اصحاب رسول فتحیاب ہو کر آتے ہیں یا رومیوں کی فوجی طاقت سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ اس کا جواب انہیں یہ دیا گیا کہ جن دو نتیجوں میں سے ایک کے ظہور کا تمہیں انتظار ہے، اہل ایمان کے لیے تو وہ دونوں ہی سراسر بھلائی ہیں۔ وہ اگر فتحیاب ہوں تو اس کا بھلائی ہونا تو ظاہر ہی ہے، لیکن اگر اپنے مقصد کی راہ میں جانیں لڑاتے ہوئے وہ سب کے سب پیوند خاک ہو جائیں تب بھی دنیا کی نگاہ میں چاہے یہ انتہائی ناکامی ہو، مگر حقیقت میں یہ بھی ایک دوسری کامیابی ہے۔ اس لیے کہ مومن کی کامیابی و ناکامی کا معیار یہ نہیں ہے کہ اس نے کوئی ملک فتح کیا یا نہیں یا کوئی حکومت قائم کر دی یا نہیں، بلکہ اس کا معیار یہ ہے کہ اس نے اپنے خدا کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے اپنے دل و دماغ اور جسم و جان کی ساری قوتیں لڑا دیں یا نہیں۔ یہ کام اگر اس نے کر دیا تو درحقیقت کامیاب ہے خواہ دنیا کے اعتبار سے اس کی سعی کا نتیجہ صفر ہی کیوں نہ ہو۔

ان سے کہو "تم اپنے مال خواہ راضی خوشی خرچ کرو یا بکراہت،[1] بہرحال وہ قبول نہ کیے جائیں گے کیونکہ تم فاسق لوگ ہو۔" ان کے دیے ہوئے مال قبول نہ ہونے کی کوئی وجہ اس کے سوا نہیں ہے کہ انھوں نے اللہ اور رسول کے ساتھ کفر کیا ہے، نماز کے لیے آتے ہیں تو کسمساتے ہوئے آتے ہیں اور راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں تو بادلِ ناخواستہ خرچ کرتے ہیں۔ ان کے مال و دولت اور ان کی کثرتِ اولاد کو دیکھ کر دھوکا نہ کھاؤ، اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ انہی چیزوں کے ذریعہ سے ان کو دنیا کی زندگی ہی میں مبتلائے عذاب کرے[2] اور یہ جان بھی دیں گے تو انکارِ حق ہی کی حالت میں دیں گے۔[3]

وہ خدا کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تمہیں میں سے ہیں، حالانکہ وہ ہرگز تم میں سے نہیں ہیں۔ اصل میں تو وہ ایسے لوگ ہیں جو تم سے خوف زدہ ہیں۔ اگر وہ کوئی جائے پناہ پالیں یا کوئی کھوہ یا گھس بیٹھنے کی جگہ، تو بھاگ کر اس میں جا چھپیں۔[4]

---

[1] بعض منافق ایسے بھی تھے جو اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کے لیے تو تیار نہ تھے، مگر یہ بھی نہ چاہتے تھے کہ اس جہاد اور اس کی سعی سے بالکل بے تعلق رہ کر مسلمانوں کی نگاہ میں اپنی ساری وقعت کھو دیں اور اپنے نفاق کو علانیہ ظاہر کر دیں، اس لیے وہ کہتے تھے کہ ہم جنگی خدمت انجام دینے سے تو اس وقت معذور چاہتے ہیں لیکن مال سے مدد کرنے کے لیے حاضر ہیں۔

[2] یعنی اس مال و اولاد کی محبت میں گرفتار ہو کر جو منافقانہ رویہ انھوں نے اختیار کیا ہے، اس کی وجہ سے مسلم سوسائٹی میں یہ انتہائی ذلیل و خوار ہو کر رہیں گے اور وہ ساری شانِ ریاست، عزت و ناموری اور شیخیت و چودھراہٹ جو اب تک عرب سوسائٹی میں ان کو حاصل رہی ہے، نئے اسلامی نظامِ اجتماعی میں وہ خاک میں مل جائے گی۔ ادنیٰ ادنیٰ غلام اور غلام زادے اور معمولی کاشتکار اور چرواہے جنھوں نے اخلاصِ ایمانی کا ثبوت دیا ہے، اس نئے نظام میں باعزت ہوں گے، اور یہ خاندانی چودھری اپنی دنیا پرستی کی بدولت بے عزت ہو کر رہ جائیں گے۔

[3] یعنی اس ذلت و رسوائی سے بڑھ کر مصیبت ان کے لیے یہ ہوگی کہ جن منافقانہ اوصاف کو یہ اپنے اندر پرورش کر رہے ہیں ان کی بدولت انھیں مرتے دم تک صدقِ ایمانی کی توفیق نصیب نہ ہوگی اور اپنی دنیا خراب کر لینے کے بعد یہ اس حال میں دنیا سے رخصت ہوں گے کہ آخرت بھی خراب بلکہ خراب تر ہوگی۔

[4] مدینہ کے یہ منافق زیادہ تر مالدار اور سن رسیدہ لوگ تھے۔ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں ان کی جو فہرست دی ہے اس میں صرف ایک نوجوان کا ذکر ملتا ہے اور غریب ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ یہ لوگ مدینہ میں جائدادیں اور پھیلے ہوئے کاروبار رکھتے تھے اور جہاندیدگی نے ان کو مصلحت پرست بنا دیا تھا۔ اسلام جب مدینہ پہنچا اور آبادی کے ایک بڑے حصہ نے پورے اخلاص اور جوشِ ایمانی کے ساتھ اسے قبول کر لیا، تو ان لوگوں نے اپنے آپ کو ایک عجیب مخمصہ میں مبتلا پایا۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک طرف تو خود ان کے اپنے قبیلوں کی اکثریت بلکہ ان کے بیٹوں اور بیٹیوں تک کو اس نئے دین نے ایمان کے نشے سے سرشار کر دیا ہے اور ان کے خلاف اگر وہ کفر و انکار پر قائم رہتے ہیں تو ان کی ریاست، عزت، شہرت سب خاک میں مل جاتی ہے حتیٰ کہ ان کے اپنے گھروں میں ان کے خلاف بغاوت برپا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ دوسری طرف اس دین کا ساتھ دینے کے معنی یہ ہیں کہ وہ سارے عرب سے بلکہ اطراف و نواح کی قوموں اور سلطنتوں سے بھی لڑائی مول لینے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اغراضِ نفسانی کی بندگی نے معاملہ کے اس پہلو پر نظر کرنے کی استعداد تو ان کے اندر باقی ہی نہیں رہنے دی تھی کہ حق اور صداقت بجائے خود بھی کوئی قیمتی چیز ہے جس کے عشق میں انسان خطرات مول لے سکتا ہے اور جان و مال کی قربانیاں گوارا کر سکتا ہے۔ وہ دنیا کے سارے معاملات و مسائل پر صرف مفاد اور مصلحت ہی کے لحاظ سے نگاہ ڈالنے کے خوگر ہو چکے تھے۔ اس لیے ان کو اپنے مفاد کے تحفظ کی بہترین صورت یہی نظر آئی کہ ایمان کا دعویٰ کریں تاکہ اپنی قوم کے درمیان اپنی ظاہری عزت اور اپنی (باقی حاشیہ صفحہ ۱۷ پر)

اے نبی، ان میں سے بعض لوگ صدقات کی تقسیم میں تم پر اعتراضات کرتے ہیں۔ اگر اس مال میں سے انھیں کچھ دے دیا جائے تو خوش ہو جائیں، اور نہ دیا جائے تو بگڑنے لگتے ہیں۔[۵۸] کیا اچھا ہوتا کہ اللہ اور رسول نے جو کچھ بھی انھیں دیا تھا اس پر وہ راضی رہتے[۵۹] اور کہتے کہ "اللہ ہمارے لیے کافی ہے، وہ اپنے فضل سے ہمیں اور بہت کچھ دے گا اور اس کا رسول بھی ہم پر عنایت فرمائے گا،[۶۰] ہم اللہ ہی کی طرف نظر جمائے ہوئے ہیں"۔[۶۱] یہ صدقات تو دراصل فقیروں[۶۲] اور مسکینوں[۶۳] کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۶) جائدادیں اور اپنے کاروبار کو برقرار رکھ سکیں، مگر مخلصانہ ایمان نہ اختیار کریں تاکہ ان خطرات و نقصانات سے دوچار نہ ہوں جو اخلاص کی راہ اختیار کرنے سے لازماً پیش آنے تھے۔ ان کی اسی ذہنی کیفیت کو یہاں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ حقیقت میں یہ لوگ تمہارے ساتھ نہیں ہیں بلکہ نقصانات کے خوف نے انھیں زبردستی تمہارے ساتھ باندھ دیا ہے۔ جو چیز انھیں اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرائیں وہ صرف یہ خوف ہے کہ مدینہ میں رہتے ہوئے اگر وہ غیر مسلم ہوں تو جاہ و منزلت ختم ہوتی ہے اور بیوی بچوں تک سے تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں۔ مدینہ کو چھوڑ دیں تو اپنی جائدادوں اور تجارتوں سے دست بردار ہونا پڑتا ہے، اور ان کے اندر کفر کے لیے بھی اتنا اخلاص نہیں ہے کہ اس کی خاطر وہ ان نقصانات کو برداشت کرنے پر تیار ہو جائیں۔ اس مخمصے نے انھیں کچھ ایسا پھانس رکھا ہے کہ مجبوراً مدینہ میں بیٹھے ہوئے ہیں، بادلِ ناخواستہ نمازیں پڑھ رہے ہیں اور زکوٰۃ کا جرمانہ بھگت رہے ہیں۔ ورنہ آئے دن جہاد اور آئے دن کسی نہ کسی خوفناک دشمن کے مقابلے اور آئے دن جان و مال کی قربانیوں کے مطالبے کی جو "مصیبت" ان پر پڑی ہوئی ہے اس سے بچنے کے لیے یہ اس قدر بے چین ہیں کہ اگر کوئی سوراخ یا بل بھی ایسا نظر آ جائے جس میں انھیں امن ملنے کی امید ہو تو یہ بھاگ کر اس میں گھس بیٹھیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۵۸ عرب میں یہ پہلا موقع تھا کہ ملک کے تمام ان باشندوں پر جو ایک مقرر مقدار سے زائد مال رکھتے تھے، باقاعدہ زکوٰۃ عائد کی گئی تھی، اور وہ ان کی زرعی پیداوار سے، ان کے مویشیوں سے، ان کے اموالِ تجارت سے، ان کے معادن اور دفینوں سے اور ان کے سونے چاندی کے ذخائر سے ۲½ فیصدی، ۵ فیصدی، اور ۱۰ فیصدی کی مختلف شرحوں کے مطابق وصول کی جاتی تھی۔ یہ سب اموالِ زکوٰۃ ایک منظم طریقہ سے وصول کیے جاتے اور ایک مرکز پر جمع ہو کر منظم طریقہ سے خرچ کیے جاتے۔ اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ملک کے اطراف سے اتنی دولت سمٹ کر آتی اور آپ کے ہاتھوں خرچ ہوتی تھی جو عرب کے لوگوں نے کبھی اس سے پہلے کسی ایک شخص کے ہاتھوں جمع اور تقسیم ہوتے نہیں دیکھی تھی۔ دنیا پرست منافقین کے منہ میں اس دولت کو دیکھ کر پانی بھر بھر آتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس بہتے ہوئے دریا سے ان کو خوب سیر ہو کر پینے کا موقع ملے۔ مگر یہاں پلانے والا خود اپنے اوپر اور اپنے متعلقین پر اس دریا کے ایک ایک قطرے کو حرام کر چکا تھا اور کوئی یہ توقع نہ کر سکتا تھا کہ اس کے ہاتھوں سے مستحق لوگوں کے سوا کسی اور کے لب تک جام پہنچ سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ منافقین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تقسیمِ صدقات کو دیکھ دیکھ کر دلوں میں گھٹتے تھے اور ہر تقسیم کے موقع پر آپ کو طرح طرح کے الزامات سے مطعون کرتے تھے۔ دراصل شکایت تو انھیں یہ تھی کہ اس مال پر ہمیں دست درازی کا موقع نہیں دیا جاتا، مگر اس حقیقی شکایت کو چھپا کر وہ الزام یہ رکھتے تھے کہ مال کی تقسیم انصاف سے نہیں کی جاتی اور اس میں جانب داری سے کام لیا جاتا ہے۔ ۵۹ یعنی مالِ غنیمت میں جو حصہ یہ لوگ پاتے رہے ہیں اس پر قانع رہتے، اور خدا کے فضل سے جو کچھ یہ کماتے ہیں اور خدا کے دیے ہوئے ذرائع آمدنی سے جو خوشحالی انھیں میسر ہے اس کو اپنے لیے کافی سمجھتے۔ ۶۰ یعنی زکوٰۃ کے علاوہ جو اموال حکومت کے خزانے میں آئیں گے اُن سے حسبِ استحقاق ان لوگوں کو اسی طرح استفادہ کا موقع حاصل رہے گا جس طرح پہلے رہا ہے۔ ۶۱ یعنی ہماری نظر دنیا اور اس کی متاعِ حقیر پر نہیں بلکہ اللہ اور اس کے فضل و کرم پر ہے۔ اسی کی خوشنودی ہم چاہتے ہیں، اسی سے امید رکھتے ہیں، اور جو کچھ وہ دے اُس پر راضی ہیں۔ ۶۲ فقیر سے مراد ہر وہ شخص ہے جو اپنی معیشت کے لیے دوسرے کی مدد کا محتاج ہو۔ یہ لفظ تمام حاجت مندوں کے لیے عام ہے خواہ وہ جسمانی نقص یا بڑھاپے کی وجہ سے مستقل طور پر محتاجِ اعانت ہو گئے ہوں، یا کسی عارضی سبب سے سردست مدد کے محتاج ہوں اور اگر انھیں سہارا مل جائے تو آگے چل کر خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہوں، مثلاً یتیم بچے، بیوہ عورتیں، (باقی حاشیہ صفحہ ۱۸)

جو صدقات کے کام پر مامور ہوں،[55] اور ان کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو،[56] نیز یہ گردنوں کے چھڑانے اور قرض داروں کی مدد

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷) بے روزگار لوگ اور وہ لوگ جو وقتی حوادث کے شکار ہو گئے ہوں۔ ۵۴ مسکنت کے لفظ میں عاجزی، درماندگی، بے چارگی اور ذلت کے مفہومات شامل ہیں اور اس اعتبار سے مساکین وہ لوگ ہیں جو عام حاجت مندوں کی بہ نسبت زیادہ خستہ حال ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لفظ کی تشریح کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ ایسے لوگوں کو مستحق امداد ٹھیرایا ہے جو اپنی ضروریات کے مطابق ذرائع نہ پا رہے ہوں اور سخت تنگ حال ہوں، مگر نہ تو ان کی خودداری کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی اجازت دیتی ہو اور نہ ان کی ظاہری پوزیشن ایسی ہو کہ کوئی انھیں حاجت مند سمجھ کر ان کی مدد کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ چنانچہ حدیث میں اس کی تشریح یوں آئی ہے کہ المسکین الذی لا یجد غنی یغنیہ ولا یفطن لہ فیتصدق علیہ ولا یقوم فیسئال الناس۔ "مسکین وہ ہے جو اپنی حاجت بھر مال نہیں پاتا، اور نہ پہچانا جاتا ہے کہ اس کی مدد کی جائے، اور نہ کھڑا ہو کر لوگوں سے مانگتا ہے۔"

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۵۵ یعنی وہ لوگ جو صدقات وصول کرنے اور وصول شدہ مال کی حفاظت کرنے اور ان کا حساب کتاب لکھنے اور انھیں تقسیم کرنے میں حکومت کی طرف سے استعمال کیے جائیں۔ ایسے لوگ خواہ فقیر و مسکین نہ ہوں، ان کی تنخواہیں بہرحال صدقات ہی کی مد سے دی جائیں گی۔

اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات اور اپنے خاندان (یعنی بنی ہاشم) پر زکوٰۃ کا مال حرام قرار دیا تھا۔ چنانچہ آپ نے خود بھی صدقات کی تحصیل و تقسیم کا کام ہمیشہ بلا معاوضہ کیا اور دوسرے بنی ہاشم کے لیے بھی یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ اگر وہ اس خدمت کو بلا معاوضہ انجام دیں تو جائز ہے، لیکن معاوضہ لے کر اس شعبے کی کوئی خدمت کرنا ان کے لیے جائز نہیں ہے۔ آپ کے خاندان کے لوگ اگر صاحب نصاب ہوں تو زکوٰۃ دینا ان پر فرض ہے، لیکن اگر وہ غریب و محتاج یا قرض دار یا مسافر ہوں تو زکوٰۃ لینا ان کے لیے حرام ہے۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ خود بنی ہاشم کی زکوٰۃ بھی بنی ہاشم لے سکتے ہیں یا نہیں۔ امام ابو یوسف کی رائے یہ ہے کہ لے سکتے ہیں۔ لیکن اکثر فقہا اس کو بھی جائز نہیں رکھتے۔

۵۶ تالیف قلب کے معنی ہیں دل موہنا۔ اس حکم سے مقصود یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کی مخالفت میں سرگرم ہوں اور مال دے کر ان کے جوش عداوت کو ٹھنڈا کیا جا سکتا ہو، یا جو لوگ کفار کے کیمپ میں ایسے ہوں کہ اگر مال سے انھیں توڑا جائے تو ٹوٹ کر مسلمانوں کے مددگار بن سکتے ہوں، یا جو لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہوں اور ان کی سابقہ عداوت یا ان کی کمزوری کو دیکھتے ہوئے اندیشہ ہو کہ اگر مال سے ان کی استمالت نہ کی گئی تو پھر کفر کی طرف پلٹ جائیں گے، ایسے لوگوں کو مستقل وظائف یا وقتی عطیے دے کر اسلام کا حامی و مددگار، یا مطیع و فرمان بردار، یا کم از کم بے ضرر دشمن بنا لیا جائے۔ اس مد پر غنائم اور دوسرے ذرائع آمدنی سے بھی مال خرچ کیا جا سکتا ہے اور اگر ضرورت ہو تو زکوٰۃ کی مد سے بھی۔ اور ایسے لوگوں کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ فقیر و مسکین یا مسافر ہوں تب ہی ان کی مدد زکوٰۃ سے کی جا سکتی ہے، بلکہ وہ مالدار و رئیس ہونے پر بھی زکوٰۃ دیے جانے کے مستحق ہیں۔

یہ امر تو متفق علیہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بہت سے لوگوں کو تالیف قلب کے لیے وظیفے اور عطیے دیے جاتے تھے۔ لیکن اس امر میں اختلاف ہو گیا ہے کہ آیا آپ کے بعد بھی یہ مد باقی رہی یا نہیں۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کی رائے یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے سے یہ مد ساقط ہو گئی ہے اور اب مؤلفۃ القلوب کو کچھ دینا جائز نہیں ہے۔ امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ فاسق مسلمانوں کو تالیف قلب کے لیے زکوٰۃ کی مد سے دیا جا سکتا ہے مگر کفار کو نہیں۔ اور بعض دوسرے فقہا کے نزدیک مؤلفۃ القلوب کا حصہ اب بھی باقی ہے اگر اس کی ضرورت ہو۔

حنفیہ کا استدلال اس واقعہ سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عُیَینہ بن حِصن اور اقرع بن حابس حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور انھوں نے ایک زمین آپ سے طلب کی۔ آپ نے ان کو عطیہ کا فرمان لکھ دیا۔ انھوں نے چاہا کہ مزید پختگی کے لیے دوسرے اعیان صحابہ بھی اس فرمان پر گواہیاں ثبت کر دیں۔ چنانچہ (باقی حاشیہ صفحہ ۱۹ پر)

کرنے میں[۵۱] اور راہ خدا میں[۵۲] اور مسافر نوازی میں[۵۳] استعمال کرنے کے لیے ہیں۔ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸) گواہیاں بھی ہو گئیں۔ مگر جب یہ لوگ حضرت عمرؓ کے پاس گواہی لینے گئے تو انھوں نے فرمان کو پڑھ کر اسے ان کی آنکھوں کے سامنے چاک کر دیا اور ان سے کہا کہ بے شک نبی صلی اللہ علیہ وسلم تم لوگوں کی تالیف قلب کے لیے تمہیں دیا کرتے تھے، مگر وہ اسلام کی کمزوری کا زمانہ تھا۔ اب اللہ نے اسلام کو تم جیسے لوگوں سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اس پر وہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس شکایت لے کر آئے اور آپ کو طعنہ بھی دیا کہ خلیفہ آپ ہیں یا عمر؟ لیکن نہ تو حضرت ابوبکرؓ ہی نے اس پر کوئی نوٹس لیا اور نہ ہی دوسرے صحابہ میں سے کسی نے حضرت عمرؓ کی اس رائے سے اختلاف کیا۔ اس سے حنفیہ یہ دلیل لاتے ہیں کہ جب مسلمان کثیر التعداد ہو گئے اور ان کو یہ طاقت حاصل ہو گئی کہ اپنے بل بوتے پر کھڑے ہو سکیں تو وہ سبب باقی نہیں رہا جس کی وجہ سے ابتداءً مؤلفۃ القلوب کا حصہ رکھا گیا تھا، اس لیے باجماع صحابہ یہ حصہ ہمیشہ کے لیے ساقط ہو گیا۔

امام شافعیؒ کا استدلال یہ ہے کہ تالیف قلب کے لیے کفار کو مال زکوٰۃ دینا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے ثابت نہیں ہے۔ جتنے واقعات حدیث میں ہم کو ملتے ہیں ان سب سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے کفار کو تالیف قلب کے لیے جو کچھ دیا وہ مال غنیمت سے دیا نہ کہ مال زکوٰۃ سے۔

ہمارے نزدیک حق یہ ہے کہ مؤلفۃ القلوب کا حصہ قیامت تک کے لیے ساقط ہو جانے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلاشبہ حضرت عمرؓ نے جو کچھ کیا وہ بالکل صحیح تھا۔ اگر اسلامی حکومت تالیف قلب کے لیے مال صرف کرنے کی ضرورت نہ سمجھتی ہو تو کسی نے اس پر فرض نہیں کیا ہے کہ ضرور ہی اس مد میں کچھ نہ کچھ صرف کرے۔ لیکن اگر کسی وقت اس کی ضرورت محسوس ہو، تو اللہ نے اس کے لیے جو گنجائش رکھی ہے اسے باقی رہنا چاہیے۔ حضرت عمرؓ اور صحابہ کرام کا اجماع جس امر پر ہوا تھا وہ صرف یہ تھا کہ ان کے زمانہ میں جو حالات تھے ان میں تالیف قلب کے لیے کسی کو کچھ دینے کی وہ حضرات ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ صحابہ کے اجماع نے اُس مد کو قیامت تک کے لیے ساقط کر دیا جو قرآن میں بعض اہم مصالح دینی کے لیے رکھی گئی تھی۔

رہی امام شافعیؒ کی رائے تو وہ اس حد تک تو صحیح معلوم ہوتی ہے کہ جب حکومت کے پاس دوسری مدات آمدنی سے کافی مال موجود ہو تو اسے تالیف قلب کی مد پر زکوٰۃ کا مال صرف نہ کرنا چاہیے، لیکن جب زکوٰۃ کے مال سے اس کام میں مدد لینے کی ضرورت پیش آجائے تو پھر یہ تفریق کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ فاسقوں پر اسے صرف کیا جائے اور کافروں پر نہ کیا جائے۔ اس لیے کہ قرآن میں مؤلفۃ القلوب کا جو حصہ رکھا گیا ہے وہ ان کے دعوائے ایمان کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس بنا پر ہے کہ اسلام کو اپنے مصالح کے لیے ان کی تالیف قلب مطلوب ہے اور وہ اس قسم کے لوگ ہیں کہ ان کی تالیف قلب صرف مال کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے۔ یہ حاجت اور یہ صفت جہاں بھی متحقق ہو وہاں امام المسلمین بشرط ضرورت زکوٰۃ کا مال صرف کرنے کا از روئے قرآن مجاز ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر اس مد سے کفار کو کچھ نہیں دیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کے پاس دوسری مدات کا مال موجود تھا۔ ورنہ اگر آپ کے نزدیک کفار پر اس مد کا مال صرف کرنا جائز نہ ہوتا تو آپ اس کی تصریح فرمانے۔ [۵۲] گردنیں چھڑانے سے مراد یہ ہے کہ غلاموں کی آزادی میں زکوٰۃ کا مال صرف کیا جائے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس غلام نے اپنے مالک سے یہ معاہدہ کر لیا ہو کہ اگر میں اتنی رقم تمہیں ادا کر دوں تو تم مجھے آزاد کر دو، اسے آزادی کی قیمت ادا کرنے میں مدد دی جائے۔ دوسرے یہ کہ خود زکوٰۃ کی مد سے غلام خرید کر آزاد کیے جائیں۔ ان میں سے پہلی صورت پر تو سب فقہا متفق ہیں۔ لیکن دوسری صورت کو حضرت علی، سعید بن جبیر، لیث، ثوری، ابراہیم نخعی، شعبی، محمد بن سیرین، حنفیہ اور شافعیہ ناجائز کہتے ہیں، اور ابن عباس، حسن بصری، مالک، احمد اور ابو ثور جائز قرار دیتے ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۵۱] یعنی ایسے قرض دار جو اگر اپنے مال سے اپنا پورا قرض چکا دیں تو ان کے پاس قدر نصاب سے کم مال بچ سکتا ہو۔ وہ خواہ کمانے والے ہوں یا بے روزگار، اور خواہ عرف عام میں فقیر سمجھے جاتے ہوں یا غنی، دونوں صورتوں میں ان کی اعانت زکوٰۃ کی مد سے کی جا سکتی ہے۔ مگر متعدد فقہا کی رائے یہ ہے کہ جس شخص نے بداعمالیوں اور فضول خرچیوں میں اپنا مال اڑا کر اپنے آپ کو قرضداری میں مبتلا کیا ہو اس کی مدد نہ کی جائے جب تک وہ توبہ نہ کر لے۔

(حاشیہ ۵۲ و ۵۳، صفحہ ۲۰ پر)

جاننے والا اور دانا و بینا ہے۔

ان میں سے کچھ لوگ ہیں جو اپنی باتوں سے نبی کو دکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص کانوں کا کچا ہے۔[1] کہو، "وہ تمہاری بھلائی کے لیے ایسا ہے،[2] اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور اہل ایمان پر اعتماد کرتا ہے[3] اور سراسر رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو تم میں سے ایماندار

(حاشیہ ۲، ۳ صفحہ ۱۹) [2] راہِ خدا کا لفظ عام ہے۔ تمام وہ نیکی کے کام جن میں اللہ کی رضا ہو، اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس حکم کی رو سے زکوٰۃ کا مال ہر قسم کے نیک کاموں پر صرف کیا جاسکتا ہے۔ لیکن حق یہ ہے، اور ائمہ سلف کی بڑی اکثریت اسی کی قائل ہے کہ یہاں فی سبیل اللہ سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے یعنی وہ جدوجہد جس سے مقصود نظام کفر کو مٹانا اور اس کی جگہ نظام اسلامی کو قائم کرنا ہو۔ اس جدوجہد میں جو لوگ کام کریں ان کو سفر خرچ کے لیے، سواری کے لیے، آلات و اسلحہ اور سروسامان کی فراہمی کے لیے زکوٰۃ سے مدد دی جاسکتی ہے خواہ وہ بجائے خود کھاتے پیتے لوگ ہوں اور اپنی ذاتی ضروریات کے لیے ان کو مدد کی ضرورت نہ ہو۔ اسی طرح جو لوگ رضاکارانہ اپنی تمام خدمات اور اپنا تمام وقت، عارضی طور پر یا مستقل طور پر اس کام کے لیے دے دیں ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بھی زکوٰۃ سے وقتی یا استمراری اعانتیں دی جاسکتی ہیں۔

یہاں یہ بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ ائمہ سلف کے کلام میں بالعموم اس موقع پر غزوہ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو قتال کا ہم معنی ہے، اس لیے لوگ یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ زکوٰۃ کے مصارف میں فی سبیل اللہ کی جو مد رکھی گئی ہے وہ صرف قتال کے لیے مخصوص ہے۔ لیکن درحقیقت جہاد فی سبیل اللہ، قتال سے وسیع تر چیز کا نام ہے اور اس کا اطلاق ان تمام کوششوں پر ہوتا ہے جو کلمۂ کفر کو پست اور کلمۂ خدا کو بلند کرنے اور اللہ کے دین کو ایک نظام زندگی کی حیثیت سے قائم کرنے کے لیے کی جائیں، خواہ وہ دعوت و تبلیغ کے ابتدائی مرحلے میں ہوں یا قتال کے آخری مرحلے میں۔

[3] مسافر خواہ اپنے گھر میں غنی ہو لیکن حالت سفر میں اگر وہ مدد کا محتاج ہو جائے تو اس کی مدد زکوٰۃ کی مد سے کی جائے گی۔

یہاں بعض فقہا نے یہ شرط لگائی ہے کہ جس شخص کا سفر معصیت کے لیے نہ ہو صرف وہی اس آیت کی رو سے مدد کا مستحق ہے۔ مگر قرآن و حدیث میں ایسی کوئی شرط موجود نہیں ہے، اور دین کی اصولی تعلیمات سے ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص مدد کا محتاج ہو اس کی دستگیری کرنے میں اس کی گناہ گاری مانع نہ ہونی چاہیے۔ بلکہ فی الواقع گناہ گاروں اور اخلاقی پستی میں گرے ہوئے لوگوں کی اصلاح کا بہت بڑا ذریعہ یہ ہے کہ مصیبت کے وقت ان کو سہارا دیا جائے اور حسن سلوک سے ان کے نفس کو پاک کرنے کی کوشش کی جائے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] منافقین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جن عیوب سے متہم کرتے تھے ان میں سے ایک یہ بات بھی تھی کہ حضور ہر شخص کی سن لیتے تھے اور ہر ایک کو اپنی بات کہنے کا موقع دیا کرتے تھے۔ یہ خوبی ان کی نگاہ میں عیب تھی۔ کہتے تھے کہ آپ کانوں کے کچے ہیں، جس کا جی چاہتا ہے آپ کے پاس پہنچ جاتا ہے جس طرح چاہتا ہے آپ کے کان بھرتا ہے، اور آپ اس کی بات مان لیتے ہیں۔ اس الزام کا چرچا زیادہ تر اس وجہ سے کیا جاتا تھا کہ سچے اہل ایمان ان منافقین کی سازشوں اور ان کی شرارتوں اور ان کی مخالفانہ گفتگوؤں کا حال نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دیا کرتے تھے اور اس پر یہ لوگ سیخ پا ہو کر کہتے تھے کہ آپ ہم جیسے شرفا و معززین کے خلاف ہر کنگلے اور ہر فقیر کی دی ہوئی خبروں پر یقین کر لیتے ہیں۔

[2] جواب میں ایک جامع بات ارشاد ہوئی ہے جو اپنے اندر دو پہلو رکھتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ فساد اور شر کی باتیں سننے والا آدمی نہیں ہے بلکہ صرف انہی باتوں پر توجہ کرتا ہے جن میں خیر اور بھلائی ہے اور جن کی طرف التفات کرنا امت کی بہتری اور دین کی مصلحت کے لیے مفید ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کا ایسا ہونا تمہارے ہی لیے بھلائی ہے۔ اگر وہ ہر ایک کی سن لینے والا اور ضبط و تحمل سے کام لینے والا آدمی نہ ہوتا تو ایمان کے وہ جھوٹے دعوے اور خیر سگالی کی وہ نمائشی باتیں اور راہ خدا سے بھاگنے کے لیے وہ معذرات لنگ جو تم کیا کرتے ہو انہیں صبر سے سننے کے بجائے تمہاری خبر لے ڈالتا اور تمہارے

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۰ پر)

ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کے رسول کو دکھ دیتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے"۔

یہ لوگ تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تمھیں راضی کریں حالانکہ اگر یہ مومن ہیں تو اللہ اور رسول اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ یہ ان کو راضی کرنے کی فکر کریں کیا انھیں معلوم نہیں ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کرتا ہے اس کے لیے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور یہ بہت بڑی رسوائی ہے؟

یہ منافق ڈر رہے ہیں کہ کہیں ان پر کوئی ایسی سورت نازل نہ ہو جائے جو ان کے دلوں کے بھید کھول کر رکھ دے۔[71] اے نبی! ان سے کہو "اور مذاق اڑاؤ، اللہ اس چیز کو کھول دینے والا ہے جس کے کھل جانے سے تم ڈرتے ہو۔" اگر ان سے پوچھو کہ تم کیا باتیں کر رہے تھے، تو جھٹ کہہ دیں گے کہ ہم تو ہنسی مذاق اور دل لگی کر رہے تھے۔[72] ان سے کہو "کیا تمہاری ہنسی دل لگی اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسول ہی کے ساتھ تھی؟ اب عذرات نہ تراشو، تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا ہے۔ اگر ہم نے تم میں سے ایک گروہ کو معاف بھی کر دیا تو دوسرے گروہ کو ہم ضرور سزا دیں گے کیونکہ وہ مجرم ہے"۔[73]

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک دوسرے کے ہم رنگ ہیں۔ برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھ خیر سے روک رکھتے ہیں۔[74] یہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے بھی انھیں بھلا دیا۔ یقیناً یہ منافق ہی فاسق ہیں۔ ان منافق مردوں اور عورتوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰) لیے مدینہ میں جینا دشوار ہو جاتا۔ پس اس کی یہ صفت تو تمہارے حق میں اچھی ہے نہ کہ بری۔ [70] یعنی تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ وہ ہر ایک کی بات پر یقین لے آتا ہے۔ وہ چاہے سنتا سب کی ہو مگر اعتماد صرف انہی لوگوں پر کرتا ہے جو سچے مومن ہیں۔ تمہاری جن شرارتوں کی خبریں اس تک پہنچیں اور اس نے ان پر یقین کیا وہ بد اخلاق چغل خوروں کی پہنچائی ہوئی نہ تھیں بلکہ صالح اہل ایمان کی پہنچائی ہوئی تھیں اور اس قابل تھیں کہ ان پر اعتماد کیا جاتا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [71] یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر سچا ایمان تو نہیں رکھتے تھے لیکن جو تجربات انھیں پچھلے آٹھ نو سالوں کے دوران میں ہو چکے تھے ان کی بنا پر انھیں اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ آپ کے پاس کوئی نہ کوئی فوق الفطری ذریعۂ معلومات ضرور ہے جس سے آپ کو ان کے پوشیدہ رازوں تک کی خبر پہنچ جاتی ہے اور بسا اوقات قرآن میں (جسے وہ حضور کی اپنی تصنیف سمجھتے تھے) آپ ان کے نفاق اور ان کی سازشوں کو بے نقاب کر کے رکھ دیتے ہیں۔

[72] غزوہ تبوک کی تیاری کے زمانہ میں بہت سے منافق اپنی مجلسوں میں بیٹھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا مذاق اڑاتے تھے اور اپنی تضحیک سے ان لوگوں کی ہمتیں پست کرنے کی کوشش کرتے تھے جنھیں وہ نیک نیتی کے ساتھ جنگ کی تیاری میں مشغول پاتے۔ چنانچہ روایات میں ان لوگوں کے بہت سے اقوال منقول ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک محفل میں چند منافق بیٹھے گپ اڑا رہے تھے۔ ایک نے کہا "اجی کیا رومیوں کو بھی تم نے کچھ عربوں کی طرح سمجھ رکھا ہے؟ کل دیکھ لینا کہ یہ سورما جو لڑنے تشریف لائے ہیں رسیوں میں بندھے ہوئے ہوں گے۔" دوسرا بولا "مزا ہو جو اوپر سے سو سو کوڑے بھی لگانے کا حکم ہو جائے۔" ایک اور منافق نے حضور کو جنگ کی سرگرم تیاریاں کرتے دیکھ کر اپنے یار دوستوں سے کہا "آپ کو دیکھیے، آپ روم و شام کے قلعے فتح کرنے چلے ہیں۔"

[73] یعنی وہ کم عقل مسخرے تو معاف بھی کیے جا سکتے ہیں جو صرف اس لیے ایسی باتیں کرتے اور ان میں دلچسپی لیتے ہیں کہ ان کے نزدیک دنیا میں کوئی چیز سنجیدہ ہے ہی نہیں۔ لیکن جن لوگوں نے جان بوجھ کر یہ باتیں اس لیے کی ہیں کہ وہ رسول اور اس کے لائے ہوئے دین کو اپنے دعوائے ایمان کے باوجود ایک مضحکہ سمجھتے ہیں، اور جن کے اس تمسخر کا اصل مدعا یہ ہے کہ اہل ایمان کی ہمتیں پست ہوں اور وہ پوری قوت کے ساتھ جہاد کی تیاری نہ کر سکیں، ان کو تو ہرگز معاف نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ مسخرے نہیں بلکہ مجرم ہیں۔

[74] یہ تمام منافقین کی مشترک خصوصیت ہے۔ ان سب کو برائی سے دلچسپی اور بھلائی سے عداوت ہوتی ہے۔ کوئی شخص برا کام کرنا چاہے تو ان کی ہمدردیاں،

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۳ پر)

اور کافروں کے لیے اللہ نے آتشِ دوزخ کا وعدہ کیا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، وہی ان کے لیے موزوں ہے۔ ان پر اللہ کی پھٹکار ہے اور ان کے لیے قائم رہنے والا عذاب ہے ۔۔۔ تم لوگوں[۵۱] کے رنگ ڈھنگ وہی ہیں جو تمھارے پیش روؤں کے تھے۔ وہ تم سے زیادہ زور آور اور تم سے بڑھ کر مال اور اولاد والے تھے۔ پھر انھوں نے دنیا میں اپنے حصے کے مزے لوٹ لیے اور تم نے بھی اپنے حصے کے مزے اسی طرح لوٹے جیسے انھوں نے لوٹے تھے، اور ویسی ہی بحثوں میں تم بھی پڑے جیسی بحثوں میں وہ پڑے تھے سو ان کا انجام یہ ہوا کہ دنیا اور آخرت میں ان کا سب کیا دھرا ضائع ہو گیا اور وہی اب خسارے میں ہیں ـــــ کیا ان[۵۲] لوگوں کو اپنے پیش روؤں کی تاریخ نہیں پہنچی؟ نوح کی قوم، عاد، ثمود، ابراہیم کی قوم، مدین کے لوگ اور وہ بستیاں جنھیں الٹ دیا گیا[۵۳]۔ ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے۔ پھر یہ اللہ کا کام نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا مگر وہ آپ ہی اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے[۵۴]۔

مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق و دمساز ہیں۔ بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں[۵۵]۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱) ان کے مشورے، ان کی ہمت افزائیاں، ان کی اعانتیں، ان کی سفارشیں، ان کی تعریفیں اور مدح سرائیاں، سب اس کے لیے وقف ہوں گی۔ دل و جان سے خود اس برے کام میں شریک ہوں گے، دوسروں کو اس میں حصہ لینے کی ترغیب دیں گے، کرنے والے کی ہمت بڑھائیں گے، اور ان کی ہر ادا سے یہ ظاہر ہوگا کہ اس برائی کے پروان چڑھنے سے کچھ ان کے دل کو راحت اور ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچتی ہے۔ بخلاف اس کے کوئی بھلا کام ہو رہا ہو تو اس کی خبر سے ان کو صدمہ ہوتا ہے، اس کے تصور سے ان کا دل دکھتا ہے، اس کی تجویز تک انھیں گوارا نہیں ہوتی، اس کی طرف کسی کو بڑھتے دیکھتے ہیں تو ان کی روح بے چین ہونے لگتی ہے، ہر ممکن طریقہ سے اس کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں اور ہر تدبیر سے یہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح وہ اس نیکی سے باز آجائے اور باز نہیں آتا تو اس کام میں کامیاب نہ ہو سکے۔ پھر یہ بھی ان سب کا مشترک خاصہ ہے کہ نیکی کے کام میں خرچ کرنے کے لیے ان کا ہاتھ کبھی نہیں کھلتا۔ خواہ وہ کنجوس ہوں یا بڑے خرچ کرنے والے ہوں، بہرحال ان کی دولت یا تجوریوں کے لیے ہوتی ہے یا پھر حرام راستوں سے آتی اور حرام ہی کے راستوں میں بہ جاتی ہے۔ بدی کے لیے چاہے وہ اپنے وقت کے قارون ہوں، مگر نیکی کے لیے ان سے زیادہ مفلس کوئی نہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵۱] منافقین کا غائبانہ ذکر کرتے کرتے یکایک ان سے براہِ راست خطاب شروع ہو گیا ہے۔

[۵۲] یہاں سے پھر ان کا غائبانہ ذکر شروع ہو گیا۔

[۵۳] اشارہ ہے قومِ لوط کی بستیوں کی طرف۔

[۵۴] یعنی ان کی تباہی و بربادی اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ اللہ کو ان کے ساتھ کوئی دشمنی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ انھیں تباہ کرے بلکہ دراصل انھوں نے خود ہی اپنے لیے وہ طرزِ زندگی پسند کیا جو انھیں بربادی کی طرف لے جانے والا تھا۔ اللہ نے تو انھیں سوچنے سمجھنے اور سنبھلنے کا پورا موقع دیا، ان کی فہمائش کے لیے رسول بھیجے، رسولوں کے ذریعے سے ان کو غلط روی کے برے نتائج سے آگاہ کیا اور انھیں کھول کھول کر نہایت واضح طریقے سے بتا دیا کہ ان کے لیے فلاح کا راستہ کونسا ہے اور ہلاکت و بربادی کا کونسا۔ مگر جب انھوں نے اصلاحِ حال کے کسی موقع سے فائدہ نہ اٹھایا اور ہلاکت کی راہ چلنے ہی پر اصرار کیا تو لامحالہ ان کا وہ انجام ہونا ہی تھا جو بالآخر ہو کر رہا، اور یہ ظلم اللہ نے ان پر نہیں کیا بلکہ انھوں نے خود اپنے اوپر کیا۔

[۵۵] جس طرح منافقین ایک الگ امت ہیں اسی طرح اہلِ ایمان بھی ایک الگ امت ہیں، اگرچہ ایمان کا ظاہری اقرار اور اسلام کی پیروی

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۳ پر)

یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔ ان مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انھیں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان سدا بہار باغوں میں ان کے لیے پاکیزہ قیام گاہیں ہوں گی، اور سب سے بڑھکر یہ کہ اللہ کی خوشنودی انھیں حاصل ہوگی، یہی بڑی کامیابی ہے۔

اے نبیؐ[۵۱]! کفار اور منافقین دونوں کا پوری قوت سے مقابلہ کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ[۵۲]، آخر کار ان کا ٹھکانا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲) کا خارجی اظہار ان دونوں گروہوں میں مشترک ہے لیکن دونوں کے مزاج، اخلاق، اطوار، عادات اور طرزِ فکر و عمل ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ جہاں ایمان کا دعویٰ ہے مگر دل سچے ایمان سے خالی ہیں وہاں زندگی کا سارا رنگ ڈھنگ ایسا ہے جو اپنی ایک ایک ادا سے اس دعوائے ایمان کی تکذیب کر رہا ہے۔ اوپر کے لیبل پر تو لکھا ہے کہ یہ مشک ہے مگر لیبل کے نیچے جو کچھ ہے وہ اپنے پورے وجود سے ثابت کر رہا ہے کہ یہ گوبر کے سوا کچھ نہیں۔ بخلاف اس کے جہاں ایمان اپنی اصل حقیقت کے ساتھ موجود ہے وہاں مشک اپنی صورت سے، اپنی خوشبو سے، اپنی خاصیتوں سے ہر آزمائش اور ہر معاملہ میں اپنا مشک ہونا کھولے دے رہا ہے۔ اسلام و ایمان کے عرفی نام نے بظاہر دونوں گروہوں کو ایک امت بنا رکھا ہے، مگر فی الواقع منافق مسلمانوں کا اخلاقی مزاج اور رنگِ طبیعت کچھ اور ہے اور صادق الایمان مسلمانوں کا کچھ اور۔ اسی وجہ سے منافقانہ خصائل رکھنے والے مرد و زن ایک الگ جتھا بن گئے ہیں جن کو خدا سے غفلت، برائی سے دلچسپی، نیکی سے بُعد اور خیر سے عدم تعاون کی مشترک خصوصیات نے ایک دوسرے سے وابستہ اور اہلِ ایمان سے عملاً بے تعلق کر دیا ہے، اور دوسری جانب سچے مومن مرد و زن ایک دوسرا گروہ بن گئے ہیں جس کے سارے افراد میں یہ خصوصیت مشترک ہے کہ نیکی سے وہ دلچسپی رکھتے ہیں، بدی سے نفرت کرتے ہیں، خدا کی یاد ان کے لیے غذا کی طرح زندگی کی ناگزیر ضروریات میں شامل ہے، راہِ خدا میں خرچ کرنے کے لیے ان کے دل اور ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، اور خدا اور رسول کی اطاعت ان کی زندگی کا وتیرہ ہے، اس مشترک اخلاقی مزاج اور طرزِ زندگی نے انھیں آپس میں ایک دوسرے سے جوڑا اور منافقین کے گروہ سے توڑ دیا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۵۱ یہاں سے ایک تیسری تقریر شروع ہوتی ہے جو غزوۂ تبوک کے بعد نازل ہوئی ہے۔

۵۲ اس وقت تک منافقین کے ساتھ زیادہ تر درگزر کا معاملہ ہو رہا تھا اور اس کے دو وجوہ تھے۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کی طاقت ابھی اتنی مضبوط نہ ہوئی تھی کہ باہر کے دشمنوں سے لڑنے کے ساتھ ساتھ وہ گھر کے دشمنوں سے بھی لڑائی مول لے لیں۔ دوسرے یہ کہ ان میں سے جو لوگ شکوک و شبہات میں مبتلا تھے ان کو ایمان و یقین حاصل کرنے کے لیے کافی موقع دینا مقصود تھا۔ یہ دونوں وجوہ اب باقی نہیں رہے تھے۔ مسلمانوں کی طاقت اب تمام عرب کو اپنی گرفت میں لے چکی تھی اور عرب سے باہر کی طاقتوں سے کشمکش کا سلسلہ شروع ہو رہا تھا اس لیے ان آستین کے سانپوں کا سر کچلنا اب ممکن بھی تھا اور ضروری بھی ہو گیا تھا، تاکہ یہ لوگ بیرونی طاقتوں سے ساز باز کر کے ملک میں کوئی اندرونی خطرہ نہ کھڑا کر سکیں۔ پھر ان لوگوں کو پورے ۹ سال تک سوچنے، سمجھنے اور دینِ حق کو پرکھنے کا موقع بھی دیا جا چکا تھا جس سے وہ فائدہ اٹھا سکتے تھے اگر ان میں واقعی خیر کی کوئی طلب ہوتی۔ اس کے بعد ان کے ساتھ مزید رعایت کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس لیے حکم ہوا کہ کفار کے ساتھ ساتھ اب ان منافقین کے خلاف بھی جہاد (Campaign) شروع کر دیا جائے اور جو نرم رویہ اب تک ان کے معاملہ میں اختیار کیا جاتا رہا ہے، اسے ختم کر کے اب ان کے ساتھ سخت برتاؤ کیا جائے۔

منافقین کے خلاف جہاد اور سخت برتاؤ سے مراد یہ نہیں ہے کہ ان سے جنگ کی جائے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ ان کی منافقانہ روش سے جو چشم پوشی اب تک برتی گئی ہے، جس کی وجہ سے یہ مسلمانوں میں ملے جلے رہے اور عام مسلمان ان کو اپنی ہی سوسائٹی کا ایک جز سمجھتے رہے اور ان کو جماعت (باقی حاشیہ صفحہ ۲۴ پر)

جہنم ہے اور وہ بدترین جائے قرار ہے۔ یہ لوگ خدا کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم نے وہ بات نہیں کہی، حالانکہ انہوں نے ضرور وہ کافرانہ بات کہی ہے[٨١]۔ وہ اسلام لانے کے بعد کفر کے مرتکب ہوئے اور انہوں نے وہ کچھ کرنے کا ارادہ کیا جسے کر نہ سکے[٨٢]۔ یہ ان کا سارا غصہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳) معاملات میں دخل دینے اور سوسائٹی میں اپنے نفاق کا زہر پھیلانے کا موقع ملتا رہا، اس کو آئندہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ اب جو شخص بھی مسلمانوں میں شامل رہ کر منافقانہ روش اختیار کرے اور جس کے طرز عمل سے بھی یہ ظاہر ہو کر وہ خدا اور رسول اور اہل ایمان کا مخلص رفیق نہیں ہے، اسے کھلم کھلا بے نقاب کیا جائے، علانیہ اس کو ملامت کی جائے، سوسائٹی میں اس کے لیے عزت و اعتبار کا کوئی مقام باقی نہ رہنے دیا جائے، معاشرت میں اس سے قطع تعلق ہو، جماعتی مشوروں سے وہ الگ رکھا جائے، عدالتوں میں اس کی شہادت غیر معتبر ہو، عہدوں اور مناصب کا دروازہ اس کے لیے بند ہے، محفلوں میں اسے کوئی منہ نہ لگائے، ہر مسلمان اس سے ایسا برتاؤ کرے جس سے اس کو خود معلوم ہو جائے کہ مسلمانوں کی پوری آبادی میں کہیں بھی اس کا کوئی وقار نہیں اور کسی دل میں بھی اس کے لیے احترام کا کوئی گوشہ نہیں۔ پھر اگر ان میں سے کوئی شخص کسی صریح غداری کا مرتکب ہو تو اس کے جرم پر پردہ نہ ڈالا جائے، نہ اسے معاف کیا جائے، بلکہ علی رؤس الاشہاد اس پر مقدمہ چلایا جائے اور اسے قرار واقعی سزا دی جائے۔

یہ ایک نہایت اہم ہدایت تھی جو اس مرحلہ پر مسلمانوں کو دی جانی ضروری تھی۔ اس کے بغیر اسلامی سوسائٹی کو تنزل و انحطاط کے اندرونی اسباب سے محفوظ نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ کوئی جماعت جو اپنے اندر منافقوں اور غداروں کو پرورش کرتی ہو اور جس میں گھر بیٹھے سانپ عزت اور تحفظ کے ساتھ آستینوں میں بٹھائے جاتے ہوں، اخلاقی زوال اور بالآخر کامل تباہی سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ نفاق کا حال طاعون کا سا ہے اور منافق وہ چوہا ہے جو اس وبائے جراثیم لیے پھرتا ہے۔ اس کو آبادی میں آزادی کے ساتھ چلنے پھرنے کا موقع دینا گویا پوری آبادی کو موت کے خطرے میں ڈالنا ہے۔ ایک منافق کو مسلمانوں کی سوسائٹی میں عزت و احترام کا مرتبہ حاصل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہزاروں آدمی غداری و منافقت پر دلیر ہو جائیں اور یہ خیال عام ہو جائے کہ اس سوسائٹی میں عزت پانے کے لیے اخلاص، خیر خواہی اور صداقت ایمانی کچھ ضروری نہیں ہے بلکہ جھوٹے اظہار ایمان کے ساتھ خیانت اور بے وفائی کا رویہ اختیار کر کے بھی یہاں آدمی پھل پھول سکتا ہے۔ یہی بات ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مختصر سے حکیمانہ فقرے میں بیان فرمایا ہے کہ من وقر صاحب بدعۃ فقد اعان علی ھدم الاسلام "جس شخص نے کسی صاحب بدعت کی تعظیم و توقیر کی وہ دراصل اسلام کی عمارت ڈھانے میں مددگار ہوا"۔

(حواشی صفحہ ہذا) [٨١] وہ بات کیا تھی جس کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے، اس کے متعلق کوئی یقینی معلومات ہم تک نہیں پہنچی ہیں۔ البتہ روایات میں متعدد ایسی کافرانہ باتوں کا ذکر آیا ہے جو اس زمانہ میں منافقین نے کی تھیں۔ مثلاً ایک منافق کے متعلق مروی ہے کہ اس نے اپنے عزیزوں میں سے ایک مسلمان نوجوان کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ "اگر واقعی وہ سب کچھ برحق ہے جو یہ شخص (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم) پیش کرتا ہے تو ہم سب گدھوں سے بھی بدتر ہیں"۔ ایک اور روایت میں ہے کہ تبوک کے سفر میں ایک جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی گم ہو گئی۔ مسلمان اس کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ اس پر منافقوں کے ایک گروہ نے اپنی مجلس میں بیٹھ کر خوب مذاق اڑایا اور آپس میں کہا کہ "یہ حضرت آسمان کی خبریں تو خوب سناتے ہیں، مگر ان کو اپنی اونٹنی کی کچھ خبر نہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہے"۔

[٨٢] یہ اشارہ ہے ان سازشوں کی طرف جو منافقوں نے غزوۂ تبوک کے سلسلے میں کی تھیں۔ ان میں سے پہلی سازش کا واقعہ محدثین نے اس طرح بیان کیا ہے کہ تبوک سے واپسی پر جب مسلمانوں کا لشکر ایک ایسے مقام کے قریب پہنچا جہاں سے پہاڑوں کے درمیان راستہ گزرتا تھا

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۵ پر)

اسی بات پہ ہے ناکہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے ان کو غنی کر دیا ہے[٩١]! اب اگر یہ اپنی اس روش سے باز آجائیں تو انہی کے لیے بہتر ہے ورنہ اللہ ان کو نہایت دردناک سزا دے گا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور زمین میں ان کا کوئی حامی اور مددگار نہ پائیں گے۔

ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر اس نے اپنے فضل سے ہم کو نوازا تو ہم خیرات کریں گے اور صالح بن کر رہیں گے۔ مگر جب اللہ نے اپنے فضل سے ان کو دولت مند کر دیا تو وہ بخل پر اتر آئے اور اپنے عہد سے ایسے پھرے کہ انھیں اس کی پروا تک نہیں ہے[٩٢]۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی اس بد عہدی کی وجہ سے جو انھوں نے اللہ کے ساتھ کی اور اس جھوٹ کی وجہ سے جو وہ بولتے رہے، اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق بٹھا دیا جو اس کے حضور ان کی پیشی کے دن تک ان کا پیچھا نہ چھوڑے گا۔ کیا یہ لوگ جانتے نہیں ہیں کہ اللہ کو ان کے مخفی راز اور ان کی پوشیدہ سرگوشیاں تک معلوم ہیں اور وہ تمام غیب کی باتوں سے پوری طرح باخبر ہے؟ (وہ خوب جانتا ہے ان کنجوس دولت مندوں کو) جو برضا و رغبت دینے والے اہل ایمان کی مالی قربانیوں پر باتیں چھانٹتے ہیں اور ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں جن کے پاس (راہ خدا میں دینے کے لیے) اس کے سوا کچھ نہیں ہے جو وہ اپنے اوپر مشقت برداشت کر کے دے دیتے ہیں[٩٣]۔ اللہ ان مذاق اڑانے والوں کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کے لیے دردناک سزا ہے۔ اے نبیؐ، تم خواہ ایسے لوگوں کے لیے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴) تو بعض منافقین نے آپس میں طے کیا کہ رات کے وقت کسی گھاٹی میں سے گزرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڈ میں پھینک دیں گے۔ حضورؐ کو اس کی اطلاع ہو گئی۔ آپ نے تمام اہل لشکر کو حکم دیا کہ وادی کے راستے سے نکل جائیں اور آپ خود صرف عمار بن یاسرؓ اور حذیفہ بن یمانؓ کو ساتھ لے کر گھاٹی کے راستے سے چلے۔ اثنائے راہ میں یکایک معلوم ہوا کہ دس بارہ منافق ڈھاٹے باندھے ہوئے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر حضرت حذیفہؓ ان کی طرف لپکے تاکہ ان کے اونٹوں کو مار مار کر ان کے منہ پھیر دیں۔ مگر وہ دور ہی سے حضرت حذیفہؓ کو آتے دیکھ کر ڈر گئے اور اس خوف سے کہ کہیں ہم پہچان نہ لیے جائیں فوراً بھاگ نکلے۔

دوسری سازش جس کا اس سلسلہ میں ذکر کیا گیا ہے، یہ ہے کہ منافقین کو رومیوں کے مقابلہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے وفادار ساتھیوں کے بخیریت بچ کر واپس آجانے کی توقع نہ تھی، اس لیے انھوں نے آپس میں طے کر لیا تھا کہ جونہی اُدھر کوئی سانحہ پیش آئے اِدھر مدینہ میں عبداللہ بن اُبی کے سر پر تاجِ شاہی رکھ دیا جائے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [٩١] نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے مدینہ عرب کے قصبات میں سے ایک معمولی قصبہ تھا اور اوس و خزرج کے قبیلے عرب کے قبائل میں مال یا جاہ کے لحاظ سے کوئی اونچا درجہ نہ رکھتے تھے۔ مگر جب حضورؐ وہاں تشریف لے گئے اور انصار نے آپ کا ساتھ دے کر اپنے آپ کو خطرات میں ڈال دیا تو آٹھ نو سال کے اندر اندر یہی متوسط درجہ کا قصبہ تمام عرب کا دار السلطنت بن گیا۔ وہی اوس و خزرج کے کاشتکار سلطنت کے اعیان و اکابر بن گئے، اور ہر طرف سے فتوحات، غنائم اور تجارت کی برکات اس مرکزی شہر پر بارش کی طرح برسنے لگیں۔ اللہ تعالیٰ اسی پر انھیں شرم دلا رہا ہے کہ ہمارے نبی پر تمہارا یہ غصہ کیا اسی قصور کی پاداش میں ہے کہ اس کی بدولت یہ نعمتیں تمھیں بخشی گئیں!

[٩٢] اوپر کی آیت میں ان منافقین کی جس کافر نعمتی و محسن کشی پر ملامت کی گئی تھی اس کا ایک اور ثبوت خود انہی کی زندگیوں سے پیش کر کے یہاں واضح کیا گیا ہے کہ دراصل یہ لوگ عادی مجرم ہیں، ان کے ضابطۂ اخلاق میں شکر، اعترافِ نعمت، اور پاسِ عہد جیسی خوبیوں کا کہیں نام و نشان تک نہیں پایا جاتا۔

[٩٣] غزوۂ تبوک کے موقع پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چندے کی اپیل کی تو بڑے بڑے مال دار منافقین ہاتھ روکے بیٹھے رہے۔ مگر جب مخلص اہل ایمان بڑھ بڑھ کر چندے دینے لگے تو ان لوگوں نے ان پر باتیں چھانٹنی شروع کیں۔ کوئی ذی استطاعت مسلمان اپنی حیثیت کے مطابق یا اس سے بڑھ کر کوئی بڑی

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۶ پر)

معافی کی درخواست کرو یا نہ کرو۔ اگر تم ستر مرتبہ بھی انھیں معاف کر دینے کی درخواست کرو گے تو اللہ انھیں ہرگز معاف نہ کرے گا۔ اس لیے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے، اور اللہ فاسق لوگوں کو راہ نجات نہیں دکھاتا۔

جن لوگوں کو پیچھے رہ جانے کی اجازت دے دی گئی تھی وہ اللہ کے رسول کا ساتھ نہ دینے اور گھر بیٹھے رہنے پر خوش ہوئے اور انھیں گوارا نہ ہوا کہ اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کریں۔ انھوں نے لوگوں سے کہا کہ "اس سخت گرمی میں نہ نکلو۔" ان سے کہو کہ جہنم کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے۔ کاش انھیں اس کا شعور ہوتا۔ اب چاہیے کہ یہ لوگ ہنسنا کم کریں اور روئیں زیادہ، اس لیے کہ جو بدی یہ کماتے رہے ہیں اس کی جزا ایسی ہی ہے (کہ انھیں اس پر رونا چاہیے)۔ اگر اللہ ان کے درمیان تمھیں واپس لے جائے اور آئندہ ان میں سے کوئی گروہ جہاد کے لیے نکلنے کی تم سے اجازت مانگے تو صاف کہہ دینا کہ "اب تم میرے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتے اور نہ میری معیت میں لڑ سکتے ہو، تم نے پہلے بیٹھ رہنے کو پسند کیا تھا تو اب گھر بیٹھنے والوں ہی کے ساتھ بیٹھے رہو۔"

اور آئندہ ان میں سے جو کوئی مرے اس کی نماز جنازہ بھی تم ہرگز نہ پڑھنا اور نہ کبھی اس کی قبر پر کھڑے ہونا کیونکہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ مرے ہیں اس حال میں کہ وہ فاسق تھے[۵]۔ ان کی مال داری اور ان کی کثرت اولاد تم کو دھوکے میں نہ ڈالے، اللہ نے تو ارادہ کر لیا ہے کہ اس مال و اولاد کے ذریعہ سے ان کو اسی دنیا میں سزا دے اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں۔

جب کبھی کوئی سورۃ اس مضمون کی نازل ہوئی کہ اللہ کو مانو اور اس کے رسول کے ساتھ مل کر جہاد کرو تو تم نے دیکھا کہ جو لوگ ان میں سے صاحب مقدرت تھے وہی تم سے درخواست کرنے لگے کہ انھیں جہاد کی شرکت سے معاف رکھا جائے اور انھوں نے کہا کہ ہمیں چھوڑ دیجیے کہ ہم بیٹھنے والوں کے ساتھ رہیں۔ ان لوگوں نے گھر بیٹھنے والیوں میں شامل ہونا پسند کیا اور ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا گیا، اس لیے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۔۔) نہ پیش کرتا تو یہ اس پر ریاکاری کا الزام لگاتے، اور اگر کوئی غریب مسلمان اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ کاٹ کر کوئی چھوٹی سی رقم حاضر کرتا یا رات بھر محنت مزدوری کرکے کچھ کھجوریں حاصل کرتا اور وہی لاکر پیش کر دیتا تو یہ اس پر آوازے کستے کہ لو یہ ٹڈی کی ٹانگ بھی آگئی ہے تاکہ اس سے روم کے قلعے فتح کیے جائیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵] تبوک سے واپسی پر کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین مرگیا۔ اس کے بیٹے عبداللہ بن عبداللہ، جو مخلص مسلمانوں میں سے تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کفن میں لگانے کے لیے آپ کا کرتا مانگا۔ آپ نے کمال فراخ دلی کے ساتھ وہ عطا کر دیا۔ پھر انھوں نے درخواست کی کہ آپ ہی اس کی نماز جنازہ پڑھائیں۔ آپ اس کے لیے بھی تیار ہو گئے۔ حضرت عمر نے باصرار عرض کیا کہ یا رسول اللہ، کیا آپ اس شخص پر نماز جنازہ پڑھیں گے جو یہ اور یہ کر چکا ہے۔ مگر حضور ان کی یہ سب باتیں سن کر مسکراتے رہے اور اپنی اس رحمت کی بنا پر جو دوست دشمن سب کے لیے عام تھی، آپ نے اس بدترین دشمن کے حق میں بھی دعائے مغفرت کرنے میں تامل نہ کیا۔ آخر جب آپ نماز پڑھانے کھڑے ہی ہو گئے تو یہ آیت نازل ہوئی اور براہ راست حکم خداوندی سے آپ کو روک دیا گیا۔ کیونکہ اب یہ مستقل پالیسی مقرر کی جا چکی تھی کہ مسلمانوں کی جماعت میں منافقین کو کسی طرح پنپنے نہ دیا جائے اور کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جس سے اس گروہ کی ہمت افزائی ہو۔

اسی سے یہ مسئلہ نکلا ہے کہ فساق اور فجار اور مشہور بفسق لوگوں کی نماز جنازہ مسلمانوں کے امام اور سربرآوردہ لوگوں کو نہ پڑھانی چاہیے نہ پڑھنی چاہیے۔ ان آیات کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریقہ ہو گیا تھا کہ جب آپ کو کسی جنازے پر تشریف لانے کے لیے کہا جاتا تو آپ پہلے مرنے والے کے متعلق دریافت کرتے تھے کہ کس قسم کا آدمی تھا، اور اگر معلوم ہوتا کہ برے چلن کا آدمی تھا تو آپ اس کے گھر والوں سے کہہ دیتے کہ تمھیں اختیار ہے، جس طرح چاہو اسے دفن کر دو۔

ان کی سمجھ میں اب کچھ نہیں آتا۔[۹۱] بخلاف اس کے رسول نے اور ان لوگوں نے جو رسول کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی جان و مال سے جہاد کیا اور اب ساری بھلائیاں انہی کے لیے ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ ہے عظیم الشان کامیابی۔ ۱۱

بدوی عربوں میں سے بھی بہت سے لوگ آئے[۹۲] جنہوں نے عذر کیے تاکہ انہیں بھی پیچھے رہ جانے کی اجازت دی جائے۔ اس طرح بیٹھ رہے وہ لوگ جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے ایمان کا جھوٹا عہد کیا تھا۔ ان بدویوں میں سے جن جن لوگوں نے کفر کا طریقہ اختیار کیا ہے[۹۳] عنقریب وہ دردناک سزا سے دوچار ہوں گے۔

ضعیف اور بیمار لوگ اور وہ لوگ جو شرکت جہاد کے لیے زادِ راہ نہیں پاتے، اگر پیچھے رہ جائیں تو کوئی حرج نہیں جبکہ وہ خلوص دل کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے وفادار ہوں۔[۹۴] ایسے محسنین پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اللہ

---

۹۱ یعنی اگرچہ یہ بڑی شرم کی بات ہو کر اچھے خاصے ہٹے کٹے، تندرست، صاحبِ مقدرت لوگ ایمان کا دعویٰ رکھنے کے باوجود کام کا وقت آنے پر میدان میں نکلنے کے بجائے گھروں میں گھس بیٹھیں اور عورتوں میں جا شامل ہوں، لیکن چونکہ ان لوگوں نے خود جان بوجھ کر اپنے لیے یہی رویہ پسند کیا تھا اس لیے قانون فطرت کے مطابق ان سے وہ پاکیزہ احساسات چھین لیے گئے جن کی بدولت آدمی ایسے ذلیل اطوار اختیار کرنے میں شرم محسوس کیا کرتا ہے۔

۹۲ بدوی عربوں سے مراد مدینہ کے اطراف میں رہنے والے دیہاتی اور صحرائی عرب ہیں جنہیں عام طور پر بدو کہا جاتا ہے۔

۹۳ منافقانہ اظہارِ ایمان جس کی تہ میں فی الواقع تصدیق، تسلیم، اخلاص اور اطاعت نہ ہو۔ اور جس کے ظاہری اقرار کے باوجود انسان خدا اور اس کے دین کی بہ نسبت اپنے مفاد اور اپنی دنیوی دلچسپیوں کو عزیز تر رکھتا ہو، اصل حقیقت کے اعتبار سے کفر و انکار ہی ہے اور خدا کے ہاں ایسے لوگوں کے ساتھ وہی معاملہ ہوگا جو منکروں اور باغیوں کے ساتھ ہوگا، چاہے دنیا میں اس قسم کے لوگ کافر نہ ٹھیرائے جا سکتے ہوں اور ان کے ساتھ مسلمانوں ہی کا سا معاملہ ہوتا رہے۔ اس دنیوی زندگی میں جس قانون پر مسلم سوسائٹی کا نظام قائم کیا گیا ہے اور جس ضابطہ کی بنا پر اسلامی حکومت اور اس کے قاضی احکام کی تنفیذ کرتے ہیں، اس کے لحاظ سے تو منافقت پر کفر یا اشتباہ کفر کا حکم صرف انہی صورتوں میں لگایا جا سکتا ہے جبکہ انکار و بغاوت یا غداری و بے وفائی کا اظہار صریح طور پر ہو جائے۔ اس لیے منافقت کی بہت سی صورتیں اور حالتیں ایسی رہ جاتی ہیں جو قضائے شرعی میں کفر کے حکم سے بچ جاتی ہیں۔ لیکن قضائے شرعی میں کسی منافق کا حکم کفر سے بچ نکلنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ قضائے خداوندی میں بھی وہ اس حکم اور اس کی سزا سے بچ نکلے گا۔

۹۴ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ بظاہر معذور ہوں ان کے لیے بھی مجرد ضعیفی و بیماری یا محض ناداری کافی وجہ معافی نہیں ہے بلکہ ان کی یہ مجبوریاں صرف اسی صورت میں ان کے لیے وجہ معافی ہو سکتی ہیں جبکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے سچے وفادار ہوں، ورنہ اگر وفاداری موجود نہ ہو تو کوئی شخص صرف اس لیے معاف نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ادائے فرض کے موقع پر بیمار یا نادار تھا۔ خدا صرف ظاہر کو نہیں دیکھتا ہے کہ ایسے سب لوگ جو بیماری کا طبی صداقت نامہ یا بڑھاپے اور جسمانی نقص کا عذر پیش کریں، اس کے ہاں یکساں معذور قرار دے دیئے جائیں اور ان پر سے باز پرس ساقط ہو جائے۔ وہ تو ان میں سے ایک ایک شخص کے دل کا جائزہ لے گا، اس کے پورے خفی و ظاہر برتاؤ کو دیکھے گا، اور یہ جانچے گا کہ اس کی معذوری ایک وفادار بندے کی سی معذوری ہے یا ایک غدار اور باغی کی سی۔ ایک شخص ہے کہ جب اس نے فرض کی پکار سنی تو دل میں لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ بڑے

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۸ پر)

درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اسی طرح ان لوگوں پر بھی کوئی اعتراض کا موقع نہیں ہے جنھوں نے خود آکر تم سے درخواست کی تھی کہ ہمارے لیے سواریاں بہم پہنچائی جائیں، اور جب تم نے کہا کہ میں تمھارے لیے سواریوں کا انتظام نہیں کر سکتا تو وہ مجبوراً واپس گئے اور حال یہ تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور انھیں اس بات کا بڑا رنج تھا کہ وہ اپنے خرچ پر شریک جہاد ہونے کی مقدرت نہیں رکھتے۔[۱] البتہ اعتراض ان لوگوں پر ہے جو مالدار ہیں اور پھر بھی تم سے درخواستیں کرتے ہیں کہ انھیں شرکت جہاد سے معاف رکھا جائے۔ انھوں نے گھر بیٹھنے والیوں میں شامل ہونا پسند کیا اور اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا، اس لیے اب یہ کچھ نہیں جانتے۔

تم جب پلٹ کر ان کے پاس پہنچو گے تو یہ طرح طرح کے عذرات پیش کریں گے مگر تم صاف کہہ دینا کہ "بہانے نہ کرو، ہم تمھاری کسی بات کا اعتبار نہ کریں گے، اللہ نے ہم کو تمھارے حالات بتا دیے ہیں، اب اللہ اور اس کا رسول تمھارے طرز عمل کو دیکھے گا، پھر تم اس کی طرف پلٹائے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے سب کا جاننے والا ہے اور وہ تمھیں بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو"۔ تمھاری

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۷) اچھے موقع پر میں بیمار ہو گیا ورنہ یہ بلا کسی طرح ٹالے نہ ٹلتی اور خواہ مخواہ کی مصیبت بھگتنی پڑتی"۔ دوسرے شخص نے یہی پکار سنا تو تلملا اٹھا کہ "ہائے، کیسے موقع پر اس کمبخت بیماری نے آن دبوچا، جو وقت میدان میں نکل کر خدمت انجام دینے کا تھا وہ کس بری طرح یہاں بستر پر ضائع ہو رہا ہے"۔ ایک نے اپنے لیے تو خدمت سے بچنے کا بہانہ پایا ہی تھا مگر اس کے ساتھ اس نے دوسروں کو بھی اس سے روکنے کی کوشش کی۔ دوسرا اگرچہ خود بستر علالت پر مجبور پڑا ہوا تھا مگر وہ برابر اپنے عزیزوں، دوستوں اور بھائیوں کو جہاد کا جوش دلاتا رہا اور اپنے تیمارداروں سے بھی کہتا رہا کہ "میرا اللہ مالک ہے، دوا دارو کا انتظام کسی نہ کسی طرح ہو ہی جائے گا، مجھ اکیلے انسان کے لیے تم اس قیمتی وقت کو ضائع نہ کرو جسے دین حق کی خدمت میں صرف ہونا چاہیے"۔ ایک نے بیماری کے عذر سے گھر بیٹھ کر سارا زمانۂ جنگ بددلی پھیلانے، بری خبریں اڑانے، جنگی مساعی کو خراب کرنے اور مجاہدین کے پیچھے ان کے گھر بگاڑنے میں صرف کیا۔ دوسرے نے یہ دیکھ کر کہ میدان میں جانے کے شرف سے وہ محروم رہ گیا ہے، اپنی حد تک پوری کوشش کی کہ گھر کے محاذ (Homefront) کو مضبوط رکھنے میں جو زیادہ سے زیادہ خدمت اس سے بن آئے اسے انجام دے۔ ظاہر کے اعتبار سے تو یہ دونوں ہی معذور ہیں، مگر خدا کی نگاہ میں یہ دو مختلف قسم کے معذور کسی طرح یکساں نہیں ہو سکتے۔ خدا کے ہاں معافی اگر ہے تو صرف دوسرے شخص کے لیے، رہا پہلا شخص تو وہ اپنی معذوری کے باوجود غداری و نا وفاداری کا مجرم ہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ۱۔ ایسے لوگ جو خدمت دین کے لیے بے تاب ہوں اور اگر کسی حقیقی مجبوری کے سبب سے یا ذرائع نہ پانے کی وجہ سے عملاً خدمت نہ کر سکیں تو ان کے دل کو اتنا ہی سخت صدمہ ہو جتنا کسی دنیا پرست کو روزگار چھوٹ جانے یا کسی بڑے نفع کے موقع سے محروم رہ جانے کا ہوا کرتا ہے، ان کا شمار خدا کے ہاں خدمت انجام دینے والوں ہی میں ہوگا اگرچہ انھوں نے عملاً کوئی خدمت انجام نہ دی ہو، اس لیے کہ وہ چاہے ہاتھ پاؤں سے کام نہ کر سکے ہوں لیکن دل سے تو وہ برسر خدمت (On active service) ہی رہے ہیں۔ یہی بات ہے جو غزوہ تبوک سے واپسی پر اثنائے سفر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفقا کو خطاب کرتے ہوئے فرمائی تھی ان بالمدینۃ اقواماً ما سرتم مسیراً ولا قطعتم وادیاً الا کانوا معکم "مدینہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ تم نے کوئی وادی طے نہیں کی اور کوئی کوچ نہیں کیا جس میں وہ تمھارے ساتھ ساتھ نہ رہے ہوں"۔ صحابہ نے تعجب سے کہا "کیا مدینہ ہی میں رہتے ہوئے؟" فرمایا "ہاں، مدینے ہی میں رہتے ہوئے، کیونکہ مجبوری نے انھیں روک لیا تھا ورنہ وہ خود رکنے والے نہ تھے"۔

واپسی پر یہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے صرفِ نظر کرو، تو بے شک تم ان سے صرفِ نظر ہی کر لو،[۹۵] کیونکہ یہ ایک گندگی ہیں، اور ان کا اصلی مقام جہنم ہے جو ان کی کمائی کے بدلے میں انھیں نصیب ہوگی۔ یہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، حالانکہ اگر تم ان سے راضی ہو بھی گئے تو اللہ ہرگز ایسے فاسق لوگوں سے راضی نہ ہوگا۔

یہ بدوی عرب کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور ان کے معاملہ میں اس امر کے امکانات زیادہ ہیں کہ اس دین کے حدود سے ناواقف رہیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے۔[۹۶] اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکیم و دانا ہے۔ ان میں ایسے ایسے لوگ موجود ہیں

[۹۵] پہلے فقرے میں صرفِ نظر سے مراد درگزر ہے اور دوسرے فقرے میں قطعِ تعلق۔ یعنی وہ تو چاہتے ہیں کہ تم ان سے تعرض نہ کرو، مگر بہتر یہ ہے کہ تم ان سے کوئی واسطہ ہی نہ رکھو اور سمجھ لو کہ تم ان سے کٹ گئے اور وہ تم سے۔

[۹۶] جیساکہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں یہاں بدوی عربوں سے مراد وہ دیہاتی و صحرائی عرب ہیں جو مدینہ کے اطراف میں آباد تھے۔ یہ لوگ مدینہ میں ایک مضبوط اور منظم طاقت کو اٹھتے دیکھ کر پہلے تو مرعوب ہوئے، پھر اسلام اور کفر کی آویزشوں کے دوران میں ایک مدت تک موقع شناسی و ابن الوقتی کی روش پر چلتے رہے۔ پھر جب اسلامی حکومت کا اقتدار حجاز و نجد کے ایک بڑے حصے پر چھا گیا اور مخالف قبیلوں کا زور اس کے مقابلہ میں ٹوٹنے لگا تو ان لوگوں نے مصلحتِ وقت اسی میں دیکھی کہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ لیکن ان میں کم لوگ ایسے تھے جو اس دین کو دینِ حق سمجھ کر سچے دل سے ایمان لائے ہوں اور مخلصانہ طریقہ سے اس کے تقاضوں کو پورا کرنے پر آمادہ ہوں۔ بیشتر بدویوں کے لیے قبولِ اسلام کی حیثیت ایمان و اعتقاد کی نہیں بلکہ محض مصلحت اور پالیسی کی تھی۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ ان کے حصہ میں صرف وہ فوائد آجائیں جو برسرِ اقتدار جماعت کی رکنیت اختیار کرنے سے حاصل ہوا کرتے ہیں۔ مگر وہ اخلاقی بندشیں جو اسلام ان پر عائد کرتا تھا، وہ نماز روزے کی پابندیاں جو اس دین کو قبول کرتے ہی ان پر لگ جاتی تھیں، وہ زکوٰۃ جو باقاعدہ تحصیل داروں کے ذریعہ سے ان کے نخلستانوں اور ان کے گلوں سے وصول کی جاتی تھی، وہ ضبط و نظم جس کے شکنجے میں وہ اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسے گئے تھے، وہ جان و مال کی قربانیاں جو لوٹ مار کی لڑائیوں میں نہیں بلکہ خالص راہِ خدا کے جہاد میں آئے دن ان سے طلب کی جا رہی تھیں، یہ ساری چیزیں ان کو شدت کے ساتھ ناگوار تھیں اور وہ ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے ہر طرح کی چالبازیاں اور بہانہ سازیاں کرتے رہتے تھے۔ ان کو اس سے کچھ بحث نہ تھی کہ حق کیا ہے اور ان کی اور تمام انسانوں کی حقیقی فلاح کس چیز میں ہے۔ انھیں جو کچھ بھی دلچسپی تھی وہ اپنے معاشی مفاد، اپنی آسائش، اپنی زمینوں، اپنے اونٹوں اور بکریوں اور اپنے خیمے کے آس پاس کی محدود دنیا سے تھی۔ اس سے بالاتر کسی چیز کے ساتھ وہ اُس طرح کی عقیدت تو رکھ سکتے تھے جیسی پیروں اور فقیروں سے رکھی جاتی ہے کہ ان کے آگے نذر و نیاز پیش کریں اور وہ اس کے عوض ترقیِ روزگار اور آفات سے تحفظ اور ایسی ہی دوسری اغراض کے لیے ان کو تعویذ گنڈے دیں اور ان کے لیے دعائیں کریں، لیکن ایسے ایمان و اعتقاد کے لیے وہ تیار نہ تھے جو ان کی پوری تمدنی، معاشی اور معاشرتی زندگی کو اخلاق اور قانون کے ضابطہ میں کس دے اور مزید برآں ایک عالمگیر اصلاحی مشن کے لیے ان سے جان و مال کی قربانیوں کا بھی مطالبہ کرے۔

ان کی اسی حالت کو یہاں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ شہریوں کی بہ نسبت یہ دیہاتی و صحرائی لوگ زیادہ منافقانہ رویہ رکھتے ہیں اور حق سے انکار کی کیفیت ان کے اندر زیادہ پائی جاتی ہے۔ پھر اس کی وجہ بھی بتا دی ہے کہ شہری لوگ تو اہلِ علم اور اہلِ حق کی صحبت سے مستفید ہو کر کچھ دین کو اور اس کی حدود کو جان بھی لیتے ہیں، مگر یہ بدوی چونکہ ساری ساری عمر بالکل ایک معاشی حیوان کی طرح شب و روز رزق کے پھیر ہی میں پڑے رہتے ہیں اور حیوانی زندگی کی ضروریات سے بلند تر کسی چیز کی طرف توجہ کرنے کا انھیں موقع ہی نہیں ملتا اس لیے دین اور اس کے

(باقی حاشیہ صفحہ ۳۰ پر)

جو راہِ خدا میں کچھ خرچ کرتے ہیں تو اسے اپنے اوپر زبردستی کی چٹی سمجھتے ہیں[۵۱] اور تمھارے حق میں زمانہ کی گردشوں کا انتظار کر رہے ہیں کہ (تم کسی چکر میں پھنسو تو وہ اپنی گردن سے اس نظام کی اطاعت کا قلادہ اتار پھینکیں جس میں تم نے انھیں کس دیا ہے) حالانکہ بدی کا چکر خود انہی پر مسلط ہے اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ اور انہی بدویوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے ہاں تقرب کا اور رسول کی طرف سے رحمت کی دعائیں لینے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ہاں! وہ ضرور ان کے لیے تقرب کا ذریعہ ہے اور اللہ ضرور ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا، یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ۲

وہ مہاجر و انصار جنھوں نے سب سے پہلے دعوتِ ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی، نیز وہ جو بعد میں راستبازی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے، اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔

تمھارے گرد و پیش جو بدوی رہتے ہیں ان میں بہت سے منافق ہیں اور اسی طرح خود مدینہ کے باشندوں میں بھی منافق موجود ہیں جو نفاق میں طاق ہو گئے ہیں، تم انھیں نہیں جانتے، ہم ان کو جانتے ہیں[۵۲]۔ قریب ہے وہ وقت جب ہم ان کو دوہری سزا دیں گے[۵۳] پھر وہ زیادہ بڑی سزا کے لیے واپس لائے جائیں گے۔

کچھ اور لوگ ہیں جنھوں نے اپنے قصوروں کا اعتراف کر لیا ہے، ان کا عمل مخلوط ہے، کچھ نیک اور کچھ بد۔ بعید نہیں کہ اللہ ان پر پھر مہربان ہو جائے کیونکہ وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اے نبی! تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انھیں پاک کرو اور (نیکی کی راہ میں) انھیں بڑھاؤ، اور ان کے حق میں دعائے رحمت کرو کیونکہ تمھاری دعا ان کے لیے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹) حدود سے ان کے ناواقف رہنے کے امکانات زیادہ ہیں۔

یہاں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دینا غیر موزوں نہ ہوگا کہ ان آیات کے نزول سے تقریباً دو سال بعد حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے ابتدائی عہد میں ارتداد اور منعِ زکوٰۃ کا جو طوفان برپا ہوا تھا اس کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہی تھا جس کا ذکر ان آیات میں کیا گیا ہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۵۱] مطلب یہ ہے کہ جو زکوٰۃ ان سے وصول کی جاتی ہے اُسے یہ ایک جرمانہ سمجھتے ہیں۔ مسافروں کی ضیافت و مہمانداری کا جو حق ان پر عائد کیا گیا ہے وہ ان کو بری طرح کھلتا ہے۔ اور اگر کسی جنگ کے موقع پر یہ کوئی چندہ دیتے ہیں تو اپنے دلی جذبہ سے رضائے الٰہی کی خاطر نہیں دیتے بلکہ باولِ ناخواستہ اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لیے دیتے ہیں۔

[۵۲] یعنی اپنے نفاق کو چھپانے میں اتنے مشاق ہو گئے ہیں کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی کمال درجے کی فراست کے باوجود ان کو نہیں پہچان سکتے۔

[۵۳] دوہری سزا سے مراد یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ دنیا جس کی محبت میں مبتلا ہو کر انھوں نے ایمان و اخلاص کے بجائے منافقت اور غداری کا رویہ اختیار کیا ہے ان کے ہاتھ سے جائے گی اور یہ مال و جاہ اور عزت حاصل کرنے کے بجائے الٹی ذلت و نامرادی پائیں گے۔ دوسری طرف جس مشن کو یہ ناکام دیکھنا اور اپنی چال بازیوں سے ناکام کرنا چاہتے ہیں وہ ان کی خواہشوں اور کوششوں کے علی الرغم ان کی آنکھوں کے سامنے فروغ پائے گا۔

وہ تسکین ہوگی، اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کی خیرات کو قبولیت عطا فرماتا ہے، اور یہ کہ اللہ بہت معاف کرنے والا اور رحیم ہے؟ اور اے نبی ان لوگوں سے کہدو کہ تم عمل کرو، اللہ اور اس کا رسول اور مومنین سب دیکھیں گے کہ تمہارا طرزِ عمل اب کیا رہتا ہے[1]، پھر تم اس کی طرف پلٹائے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے سب کو جانتا ہے اور وہ تمہیں بتادے گا کہ تم

---

[1] یہاں جھوٹے مدعی ایمان اور گناہ گار مومن کا فرق صاف صاف واضح کر دیا گیا ہے۔ جو شخص ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر فی الواقع خدا اور اس کے دین اور جماعت مومنین کے ساتھ کوئی خلوص نہیں رکھتا اس کے عدم اخلاص کا ثبوت اگر اس کے طرزِ عمل سے مل جائے تو اس کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا جائے گا، خدا کی راہ میں صرف کرنے کے لیے وہ کوئی مال پیش کرے تو اسے رد کر دیا جائے گا، مر جائے تو نہ مسلمان اس کی نماز جنازہ پڑھیں گے اور نہ کوئی مومن اس کے لیے دعائے مغفرت کرے گا چاہے وہ اس کا باپ یا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔ بخلاف اس کے جو شخص مومن ہو اور اس سے کوئی غیر مخلصانہ طرزِ عمل سرزد ہو جائے وہ اپنے قصور کا اعتراف کر لے تو اس کو معاف بھی کیا جائے گا، اس کے صدقات بھی قبول کیے جائیں گے اور اس کے لیے دعائے رحمت بھی کی جائے گی۔ اب رہی یہ بات کہ کس شخص کو غیر مخلصانہ طرزِ عمل کے صدور کے باوجود منافق کے بجائے محض گناہ گار مومن سمجھا جائے گا، تو یہ تین معیاروں سے پرکھی جائے گی جن کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے۔

(۱) وہ اپنے قصور کے لیے عذرات لنگ اور تاویلات و توجیہات پیش نہیں کرے گا بلکہ جو قصور ہوا ہے اسے سیدھی طرح صاف صاف مان لے گا۔

(۲) اس کے سابق طرزِ عمل پر نگاہ ڈال کر دیکھا جائے گا کہ یہ عدم اخلاص کا عادی مجرم تو نہیں ہے۔ اگر پہلے وہ جماعت کا ایک صالح فرد رہا ہے اور اس کے کارنامۂ زندگی میں مخلصانہ خدمات، ایثار و قربانی، اور سبقت الی الخیرات کا ریکارڈ موجود ہے تو باور کر لیا جائے گا کہ اس وقت جو قصور اس سے سرزد ہوا ہے وہ ایمان و اخلاص کے عدم کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ محض ایک کمزوری ہے جو وقتی طور پر رونما ہو گئی ہے۔

(۳) اس کے آئندہ طرزِ عمل پر نگاہ رکھی جائے گی کہ آیا اس کا اعتراف قصور محض زبانی ہے یا فی الواقع اس کے اندر کوئی گہرا احساس ندامت موجود ہے۔ اگر وہ اپنے قصور کی تلافی کے لیے بے تاب نظر آئے اور اس کی بات بات سے ظاہر ہو کہ جس نقص ایمانی کا نقش اس کی زندگی میں ابھر آیا ہے اسے مٹانے اور اس کا تدارک کرنے کی وہ سخت کوشش کر رہا ہے، تو سمجھا جائے گا کہ وہ حقیقت میں نادم ہے اور یہ ندامت ہی اس کے ایمان و اخلاص کی دلیل ہوگی۔

محدثین نے ان آیات کی شان نزول میں جو واقعہ بیان کیا ہے اس سے یہ مضمون آئینہ کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ آیات ابولبابہ اور انہی جیسے سات آٹھ دوسرے اصحاب کے معاملہ میں نازل ہوئی تھیں۔ ابولبابہ ان لوگوں میں سے تھے جو بیعت عقبہ کے موقع پر ہجرت سے پہلے اسلام لائے تھے پھر یہ جنگ بدر، جنگ احد اور دوسرے معرکوں میں برابر شریک رہے، مگر غزوۂ تبوک کے موقع پر نفس کی کمزوری نے غلبہ کیا اور یہ کسی عذر شرعی کے بغیر بیٹھے رہ گئے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے اور ان کو معلوم ہوا کہ پیچھے رہ جانے والوں کے متعلق اللہ اور رسول کی کیا رائے ہے تو انہیں سخت ندامت ہوئی۔ انھوں نے اپنے آپ کو خود ایک ستون سے باندھ لیا اور کہا کہ مجھ پر خواب و خور حرام ہے جب تک میں معاف نہ کر دیا جاؤں یا پھر مر جاؤں۔ چنانچہ کئی روز وہ اسی طرح بے آب و دانہ اور بے خواب بندھے رہے حتیٰ کہ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ آخر کار جب انھیں بتایا گیا کہ اللہ اور رسول نے تمہیں معاف

(باقی حاشیہ صفحہ ۳۲ پر)

کیا کرتے رہے ہوں[۱]

کچھ دوسرے لوگ ہیں جن کا معاملہ ابھی خدا کے حکم پر ٹھیرا ہوا ہے، چاہے انھیں سزا دے اور چاہے ان پر ازسرِ نو مہربان ہو جائے
اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکیم و دانا ہے[۲]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰) کر دیا تو انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میری توبہ میں یہ بھی شامل ہے کہ جس گھر کی آسائش نے مجھے فرض سے غافل کیا ہے اور اپنے تمام مال کو خدا کی راہ میں دے دوں۔ مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سارا مال دینے کی ضرورت نہیں، صرف ایک تہائی کافی ہے۔ اور وہ انھوں نے اسی وقت فی سبیل اللہ وقف کر دیا۔ تقریباً یہی معاملہ ان دوسرے اصحاب کے ساتھ بھی پیش آیا جو اس قصور میں ابو لبابہ کے ساتھ شریک تھے۔ یہ سب حضرات عادی غیر مخلص نہ تھے بلکہ ان کا پچھلا کارنامۂ زندگی ان کے اخلاص ایمانی پر دلیل تھا۔ ان میں سے کوئی عادت نہیں تراشے بلکہ قصور کو سیدھی طرح قصور مان لیا۔ انھوں نے اعتراف قصور کے ساتھ اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ واقعی نہایت نادم اور اپنے اس گناہ کی تلافی کے لیے سخت بے چین ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک اور مفید نکتہ پر بھی نگاہ رہنی چاہیے جو ان آیات میں ارشاد ہوا ہے۔ وہ یہ کہ گناہوں کی تلافی کے لیے زبان اور قلب کی توبہ کے ساتھ ساتھ عملی توبہ بھی ہونی چاہیے، اور اس عملی توبہ کی ایک شکل یہ ہے کہ آدمی خدا کی راہ میں مال خیرات کرے۔ اس طرح وہ گندگی جو نفس میں پرورش پا رہی تھی اور جس کی بدولت آدمی سے گناہ کا صدور ہوا تھا، دور ہو جاتی ہے اور خیر کی طرف پلٹنے کی استعداد بڑھتی ہے۔ گناہ کرنے کے بعد اس کا اعتراف کرنا ایسا ہے جیسے ایک آدمی جو گڑھے میں گر گیا تھا، اپنے گرنے کو خود محسوس کرے۔ پھر اس کا اپنے گناہ پر شرمسار ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اس گڑھے کو اپنے لیے نہایت بری جائے قرار سمجھتا ہے اور اپنی اس حالت سے سخت تکلیف میں ہے۔ پھر اس کا صدقہ و خیرات اور دوسری نیکیوں سے اس کی تلافی کی سعی کرنا گویا گڑھے سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] مطلب یہ ہے کہ آخر کار معاملہ اس خدا کے ساتھ ہے جس سے کوئی چیز چھپ نہیں سکتی اس لیے بالفرض اگر کوئی شخص دنیا میں اپنے نفاق کو چھپانے میں کامیاب ہو جائے اور انسان جن جن معیاروں پر کسی کے ایمان و اخلاص کو پرکھ سکتے ہیں ان سب پر بھی پورا اتر جائے تو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ نفاق کی سزا پانے سے بچ نکلا ہے۔

[۲] یہ لوگ ایسے تھے جن کا معاملہ مشکوک تھا۔ نہ ان کے منافق ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا تھا نہ گناہ گار مومن ہونے کا۔ ان دونوں چیزوں کی علامات ابھی پوری طرح نہ ابھری تھیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے معاملہ کو ملتوی رکھا۔ نہ اس معنی میں کہ فی الواقع خدا کے سامنے معاملہ مشکوک ہے بلکہ اس معنی میں کہ مسلمانوں کو کسی شخص یا گروہ کے معاملہ میں اپنا طرز عمل اس وقت تک متعین نہ کرنا چاہیے جب تک اس کی پوزیشن ایسی علامات سے واضح نہ ہو جائے جو علم غیب سے نہیں بلکہ حس اور عقل سے جانچی جا سکتی ہوں۔

مقالات

امامت حکمیہ کی حقیقت اور اس کی اقسام

(ماخوذ از منصب امامت مولانا شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ)

مترجمہ نعیم صدیقی صاحب

(۳)

غرور و کبر : بعض لوگ ایسے پائے جاتے ہیں کہ ان کی سرشت میں سرکشی اور خود پسندی کا خمیر شامل ہوتا ہے۔ ان کو اپنے منہ میاں مٹھو بننا اور ڈینگیں مارنے اور شیخی بگھارنے میں مزہ آتا ہے۔ اپنی ہستی کو بہت کچھ سمجھتے ہیں اور فخر میں اینٹھ کر چلتے ہیں، کیونکہ اولاد آدم انھیں مقابلے کے قابل نظر نہیں آتی۔ دوسروں کے بڑے سے بڑے کمال کو اپنی ادنیٰ سی خوبی کے مقابلہ میں ہیچ ثابت کر دیں گے، حالانکہ اپنی خوبی محض ایک سراب تخیل ہو۔ جیسے سب سے بڑھ کر ... دوسروں کے ساتھ کسی معاملہ میں برابر ہونا تو ان کے لیے بڑی شرم کی بات ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اپنے ساتھیوں کی تحقیر کو اپنی آبرو شمار کرتے ہیں اور اپنے بھائیوں کے زوال کو اپنی عظمت کا ثبوت قرار دیتے ہیں۔ نیز دوسروں کے کمالات کو پایۂ اعتبار سے گرا کر اپنی خوبیوں پر اتراتے ہیں۔ بس ان کی ذات سے مقصود فقط یہ ہوتا ہے کہ انھیں افراد انسانی کے درمیان اتنا امتیاز حاصل ہو جائے کہ کوئی ان کی برابری کی جرأت نہ کرے۔

اس قسم کا آدمی جب تخت حکومت پر قابض ہو گا تو کبر و نخوت کی وجہ سے آداب و القاب، حیال، زیور، مجلس حوالی اور دوسرے تمام معاملات میں اپنا ایک امتیازی شان پیدا کرے گا۔ پھر وہ اپنی ذات کے لیے مختلف چیزیں مخصوص رکھے گا۔ ان میں کسی دوسرے کی شرکت و مساوات سے سخت رنجیدہ ہوگا اور ان کی قطعی ممانعت کر دے گا۔ وہ جس تخت کو استعمال کرے گا اس پر بیٹھنا دوسروں کے لیے حرام کر دے گا۔ جس محل میں وہ رونق افروز ہوگا اس میں دوسروں کو داخلہ روک دیگا، پھر جو خاص الفاظ اپنے لیے تجویز کرے گا مثلاً "سلطان" "شاہ" "بادشاہ" "ظل سبحانی" اور "حضور اقدس" وغیرہ، ان الفاظ کو اگر خود سلطان کے بیٹے پر بھی کسی نے استعمال کر دیا تو وہ مجرم قرار پائے گا اور تعزیر اس پر عائد ہوگی۔ الغرض ایسے لوگوں کی دلی تمنا یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح خدا کے بندوں اور نبی کے امتیوں کو بالکل حقیر اور ذلیل سمجھ پائیں کیونکہ انھیں وہ اپنا ہم جنس تسلیم نہیں کرتے اور ہر معاملہ میں بڑھ چڑھ کر اپنی مسند دوسروں سے الگ بناتے ہیں۔

پھر ان ظالموں کی یہ بھی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے قوانین جمہور میں اصول دین اور ضوابط شریعت کا درجہ حاصل کرلیں اور ہر خاص و عام ان کی پوری اطاعت کرے۔ پھر ان کے سامنے قیل و قال اور بحث و تمحیص کی کسی کو جرأت نہ ہو۔ گویا خود یہ لوگ احکام الٰہی کے مخاطب ہی نہیں اور نہ ان احکام کی مخالفت پر انھیں کوئی پوچھنے والا ہے۔ یہ بڑائی اور حکم چلانے کی خواہش جب جلد ترقی کرتی ہے تو یہ صورت اختیار کرتی ہے اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ ربوبیت یا الوہیت کا صاف دعویٰ کر دیا جاتا ہے۔ اب سلطان ... اور ... کا ثانی بن جاتا ہے۔ خدائے بزرگ و برتر کی کوئی صفت ایسی نہیں رہ جاتی جسے یہ ظالم اپنے پروانوں اور حکم ناموں میں اپنی ذات سے منسوب نہ کرے اور خالق اکبر کے ناموں میں سے کوئی نام ایسا نہیں چھوٹ جاتا جسے یہ جاہل اپنے لقب کے طور پر استعمال نہ کرتا ہو۔ پھر انبیاء و مرسلین کے مدارج میں سے کوئی درجہ ایسا نہیں بچ رہتا کہ یہ دشمن دین اس کا مدعی نہ بن بیٹھتا ہو، ... دین کے مراتب میں سے کوئی رتبہ ایسا نہیں باقی رہتا جس میں یہ اپنے استاد ان کی برابری کا دم نہ بھرتا ہو۔

غرور و کبر کی یہ سلطنت جس طرح پوری امت کے لیے اور پورے دین کے لیے حد درجہ مضر ہے اسی طرح خود اس سے بڑا گناہ یہی ہے جو اس جاہل نے ... زہر قاتل ہے۔ کوئی سلطان اپنی سلطنت سے وہ نقصان نہیں اٹھاتا جو سلطانی تکبر اپنی سلطنت سے اٹھاتا ہے۔ یہ ظالم اپنی ہستی کو رب یا کا گویا خالق سمجھتا ہے خصوصاً جب زمانہ اس کا ساتھ دے رہا ہو اور قسمت یاوری کر رہی ہو یعنی دنیا اس کے آگے پیش ... ہو اور کسی کو سرکشی کی جرأت نہ ہو تو اس کا انداز ... اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے اور اس کا خطرہ ... کو بھی چھوتا ہے۔ فرمایا صاحب نبوت نے:

اذا مشت امتی المطیطاء وخدمتها ابناء الملوك ابناء فارس والروم سلط الله شرارها علی خیارها

جب میری امت اکڑ کر چلنے لگے گی اور فارس و روم کے شہزادے اس کی خدمت بجا لانے لگیں گے اس وقت اللہ تعالیٰ امت کے شریر لوگوں کو اس کے نیکوکار بندوں پر مسلط کر دے گا۔

نیز فرمایا:-

الكبرياء ردائی والعظمة ازاری فمن نازعنی واحداً منهما ادخلته النار

کبریائی میری چادر ہے اور عظمت میری ازار، سو جس کسی نے ان دونوں میں سے کسی چیز کو مجھ سے چھیننے کی کوشش کی اسکو میں جہنم میں جھونک دوں گا

اور یہ بھی کہ:

اغیظ رجل علی الله یوم القیامة واخبثه رجل كان یسمی ملك الاملاك لا مالك الا الله

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کو سب سے زیادہ بھڑکانے والا اور بدترین انسان وہ ہو گا جو دنیا میں بادشاہ (شہنشاہ) کہا جاتا تھا۔ اللہ کے سوا کوئی بادشاہ نہیں۔

پھر یہاں تک کہ:-

لا یقولن احدكم عبدی وامتی كلكم عبید الله وكل نساءكم اماء الله ولكن لیقل غلامی وجاریتی

تم میں سے کوئی کسی کو "میرا بندہ" یا "میری بندی" نہ کہے۔ تم سب لوگ اللہ کے "بندے" ہو اور تمھاری ساری عورتیں اسی کی بندیاں

وفتائی وفتاتی ولا یقل العبد ربی ولکن لیقل سیدی وفی روایۃ لا یقل العبد لسیدہ مولای فان مولاکم اللّٰہ

ہیں۔ بلکہ یوں کہے کہ میرا "غلام" اور "میری لونڈی" یا "میرا خادم" اور "میری خادمہ" اسی طرح کوئی غلام اپنے آقا کو "رب" نہ کہے بلکہ "سید" کہہ کر پکارے۔ ایک دوسری روایت یں ہے کہ کوئی غلام اپنے آقا کو مولا نہ کہے کیونکہ تمھارا مولا صرف اللہ ہے۔

سلطنت جابرہ کی اقسام سلطنت جابرہ جس کا مفصل بیان اوپر ہو چکا ہے دو طرح کی ہوتی ہے ایک صورت اس کی یہ ہے کہ سلطان جابر اپنی شوخ چشمی اور گستاخی کے باوجود ایمان کی بھی کچھ رمق دل میں رکھتا ہے اور اس سے بعض اعمال صالحہ بھی ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس کے اعمال صالحہ طریق مشروع پر منطبق نہیں ہوتے، ورنہ اہل دیانت کے نزدیک ان کو کوئی وزن حاصل ہو سکتا ہے، کیوں کہ وہ ان کی انجام دہی کے لیے اپنا ہی ایک ڈھنگ نکالتا ہے اور اپنی ہی پسند کے مطابق اقدام کرتا ہے۔ لیکن دل میں وہ ان اعمال کو تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھتا ہے اور پورے خلوص نیت سے انھیں بجا لاتا ہے۔ مثلاً ہوا و ہوس کی راہ میں جس دریا دلی سے اپنے خزانے لٹاتا ہے اسی کشادہ دلی سے ایک مسجد کی تعمیر پر بھی خرچ کرتا ہے اور اسے سونے چاندی کے نقش و نگار سے خوب مزین کرتا ہے اور اس کو اپنی عبادت سمجھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بنا بجائے خود اسراف میں داخل ہے اور اسراف شریعت میں حد درجہ مذموم فعل ہے اور اس وجہ سے خدا کے ہاں اس کی مقبولیت کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی، مگر چونکہ سلطان مسرف ہے اور اس کی رائے میں یہی اسراف انفاق فی سبیل اللہ ہے اور اسے سرانجام دیتے ہوئے وہ یہی یقین کرتا ہے کہ ایسے دینی کاموں میں جتنا زیادہ بڑھ چڑھ کے خرچ کروں گا اتنا ہی خدا کے ہاں مقبول ٹھہروں گا۔ ان خیالات کے ماتحت وہ تقرب الی اللہ کے لیے بے بہا دولت لٹا دیتا ہے۔

دوسری صورت میں سلطان جابر کا دل خوف خدا سے بالکل ہی بے نصیب ہوتا ہے اور وہ اعمال شرعی کو اخلاص سے انجام نہیں دیتا بلکہ کچھ بطور عادت اور کچھ دنیاوی شہرت یا اہل زمانہ پر تفوق کے لیے بعض احکام شریعت کی اطاعت کر لیتا ہے اور اس پابندی شرع کو جاہ و جلال کا لازمہ سمجھتا ہے۔ پس صورت اولیٰ میں تو سلطان کے اعمال کی ظاہری شکل مردود تھی اور اس کی نیت محمود، مگر اس دوسری صورت میں باطن بھی کھوٹ ہے اور ظاہر بھی کھوٹ ہے۔

چند ضروری نکات ذیل میں سلطنت جابرہ کے متعلق چند اہم نکات بیان کیے جاتے ہیں جن سے سلطان جابر کی حیثیت کو سمجھنے اور اس کے ساتھ معاملہ کرنے کی حدود کو متعین کرنے میں آسانی ہوگی۔

نکتۂ اول:۔ سلطان جابر کے متعلق یہ تو قطعی ہے کہ وہ خدا کے ہاں تو بالکل مردود و مقہور ہے، لیکن اس کے وجود سے ملت مومنین کو کسی قدر فائدہ ہوتا ہے اور کفر کو اس کے ذریعے نقصان پہنچتا ہے، مثلاً وہ سلطنت کے قیام کے لیے مسلمان

نیکی اور تقویٰ اور صالحیت حدود شرعی کے باہر کہیں نہیں پائی جاتی۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ اس کی شریعت سے آزاد ہو کر آپ نیکی کا ارادہ دل کو جس طرح چاہیں پورا کریں، نہیں بلکہ اسلام کی شریعت سے بے نیاز ہو کر اگر آپ لاکھ تسبیحیں روز پڑھیں اور کروڑوں سجدے دن رات میں کر لیں یہ نیکی اور تقویٰ نہیں ہیں۔ تصوف نے غلطی اگر کی تو یہی کہ تقویٰ کی راہ کو شریعت اسلامی کی حدود سے آزاد کر دیا۔ شاہ صاحب نے موقع پر بات واضح کر دی کہ ایسے "اعمال صالحہ" کو جو طریقۂ مشروع پر منطبق نہ ہوں مومن کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ (ن۔ص)

اہل جماعت کو وزیر وامیر مقرر کرے گا اور کافر بادشاہوں کی بیخ کنی کی فکر کرے گا۔ یہ ضروری ہے کہ اس مسلم پروری کی اصل علت اتباعِ دین نہیں ہے اور اس کی فراخ دلی کی وجہ اعلائے کلمۃ اللہ کا ارادہ نہیں ہے۔ اور اس وجہ سے عاقبت اندیشانہ نقطۂ نظر سے خود اسے تو کوئی فائدہ نہ ہوگا مگر دین اور اہل دین کا کچھ نہ کچھ بھلا ہو ہی جائے گا۔ ایسے سلطان کو "اندھا مشعلچی" یا "خدمتگار قیدی" سمجھنا چاہیے کہ دوسروں کو اس سے فائدہ پہنچتا ہے مگر وہ اپنے آپ سے نفع نہیں پا سکتا۔ اس کے نیک کاموں میں حصہ لینے سے انکار نہ کرنا چاہیے اور حتی الوسع اس سے تصادم نہ کرنا چاہیے۔ بس درگاہ الٰہی سے اس کی اصلاح احوال کی دعا کرنی چاہیے اور اس کی طرف سے جو ظلم و تعدی ہو اسے بلائے آسمانی سمجھ کر صبر کر لینا ہی مناسب ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ان اللہ تبارک وتعالیٰ یقول انا اللہ لا الٰہ الا انا مالک الملوک وملک الملوک قلوب الملوک فی یدی وان العباد اذا عصونی حولت قلوبهم بالسخط والنقمة فساموهم سوء العذاب فلا تشغلوا انفسكم بالدعاء على الملوك ولكن اشغلوا انفسكم بالذكر والتضرع كي اكفيكم ملوككم

اللہ تبارک وتعالیٰ کہتا ہے کہ میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، سارے بادشاہوں کا مالک ہوں، ان کے دل میرے ہاتھ میں ہوتے ہیں، جب میرے بندے میری نافرمانی کرتے ہیں تو میں ان بادشاہوں کے قلوب کو غصہ اور غضب کی طرف پھیر دیتا ہوں اور وہ ان کو سخت تکلیفوں میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ ایسے وقت میں تم ان کے حق میں بددعا مت کرنے نہ جاؤ بلکہ مجھ کو یاد کرنے اور میرے سامنے گڑگڑانے میں مشغول ہو جاؤ تاکہ میں تم کو تمہارے ظالم بادشاہوں سے بچا دوں۔

نکتۂ دوم:۔ سلطان جابر چونکہ اپنے طور پر یہی سمجھتا ہے کہ وہ مسلمان ہے اس وجہ سے کبھی کبھی حمیت دینی اور غیرت شرعی اسے اعلائے کلمۃ اللہ پر اکسا دیتی ہے۔ ایسی صورت میں دین و شریعت کی شان بڑھتی ہے۔ جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

ان اللہ لیؤید ہذا الدین بالعبد الفاجر — یقین رکھو، اللہ تعالیٰ اس دین کو بدکاروں کے ذریعہ بھی تقویت دیتا ہے۔

خاص ان حالات میں اس کی اعانت وحمایت ارکانِ اسلام میں سے ہے اور یہ اعانت وحمایت گویا نبی صلعم کی سچی خدمت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:

الجہاد ماض الی یوم القیامۃ لا یبطلہ عدل عادل ولا جور جائر — جہاد قیامت تک جاری رہے گا، اس کو نہ تو کسی عادل کا عدل باطل کر سکے گا نہ کسی ظالم کا ظلم۔

نکتۂ سوم:۔ بلاشک سلطان جابر امر بالمعروف کا محتاج ہے اور اس کے سامنے حق کو واضح کرنا ایک اونچے درجہ کی عبادت ہے، جیسا کہ ارشاد نبوت ہے کہ:۔

افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر — سب سے بڑا جہاد ظالم بادشاہ کے روبرو حق بات کا کہہ دینا ہے۔

لیکن یہ امر بالمعروف ایسے مناسب طریقے سے ہونا چاہیے کہ نوبت مخالفت اور کشمکش تک نہ پہنچے اور بغاوت نہ برپا ہو جائے کیونکہ امام جابر کے خلاف علم بغاوت اٹھانا جائز نہیں ہے[1] جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے:۔

---

[1] یہ ایک نازک سا مسئلہ ہے مگر میں یہ ضرور لکھوں گا کہ اس میں شاہ صاحب سے اختلاف ممکن ہے، یعنی بغاوت اور انارکی کی اجازت شریعت نہیں دیتی مگر مخالفت ومنازعت کو روکنے کی کوئی وجہ نہیں۔ منازعت کی بے شمار شکلیں ہیں۔ اگر نظام اسلامی تباہ ہو رہا ہو تو اسے ہموار کرنے کے لیے "غیر خونی انقلاب" کا راستہ اختیار کرنے میں کیا حرج ہے (ن ص)

الا من ولی علیہ وال فراٰہ یاتی شیئاً من معصیۃ اللہ فلیکرہ ما یاتی من معصیۃ اللہ ولا ینزعن یداً عن طاعتہ[1]

دیکھو! سن رکھو! جس کسی پر کوئی حاکم مقرر ہو اور وہ اس حاکم کو کسی معصیت کا مرتکب ہوتا ہوا دیکھے تو چاہیے کہ اس کو برا سمجھے لیکن اس کی اطاعت سے منہ ہرگز نہ موڑے۔

۲۔ سلطنت ضالہ

سلطنت جابرہ جب زیادہ قوی ہو جاتی ہے اور دیر تک مسلسل متواتر ایک ہی طریق جبر و کبر پر نظام اجتماعی کو چلاتے رہتے ہیں تو کارگاہ سلطنت میں دور ختم الانبیاء سے پہلے کا زمانہ جاہلیت ابھر آتا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ خلافت راشدہ اور سلطنت عادلہ کے طور طریقے بھولے بسرے خواب ہو جاتے ہیں اور حکومت و ریاست کے الفاظ بولتے ہی سلطنت جابرہ متصور ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں کوئی صاحب ایمان و دیانت نظام حکومت میں حصہ لینے کو طاعت و عبادت شمار نہیں کر سکتا بلکہ الٹا وہ اسے دنیا کی بدترین حرص اور پستی و گمراہی کا سب سے زیادہ ذلیل راستہ قرار دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکابر ملت امور سیاسیات سے دور رہتے ہیں اور سلاطین کی مجالست و مصاحبت سے دل برداشتہ ہو جاتے ہیں۔ اور پھر قرآن و سنت سلاطین کو چھٹی مل جاتی ہے کہ نفس امارہ کے پیچھے لگ جائیں۔ وہ لوگ جہاں تک چاہیں بہک کر چلے جائیں اور نخوت و غرور کی وادی میں جتنا دل چاہے دکھا دیں۔ پھر ان کی اور ان کے ساتھیوں کی عقلیں فسق و فجور کے تجربوں میں خوار رہتی ہیں اور ان کے موضوع فکر یہ ہوتے ہیں کہ رعایا کا مال کس طرح اڑایا جائے، شاہی اخراجات کس طرح پورے کیے جائیں، محصول کیونکر لگائیں، فلاں شخص کو کون سا منصب دیں، رعیت کو کن نئی بندشوں میں جکڑیں، اپنا شاہانہ ٹھاٹ اور رعب جمانے کے لیے کون سے طریقے اختیار کریں، وغیرہ۔ اس طرح جاہلیت کے اصول و فروع سے پیدا ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ کام کرتا ہے، ہر آنے والا چند قدم اور آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، حتیٰ کہ یہ فن مکروہ مکمل ہو جاتا ہے۔ ایک ایک مسئلے کے سر معاملے میں شریعت کی مخالفت شروع ہوتی ہے اور ہر معاملے کے لیے دین کے مقابلہ میں ایک نیا عمل اختیار کیا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت آ جاتی ہے کہ ملت مصطفوی کے مقابلہ میں ایک نئی ملت پیدا ہو جاتی ہے اور سنت نبوی کے متوازی ایک نئی سنت کھڑی ہو جاتی ہے اور قوانین الٰہی کی جگہ لینے کے لیے قوانین انسانی نمودار ہو جاتے ہیں۔ شرع الٰہی میں جو باتیں حرام ہیں وہ شریعت سلطانی میں واجب ہو جاتی ہیں اور اسی طرح وہاں جو کچھ واجب ہے وہ یہاں ممنوع قرار پاتا ہے۔ مثلاً شاہ کے لیے "خداوند جہاں پناہ"، "حضور اقدس"، "عرش آشیانی"، "ظل اللہ"، "حضور"، "پرستار"، "باختصاص تم قدر توام" وغیرہ الفاظ کا استعمال، امراء کا سر جھکا کر دست بستہ کھڑا ہونا، رقص و سرود کی مجالس کے ہنگامے یا عیدین، جشن وغیرہ مواقع پر ریشمی لباس پہننا، سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا، کفار کی عیدوں مثلاً نوروز، ہولی، دیوالی وغیرہ کی رسوم میں حصہ لینا اور ایسی ہی بہت سی حرکتیں اور ہیں جو شریعت اسلامی میں قطعاً حرام ہیں، مگر بادشاہ صاحب کا قانون کہتا ہے کہ یہ سب کچھ کرنا لازم ہے۔ دوسری طرف "السلام علیکم"

---

[1] اس بحث سے تعلق رکھنے والی حدیثوں کا ذخیرہ اچھی طرح پرکھے جانے کے قابل ہے کیونکہ ... بڑی بڑی کارستانیاں کی گئی ہیں۔ ... جو حدیث ہر حاکم کی اطاعت کا حکم دیتی ہیں وہ اس ... سے کہ خدا کی نافرمانی تک نوبت نہ پہنچے ... کتاب و سنت ... برداشت کرو لیکن ... شریعت ... بالکل ... ہو جائے تو ... "کفر بواح" ... کی صورت ... (۔ ۔)

کا جواب[1] دینا جماعت [illegible] اپنے ادنیٰ بندوں سے مروت و اخلاق سے پیش آنا، ہر مسلمان سے مصافحہ و معانقہ کرنا، [illegible] عوام سے رابطہ رکھنا، بیت اللہ کا حج کرنا، خدا پرستوں [illegible] مجالس علم و ذکر کی [illegible] اور اہل حاجت کی عرض [illegible] امور [illegible] انہی میں داب [illegible]

[illegible] دیتا اور دریائی و صحرائی [illegible] ہوں اور [illegible] مسافروں کی پکڑ دھکڑ کرتے رہیں اور ان کی [illegible] شامل ہیں اور ان کے مال [illegible] [illegible] اسلام [illegible]

[illegible] فی سبیل [illegible] آئین سلطانی میں [illegible] بیٹوں کی عداسلام [illegible] قطع [illegible] گمراہ [illegible] تلیا اور [illegible] شریعت کے قانون وراثت کی رو سے [illegible] بھائی [illegible] ترکہ میں [illegible] سلطنت [illegible] محروم قرار دیتا ہے۔ پھر بیت المال [illegible] شریعت [illegible] مسلمانوں کا [illegible] قانون [illegible]

[illegible] کرنا ہے کہ شریعت کے مقابلہ میں کس طرح قسم قسم کے احکام و ضوابط سلاطین [illegible] [illegible] ریاست حکومت [illegible] احکام و ضوابط انسانی کی تعلیم رواج پا رہی ہے اور ان کے [illegible] اسی معقول تعلیم کا انتظام [illegible] کے ماہرین [illegible] تعلیم کا نام کمال رکھتے ہیں اور اس [illegible] سلطنت [illegible] کے ماہرین ہوتے ہیں ان مروجہ فنون پر کتابیں مرتب کرتے ہیں اور اس سرمایہ [illegible] بزعم خود تحقیقات کرتے ہیں جیسے [illegible] ایک [illegible] [illegible] دینے کی کوشش کی گئی۔ اس [illegible] کتاب [illegible] ساتھ دین [illegible] کے نام [illegible] اسلامی اصول [illegible]

---

[1] شاہ صاحب اپنے زمانے [illegible] تاریخ [illegible] نظر رکھتے تھے اور یہاں بطور مثال جن جن باتوں کا موصوف نے تذکرہ کیا ہے وہ اسی دور میں جانی بوجھی باتیں تھیں۔ دراصل [illegible] کے سامنے پیش کیا جا رہا ہو یا جس سوسائٹی کی اصلاح منظور ہو اس کے مخصوص حالات اور اس کی مخصوص تاریخ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کے اصولوں کی تبلیغ اور کفر [illegible] کی تردید دونوں کے لیے مثالیں وہ لینی چاہئیں جو لوگوں کے ارد گرد [illegible] مثلاً آج اگر دعوت حق کا کام کرنا ہو تو [illegible] زیادہ ضرورت ہے [illegible]

[2] ذرا آج کل [illegible] دیکھیں کہ ان کا رویہ آج کیا ہے [illegible] اکبر اور محمد شاہ کے دور میں تھا! یعنی جس کمال کی قدر سلطنت کی طرف سے ہو رہی ہو اس کو بچوں [illegible] پیدا کرنا ہے [illegible] غلامی ہو یا کمال کفر!

[illegible]

خلاصہ یہ کہ یہ سیاست سلطانی مذہب اسلام سے الگ ایک مستقل مذہب ہے اور ملت [illegible] سے علیحدہ ایک ملت ہے۔ جیسے کہ [illegible] مستقل مذاہب [illegible] غلط فہمی [illegible] کہ یہ سیاسی مذہب باطل [illegible] کے مذاہب [illegible] ان فرقوں کے مذہب باطل [illegible] ان کا دعویٰ [illegible] ہے [illegible] سلاطین [illegible] کتاب و سنت سے ماخوذ ماننے کا لفظی دعویٰ [illegible] سلطنت [illegible] ہے [illegible] کے [illegible] پر حکم دیتے ہیں [illegible] ان کے [illegible] ملت اسلامیہ کے دائرے میں ان کا شمار کسی طرح نہیں کیا جا سکتا۔

چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہی [illegible] سلاطین کے متعلق خبر دے دی ہے کہ :

[illegible] المضلین [illegible] اسلام [illegible]

حضرت [illegible] سے روایت ہے کہ :

[illegible] رسول اللہ [illegible] هذا الخیر [illegible]

[illegible] فیہ [illegible] فقال نعم [illegible] [illegible]

[illegible] السیف لقیۃ [illegible] [illegible]

قال [illegible] علیٰ [illegible] [illegible]

[illegible] الضلال [illegible] [illegible]

[illegible] وجود میں آئے گی جس کی نسبت ہی ایک طوفان ہوگا [illegible]

[illegible] ارشاد فرمایا :

[illegible] علی ابواب ایک اندھا بہرا فتنہ [illegible]

[illegible] پھر کثرت ہوگی لوگوں [illegible]

[illegible] سلاطین [illegible] کے گروہ میں سے ہوتے ہیں اور ان کا [illegible] زبان [illegible] کے مدعی ہوتے [illegible] ان کا کفر ان کے اعلان ایمان کے پیچھے مستور رہتا ہے۔ وہ [illegible] کے لیے [illegible] اور [illegible] کی پابندی کرتے ہیں، مثلاً نکاح، ختنہ، عید [illegible] مردوں کی تجہیز و تکفین اور [illegible] قبروں میں دفنانے کا اہتمام وغیرہ۔ الغرض [illegible] دامن صاف [illegible] چھوڑ [illegible] لیکن [illegible] سلطانی [illegible] و آئین ہی کو [illegible] رسم و رسم کے لیے [illegible] ہیں۔ چنانچہ اپنے [illegible] اور [illegible] کرنے میں [illegible] شریعت اور آئین سلطانی دونوں کے ضوابط [illegible] قانون تو شریعت کا قانون ہے [illegible] سیاست میں شریعت کے ساتھ "[illegible]" کی [illegible] ہوتی ہے [illegible] مراد ہوتی ہے چنگیز خانی قانون۔ سو عملی کفر کے ساتھ یہ جو اسلام کا لیبل برقرار رکھا جاتا ہے [illegible] شریعت [illegible] ایک [illegible] رکھتا ہے۔ آخرت میں مواخذہ کے لیے یقیناً ان کا کفر مخفی کافی ہے لیکن دنیا میں ان سے [illegible] کا معاملہ

کیا جائے گا۔ خواہ وہ قیامت میں کفار اشرار کے ساتھ دوزخ کی گہرائیوں میں دائماً جلنے والے ہوں یا رحمت الٰہی انھیں عذاب سے پہلے یا بعد بخش دے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں۔ یہ ان کا معاملہ ہے جو خدا کے سپرد ہے البتہ امور دنیا میں ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو کافروں کے ساتھ ہوتا ہے۔

فی الحال جب سلطنت بگڑ کر سلطنت ضلالت بن جاتی ہے تو اس کا قدم فسق و ظلم کی سرحد سے آگے بڑھ کر ضلالت کی وادی میں جا داخل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے سلاطین مضلین کی حیثیت وہی ہے جو مختلف بدعتی فرقوں کے داعیوں کی ہے اور جیسا اختلاف بدعتیوں کی تکفیر و عدم تکفیر میں پیدا ہوا ہے ویسا ہی اختلاف سلاطین مضلین کی تکفیر و عدم تکفیر کے مسئلہ میں بھی ہے۔ ایسے موقع پر احتیاط لازم ہے اور کوئی فیصلہ دینے میں تامل کرنا چاہیے۔

سلاطین مضلین کی دو قسمیں سلاطین مضلین کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ان میں سے کچھ تو متمردین ہوتے ہیں اور کچھ مقلدین۔ اس تقسیم کی حقیقت یہ ہے کہ آئین سلطانی جب سوسائٹی میں ایک مذہب کی طرح جاری و ساری ہو چکتا ہے اور اس کی خوب شہرت ہو جاتی ہے[1] تو بعض سلاطین متاخرین اگرچہ اپنی اصل جبلت کی رو سے عیش و نشاط کی طرف راغب نہیں ہوتے اور نہ انھیں تکبر کا طریقہ مرغوب ہوتا ہے، لیکن محض آئین اسلاف کی رعایت سے اور کچھ رسم و عادت کے طور پر تکبر کی تقلید کرتے ہیں۔ اس حال میں کہ ان کا دل اس سے نفرت رکھتا ہے۔ وہ اکثر قوانین سلطانی کے باطل ہونے پر یقین رکھتے ہیں مگر ناچار ان کو نافذ کرتے ہیں۔ اگر ان کے دلوں کو چیر کر دیکھا جائے تو معلوم ہو کہ قوانین شریعت کے مقابلہ میں آئین ریاست ان کے نزدیک زیادہ قابل احترام ہے اور خدائے ذوالجلال کی محبت سے ان کی محبت مال و منال بڑھی ہوئی ہے اور خدا کے احکام کو طلب کرنے سے اپنے منصب سلطانی کا تحفظ زیادہ عزیز ہے۔ ایسے سلاطین کو ہم سلاطین مقلدین کہتے ہیں۔

دوسری قسم وہ سلاطین ہیں جو خلقی طور پر عیش و نشاط اور تجبر و تکبر کے دلدادہ ہوتے ہیں اور ایمان کی حقیقت سے قطعی بے بہرہ۔ ان کی اس افتاد مزاج کے ساتھ آئین اسلاف بھی سازگاری کرتا ہے تو ان کی عیاشی اور جباری کی شان دوبالا ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ آئین سلطانی کو خوب چمکاتے ہیں اور اس کی رونق کو حد کمال تک پہنچا دیتے ہیں۔ یہ دین شاہی کے مجتہد اور سنت سلطانی کے مجدد ہوتے ہیں۔ ہم ان کا امتیازی لقب سلاطین متمردین تجویز کرتے ہیں۔

سلطان مضل کی حیثیت اب یہاں سلطان مضل کی حیثیت کے تعین کے لیے چند اشارات پیش کیے جاتے ہیں۔

نکتۂ اول: سلطان مضل کے رئیس المفسدین اور امام المبتدعین ہونے میں کیا شک ہے۔ اس کی ریاست دین کے حق میں زہر ہلاہل اور اس کی امامت کتاب و سنت کے حق میں تباہ کن ہے، لیکن چونکہ امور اسلامی میں مسلمانوں کو اسی سے پالا پڑتا ہے اس لیے

---

[1] سوسائٹی میں جو طور طریقے اور جو آئین و ضوابط مقبول ہو جاتے ہیں ان کی قوت اتنی زبردست ہوتی ہے کہ "بادشاہ" تک ان کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔ اس سے دو نکات اخذ ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ریاستی نظم کی اصلاح کے لیے رائے عامہ اور سوسائٹی کو اپنے ڈھب پر لانا چاہیے اور دوسرے یہ کہ باطل کا سدباب اس سے پہلے کرنے کی فکر کی جانی چاہیے کہ وہ سوسائٹی میں مقبول اور نافذ ہو جائے۔ اسی نکتہ کی بنا پر ہم یہ رائے رکھتے ہیں کہ اسلامی ریاست کے سربراہ کاروں کی لغزشوں پر چشم پوشی کے بجائے انھیں درست کرنے میں جستجو دکھانی چاہیے۔ (ن۔س)

اس کی تکفیر کا مسئلہ پیچیدہ ہے اور اس کے خلاف علم بغاوت اٹھانا یا اس کی اطاعت سے انکار کر دینا ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ پس محتاط[1] لوگوں کو خود بغی و خروج سے بچنا چاہیے اور اگر کوئی دوسرا اقدام کرے تو اسے ملامت بھی نہ کرنی چاہیے۔ جیسا کہ علمائے اہل سنت نے رافضیوں پر خود تلوار نہیں اٹھائی اور اگر علمائے ماوراء النہر نے اسے روا ٹھہرایا تو اس پر اعتراض بھی نہیں کیا۔ سلاطین مضلین پر بغی و خروج کو ناجائز ماننے کے بعد ان کی سلطنت کو اقسام امامت ہی میں گننا لازم آتا ہے۔

نکتۂ دوم:۔ سلطان متغلب ملت اسلام سے نسبتاً زیادہ قربت رکھتا ہے، اس وجہ سے اس کی مخالفت میں بے باک نہ ہونا چاہیے۔ اس سے کشمکش کرنا اور اس کی اطاعت کا انکاری ہونا اگرچہ بظاہر شریعت کی رو سے موجب الزام نہیں ہے مگر مصلحت وقت کے خلاف ہے۔ ہاں اگر اس کی ریاست کو تہ و بالا کرنے سے خلافت راشدہ یا سلطنت عادلہ کا قیام متیقن[2] ہو تو قتل و مقاتلہ کا جھنڈا اٹھانا اور اس گمراہ متبارع کو اقتدار سے ہٹانے کی کوشش کرنا اسلام اور فرزندان اسلام کے لیے مفید ہے۔ ورنہ بے نتیجہ شورش عوام و خواص سب کے لیے مضر ہے۔

۴۔ سلطنت کفر

یہاں سب سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ سلطنت کفر سے مراد خاص[3] کافروں کی قائم کردہ حکومت نہیں ہے بلکہ اس اصطلاح سے ایسی حکومت مراد ہے جسے چلانے والے اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار نہ کرتے ہوں لیکن ان سے کھلے بندوں

---

[1] اس احتیاط کی کوئی حد بھی ہے کہ اسلام کا اجتماعی نظم پارہ پارہ ہوتا چلا جائے مگر دم سادھے لوگ بیٹھے رہیں۔ دراصل اسی احتیاط نے ہماری پچھلی تاریخ کو صدیوں تک وادی ضلالت میں بڑھتے چلے جانے کا موقع دیا۔ محتاط لوگ ریاست کی اصلاح کے لیے قوت کے استعمال کی اجازت اس وقت دیتے ہیں، جب نہ قوت پانے کا موقع رہتا ہے اور نہ قوت استعمال کرنے کا۔ آغاز مرض میں علاج آسان ہوتا ہے، لیکن اس وقت تو حضرات صبر کر کے بیٹھے رہنے کا مشورہ دیتے ہیں، پھر جب مرض کا طوفانی دور شروع ہوتا ہے تو علاج کی اجازت دیتے ہیں بلکہ بعض تو عالم نزع طاری ہونے سے پہلے طبیب کو مریض کے قریب نہیں پھٹکنے دیتے۔ ہم اس احتیاط کے قائل نہیں، البتہ اسے صحیح مانتے ہیں کہ مرض کے مختلف مدارج میں مختلف تدابیر اختیار کرنی چاہئیں اور اسی اصول پر تعجب ہوتا ہے کہ اکبر اور محمد شاہ تک کے ادوار میں ہمیں صرف کلمۂ حق کے کہہ دینے کی اجازت ملتی ہے، حالانکہ یہ تو مرض کی انتہائی صورت ہے اور اس کے ازالہ کے لیے منظم تحریک کی ضرورت ہے (ن۔ص)

[2] یہاں متیقن سے مراد یہ ہے کہ اس کا ظن غالب ہو اور اس کا امکان ثابت ہو۔ ہم بھی اس بات میں شاہ صاحب سے متفق ہیں کہ کسی حالت میں انقلابی سرگرمیوں کی اجازت اگر دی جا سکتی ہے تو اس شرط کے ساتھ کہ ریاست کی اصلاح ہو جانے کا امکان غالب ہو (ن۔ص)

[3] یہاں سے یہ نکتہ سمجھ لینا چاہیے کہ کسی فرد کے مسلمان کہلانے کے ساتھ اس بات کا امکان ہے کہ جس ادارے کو یا جس تحریک کو وہ چلا رہا ہو وہ کفر کا ادارہ یا کفر کی تحریک ہو۔ پھر اس نکتہ کی روشنی میں موجودہ مسلمانوں کو اپنے اجتماعی مشاغل پر نگاہ رکھنی چاہیے کہ وہ اگرچہ مسلمان ہیں مگر کیا ان کی جماعتیں، ان کی تحریکیں، ان کے سیاسی ہنگامے، ان کے علوم و فنون، ان کے مدرسے، ان کی صحافت اور ان کے پیشے بھی مسلمان ہیں یا نہیں؟ (ن۔ص)

موجباتِ کفر فی الحقیقت ہوں) اور ان کی طرف سے احکامِ شریعت کی اتنی مخالفت اور دشمنی سرزد ہوتی ہو کہ ان پر کفر و ارتداد کا حکم ثابت ہو جائے۔ بعض لوگ جبلۃً ملحد مزاج اور زندیق طبع ہوتے ہیں اور بظاہر کلمۂ اسلام پڑھتے رہنے کے باوجود دل میں خدا و رسول اور دین و مذہب اور حساب و کتاب پر یقین نہیں رکھتے۔ ان کی نگاہ صرف دنیوی نشیب و فراز پر رہتی ہے اور جاہ و جلال اور مال و منال کو کمالِ زندگی شمار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ذہین و ذکی وہی ہے جو انہی الجھنوں میں الجھا رہے اور جن کو ان دنیوی سربلندیوں سے دلچسپی نہ ہو اسے یہ احمق و غبی شمار کرتے ہیں۔ جو چیز دنیائے دوں کے حصول کا ذریعہ بن سکے وہ ان کے ہاں لائقِ شمار ہوتی ہے۔ اور جس کوشش سے ناموری اور شہرت حاصل نہ ہو وہ بے سود گنی جاتی ہے۔ اس نظریہ کے ماتحت یہ حضرات تمام انبیاء اور راہِ حق کے دیگر رہنماؤں کو جاہ طلب ہوشیاروں میں شمار کرتے ہیں اور ان کے پیروؤں کو عقل کے کورے قرار دیتے ہیں جو کہ انبیاء کی (نعوذ باللہ) دل فریب باتوں میں آ گئے اور ان کے خوشنما وعدوں میں مگن ہو گئے۔ ظاہر بات ہے کہ جن لوگوں کے دل میں ایسے خیالات جمع ہوں وہ اعمال و اقوال میں کتاب و سنت کی رعایت کو حماقت ہی سمجھیں گے اور عادات و معاملات میں مذہب و ملت کی قیود کو بے وقوفی ہی جانیں گے۔ عبادتوں کی تکلیف اٹھانا اور عجز و توکل کی راہ پر گامزن ہونا انھیں کب مرغوب ہو سکتا ہے۔

ایسے لوگ جب تختِ سلطنت پر براجمان ہوتے ہیں تو آئینِ سلطانی کو جو ظاہرِ سلطنت کا دبدبہ بڑھاتا ہے، فراست و کیاست پر مبنی سمجھتے ہیں اور شرعِ ربانی کو محض نقصد پاکر احمقانہ رسوم کا مجموعہ قرار دیتے ہیں۔ اس عقیدت کے ماتحت ائمہ کے حق میں بدگوئی کرتے ہیں اور اپنے کارندوں کی نگاہوں میں اسے حقیر بناتے رہتے ہیں اور اس کی بیخ کنی کے لیے طرح طرح کے حیلے نکالتے ہیں۔ ہر معاملہ میں حکمِ سلطانی کو ترجیح دے کر حکمِ الٰہی کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ اپنے حکم کے فوائد اور حکمِ الٰہی کے نقائص ثابت کرنے میں خوب چرب زبانی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی ہر بات میں دینِ رب العلمین پر ایک چوٹ اور سنتِ سید المرسلین پر ایک تعریض ہوتی ہے۔ اور اپنی خرافات میں زور پیدا کرنے کے لئے وہ کبھی یاوہ گو شعرا کے اشعار اور علمائے جاہ طلب کی گھڑی ہوئی تمثیلات سے مدد لیتے ہیں اور کبھی فلسفیوں کے اقوال اور ملحدوں کے خیالات سے استدلال کرتے ہیں[۲]

ایسے سلاطین کے متعلق بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سرکش کافروں اور زندیقوں اور مرتدوں کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے خلاف جہاد کرنا ارکانِ اسلام میں سے ہے اور ان کی تذلیل سید الانام کی سچی حمایت ہے۔ ان کی سلطنت قطعاً امامتِ حکمیہ کے زیرِ عنوان نہیں آتی۔ اور اس وجہ سے ان کی اطاعت کرنا شریعت کو ہرگز مطلوب نہیں ہے۔ اسی معنی پر عبادہ ابن صامت کی یہ روایت گواہ ہے کہ:-

بایعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ان — ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر بیعت کی ہے کہ حاکمِ وقت

[۱] اس مقام پر شاہ صاحب نے سلاطینِ اسلام کش کی جو تصویر کھینچی ہے اس سے ذرا موجودہ دور کے مسلمان اپنی شکلوں کو ملا کر دیکھیں، کیا ایک نقطے اور شوشے کا فرق بھی باقی رہ گیا ہے۔ ہاں ایک فرق ہے کہ وہاں سلطنت تھی اور یہاں غلامی ہے۔ (ن-ص)

[۲] گمراہوں کا یہ شیوہ رہا ہے کہ قرآن و حدیث کو سند مان کر احکامِ شرعی سے ٹھوس استدلال کرنے کے بجائے فلسفہ اور شاعری کے خرافات سے باتوں میں زور پیدا کرتے ہیں۔ (ن-ص)

لا ننازع الامر اھلہ الا ان تروا کفرا بواحا عندکم من اللہ فیہ برھان — ہم منازعت نہ کریں الا آنکہ اس سے ایسے کفر صریح کا صدور ہو جس کے متعلق تمہارے پاس خدا کی کھلی ہوئی حجت موجود ہو۔

بعض حالات میں جب سلطانِ مرتد کو یہ خیال لاحق ہو جاتا ہے کہ عوام جو سعی بلیغ انبیاء و مرسلین کی اطاعت میں کر سکتے ہیں اور ان کی اطاعت کو جس طرح اپنی انسانی سعادت شمار کرتے ہیں، اس طرح کی اطاعت ملوک و سلاطین کی نہیں کر سکتے، بلکہ اطاعت سلاطین کو ذلت و ننگ سمجھتے ہیں تو وہ دعوئے سلطنت کے ساتھ دعوائے نبوت کو بھی شامل کر دیتا ہے تاکہ اہلِ خرد جاہ و مال کے لالچ میں آکر اور سادہ لوح فلاح عاقبت کے خیال سے اطاعت کیش بنے رہیں یوں ایک جدید مذہب گھڑ جاتا ہے۔ مگر بات نبوت کے دعوے پر ہی ختم نہیں ہو جاتی۔ تجرّد و تکبر کا قدم اور آگے اٹھتا ہے اور دعوائے نبوت میں خدائی کا دعویٰ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر سلطانِ مرتد کا کفر فرعون کے کان کاٹتا ہے۔ ایسی ناپاک سلطنت کفر کا قیام بالکل غلبۂ کفار کی حیثیت رکھتا ہے اور مسلمانوں پر اس کا وجود یہ لازم کر دیتا ہے کہ وہ اس کے خلاف جہاد کریں اور اس طوفانِ فساد کو سختی سے فرو کریں، یہ ممکن نہ ہو تو ایسے ناپاک دیس سے ہجرت کر جائیں بشرطیکہ کوئی دار الاسلام موجود ہو۔

یہاں جو سلطنتِ کفر زیرِ بحث ہے ایک فرضی صورت ہے۔ اس کا تذکرہ اس لئے کیا گیا ہے کہ انہی دعوائے اسلام رکھنے والے سلاطین میں ایسا شخص بھی نمودار ہو سکتا ہے جو کافر و بے دین ملحد و مرتد ہو۔ ایسے شخص کا استیصال عین اسلام کا تقاضا ہے اور ہر عاصی و فساد کی اطاعت کرنا اور ہر جبار کے آگے گردن جھکا دینا دین کا مدعا نہیں ہے[۵]۔

---

۵ یہ فیصلہ ایسے نظام حکومت کے متعلق ہے جسے چلانے والا کم از کم نام کا "عبد اللہ" اور "محمد احمد" اور "محبوب علی" ہو۔ پھر معلوم نہیں کہ جہاں یہ نام کا اسلام بھی موجود نہ ہو وہاں کے مسلمان نافص حکومتِ کفر کو کیونکر قابلِ برداشت قرار دیتے ہیں اور اس کے کارندے بن کر کیسے اپنے تقویٰ کو محفوظ کر لیتے ہیں۔ (ان

لکھ کیا لوگوں نے رفتہ رفتہ ٹھیک ٹھیک اسی غلط طریقہ کو دین نہیں بنا لیا اور ان کا عمل "وَاتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ" کی شکل نہیں اختیار کر گیا ہے۔ نصوصِ قرآنی کی کیسی غلط تشریحیں اور تاویلیں بلکہ کھلی ہوئی معنوی تحریفیں ہیں جو اس طریق مجرمانہ کے جواز کے لیے اختیار کی گئیں اور تاریخ کی کیسی کیسی دور از کار تفسیریں ہیں جو کفار کی اعانت و اطاعت کو برحق ثابت کرنے کے لیے استدلال کے تھیلوں سے نکالی گئیں۔ کاش کہ اب بھی لوگوں کی آنکھیں کھل جائیں اور اب بھی انھیں ہوش آجائے کہ ابھی سنبھلنے کا وقت ہے۔ (ن۔ ص)

نئی مطبوعات

روداد جماعت اسلامی حصہ سوم	عہ	نماز کی حقیقت	۴ر
دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات	عہ مجلد عہ	اسلام کی راہِ راست اور اس سے انحراف کی راہیں	۱۰ر
زندگی بعد موت	ار	نبوتِ محمدی کا عقلی ثبوت	۳ر
لباس کا مسئلہ	۳ر	قرآن فہمی کے بنیادی اصول	۳ر

فریضۂ اقامتِ دین

(از جناب مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی)

(۲)

اقامتِ دین کے امکان وعدم امکان کی بحث

عدم امکان کے قائلین اب اس گروہ کے خیالات کو لیجیے جو اس نصب العین — اس واحد فریضۂ حیات کی بجا آوری سے اس لیے کترا رہا ہے اور دوسروں کو بھی کترا کر چلنے کا مشورہ دے رہا ہے کہ بحالت موجودہ اس کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں اور دین کی اقامت کے لیے براہ راست جد وجہد کرنا نہ صرف ضیاع وقت ہے بلکہ مفاد ملی کے لیے تباہ کن بھی ہے، اس لیے عقل چاہتی ہے اور مصلحت اس کا تقاضا کرتی ہے کہ فی الحال اس کا نام نہ لیا جائے اور اپنی ساری قوتیں کسی ایسے مورچہ پر صرف کر دی جائیں جہاں سے ہم اپنے ماحول کے بدلتے ہوئے حالات پر اس حد تک اثر ڈال سکیں کہ آئندہ چل کر حالات ہماری اس جد وجہد کے لیے نسبتاً زیادہ سازگار ہو جائیں اور وہ دور سید آجائے جس میں ہم بآسانی اپنے نصب العین کی طرف علانیہ رجوع کر سکیں۔

اس نظریہ پر غور کیجیے تو ذہن میں چند سوال پیدا ہوتے ہیں:۔

(۱) کیا اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے براہ راست جد وجہد کرنے میں اس کی کامیابی کے امکان وعدم امکان کی بحث پیدا بھی ہو سکتی ہے؟

(۲) کیا دین کی اقامت واقعی ناممکن ہے؟

(۳) ناسازگاری حالات کی بناپر اس منزل مقصود کی طرف پھیر کے راستوں سے پیش قدمی کرنے کی کوئی عملی مثال، کوئی انسانی تجربہ یا کوئی صحیح فکری بنیاد موجود ہے؟

انہی سوالوں کے صحیح جواب میں اس نظریہ کا سقم وصواب مستور ہے، اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ اللہ کی کتاب اور اس کے پیغمبروں کے طریق کار اور اسوۂ اعمال سے یہ جوابات حاصل کیے جائیں۔ اللہ کی کتاب سے اس لیے کہ اسی نے اپنے پیرووں پر یہ بارِ عظیم ڈالا ہے اور ساتھ ہی اس کو یہ دعویٰ ہے کہ وہ تِبۡیَانًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ ہے، اس لیے یہ ممکن نہیں کہ تمام معاملات میں تو اس نے ہماری رہنمائی کی ہو اور اس معاملے کو تاریکی میں چھوڑ دیا ہو جو پورے صحیفۂ زندگی کا سرعنوان اور تمام فرائض دینی کا صدر نشین ہے اور اللہ کے رسولوں کے طریق کار اور اسوۂ اعمال سے اس لیے کہ ان پاکان خاص اور ان کے سچے اور کامل پیرووں کے سوا دنیا کسی ایسے انسان یا انسانی گروہ سے واقف نہیں ہے جس نے اس نصب العین کو اپنایا ہو۔

ادائے فرض بحث امکان سے بے نیاز ہے

قرآن مجید نے اس چیز کو کہ اپنے منصب اور نصب العین کی خاطر جد و جہد بہر حال ضروری ہے اور اس میں انجام کی پروا کیے بغیر ہر وقت لگے رہنا چاہیے۔ اتنی وضاحت سے بیان کیا ہے اور انبیا کرام نے اپنے عمل سے اس اصول زندگی کی ہمہ گیری اور صداقت کی ایسی روشن شہادتیں بہم پہنچائی ہیں کہ ایک منکر قرآن ہی اس کے انکار کی جرأت کر سکتا ہے۔ ہر نبی کو منصب رسالت پر مامور کرنے ہی اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ لوگوں کے سامنے اس حقیقت اور اس مطالبہ کا اعلان کر دو کہ:۔

اُعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ | لوگو! اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کے اتباع سے بچو

...... لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ | ...... میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری ہی عبادت کرو۔

چنانچہ اسی اعلان سے ہر نبی نے اپنی دعوت کی ابتدا کی۔ یہ چند حرفی اعلان دراصل اسی انقلابی مشن کا ایک اجمالی تفصیلی ہے جس کو قرآنی اصطلاح میں اقامت دین کہتے ہیں۔ یعنی ہر نبی نے آتے ہی اپنے اس نصب العین کا اظہار کیا اور لوگوں کو اس کی طرف بلایا اور خود اس کے لیے عملی سعی و جہد شروع کر دی کہ خدا کی زمین پر صرف اسی کا نازل کیا ہوا ضابطہ حیات نافذ ہو اور نافذ رہے۔ "عبادت" "الٰہ" اور "طاغوت" کے موجودہ بے جان تصورات کے پیش نظر اس بات کے اندر کچھ مذہبیانہ غلو محسوس ہوگا کہ ایک اللہ کی عبادت کی دعوت دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہر نبی نے اقامت دین کی جد و جہد شروع کر دی۔ لیکن قرآن نے اس وہم کا خود ہی استیصال کر دیا ہے اور صاف صاف بتا دیا ہے کہ حاملین توراۃ و انجیل و قرآن ہی کو یہ فریضہ نہیں سپرد کیا گیا تھا بلکہ ہر نبی کا مقصد بعثت یہی تھا:۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ (شوریٰ - ۲)

اللہ نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کی (پیروی کی) نوح کو وصیت کی تھی اور جس کی (اے نبی) تمہارے اوپر وحی کی ہے اور جس کا م نے ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ (وغیرہ تمام انبیا اور ان کے پیرووں) کو حکم دیا تھا اور کہا تھا کہ اس دین کو قائم کرو۔

غرض قرآنی تصریحات گواہ ہیں کہ بلا استثنا ہر نبی کو اللہ واحد کے نازل کردہ دین کی دعوت اور اقامت کا فرض سپرد کیا گیا تھا اور پھر قرآن ہی اس بات پر بھی گواہ ہے کہ ہر نبی نے اس امر الٰہی کی بجا آوری اس شان سے کی کہ نہ تو کبھی اس دعوت کے کامیاب ہونے پر خدا سے گارنٹی طلب کی، نہ ایک لمحہ اس کے انجام پر فکر و تامل میں ضائع کیا، نہ اس کے امکان اور عدم امکان کا ان کے ذہنوں نے سوال اٹھایا، نہ حالات کی ناسازگاری ایک آن کے لیے ان سے اس آواز کو سینہ میں دبا رکھنے کا مطالبہ کر سکی، بلکہ ہر ایک نے اپنی بعثت کی ابتدا سے زندگی کے آخری لمحہ تک اپنے اس فرض کو پورا کیا۔ ان میں اگر کچھ ایسے تھے کہ ان کی دعوت الی الحق نے کامیابی حاصل کی اور وہ دنیا چھوڑنے سے پہلے سچے خدا پرستوں کا ایک گروہ پیدا کر گئے تو متعدد ایسے بھی تھے جن کی آواز آخر تک بے حس دلوں کی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس ہوتی رہی۔ نوح علیہ السلام نے تقریباً ایک ہزار سال کے لیل و نہار اس ادائے فرض میں صرف کر ڈالے مگر اس طویل اور صبر آزما سعی کا انجام ان گالیوں اور پتھروں کی شکل میں نمودار ہوتا رہا جن سے ان کی "قوم" رات دن ان کو نوازتی رہتی تھی۔ اور جب ان کی ادائیگی فرض کا زمانہ ختم ہوا

تو ان کی دعوت قبول کرنے والوں کی تعداد گنتی کے چند افراد سے زیادہ نہ تھی۔ ابراہیم علیہ السلام نے بڑھاپے کی عمر تک اس عبادت الٰہ اور اجتناب طاغوت کا پیغام سنایا اور اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لیے لگاتار کوششیں کرتے رہے، اس کوشش اور پیغام رسانی کے دوران میں انھیں جن جن ابتلاؤں اور جاں گداز مصیبتوں سے گذرنا پڑا، ان کے تصور ہی سے دل کانپ اٹھتا ہے لیکن ان ساری تگ و دو اور ان پیہم قربانیوں کا ثمرہ یہ نکلا کہ ان کے اپنے اہل و عیال کے سوا مشکل ہی سے کوئی ان کی آواز پر لبیک کہنے والا تھا۔ حضرت لوط، شعیب، ہود، صالح اور عیسیٰ وغیرہ انبیائے کرام کے سوانح حیات میں کم و بیش یہی قسم کے حالات و مناظر دکھائی پڑتے ہیں۔ پھر اسی طائفہ میں حضرت یحییٰ اور انہی کی طرح کے کچھ دوسرے انبیا بھی موجود ہیں جن کی تبلیغ ہدایت کا انجام یہ نظر آرہا ہے کہ کلمۂ حق سننے والا تو ایک فرد بھی نہ ملا لیکن کسی کی گردن پھانسی کے پھندوں میں دیدی گئی اور کسی کے سر پر آرے چلا دیے گئے ــــ وَيَقْتُلُونَ الْاَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا دورِ نبوت اس حقیقت کا سب سے بڑا شارح ہے۔ آپ کو اسی پیغام کے ساتھ، جو ہر نبی کو برائے تبلیغ ملا تھا اور اقامت دین کے اسی مشن کو دے کر، جس کو ہر نبی نے کر آیا تھا، مبعوث فرمایا گیا۔ ایک طرف تو یہ پیغام بھی پہلے کی بہ نسبت کامل اور وسیع المعانی تھا، دوسری طرف مخاطب ایک مخصوص سرزمین کے بجائے پورا ربع مسکون تھا۔ اور اس "ربع مسکون" کا حال یہ تھا کہ اس کے ایک ایک گوشہ میں طاغوت کا علم گڑا ہوا اور کفر و شرک کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس حال میں خدا کا یہ آخری پیامبر آتا ہے اور آتے ہی وہی بات بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اپنے لوگوں کو سناتا ہے جو ہر نبی سناتا آیا ہے۔ تدریجاً دعوت کا حلقہ وسیع ہو رہا ہے یہاں تک کہ پورے تین سال بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ اللہ کی جناب سے تبلیغ و اعلانِ عام کا حکم دے دیا جاتا ہے۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ (حجر-۷) جس بات کا تجھ کو حکم دیا گیا ہے اس کو واشگاف کہدو اور مشرکوں کی پرواہ نہ کرو

خدا کا نبی امتثالِ امر کے لیے فوراً تیار ہو جاتا ہے اور جو بات اب تک وہ اپنے عزیزوں اور قرابت داروں سے گھروں کے اندر اور دیواروں کے پیچھے سنایا کرتا تھا اسے اب پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھ کر سارے عرب و عجم کو ہانکے پکارے سنانے لگا، سننے والوں نے جس طرح اس پکار کا جواب دیا اس کو مکہ اور طائف کی گلیاں قیامت تک نہ بھولیں گی۔ لیکن خدا کے اس فرض شناس بندے کو ان باتوں کی ذرا بھی پروا نہیں ہوتی، اس کو اگر پروا ہوتی ہے تو یہ کہ جس کلمۂ حق کی تبلیغ و تفہیم کا فریضہ مجھ پر عائد کیا گیا ہے اس کے سنانے سمجھانے میں کوئی کسر نہ رہ جائے اور جس صداقت پر ان گم کردہ راہوں کی فلاح و نجات منحصر ہے اس کو یہ سنتے اور مانتے کیوں نہیں! اس کی ساری تمنائیں اس ایک آرزو میں آکر سمٹ گئی ہیں کہ کسی طرح میری بات دلوں میں اتر جائے اور جس ہدایت کو اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ نازل فرمایا ہے اس کو یہ لوگ قبول کرلیں۔ مگر اللہ تعالیٰ ہے کہ اس کو بار بار محبت کے ساتھ جھڑکتا ہے اور یہ حقیقت ذہن نشین کراتا ہے کہ تمھارا کام صرف پہنچا دینا اور کھول کھول کر امرِ حق بیان کر دینا ہے، اگر ایک شخص بھی اس امرِ حق کو سن کر نہیں دیتا تو اس کی کوئی پروا نہ کرو (فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ) یہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر کچھ اپنا ہی بگاڑیں گے۔ تمھارا کچھ نہ بگاڑیں گے۔ تم اپنی اس دعوت کا کام انجام سے بے پروا ہو کر بجا لاتے رہو۔ یہ نہ سوچو کہ کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ تم اپنی آنکھوں سے اس دعوت کو کامیاب اور اس کے

دشمنوں کو تباہ و برباد دیکھو اور اس کا بھی امکان ہے کہ ایسا نہ ہو۔

وَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ (یونس)

اور اے پیغمبر! جس عذاب کی ہم ان منکروں کو دھمکی دے رہے ہیں یا تو اس کا کچھ حصہ ہم تم کو دکھلا دیں گے (اور تمھاری نگاہوں کے سامنے ہی یہ اپنے انجام بد سے کسی قدر دوچار ہو لیں گے) یا تم کو وفات دے دیں گے۔ سو ہماری ہی طرف تو ان کو پلٹ کر آنا ہے۔ پھر (یہ یقین رکھیں کہ) ان کے سارے اعمال خدا کی نگاہ میں ہیں۔

بعثت محمدی پر ایک دوسرے پہلو سے بھی غور کیجیے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ ہدایت کے بعد ساری دنیا کا بالعموم اور قوم عرب کا بالخصوص، دو میں سے ایک نتیجہ ہونے والا تھا۔ یا تو وہ اس پر ایمان لاکر اللہ تعالیٰ کی رحمت بے کراں سے سرفراز ہو یا انکار کرکے ہمیشہ کی لعنت اور دائمی عذاب خرید لے۔ ایک معمولی انسان بھی اپنی قوم کو اس طرح نذر ہلاکت ہوتا دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا، کجا کہ وہ انسان جو محبت و رافت کا پیکر، رحمۃ للعالمین تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اکثر ناعاقبت اندیشوں نے اس حق کی تکذیب اور مخالفت کرکے ہلاکت کی راہ چلنی چاہی تو آپ کا دل خون ہونے لگا۔ اس فکر میں کہ کسی طرح یہ لوگ راہ راست پر آجائیں، زندگی کا ایک ایک لمحہ سخت قلق اور عذاب میں گذرتا تھا۔ رات کی رات اس الحاح و زاری میں بسر ہوجاتی تھی کہ خدایا! اس قوم کو ہدایت دے، اس کے دلوں کی آنکھیں کھول دے کہ وہ تیرے غضب سے بچ جائیں۔ یہ جوش رافت اور جذبۂ خیرسگالی اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ حالت کفر میں مرجانے والوں کے حق میں بھی دعائے استغفار کرنے سے آپ باز نہ رہ سکتے اور جب اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ اٹل فیصلہ سنا دیا کہ "ان کے لیے دعائے مغفرت نہ کرو، اگر تم ایک بار نہیں ستر بار استغفار کرو تو بھی میں ان کو بخشنے کا نہیں" رحمت عالم کی زبان پکار اٹھی "خدایا! میں ان کے لیے ستر بار سے بھی زیادہ استغفار کروں گا"۔ آپ سے بڑھکر اس امر واقعہ کا کون ادراک رکھتا تھا کہ یہ قوم اس خطرناک آزمائش میں صرف میری بعثت کی وجہ سے ڈالی گئی ہے جس کا اگر ایک پہلو، درجہ پرور ہے تو ساتھ ہی دوسرا پہلو جانگداز بھی ہے۔ اگر ایک طرف خلافت ارضی کی سرفرازیاں اور فردوس بریں کی بہاریں ہیں تو دوسری طرف غضب الٰہی کی ہلاکت خیزیاں اور عذاب جہنم کی الم ناکیاں بھی ہیں، اور قوم ہے کہ اسی دوسرے پہلو کو اختیار کرتی اور اسی دوسری طرف جانے پر اصرار کر رہی ہے۔ لیکن پیغمبر عالم یہ سارا دہشت ناک ڈراما اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود اپنے کو مجبور محض پا رہا تھا اور قوم کے درد میں تڑپنے کے باوصف اس صورت حال میں کسی ادنی تغیر کی بھی مجال اور گنجائش نہ دیکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ میری ہی دعوت لا الٰہ الا اللہ کا ثمرہ ہے کہ شاید یہ قوم عاد و ثمود کی طرح پیوند خاک کردی جائے۔ ممکن ہے یہود کی طرح ابدی لعنت میں مبتلا ہوجائے۔ ہوسکتا ہے کہ جنگ و جدال کی نوبت آئے۔ بھائی بھائی کا گلا کاٹنے لگے۔ باپ بیٹے کے خون کا پیاسا ہوجائے۔ یعنی رشتے کٹ جائیں، خاندان تباہ ہوجائیں، وطن تاراج ہوجائے ـــــ لیکن ادائے فرض کی ناگزیری کا کیا علاج! سینہ بھنچتا ہے تو بھنچے، دل تفکر و تحسر کے ہجوم سے مضطرب ہے تو مضطرب رہے، کندھے اس بار گراں کے دباؤ سے شل ہوتے ہیں تو ہوجائیں، اور کمر اس بوجھ سے دوخم ہو رہی ہے تو ہوجائے، مگر یہ کوئی اپنی سوچی ہوئی اسکیم تو نہیں ہے کہ ملتوی یا ترک کی جاسکے۔ یہ تو بھیجنے والے کا مقرر کیا ہوا "فریضۂ زندگی" ہے جس کو ہر حال میں پورا ہونا چاہیے ـــــ پیغمبر کے دل کے یہی سارے جذبات

ہیں جو ان آیات کے اندر جھلک رہے ہیں:۔

قُلْ مَا يَكُونُ لِيٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۔ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۫ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ

(یونس ۔ ۲)

اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہہ دو کہ مجھے اس بات کا ذرا استحقاق نہیں کہ بطور خود اس قرآن میں کوئی ردو بدل کردوں۔ میں تو بس اسی چیز کا تابع ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھ کو ایک بڑے دن کی سزا کا ڈر ہے، اور کہو! اگر اللہ کو منظور ہوتا تو میں یہ قرآن تمھیں پڑھ کر سناتا ہی نہ اور نہ وہ تم کو اس کی اطلاع دیتا۔ چنانچہ اس سے پہلے میں تمھارے اندر ہی ایک عمر گذار چکا ہوں (اس وقت تو میں نے کوئی چیز تمھارے سامنے نہیں پیش کی تھی کہ اب یہ قرآن اپنے جی سے بنا کر تم کو سنانے لگا) کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔

لوگوں کا ــــ "حالات زمانہ سے واقف" اور "مصلحت شناس" لوگوں کا ــــ مطالبہ یہ تھا کہ جس قرآن کو آپ پیش کررہے ہیں اس کی تعلیمات ہماری قومی نفسیات سے میل نہیں کھاتیں نہ "احوال و ظروف حاضرہ" سے سازگاری رکھتیں، اس لیے اس کے بجائے کوئی دوسرا قرآن لائیے جس میں یہ "خامیاں" نہ ہوں، یا اسی قرآن میں کچھ اس طرح کی ترمیم و اصلاح کر دیجیے کہ اس ماحول میں ٹھیک فٹ ہو سکے (ائْتِ بِقُرْاٰنٍ اَوْ بَدِّلْهُ - (یونس ۔ ۲) ورنہ اگر آپ نے من و عن اسی قرآن اور اس کی تعلیمات کی تفہیم و ترویج پر اصرار کیا تو یاد رکھیے ایک فتنہ اٹھے گا اور قومی عمارت کے ایک ایک گوشہ کو تہ و بالا کر کے رکھ دے گا۔ پیغمبر یہ خطرہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، بلکہ وہ خطرہ بھی جو آنے والی زندگی سے متعلق تھا، ان دور بینوں کی تذکیر کا محتاج نہ تھا، مگر ساری بات کی ایک بات یہ تھی کہ آخر وہ کرتا تو کیا کرتا سوا اس کے کہ حسرت و اندوہ بھرے لہجے میں ان کو یہ سنا دے کہ مَا يَكُونُ لِيٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ الخ

یہ انبیاء کے ان احوال و سیر کے چند مشہور و مستند حقائق اور واقعات ہیں، جو سوجھ بوجھ رکھنے والوں کی عبرت پذیری اور درس نمائی کے لیے قرآن حکیم میں بیان کیے گئے ہیں، ان واقعات میں جو اصول حق سب سے زیادہ نمایاں اور جو نقش حقیقت سب سے زیادہ ابھرا ہوا دکھائی دیتا ہے وہ یہی ہے کہ اللہ کے دین کی اقامت کے لیے کوئی شگون لینے کی ضرورت نہیں نہ حالات کی سازگاری کا کوئی اندازہ لگانے یا کامیابی کے امکانات ٹٹولنے کی گنجائش ہے۔ جو چیز ہمارا فریضۂ زندگی قرار پاچکی، وہ ہر حیثیت سے اس بات کی مستحق ہے کہ جب تک زندگی ہے اس کے لیے جدوجہد کرتے رہیے۔ وہ فرض، فرض نہیں جس کو مشکلات کے اندیشے منسوخ کر دیں، جو امکان و عدم امکان کی بحثوں کا زخم کھا سکے۔ اگر دعوت توحید اور اقامت دین کا کام شروع کرنے سے پہلے امکانات کا ٹٹولنا ممکن ہوتا تو یقین جانئے انبیاء کی ایک بڑی تعداد اپنے مشن کا اظہار تک کرتی اس کے لیے سعی و کوشش تو درکنار۔ کیونکہ عموماً ہر نبی توحید کی دعوت اور اقامت دین کا مشن لے کر دنیا میں بھیجا ہی اس وقت جاتا تھا جب حالات کی ناسازگاری اپنی انتہا کو پہنچ چکتی تھی، جب کلمۂ حق کا نشوونما بظاہر ناممکن سے ناممکن تر ہو چکتا تھا، جب صدائے توحید بلند ہوتے ہی ہر طرف سے کنکر پتھر برسنے لگتے تھے۔ لیکن حالات کی اس شدید نامساعدت، مشکلات و موانع کی اتنی زبردست مزاحمت اور امکان کامیابی کی اس انتہائی قلت کے باوجود، جس سے ہم اپنے موجودہ حالات کا کوئی

مقابلہ نہیں کر سکتے، انھوں نے کشتی بحرِ ظلمات میں ڈال دی اور ذرا نہ سوچا کہ ساحل کہاں اور کدھر ہے؟ موسم پرسکون ہے یا طوفانی؟ بادبان ٹھیک ہے یا نہیں؟ ہوا کا رخ کیا ہے؟ کشتی کھینے والے بازوؤں میں توانائی کتنی ہے؟ سمندر پیداکنار ہے یا ناپیداکنار؟ راستہ صاف ہے یا زیرِ آب چٹانیں ہیں؟ انھوں نے ان میں سے کسی بات پر بھی تامل نہ کیا۔

مشکلاتِ راہ اس فرض کی اہمیت کم نہیں زیادہ کرتی ہیں۔

اب اگر ہم نے انبیاء کے قصص و احوال کو مشرکینِ عرب کی طرح اساطیر الاولین کی حیثیت دے رکھی ہے اور ان کو زمانۂ قدیم کی ایسی داستانیں سمجھ بیٹھے ہیں جن کی ہم اپنی زندگی کا سفر طے کرنے میں کسی قسم کی احتیاج نہیں رکھتے، سوا اس کے کہ آیاتِ قرآنی سمجھ کر محض حصولِ ثواب کے لیے ان کی تلاوت کر لینی چاہیے تب تو بات ہی اور ہے لیکن اگر واقعہ یہ نہیں ہے اور ہماری بدبختیوں نے ابھی تک ہم کو نَسُوا اللہَ فَاَنْسٰھُمْ اَنْفُسَھُمْ کی حد تک نہیں پہنچایا ہے بلکہ ہم ان قصص کو اسی طرح مشعلِ ہدایت اور منبعِ اعتبار و بصیرت یقین کرتے ہیں جس طرح قرآن نے ہم کو بتایا ہے تو ہم انبیاء کی اس مقدس تاریخ کے ہر دور اور ہر ورق سے یہی ایک غیر متغیر اصول سیکھ سکتے ہیں کہ جس چیز کو ہمارے پروردگار نے ہمارا مقصدِ زندگی ٹھیرا دیا ہے اس کی خاطر جدوجہد ہر حال میں ہونی چاہیے۔ صرف یہی کہ یہ جدوجہد ہر حال میں ہونی چاہیے اور اس کے لیے مشکلاتِ راہ اور ناسازگاریٔ ماحول کا کوئی لحاظ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہ دیکھتے ہو کہ ہر نبی بالعموم ایسے وقت میں اس کام پر متعین کیا جاتا رہا ہے جب کہ حق و ایمان کی روشنی اس زمین سے بالکل مفقود ہو چکی تھی اور کفر و مادیت کی آفاق گیر تاریکی میں اس جدوجہد کے لیے امکانِ کامیابی کی کوئی کرن دور دور تک کہیں نظر نہیں آتی تھی، یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ جدوجہد ایسے ہی ماحول سے مانوس ہے اور جس زمانہ میں لوگ حق سے جتنا ہی زیادہ بیگانہ ہوں، دہریت و مادیت کی جتنی ہی زیادہ گرم بازاری ہو اور طاغوت کی حکمرانی جتنی ہی زیادہ وسیع، ہمہ گیر اور مستحکم ہو، علمبردارانِ حق پر اقامتِ دینِ الٰہی کا فریضہ اتنا ہی زیادہ اہم اور سنگین ہو جاتا ہے۔ اس لیے اگر حالات کا یہ صحیح اندازہ ہے کہ دنیا حق سے اتنی ہی برگشتہ اور متنفر ہو چکی ہے کہ اس کو دینِ حق کا نام بھی سننا گوارا نہیں تو یہ اقامتِ دین کی جدوجہد میں کسی تعطل یا تخفیف کا باعث نہیں ہے بلکہ اس میں انتہائی سرگرمی، جوش اور انہماک کا طالب ہے۔

فریضۂ زندگی کا مقام اہلِ کفر کی نگاہوں میں

زندگی کا یہ اصل الاصول کہ نصب العین کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ امکان و عدمِ امکان کی بحثوں کا متحمل نہیں ہو سکتا، ایسا مستحکم اور عالم گیر ہے کہ نہ صرف اسلام ہی نے اس کا اپنے پیروؤں سے مطالبہ کیا ہے اور نہ صرف انبیاء اور ان کے سچے متبعین ہی نے اس پر عمل کر کے دکھایا ہے، بلکہ کافروں اور خالص دہریوں تک کے یہاں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے اور وہ بھی فریضۂ زندگی کا مقام یہی سمجھتے ہیں کہ وہ حالات کی سازگاری اور ناسازگاریوں سے بے نیاز اور بہرصورت زندگی کے آخری سانس تک ایک سعیٔ پیہم کا مستحق ہے۔ چنانچہ ان کی تاریخ میں اس کے بے شمار شواہد پائے جا سکتے ہیں۔

مارکس کے پیرو اس کے چند مخصوص نظریاتِ زندگی پر ایمان لائے اور انہی نظریات کی "اقامت" میں انھوں نے مصائبِ انسانی کا علاج یقین کیا، اس لیے یہی چیز ان کی زندگیوں کا نصب العین قرار پا گئی اور انھوں نے اس کی ترویج عام کے لیے پوری قوت سے جہاد شروع کر دیا، یہ جہاد اس مملکت میں شروع کیا گیا جس پر دنیا کی سب سے مستبد حکومت مسلط تھی

سے اپنے پنجے گاڑے ہوئے تھی اور جہاں زار کی مطلق العنانیت اور قہاریت کے خلاف سانس لینا بھی بظاہر ممکن نہ تھا، مگر اشتراکی اصولوں پر معاشرہ اور حکومت کی تنظیم کو اپنا فریضۂ زندگی قرار دینے والوں نے ان مصائب و آلام کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں جو اس جدوجہد کے پردے میں چھپے انھیں گھور رہے تھے۔ جب زار کے کانوں تک ان کی سرگرمیوں کی اطلاع پہنچی تو وہ تعذیب و ترہیب کے تمام اسلحوں سے مسلح ہو کر پوری خشمناکی کے ساتھ ان پر ٹوٹ پڑا، کتنوں ہی کو موت کے گھاٹ اتار دیا جو موت کے چنگل سے بچے ان کو سائبیریا کے برفستانی جہنم میں جھونک دیا، ظلم اور ایذا دہی کی کوئی ایسی ممکن صورت نہ تھی جس سے ان کو سابقہ نہ پڑا ہو، سالہا سال تک یہی ہنگامۂ دار و گیر برپا رہا مگر کوئی بڑے سے بڑا حادثہ ان کے پایۂ عزیمت میں لغزش نہ پیدا کر سکا اور اشتراکیت کا عشق آلام و مصائب کے بیچ دھارے سے ان کو تیراتا اور منزلِ مقصود کی طرف ان کے قدم بڑھاتا رہا۔

انہی اشتراکیوں میں آگے چل کر، جبکہ وہ زار کا تخت سلطنت الٹ کر اپنا اشتراکی نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو چکے، باہم اختلاف ہو گیا۔ لینن کی وفات کے بعد سیاست کی باگ ڈور اسٹالن کے ہاتھوں میں آگئی جس نے آہستہ آہستہ اشتراکی نظام سلطنت کو بین الاقوامیت کی سطح سے ہٹا کر قومی اشتراکیت کی سطح پر لانا شروع کیا، اس کی اس پالیسی جو درحقیقت اصول اشتراکیت سے صریح تجاوز اور ان کے ساتھ کھلی ہوئی غداری اور منافقت تھی، ٹراٹسکی نے اختلاف کیا اور اشتراکیت کی اصلی روح کے قیام اور خالص مارکسیت کی بقا پر زور دیا، اسٹالن نے نہ صرف اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا بلکہ اس کو اس جرم کی پاداش میں مجلس حل و عقد سے نکال باہر کیا، خفیہ پولیس نے اس کے اور اس کے حواریوں کے منہ بند اور ہاتھ پاؤں باندھ دیے، مگر وہ جن اصولوں کا عقیدت کیش تھا اور جن کے قیام و بقا میں اس کو خلائق کی فلاح نظر آرہی تھی، ان کی تبلیغ سے باز نہ رہا، آخر کار جلاوطن کر دیا گیا، امریکہ پہنچا اور وہاں سے اپنے اصولوں کی اشاعت کرنے لگا اور اپنے نصب العین کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اس کے مشن کے دشمن وہاں بھی پہنچے اور ایک روز خفیہ سازشوں کے ذریعہ اس کے سامنے موت کا پیالہ پیش کر دیا اور مارکسیت کے اس "مومن قانت" نے نہایت صبر و سکون کے ساتھ اس پیالہ کو قبول کر لیا۔

یہ تو کچھ پرانی باتیں ہیں۔ ذرا قریب آیئے، یہ جاپانی اور جرمن قومیں جو زخموں سے چور آپ کے سامنے پڑی ہیں، ان کے رہنماؤں نے ان کے سامنے ایک نصب العین رکھا، وہ اس پر ایمان لائیں اور پھر اس کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہو گئیں، حریفوں نے آگا روکا، انھوں نے نوک شمشیر اس روک کو دور کرنے کی ٹھان لی، میدان کارزار گرم ہو گیا، بخت و اتفاق نے جو پانسہ پلٹا تو جیتی ہوئی قومیں پیچھے ہٹنے لگیں، مشکلوں اور تباہیوں کے طوفان نے گھیر لیا، مگر اپنے مطاعِ مطلق کا جذبۂ اطاعت اور مطمحِ نظر کا عشق تھا کہ ان کے نوجوان موت کو منہ کھولے ہوئے دیکھتے اور اس میں کود پڑتے، ہوائی جہازوں سے چھلانگ لگاتے اور بم لے کر سیدھے دشمن کے جنگی جہازوں کی چمنیوں میں جا گھستے، بموں سے لدا ہوا پورا جہاز ان بحری جہازوں پر جا گراتے اور اس طرح دنیا کے جنگی لغت میں "خود کش ہوائی جہاز" اور "کفن بر دوش طیارے" کے تحیر خیز الفاظ کا اضافہ کر گئے۔ اور اب کہ قدرت نے ان کو اپنی آرزوؤں میں ناکام بنا دیا ہے، وہ اس عقیدے کے ساتھ ہرا کری کر رہے ہیں کہ مرنے کے بعد دیوتا بن کر اپنی قوم کی خدمت اور اپنے مقصد کی خاطر جنگ کریں گے اور ان کی عورتیں اپنے نوزائیدہ بچوں کی پرورش یہ کہہ کر شروع کرتی

ہیں کہ یہ بڑے ہو کر اپنے دشمنوں اور عظمت قومی کے غارت گروں سے انتقام لیں گے۔

یہ ان لوگوں کے نظریے اور کارنامے ہیں جن کا کوئی مستقبل نہیں، جن کی قربانیوں کا انجام اپنی زندگی کے لیے خود ان کے اپنے معتقدات کے مطابق معدوم محض ہے اور جن کے سامنے اگر کچھ ہے تو صرف اسی دنیائے دوں کے رذیل مقاصد ہیں۔ کیا ان واقعات اور حقائق میں ہمارے لیے کوئی درس عبرت ہے؟ کیا رضائے الٰہی اور سعادت ابدی کے حصول میں اتنی گیرائی بھی نہیں جتنی ان حیوانی مقاصد کے حصول میں ہے؟ کیا ایمان باللہ میں اتنی حرارت بھی نہیں جتنی مومنین بالطاغوت کے دلوں میں دیکھی جا رہی ہے؟ کیا حق کی شہادت میں اتنی حمیت بھی نہیں دکھائی جا سکتی جتنی باطل کی شہادت میں آج ظاہر ہو رہی ہے؟ اور کیا فرض زندگی کو اتنی اہمیت بھی اہل اسلام دینے کو تیار نہیں جتنی یہ کفار دے رہے ہیں؟ انبیائے کرام کے واقعات کو نفس حیلہ گر پیغمبرانہ جوش تبلیغ اور معجزہ اور تائید روح القدس کا نتیجہ قرار دے کر ٹال سکتا ہے مگر اہل کفر و ضلال کی ان سرفروشانہ مساعی کے پیچھے کس معجزہ کا سراغ پایا جائے گا۔ کاش ہم امکان و عدم امکان کی بحثیں شروع کرتے وقت باطل پرستوں ہی کے اعمال و اخلاق پر ایک نظر ڈال لیتے، اور انہی سے مقصد زندگی کا مفہوم سیکھ لیتے۔ افسوس کہ یہ منظر بھی کتنا عبرت ناک ہے، وہ جن کی نظر اسی عالم آب و گل تک ہے، اور اپنے فرض میں فکر انجام سے اتنے بے نیاز ہوں اور وہ جن کا دعویٰ ہے کہ "ہماری نماز اور ہماری قربانی، ہماری زندگی اور ہماری موت سب اللہ کے لیے ہے" اندیشۂ ناکامی کی پرستش میں مصروف ہیں۔ جو نقش حقیقت ایک اندھا کافر بھی ہاتھوں سے ٹٹول کر معلوم کر لیتا ہے وہ ایمان کی روشنی رکھنے والی آنکھوں کو سجھائی نہیں دیتا۔

یہ عقلیت ہے، جذبات پرستی نہیں اگرچہ بات اپنی جگہ شک سے بالاتر ہے کہ ادائے فرض کے سلسلہ میں امکان کی بحث نہ صرف یہ کہ پیدا نہیں ہوتی بلکہ ایمان بالقرآن کا مزاج لطیف اس کے تصور تک کو برداشت نہیں کر سکتا اور نہ صرف یہ کہ یہ طرز فکر غیر اسلامی ہے بلکہ کوئی غیور اور باحمیت کافر بھی اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں، مگر ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ چیز اس وقت کے مصلحت پرست اور عافیت پسند دماغوں میں اتر نہیں سکتی۔ عقل و تدبر کے دعوے دار ایک طعن آمیز تبسم کے ساتھ بول اٹھیں گے کہ "یہ سب جذباتی باتیں ہیں جن کا دنیائے فکر و عمل سے کوئی تعلق نہیں۔" "اہل دانش" کے اس ریمارک کو ہم بھی بڑی خوش دلی کے ساتھ قبول کر لیتے، کیونکہ اتنا بڑا بار ذمہ داری اٹھانے اور اتنی پر خطر راہ اختیار کرنے کا خواہ مخواہ کسی کو کوئی شوق نہیں ہے مگر دشواری یہ ہے کہ اس سے ہماری مشکل حل نہیں ہوتی بلکہ اس میں مزید گرہیں ہی پڑ جاتی ہیں۔ پھر وہ عقل جس کی دہائی دی جا رہی ہے، پکار کر پوچھتی ہے کہ ایسا دین قبول ہی کیوں کیا جائے جو بار بار اور تصریح کے ساتھ اس "جذباتی اصول" کی تعلیم دیتا ہو۔ اگر ایک شخص اس دین کی سچائی تسلیم کرتا اور اس کے اتباع کا عہد کرتا ہے تو اس کو لازم ہے کہ دہکتے ہوئے الاؤ کے اندر بھی کود پڑنے میں کوئی پس و پیش نہ کرے اگر اس کے دین کا اس سے یہ مطالبہ ہو۔ لیکن اگر اس کی تعلیمات اور اصول اس کی نگاہ میں جذباتی یعنی ناقابل عمل اور غیر معقول معلوم ہوتے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کی صداقت کا قائل ہی نہیں اور نہ اس پر ایمان رکھتا ہے بلکہ اس کا ایمان اپنی عقل و فہم پر ہے اور ایمانداری کا تقاضا یہ ہے کہ اس دین کے نام سے اصول و مسائل پر بحث کرنے سے پہلے وہ اپنی پوزیشن کی تنقیح اور تعیین کرے۔

لیکن کیا واقعتہً یہ بات جذباتی ہی ہے اور اس اصول کی بنیاد نرے جذبات ہی پر ہے؟ نیز کیا جذبات کا ہماری عملی زندگی میں کوئی دخل نہیں؟ ہر بالغ نظر انسان تھوڑے سے غور و فکر کے بعد اس حقیقت کو پا سکتا ہے کہ انسانی زندگی کی تعمیر اور رہنمائی سے ان دونوں میں سے کسی چیز کو بھی بے دخل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ البتہ ہے کہ دونوں کے مخصوص اور متعین حدود و اثر و عمل ہیں اور ایک کو دوسرے کے حلقۂ کار میں لے جانے کا مطلب اپنے آپ کو تباہی کے گڑھے میں پھینک دینا ہے۔ کسی مقصد کی تعیین تو خالص عقل ہی کرتی ہے اور وہ شخص بڑا ہی احمق ہوگا جو اپنے مقاصد کی تعیین میں جذبات کو بھی رائے دہی کا مستحق گردانے مگر جب عقل ایک شے کو ٹھیک ٹھیک بجا رسک کے بعد مقصد زندگی ٹھیرا دے تو پھر تنہا عقل محض کے بس کا یہ کام نہیں کہ وہ اس منزل مقصود کی طرف مطلوبہ رفتار سے قدموں کو بڑھا سکے۔ اس وقت وہ جذبات کی دست نگر ہوتی ہے اور یہی جذبات دلوں میں وہ آتشیں قوت عمل اور قدموں میں وہ جوش حرکت و اقدام پیدا کرتے ہیں جن کے بغیر منزل تک رسائی ناممکن ہے۔ یہ جذبات نہ ہوں تو قوت عمل مست خواب رہتے ہیں اور بڑے سے بڑا مقصد بھی ان کو جھنجھوڑ کر بیدار نہیں کر سکتا۔ عقل صرف سمت سفر مقرر کرتی اور انجن اور پٹری تیار کرتی ہے مگر اس انجن کو حرکت دینے والی اور منزل مقصود کی طرف دوڑانے والی اسٹیم یہی جذبات ہی مہیا کرتے ہیں۔ جذبات نے انسانی زندگی کی تعمیر میں اپنا یہ حق غاصبانہ طور پر نہیں حاصل کیا ہے بلکہ عقل ہی کا عطا کردہ اور تسلیم شدہ ہے۔ یعنی جس طرح مقاصد کی تعیین میں جذبات سے کام لینا عقلیت ہے اسی طرح ان مقاصد کے حصول میں جذبات سے بیش از بیش کام لینا بھی عقلیت ہے، جذباتیت نہیں ہے۔ اس لیے اسلام کو دین حق مان لینا اور اس کے بعد اس کے مطالبات کو پورا کرنے میں سست روی کرنا دانش مندی نہیں بلکہ دانش فروشی ہے، عقل کا نام لے کر عقلیت کو رسوا کرنا ہی نہیں احساس کمتری، دون ہمتی، بے غیرتی اور ضعف عزم و ایمان کا کھلا ہوا اعتراف ہے۔

اسلام اور اقامت دین کا تلازم اس تقریر سے، جو اوپر گزر چکی، صرف اتنا ہی نہیں ثابت ہوتا کہ اقامت دین کی جد و جہد، امکان و عدم امکان کی بحث سے بالاتر ہے اور اس کو طوعاً یا کرہاً ہر وقت، ہر ماحول اور ہر حالت میں جاری رکھنا چاہیے، بلکہ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اگر حالات کے اندازے اس جد و جہد کی ناکامی کا یقین دلا دیں، حتیٰ کہ اگر کوئی اپنی آنکھوں نوشتۂ الٰہی میں اس ناکامی کو مقدر دیکھ لے تو بھی اس کو اس "سعی" میں جو اس کے نزدیک لاحاصل ہے، لگے رہے بغیر چارہ نہیں۔ کیونکہ یہ دنیا کی عام تحریکوں اور اسکیموں کی طرح کی کوئی تحریک اور اسکیم نہیں ہے کہ اگر اس کی کامیابی کے ذرائع مفقود اور امکانات ناپید نظر آئیں تو اس کو ترک یا ملتوی کر دینا جائز اور ممکن ہو سکے نہ مسلمانوں کے سر پر یہ کوئی اوپر سے چپکی ہوئی چیز ہے کہ چاہا تو قبول کر لیا اور جب چاہا اس کو اپنے پروگرام سے خارج کر دیا بلکہ ایک شخص کے مسلمان ہونے کا لازمی تقاضا ہی یہ ہے کہ اس نے اس دین کی اقامت کے لیے اپنے کو وقف کر دیا ہے۔ اللہ پر ایمان لانے اور حق سے محبت کرنے کا فطری مطالبہ ہی یہ ہے کہ جو چیزیں خدا کو محبوب ہوں اور جو باتیں حق ہوں، انسان ان کو اپنے گرد و پیش زندہ اور کارفرما دیکھے اور اس کے لیے ہر دم کوشاں رہے اور ہر اس چیز کو مٹا دینے کے لیے تیغ بکف نظر آئے جو خدا کو ناپسند اور باطل ہوں، چنانچہ اوپر ہم واضح دلائل کے ساتھ یہ بیان کر چکے ہیں کہ جس طرح آگ اور پانی کا اتحاد ممکن نہیں اسی طرح ایمان اور منکرات میں مصالحت ممکن نہیں۔ پس یہ جد و جہد اسلام

سے علیحدہ اور اس پر زائد کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کی عین روح اور حرکت قلب ہے۔ اگر کسی جاندار کے متعلق یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ زندہ تو ہو مگر اس کے قلب میں حرکت نہ ہو تو یقین رکھیے کہ کسی انسان کے بارے میں بھی یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہو تو مومن مگر اقامت حق کی تڑپ سے اس کے دل و دماغ خالی اور عملی جدوجہد سے اس کے دست و بازو نا آشنا ہوں۔ اس تڑپ اور جدوجہد سے محروم ہو کر یعنی اس مقصد زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر کے مسلمان کا وجود ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ یہی سنگ بنیاد ہے جس پر اسلامیت کا قصر تعمیر ہوتا ہے۔ اگر یہ پتھر نیچے سے غائب ہو جائے تو پھر اس قصر کا وجود ہی ممکن نہیں۔ چنانچہ اہل کتاب کے متعلق، جنھوں نے اس مقصد زندگی کو فراموش کر رکھا تھا، قرآن نے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک تم توراۃ اور انجیل کو قائم نہ کرو گے تم کسی اصل پر نہیں ہو اور تمھارا ملی وجود ایک وجود موہوم کے سوا کچھ نہیں لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرٰاۃَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ۔ اس لیے یہ کہنا کہ اس زمانہ میں اقامت دین ناممکن ہے گویا دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمان ہونا ممکن نہیں، اور حالات زمانہ کی ناسازگاری کے پیش نظر اقامت دین کی جدوجہد کو ترک کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خود اسلام ہی سے دست برداری کی ٹھان لی جائے۔

غلطی افکار کا منبع بظاہر یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوگی اور کتنے ہی "ذکی الحس" لوگوں کو تو اس میں خارجیت کی بو محسوس ہونے لگے گی لیکن دراصل یہ استعجاب و استنکار اس غلط ذہنیت کی پیداوار ہے جس نے کامیابی اور ناکامی کا مفہوم ہی الٹ کر رکھ دیا ہے اور جس کو یہ نہیں معلوم کہ فریضۂ اقامت دین کے معنی کیا ہیں؟ اگر یہ ذہنیت تبدیل کر لی جائے اور اس کو صحیح اسلامی قالب میں ڈھال لیا جائے تو پھر نہ تو خطرات و مشکلات کا تصور اس کو پریشان کرے گا۔ نہ امکان اور عدم امکان کا سوال پیدا ہوگا۔

ہماری اصل ذمہ داری جب یہ کہا جاتا ہے کہ دین کی اقامت ہم پر فرض ہے تو اس کا مطلب بالعموم یہ لیا جاتا ہے کہ زمین پر دین یعنی الٰہی نظام زندگی کو بالفعل قائم اور نافذ کر دینا ہمارا فرض ہے، حالانکہ جو چیز ہم پر فرض ہے اور جس کی ہم سے اللہ تعالیٰ کے یہاں باز پرس ہوگی وہ دین کو قائم کر دینا نہیں ہے بلکہ اس کو قائم کرنے کی امکانی جدوجہد کرنا ہے۔ اسی طرح کامیابی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہماری تگ و دو لازماً ایک خالص اسلامی اسٹیٹ قائم کر دینے پر منتج ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے بلکہ درحقیقت یہی ہے کہ ہم اس راہ میں اتنی جانفشانی، قربانی، فدائیت اور سعی وجہد کر دکھائیں جو ہمارے بس میں ہو۔ جس نے یہ کر لیا وہ اپنے مقصد زندگی کو پورا کر گیا اور اپنے مشن میں ہر طرح کامیاب رہا اگرچہ ایک شخص نے بھی اس کی بات نہ مانی ہو اور ایک ذرہ زمین پر بھی وہ دین حق قائم کر دینے میں کامیاب نہ ہوا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان پر اتنا ہی بوجھ ڈالا ہے جتنا وہ اٹھا سکتا ہے۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ اس نے کسی انسان کو ایسی بات کی تکلیف نہیں دی ہے جو اس کی فطری صلاحیتوں اور قوتوں سے زائد ہو۔ مثلاً اس نے ہم سے مطالبہ کیا ہے کہ تقویٰ اختیار کرو مگر اس کا یہ مطالبہ ہماری فطری استطاعت سے بڑھ کر اور غیر محدود نہیں ہے بلکہ اسی حد تک ہے جتنا انسانی فطرت کے بس میں ہے، چنانچہ فرمایا:۔

اِتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (تغابن - ۲)   اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جہاں تک تمھارے بس میں ہے۔

مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے کہ وہ اعداء دین کا مقابلہ کرنے اور ان کا زور توڑنے کے لیے تیار رہیں مگر ان سے یہ مطالبہ نہیں کیا گیا ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے دشمنوں کی قوت جنگ کے برابر قوت فراہم کریں بلکہ صرف اتنا کہا گیا ہے اور اتنا ہی ان پر واجب کیا گیا ہے کہ :۔

اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ الخ (انفال-۸) دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اتنی قوت تیار کر رکھو جتنی تم کر سکتے ہو

ان آیات سے جو اصول ہاتھ آتا ہے وہ صرف یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری حدود استطاعت سے محدود ہے۔ پس اقامت دین کے معاملہ میں بھی حالات زمانہ، مشکلات راہ، ناسازگاری ماحول، قلت ذرائع، ان سب چیزوں کا الاؤنس انسان کو ملے گا اور ان کے لحاظ سے مختلف انسانوں کی کوششوں میں نمایاں تفاوت ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیے۔ ہر انسان کو اللہ تعالیٰ کے روبرو صرف اسی حد تک جوابدہی کرنی پڑے گی جس حد تک اس کو جد و جہد کرنے کی طاقت میسر ہے۔ اگر ایک شخص کو سامان کار اور سازگاری ماحول نصیب ہے لیکن اس نے اپنی طاقت سے بال برابر بھی کم جد و جہد کی تو یقیناً ادائے فرض کی کوتاہی کا مجرم قرار پائے گا خواہ ظاہری نتائج کے اعتبار سے اس راہ میں وہ دوسروں سے کتنا ہی آگے کیوں نہ نکل گیا ہو، بخلاف اس کے اگر ایک انسان نے اپنی تمام ممکن کوششیں صرف کر ڈالیں لیکن سر و سامان کار کے ناپید اور حالات کے ناموافق ہونے کے باعث آخر تک منزل مقصود کی طرف منہ کیے ہوئے وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا جہاں سے اس نے اپنی مہم کا آغاز کیا تھا تو وہ ہر طرح سے اپنے فرض کو ادا کر گیا۔ غرض انسان کو چاہیے کہ جن حالات میں جیسی کچھ قوت بھی حاصل ہوتی جائے اپنی جد و جہد کا دائرہ اسی لحاظ سے تنگ یا وسیع کرتا رہے۔ اس چیز کو ایک عام مثال سے سمجھیے۔ نماز انسان پر فرض ہے اس میں قیام و رکوع و سجود بھی فرض ہیں۔ ایک شخص اگر قیام پر قادر ہونے کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے تو اس کی نماز نہیں ہوتی، اور اگر کسی واقعی مجبوری کی وجہ سے وہ بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہو اور دو رکعتیں پڑھ چکنے کے بعد ہی اس کی مجبوری دور ہو جاتی ہو اور اب وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے پر قادر ہو گیا ہو لیکن اس کے باوجود بیٹھا نماز پڑھتا رہے تو اس کی نماز نہ ہوگی بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ جیسے ہی اس کو زوال عذر اور قدرت قیام کا احساس ہو، فوراً کھڑا ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ بالکل یہی حال اقامت دین کی جد و جہد کا بھی ہے۔ جس شخص کو جس وقت جتنی قوت میسر ہو اس وقت اتنی قوت صرف کرنا اس کے لیے ضروری ہے اس سے زیادہ کا وہ مکلف نہیں اور نہ اس سے کم ہی اس کی گنجائش ہے۔ زمین پر مکمل طور پر اللہ کے دین کو بالفعل قائم اور نافذ کر دینا ایک آخری غایت (Goal) ہے۔ جہاں تک پہنچنے کی ہر مسلمان کو دعوت دی گئی ہے، مگر وہاں بہر صورت پہنچ جانا واجب نہیں قرار دیا گیا ہے، جو کچھ واجب ہے وہ یہ کہ اس گول کی طرف اتنے قدم آگے بڑھو جتنے بڑھ سکتے ہو۔

ناکامی ناممکن ہے جب اقامت دین کی فرضیت کا مدعا یہ ہے تو یہ کہنا کتنی بڑی نادانی ہے کہ چونکہ بحالت موجودہ کامیابی کا کوئی امکان نہیں اس لیے ہم اس جد و جہد کو اختیار نہیں کر سکتے۔ جب اپنی استطاعت کے مطابق کوشش کرنے کی حد ہی تک ہم مکلف ہیں تو پھر اس راہ میں ناکامی کا کیا سوال ہے۔ دنیا کی تمام تحریکوں اور سرگرمیوں میں کامرانی اور ناکامی دونوں کا امکان ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی جد و جہد ایسی ہے جس میں ناکامی کا کوئی امکان نہیں تو یہی اقامت دین کی جد و جہد ہے جس میں بدقسمتی سے ہم کو ہر طرف ناکامی ہی ناکامی نظر آتی ہے حالانکہ اس راہ میں اگر کوئی ناکامی ہے تو صرف یہی کہ اپنی قوتوں

کو اس میں خرچ کرنے سے دریغ کیا جائے اور اپنی استطاعت کے مطابق کلمۂ حق کی سربلندی میں سعی نہ کی جائے۔ اس کے علاوہ کسی ناکامی کا خدشہ نہیں۔ اس راہ کے چلن تمام راہوں سے نیارے ہیں اور معیارِ کامرانی تمام معیاروں سے جدا ہے۔ مومن اپنی قوتیں میدانِ سعی و جہد میں ڈال دینے کے بعد جس انجام سے بھی دوچار ہوتا ہے وہ بہرحال فتحمندی و کامرانی ہے، مایوسی و نامرادی کے توہم سے بھی اس کی جد و جہد آشنا نہیں۔

کامیابی کا اسلامی تصور اس بارے میں جو چیز مسلمانوں کی نگاہوں کا حجاب بن گئی ہے وہ اشیا کی قدریں متعین کرنے کا وہ مادی اصول ہے جو آج ہر چہار سو چھایا ہوا ہے۔ لیکن جس کو قرآن مٹانا چاہتا ہے۔ آج مسلمان کسی چیز کے رد و قبول میں اسی عالم کے منافع و مضار کو سامنے رکھتا ہے اسی لیے اس سعی و کوشش کو لاحاصل اور ناکام سمجھتا ہے جس کا کوئی فوری اور مادی فائدہ ظاہر ہوتا ہوا دکھائی نہ دے۔ لیکن قرآن نجاح اور سعادت کا نشان بالکل مخالف سمت میں بتاتا ہے۔ وہ مسلمان کی امتیازی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ وہ آخرت کے مفاد کو دنیا کے مفاد پر ترجیح دینے والا ہے۔ نیز وہ انسان کی کامیابی یہ قرار دیتا ہے کہ وہ اپنی تمام کوششوں کو راہِ حق اور تلاشِ رضائے الٰہی میں لگا دے۔ اب اگر وہ پہلے ہی قدم پر اپنا سب کچھ کھو بیٹھتا ہے تو بھی، اور اگر سارے عالم پر دینِ حق کا جھنڈا لہرا دے تو بھی، ہر حال میں کامیاب ہے۔ منافقوں کی تمنا تھی اور توقع بھی کہ اب یہ جو روم کے افق سے طوفانِ جنگ نمودار ہو رہا ہے ان مٹھی بھر مسلمانوں کو، جو تمام دنیا کو دشمن بنائے بیٹھے ہیں، اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور ان کی یہ ساری شان و شوکت ناکامی و نامرادی کی قبر میں دفن ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کو حکم دیا کہ:

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ (توبہ - ۷)

ان منافقوں سے کہہ دو کہ تم ہمارے حق میں جس بات کا انتظار کرتے ہو، وہ ہمارے لیے دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی ہی تو ہے۔

دیکھا آپ نے کہ جس طرح مسلمانوں کی فتح بھلائی اور کامیابی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ ان کی شکست کو بھی "احدی الحسنیین" کہہ کر اسی کے برابر کامیابی قرار دے رہا ہے، فتح بھی "حسنیٰ" ہے اور شکست بھی۔ گویا ایک مردِ مومن جب جہاد فی سبیل اللہ کے لیے گھر سے نکلتا ہے تو بہر صورت تمغۂ کامرانی لے کر ہی لوٹتا ہے۔ بے شک یہ کامیابی بہت بڑی کامیابی ہے کہ وہ اپنی تلوار سے دشمنوں کو زیر کرے اور حق کا بول بالا کر دے مگر اس کے برعکس اگر وہ اور اس کے تمام ساتھی اسی جنگ میں قتل ہو جائیں تو جہاں تک ادائے فرض کا تعلق ہے، یہ بھی اسی کے ہم پلہ ایک کامیابی ہے، قابلِ صد رشک کامیابی، ایسی کامیابی جس پر دنیا کی ساری کامیابیاں اور تمام مفادات قربان ہو جائیں، جس سے بڑی کامیابی کی آرزو ہی نہیں کی جا سکتی۔

یہ ایک جزئی مثال تھی جس کا تعلق مومن کی زندگی کے صرف ایک مخصوص گوشہ سے ہے۔ اسی جزء سے کل کی طرف آیئے اور اسی فرع کو اصل بنا کر مومن کی ساری مساعیِ حیات یعنی مساعیِ اقامتِ دین پر پھیلا دیجیے پھر معلوم ہوگا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام جن کو دعوتِ حق دینے کے جرم میں دار پر لٹکا دیا گیا اور جو ایک بالشت زمین پر بھی دینِ حق قائم نہ کر سکے اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں ٹھیک اسی طرح دنیا سے کامران و بامراد تشریف لے گئے جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

جنھوں نے ایک وسیع خطۂ ارض پر عملاً اللہ کا دین قائم کر دیا تھا۔ مگر اس راز کو سمجھنے اور قبول کرنے کے لیے مومن کا دل چاہیے عقل مصلحت پرست کے اندر یہ "جذباتی" باتیں کہاں سما سکتی ہیں۔

قیام دین کے روشن امکانات لیکن کامیابی کا جو مفہوم عام طور پر لیا جاتا ہے، اس کے لحاظ سے بھی ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آج کی دنیا میں اس جدوجہد کی ناکامی کی بہ نسبت کامیابی کا زیادہ امکان ہے، اور اگر اس کو اس کے مزاج کے موافق طریقوں پر پوری سرگرمی سے جاری رکھا گیا جس کی توضیح ہم آگے چل کر کریں گے، تو اس کا بار آور ہونا اسی طرح یقینی ہے جس طرح شب تار کے بعد آفتاب عالم تاب کا طلوع۔ اس دعویٰ کے اثبات کے لیے آپ کو عام انسانی فطرت، دنیا کے تمدنی وسائل، تہذیب حاضرہ کے پیدا کیے ہوئے حل طلب معاملات اور حق کی ساحرانہ قوت اثر و نفوذ پر ایک گہری نظر ڈالنی چاہیے۔ اور سب سے اول اور آخر اس چیز پر کہ مسئول و مخاطب کون لوگ ہیں؟

عموماً لوگ کامیابی کے امکانات کا اندازہ لگاتے وقت پہلے ہی قدم پر یہ ایک عظیم الشان حقیقت فراموش کر جاتے ہیں کہ اس کا مطالبہ کسی گری پڑی جماعت؛ اور بے اصول، خود غرض، دنی الاخلاق اور پست نظر لوگوں سے نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ ان لوگوں سے کیا جاتا ہے جو مومن ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں اور مومن کی جو ضروری صفات قرآن میں بیان ہوئی ہیں ان کا اجمالی خاکہ یہ ہے کہ "وہ ایک خدا پر ایمان رکھنے والے ہوتے ہیں، اس کے سوا کسی کو معبود و مستعان اور صاحب حکم و امر نہیں سمجھتے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہادی مانتے ہیں اور اپنی زندگی کے کسی شعبہ میں ان کے سوا کسی کی قابل اتباع نہیں تسلیم کرتے، وہ نماز، روزے، حج، زکوٰۃ وغیرہ عبادات کے بجا لانے والے ہوتے ہیں، حق کے شائق سچائی کے مجاہد، معروف کے مبلغ، عدل و قسط کے علمبردار، باطل کے فطری دشمن، منکر کے دائمی محارب، جھوٹ سے متنفر، ظلم سے مجتنب ہوتے ہیں۔ برائی کو نیکی سے اور جہالت کو شرافت سے مٹانا ان کا شیوہ ہے، عدل پر قائم رہنا ان کا شعار ہے اگرچہ اس کی زد خود اپنے ہی اوپر کیوں نہ پڑتی ہو، دشمن کے ساتھ بھی رحم و انصاف کرنے پر مجبور ہیں اگرچہ کتنے ہی مظالم ان کے ہاتھوں جھیل چکے ہوں، ہر حال میں راہ راست پر قائم رہنے والے ہیں اگرچہ تمام دنیا ہاتھ سے نکلی جاتی ہو۔ پھر دوسروں کی عزت کو اپنی عزت سمجھنے والے اور دوسروں کے مال اور جان کو حرمت کعبہ کا مستحق سمجھنے والے ہیں۔ جو اپنے لیے پسند کرتے ہیں وہی دوسروں کے لیے پسند کرتے ہیں، ان کے ہاتھ اور ان کی زبان سے کسی کو گزند نہیں پہنچتا، خود ننگے اور بھوکے رہ کر غریبوں کو کھلانے پلانے میں فرحت محسوس کرتے ہیں، یتیموں، بیواؤں اور کمزوروں کے لیے ان کے دامن پناہ گاہ ہیں اور ان کی زندگی، ان کی موت، ان کی محبت، ان کی عداوت سب اللہ کے لیے ہوتی ہے۔"

کم و بیش اسی قسم کے اوصاف کے حامل مومن کہلاتے ہیں۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ جب اقامت دین کے امکانات پر غور و فکر کیا جائے تو اس گروہ کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے، اس چیز کو نظر انداز کر کے کبھی صحیح نقطۂ نظر نہیں اختیار کیا جا سکتا۔ اس دور میں بھی جب ایمان و دیانت کا شدید ترین قحط ہے، ایسے لوگ نایاب نہیں ہیں اگرچہ کمیاب ضرور ہیں، اس لیے جہاں تک ایسے لوگوں کے وجود کا تعلق ہے ہم اطمینان رکھ سکتے ہیں۔

اس کے بعد دوسری چیز جو قابل توجہ ہے وہ انسان کی فطرت ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ باعتبار فطرت

انسان خیر پسند ہے اور ایک قلیل تعداد کو چھوڑ کر ساری نوع انسانی نیکی کی مقناطیسیت سے کھنچ اٹھنے کی صلاحیت رکھتی ہے، خالص باطل پرست اور شر پسند لوگ دنیا میں بہت تھوڑے ہوتے ہیں، البتہ جب یہی گنتی کے شیاطین انسانی مشینری پر قابض ہو جائیں اور اہل دنیا کی زمام قیادت ان کے ہاتھوں میں چلی جائے تو عام لوگ ان کے پیچھے چل پڑنے کی وجہ سے بدی کی نجاستوں میں آلودہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر نظری اور عملی دونوں حیثیتوں سے نور حق ان کے سامنے بے حجاب کر کے چمکا دیا جائے تو فطرت انسانی کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ اس کو قبول کر لے گی اور کوئی وجہ نہیں کہ انسان اس چیز کو اس کے اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ دیکھنے کے باوجود رد کر دے جو اس کی فطرت کو مطلوب ہے اور اس چیز سے لپٹا رہے جس سے اس کی اصل فطرت ہم آہنگ نہیں۔ پچھلے زمانوں میں ایک تو انسانی عقل اپنی پختگی کو پہنچی نہیں تھی، دوسرے لوگوں میں گروہی اور مذہبی عصبیتیں حد سے زیادہ ہوتی تھیں۔ اور وہ اپنے دلوں کے دروازے ہر صدائے نامانوس کے لیے مضبوطی سے بند رکھتے تھے، تیسرے تبلیغ و اشاعت حق کے ذرائع نہایت محدود تھے۔ ان اسباب کی بنا پر دین حق کی تبلیغ کے نتائج اکثر ناکامی کی شکل میں نمودار ہوتے، مگر اب حالات بالکل بدلے ہوئے ہیں، انسان تقلیدی عقائد کی اندھی پیروی سے باغی ہو کر اور اوہام پرستی سے متنفر ہو کر روز بروز حقائق پسندی کی طرف آرہا ہے، عقلیں ان اصول و نظریات کو چھانٹ کر دور پھینکتی جا رہی ہیں جو انسانی زندگی کے مسائل کو تسلی بخش طور پر حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ مغربی تہذیب اور حریت فکر و رائے نے جہاں دنیا کو بے شمار نقصانات سے دوچار کرا دیا، وہاں ایک ایسی چیز بھی پیدا کر گئی ہے جس سے ایک ایسے دین کو آئندہ چل کر عظیم الشان فوائد حاصل ہونے کی توقع ہے جو مسائل زندگی کا صحیح، متوازن اور اطمینان بخش حل پیش کر سکے۔ اس تہذیب نے ان اوہام کی بنیاد ڈھا دی ہے جو انسانی دماغ کا پردہ بنے ہوئے تھے۔ ان اوہام کے ڈھ جانے کے ساتھ ہی ان مذاہب کی چھتیں بھی زمین پر آرہی ہیں جن کی تعمیر ان اوہام پر ہوئی تھی، اور جو صرف جذباتی عصبیتوں کے حصار میں ہی جی سکتے تھے۔ یہ ایک انقلاب تھا، انقلاب کی فطرت ہمیشہ بحرانی ہوتی ہے، اس لیے یہ انقلاب بھی اپنے جوش میں اوہام کے ساتھ بہت سے حقائق کو بھی بہا لے گیا۔ اور دیگر مذاہب کی طرح خود اسلام کو بھی چیلنج کر گیا جو اپنی فطریت اور عقلیت کی وجہ سے اس کا صحیح رہنما ہو سکتا ہے۔ مگر اس بے اعتدالی کے تلخ نتائج اب اس کے علمبرداروں کے سامنے آچکے ہیں، اور وہ اعتدال کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ اس انقلاب نے ذہنیتوں میں جو ہیجان پیدا کر دیا ہے اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس نے جاہلانہ مذہبی عصبیتوں کی بندشیں ڈھیلی کر کے بڑی حد تک قبول حق کی راہ صاف کر دی ہے اور ایسے بے شمار افراد پیدا کر دیے ہیں جو کسی ایسی بات کے تسلیم کرنے میں اپنے روایتی معتقدات کو ذرہ بھی مانع نہیں سمجھتے جس کی حقانیت ان کے دلوں کو اپیل کر سکے۔ عقل و ذہن کی اس بے تعصبی کے علاوہ تاریخی حقائق بھی کچھ کم قابل اعتنا نہیں ہیں، جب سے نظام عالم کی سیاسی باگ ڈور فاسق و فاجر اور خدا سے باغی ہاتھوں میں آئی ہے اور انھوں نے ہدایت الٰہی کو پس پشت ڈال کر اپنے ذہن و دماغ کے بنائے ہوئے اصولوں پر نظام زندگی کو چلایا ہے اس وقت سے برابر بنی نوع انسان اپنی خودسری کے برے نتائج بھگتتی چلی آرہی ہے اور انسانی دماغ کے بنائے ہوئے تمام نظام زندگی ایک ایک کر کے ناکام ثابت ہو چکے ہیں، نہ صرف ناکام ثابت ہو چکے ہیں بلکہ ان کی پیدا کی ہوئی پیچیدگیوں اور ان کی نازل کی ہوئی ہلاکتوں سے دنیائے انسانیت چیخ اٹھی ہے اور بڑی بے تابی سے ایک ایسے نظام حیات کی طلبگار ہے جو اس کے دکھوں کا مداوا ہو سکے۔

جب حالات یہ ہیں تو ڈرنے سہمنے اور مایوس ہونے کے بجائے ان لوگوں کو نہایت خوش دلی اور تپاک سے ان کا خیر مقدم کرنا چاہیے جو فی الواقع اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ حق صرف اسلام کے پاس ہے، عقل انسانی کو مطمئن کرنے اور مسائل زندگی کو تسلی بخش طریقہ پر حل کرنے کی صلاحیت صرف تعلیمات قرآن میں ہے۔ اس درد کا درماں صرف دین فطرت میں ہے جس سے آج سارا عالم انسانی تڑپ رہا ہے اور وہ آب زلال صرف سرچشمۂ محمدی میں ہے جو دنیا کی تشنہ کامی کو دور اور اس کے پیاسے جگر کو سیراب کر سکتا ہے۔ جن لوگوں نے ان باتوں کو محض موروثی عقیدت کی وجہ سے مان رکھا ہے ان کے متعلق تو ہم جانتے ہیں کہ وہ ان باتوں پر اسی طرح "داد" دے کر خاموش ہو رہیں گے جس طرح کسی اچھے اور خوش کلام شاعر کو اس کے معتقدین دیا کرتے ہیں، ایسے لوگ دین حق کے قیام سے مایوس ہی ہیں اور رہیں گے اور خدا کا دین بھی ان سے مایوس ہے۔ مگر ان لوگوں کے لیے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں جو دین حق کے ان اوصاف و حقائق پر اپنی عقل اور بصیرت کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں، اور اگر نہیں جانتے تو ان کو جان لینا چاہیے کہ ان حالات میں اگر قرآن کے پیرو اور اللہ تعالیٰ سے حق کی شہادت دینے کا عہد و پیمان کرنے والے "مومنوں" نے جن کی تعداد بفضل الٰہی ابھی کم نہیں ہے اپنے فرائض کو ٹھیک ٹھیک پہچان لیا اور خلق کے سامنے حق کی اس طرح تبیین کی جیسی کہ کرنی چاہیے یعنی اگر انھوں نے اسلام کے اصول و نظریات کو جدید طرز استدلال اور سائنٹفک دلائل سے مدلل کرکے دنیا کے سامنے پیش کیا اور قوانین الٰہی کو زمانہ حال کی تعبیروں میں ڈھال کر اور مسائل حاضرہ پر ان کو منطبق کرکے لوگوں پر واضح کر دیا کہ انسانی ضروریات کا صحیح حل اور تمدن عالم کی صحیح رہنمائی صرف الٰہی۔ قوانین کر سکتے ہیں۔ پھر اگر انھوں نے اس کے ساتھ شہادت حق کا عملی نمونہ اس طرح پیش کیا کہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی اسلام کی راہ راست سے ان کا قدم نہ ہٹا۔ اگر انھوں نے عبادات اسلامی کو بجا لاکر اپنی سیرتوں کی تعمیر کر لی، اگر وہ انفرادی مسائل اور اجتماعی معاملات دونوں میں اسلامی اخلاق پر پوری استقامت کے ساتھ جمے رہے، اگر انھوں نے قومی، وطنی، نسلی، خاندانی، طبقاتی اور ذاتی مفادات سے آنکھیں بند کرکے صرف اسلام کے مفاد کو اپنے سامنے رکھا، اگر انھوں نے ظلم کا جواب عدل سے، تعدی کا جواب قسط سے، بدی کا جواب نیکی سے، جھوٹ کا جواب سچ سے، مکر و فریب کا جواب وفائے عہد اور حسن معاملت سے، اور انتقام کا جواب رحم و انصاف سے دیا، اگر انھوں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ ان کی سعی و جہد کا محرک صرف ان اصولوں کی تبلیغ و اقامت ہے جن میں ان کے نزدیک ساری نوع انسانی کی فلاح ہے اور اگر انھوں نے اس سعی و جہد میں حسب ضرورت عیش و آرام کو خیر باد کہنے اور اپنی آرزوؤں کو پامال کرنے، تباہیاں اور بربادیاں خریدنے اور نقد جان و مال کی قربانیاں دینے میں اتنی ہی استقامت دکھائی جتنی کمیونسٹوں نے کمیونزم کی اقامت میں، جرمنوں نے نازیت کی حمایت و سربلندی میں اور جاپانیوں نے میکاڈو کی رضا جوئی میں دکھائی ہے تو حق کی ساحرانہ قوت تسخیر کا دعویٰ ہے اور خدا کی سنت اس دعویٰ کی گواہ ہے کہ یہ جد و جہد کامیاب ہو کر رہے گی اور دنیا اپنے آپ کو مفتوحیت کے لیے از خود پیش کر دے گی، دل اس کی طرف کھنچ آئیں گے، ذہنوں کے تعصبات کافور ہو جائیں گے۔ اور آنکھیں اس کی طرف فرط عقیدت سے جھک پڑیں گی اور دنیا از سر نو یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کا روح پرور منظر دیکھ لے گی۔ ہم جانتے ہیں کہ آج خدا کی پوری زمین پر باطل کی مضبوط گرفت قائم ہے مگر ہم یہ بھی جانتے

ہیں کہ باطل اپنے ابدی اقتدار کا وثیقہ لے کر نہیں آیا ہے، نہ وہ اس زمین کا جائز وارث ہے، قدرت نے زمین کو حق کا مسکن بنایا ہے، جب حق اپنے علمبرداروں کی فرض ناشناسیوں کی وجہ سے اس گھر کو چھوڑ دیتا ہے تو دیو باطل اس خانۂ خالی پر مسلط ہو جاتا ہے مگر جب بھی اس گھر کا اصلی مالک اپنی جگہ لینا چاہتا ہے تو قدرت کے مخفی ہاتھ اس غاصب کو نکال باہر کرتے ہیں، یہ ایک اصول ہے جس کی بنیاد کسی خوش گمانی پر نہیں ہے بلکہ قرآن کے بیان کے مطابق اللہ تعالیٰ کی ان سنتوں میں سے ایک سنت ہے جن میں کبھی کوئی تغیر نہیں ہوتا، چنانچہ فرمایا:۔

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا — حق آگیا اور باطل مٹ گیا، اصل یہ ہے کہ باطل مٹنے ہی والی شے ہے۔

(بنی اسرائیل - ۹)

پس باطل کی زندگی صرف حق کی غیر موجودگی تک ہے۔ جب حق آئے گا، آئے گا نہیں بلکہ لانے والے اس کو لائیں گے تو باطل خود جگہ چھوڑ دے گا۔ یہ گمان کرنا خدا پر بہتان اٹھانا ہے کہ مسلسل کوششوں کے باوجود حق کا قیام ممکن نہیں، جو خدا اس باطل کے لیے کی ہوئی قربانیوں کو بھی کامیاب بناتا ہے جو اس کا مبغوض ہے کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ اس حق کی خاطر کی ہوئی قربانیوں کو رائگاں جانے دے گا جو اس کو محبوب ہے؟ حالانکہ اس نے وعدہ کیا ہے کہ "جو میرے دین کی مدد کرتا ہے میں اس کی مدد کرتا ہوں" اور قرآن نے ہم کو یقین دلایا ہے کہ خدا کی پارٹی ہزیمت نہیں اٹھاتی، وہ دشمن کے بالمقابل ہوتی ہے تو اس کی غیبی نصرتیں اور مافوق الفطرۃ اعانتیں اس کی پشت پناہ ہوتی ہیں، یہاں تک کہ آسمان کے فرشتے اس کے پہلو بہ پہلو لڑنے کے لیے اتر آتے ہیں۔ اور وہ اپنے سے دس گنے دشمنوں پر بھی غالب آکر رہتے ہیں۔ سو یقین رکھنا چاہیے کہ جو فرشتے بدر و احد کے میدانوں میں آئے تھے وہ یہاں بھی آسکتے ہیں اور قرآن بتاتا ہے کہ خدا کے بندے اور حق کے مجاہد جب چاہیں ان کو بلا سکتے ہیں۔ چنانچہ جب غزوہ بدر کے موقع پر نزول ملائکہ کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے اپنی تائید خاص اور نصرت غیبی کا اظہار فرمایا تو ساتھ ہی اس شبہہ کو بھی رفع کر دیا کہ یہ نصرت خاص بحض وقتی تھی، اور کھول کر بتا دیا کہ "وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ"۔ فتح و نصرت کی زمام اقتدار خدا ہی کے ہاتھ میں ہے اور جس طرح آج ہے، کل بھی رہے گی، اس لیے کبھی، کسی زمانہ میں بھی، اہل ایمان کو اس تائید و نصرت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ یاس و قنوطیت اہل ایمان کے نہیں بلکہ اہل کفر کے خصائص میں سے ہے اور خدا کے ان وعدوں کو، جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، شک اور تردد کی نگاہ سے دیکھنا اس گروہ میں شامل ہونا ہے جس کے متعلق قرآن میں آیا ہے کہ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ (یہ لوگ خدا کے متعلق خلاف حق اور جاہلانہ گمان کرتے ہیں) ہر مسلمان کو اس گروہ میں شامل ہونے سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔ اور اگر قرآن پر واقعی ایمان رکھتا ہے تو اس کو کبھی بھی اللہ تعالیٰ کے یہ وعدے بھولنے نہ چاہییں کہ:۔

مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا (طلاق-۱) — جو خدا ترسی کی راہ چلتا ہے خدا اس کے ہر معاملہ میں آسانی پیدا کر دیتا ہے

مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ — جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے (مشکلات اور نقصانات سے) نجات کی راہ پیدا کر دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے جہاں کا اس کو گمان بھی نہیں ہوتا اور جو کوئی اللہ پر توکل رکھتا ہے اس (کی کل مشکلات) کے لیے اللہ کافی ہے۔

اور سب سے آخر میں یہ کہ:۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (عنکبوت) جو لوگ ہماری راہ میں سعی و جہد کرتے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھول دیتے ہیں

ان حقیقتوں کے پیش نظر کسی صاحب فکر کا قیام دین کو ناممکن کہنا قلب و نظر کی بے بصیرتی اور اداے فرض کی مشکلات سے بزدلانہ فرار کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ بالفرض اگر حالات حاضرہ عدم امکانِ کامیابی کو مستلزم ہیں تو پھر ذرا ان حالات کی نشاندہی کی جائے جن میں کامیابی کا امکان ہو۔ مستقبل کے پردے میں کیا کچھ چھپا ہوا ہے، اس کا علم تو خدا ہی کو ہے، مگر ماضی کے احوال و مناظر تو قوت حافظہ کی مدد سے پردۂ حال پر لائے جا سکتے ہیں، ان احوال کو نگاہ تعمق سے دیکھیے اور پھر بتایئے کہ تاریخ انسانی کے اس پورے سلسلہ میں جو آدم سے شروع ہو کر آج ختم ہوتا ہے، قیام دین کے لیے جتنی کوششیں کی گئیں کیا ان سب کے زمانے اس جد و جہد کے لیے آج کی بہ نسبت لازماً زیادہ سازگار تھے؟ کیا حضرت نوحؑ کا زمانہ، جب کہ ساڑھے نو سو برس تک ان پر گالیوں اور پتھروں کی بارش ہوتی رہی، یا حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ، جس میں نمرود کی خدائی قائم تھی، یا حضرت عیسیٰؑ کا زمانہ، جس میں ہر چہار طرف رومن امپائر کی طاغوتیت چھائی ہوئی تھی، یا حضرت یحییٰؑ کا زمانہ، جبکہ یہودی شیطان ہر صدائے حق کا جواب قتل اور صلیب سے دیا کرتے تھے، یا پیغمبر آخر الزمانؐ کا زمانہ، جبکہ خود مرکز حق تین سو ساٹھ بتوں کا مسکن اور جاہلیت کا دار السلطنت بنا ہوا تھا؟ یا مجدد الف ثانیؒ کا زمانہ، جب کہ "مسلمان" حکومتِ اسلام کے خلاف اپنا سارا زور صرف کر رہی تھی، یا سید احمد بریلویؒ کا زمانہ جب کہ اہل اسلام کے سینوں پر ایک طرف انگریز اور دوسری طرف سکھ سوار تھے، زمانہ حال کے مقابلہ میں زیادہ سازگار تھے؟ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے ہر زمانہ قیام دین کے لیے اس سے کہیں زیادہ پرخطر اور مایوس کن اور ناسازگار تھا، جتنا آج ہے۔ پس اگر مشکلات و موانع کا لحاظ کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ آغاز آفرینش سے اب تک ایک فیصدی دور بھی ایسے نہیں آئے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کوئی دور بھی نہیں آیا جو اس جد و جہد کے لیے سازگار رہا ہو۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے سخت زمانوں اور ناساعد حالات میں بھی کتنی ہی کوششیں کامیاب ہو گئیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم نے دنیا جہان کی ناکامیاں اسی زمانہ کے لیے کیوں مقدر مان لی ہیں اور ساری مایوسیوں کو اپنے ہی لیے کیوں مخصوص سمجھ لیا ہے؟

پھر دوسری بات یہ کہ جب ہم نے ادھر سوا سو سال سے اس مقصد کے لیے کبھی براہ راست تگ و دو کی ہی نہیں تو آخر کس تجربہ کی بنا پر ناممکن ناممکن کا ہنگامہ بپا کیا جا رہا ہے؟ ہاں اگر ہم نے فکر و عمل کی ساری قوتوں کے ساتھ طریقۂ انبیاء کے مطابق یہ کوشش کرلی ہوتی اور اس کے بعد بھی ساحل مراد دکھائی نہ دیا ہوتا تو یہ ایک تجربہ ہوتا جو عدم امکان کے دعوے کے حق میں بطور دلیل پیش کیا جا سکتا تھا مگر یہ عجیب ڈھٹائی ہے کہ آپ دریا میں اترتے نہیں اور دور سے کھڑے کھڑے اس کی اتھاہ گہرائی ناپ لینے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ آپ یقین فرمایئے جو ذہنیت آج کے حالات کو ناساعد اور کامیابی کو ناممکن قرار دے رہی ہے وہ قیامت تک امکانات کے حصول میں ناکام رہے گی اور اس ذہنیت کے ماتحت کبھی بھی یہ جد و جہد شروع نہیں کی جا سکتی، جس کفر سے آج وہ لرزاں ہے وہی کل بھی رہے گا خواہ اس کی شکلیں بدلتی رہیں، مگر قیام حق کے لیے ہر کفر کفر ہے وہ اپنے کسی دور اور کسی شکل میں بھی حق کو زندگی کا حق دار سمجھنے کا روادار نہیں ہو سکتا اور نہ ٹھنڈے دل سے اپنے سامنے

اس کو پاؤں جمانے کا موقع دے سکتا ہے۔ جب بھی اقامت حق کے لیے جد و جہد کی جائے گی، کفر اپنے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر سامنے آئے گا اور مختلف اشکال میں وہی تمام زحمتیں، رکاوٹیں، مشکلیں اور مصیبتیں استقبال کے لیے موجود ملیں گی جن کا آج تصور کیا جا سکتا ہے۔ بھولنا نہ چاہیے کہ یہ راہ ہمیشہ خارزاروں اور شعلہ زاروں ہی سے ہو کر گزری ہے، اب یا آئندہ جب بھی گزرے گی انہی کانٹوں اور انگاروں میں سے ہو کر گزرے گی۔ وہ امکان اور سازگاری جس کی آپ کو تلاش ہے اس راہ کے مسافروں کو کبھی ملی ہے نہ مل سکتی ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو اتنی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ شک و شبہ کا کوئی گوشہ باقی نہیں چھوڑا ہے اس نے بتا دیا ہے کہ ایمان کا ہر دعویٰ جانی و مالی آزمائشوں کی بھٹی میں ڈال کر تپایا جاتا ہے اور کوئی دعویٰ عند اللہ اس وقت تک قبول نہیں کیا جاتا جب تک وہ اس بھٹی میں تپنے کے بعد اپنے کو کھرا نہ ثابت کر دے۔ حتیٰ کہ اگر بظاہر ایمان کی راہ صاف اور بے خطر نظر آ رہی ہو تو بھی قدرت اس ابتلاء کے لیے ایسے حالات پیدا کر دیتی ہے جن میں اس دعویٰ کی صداقت کا امتحان ہو جائے۔

اب یہ منطق ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ جن ابتلاؤں اور ناسازگاریوں کو سنت اللہ! دعائے ایمان کے امتحان کے لیے ضروری قرار دیتی ہے آپ اس کا استقبال کر کے اپنے دعوے کا ثبوت دینے کے بجائے ان سے دور بھاگ رہے ہیں اور انہی کو الٹا اپنے ادائے فرض کو ترک کرنے کے جواز میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ انگریزی فوج کا کوئی سپاہی میدان جنگ کا رخ کرنے سے اس لیے انکار کر دے کہ وہاں سے بندوقوں اور توپوں کے چھوٹنے کی دہشت ناک آوازیں آ رہی ہیں، لیکن اس کے باوجود وکٹوریہ کراس کا اولین مستحق اپنے ہی کو یقین کرتا ہو، حالانکہ یہ معرکہ ہی وہ آزمائش گاہ ہے جو اس تمغۂ شجاعت کا استحقاق عطا کرتی ہے۔

مفاد ملی کا بت اس سلسلہ میں ہمارے لیے سب سے زیادہ حیران کن جو شے ہے وہ "مفاد ملت" کے نقصانات کا ذکر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جس مسلمان کو

كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ (نساء - ۲۰)

قسط پر (بہر حال میں) مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے والے اور اللہ کے لیے (حق کی) شہادت دینے والے بنو اگرچہ اس (قسط پر قائم رہنے اور اس شہادت حق) کی زد خود تمہارے ہی اوپر یا تمہارے والدین یا اقرباء ہی پر کیوں نہ پڑتی ہو۔

کی تعلیم دی گئی تھی اور جس کے متعلق یہ طے کر دیا گیا ہے کہ

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (توبہ - ۱۴)

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں۔

اب اس کو اس امر کی تلقین کی جا رہی ہے کہ تو حق اور عدل و قسط کی راہ چھوڑ دے اگر اس کے اختیار کرنے میں تیری قوم کا نقصان ہوتا ہو اور خدا کی رضا جوئی کو دور پھینک دے اگر اس سے تیری جان و مال پر آنچ آتی ہو! آخر مفاد ملت کے نام پر اقامت دین کے فرض سے ہاتھ اٹھانے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ اب مسلمان کی نگاہ میں مرکزی اہمیت دین اور قیام دین کو نہیں بلکہ اس کے اپنے معاشی و سیاسی مفاد کو حاصل ہو گئی ہے، اب وہ کوئی ایسا طریق کار

نہیں اختیار کر سکتا جس میں کلمۂ حق کی سربلندی اور مطالبات دین کی بجا آوری تو ہو مگر اپنے یا اپنی "قوم" کے مفاد خطرے میں پڑتے ہوں، اس کو چاہیے کہ دین کو دنیا پر، آجلہ کو عاجلہ پر، معاد کو معاش پر، رضائے الٰہی کو مفاد قومی پر، شہادت حق کو مفاسد سیاسی پر، اقامت دین کو مصالح ملی پر یعنی مقصد زندگی کو زندگی پر قربان کر دے۔ العیاذ باللہ، یہ ذہنیت ہے آج ہم مسلمانوں کی اور یہ انداز فکر ہے پیروان قرآن کا جس پر کفر اور مادیت بھی عش عش کر اٹھے۔ ہم اس نظریہ کے واضعین اور حاملین سے اس کے سوا کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ

"کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ ..... تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے" (حضرت مسیح)

اس نظریہ کے ساتھ خدا پرستی کا جوڑ کبھی نہیں لگ سکتا۔ جس مفاد قومی کا آپ شور مچا رہے ہیں۔ وہ ایک خطرناک بت ہے جس کو توڑے بغیر اسلام کا مفاد پورا نہیں کیا جا سکتا۔

زمانۂ نبوت میں منافقین کا نقطۂ نظر یہ تھا اور ان کے نفاق کی بنیاد اس چیز پر تھی کہ نَخْشٰی اَنْ تُصِیْبَنَا دَائِرَةٌ ہم کو ڈر ہے کہ اگر ہم کھلم کھلا اور یکسو ہو کر اسلامی تحریک میں شامل ہو گئے تو ہم کو مصیبتیں گھیر لیں گی اور اسلام کی وجہ سے ہم سارے جہان کی عداوت کا نشانہ بن جائیں گے۔ اسی طرح بہت سے کافروں کا بھی کہنا یہ تھا کہ خدا تمہاری باتوں کی صحت و صداقت کا ہم انکار نہیں کرتے مگر:-

اِنْ نَّتَّبِعِ الْھُدٰی مَعَکَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا (قصص - ۶) اگر ہم آپ کے ساتھ ہو کر ہدایت الٰہی کی پیروی کریں تو فوراً اپنی مادر وطن سے مار کر نکال باہر کر دیے جائیں گے۔

یہ دونوں گروہ اتباع حق کے بارے میں جس طرز فکر و استدلال سے کام لے رہے تھے کیا وہی طرز فکر و استدلال آج بھی مفاد قومی کے نعروں کے پیچھے کام نہیں کر رہا ہے؟ قرآن سراپا حق ہے۔ پیغمبر صادق و مصدق ہے، اتباع اسلام ہی ذریعہ نجاح و فلاح ہے۔ لیکن اگر قرآن کے مطالبے، رسول کے فرمان اور اسلام کے اصول و مقتضیات پر عمل ہوا تو ہم برباد ہو جائیں گے۔ ہم کو اندیشہ نہیں بلکہ یقین ہے کہ زمانہ بھر کی آفات و بلیات ہم پر ٹوٹ پڑیں گی، ذرہ ذرہ ہماری مخالفت پر کمر باندھ لے گا، اپنی "مادر وطن" کو انگریزوں ہی کے قبضہ میں رہنے دینگے یا برادران وطن کے اقتدار میں دے دیں گے اور ہم خود غلام اور اچھوت، مفلس و پسماندہ اور خدا جانے کیا کیا ہو جائیں گے! کاش مسلمان اپنے خلاف اللہ تعالیٰ کو ایسی کھلی ہوئی حجتیں دینے سے قبل ذرا سوچ لیتے کہ ہم اپنی زبانوں سے کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ تو مفاد قومی کا بچانا نہیں ہے بلکہ اللہ کے غضب کو دعوت دینا ہے۔

پھیر کے راستے اب رہا یہ سوال کہ آیا ہم اس نصب العین کے لیے براہ راست جد و جہد کرنے کے بجائے کوئی پھیر کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ سو اس کے متعلق تجربہ اور عقل دونوں کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ یہ طرز عمل سراسر غلط اور ناکام ہے۔ اور حق کی فطرت بھی اس سے ابا کرتی ہے۔ اب تک کی تاریخ یہی بتلاتی ہے کہ جن لوگوں نے بھی اس مقصد کو اپنا مقصد زندگی قرار دیا ہے ان میں سے کسی نے بھی یہ پالیسی اختیار نہیں کی۔ متمدن یا غیر متمدن، آزاد یا غلام، دولت مند یا مفلس غرض جس قسم کی قوم کے اندر بھی کوئی داعی حق اور علمبردار قیام دین آیا اس نے سب سے پہلی آواز جو منہ سے نکالی وہ یہی اور صرف یہی تھی کہ "اے بندگان خدا! خدا کی بندگی اور طاغوت سے اجتناب اختیار کرو" ہم تفحص کے باوجود کسی نبی کو اس پالیسی سے ہٹ کر کوئی دوسری پھیر والی پالیسی اختیار کرتے ہوئے نہیں پاتے۔ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ ابھی اس سوال کو چھوڑ دیجیے، پہلے اس حقیقت کو پوری جستجو اور تنقید کے ساتھ پرکھ لیجیے کہ ایسا ہی ہوا یا نہیں؟ اگر ایسا ہوا

اور یقیناً ہوا، تو پھر ان لوگوں کے لیے جو اسوۂ انبیاء ہی کو اپنا مرجع کل ماننے کے مدعی ہیں، اس طریق کار کو ترک کرنا جائز کسی حجت شرعی کی بنا پر ہو سکتا ہے؟ اگر حالات زمانہ کے اختلافات کوئی چیز ہیں تو کیا اس بات کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ تمام انبیاء کے زمانہائے بعثت تو بالکل یکساں نوعیت کے تھے، جس کی وجہ سے ان سب کے طرز عمل میں اتنی کامل یکسانی اور مماثلت پائی جاتی ہے، اور یہی بیسویں صدی کا ایک ایسا انوکھا اور غیر معمولی زمانہ ہے جس کے حالات یکایک اب تک کی پوری تاریخ انسانی کے حالات سے بالکل مختلف ہو گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا دعویٰ کوئی بھی عاقل نہیں کر سکتا اور سب جانتے ہیں کہ کچھ غیر متغیر حقائق تو ایسے ہیں جو تمام زمانوں میں مشترک رہے ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے مگر عوارض و ظواہر اور احوال و ظروف ہر دور کے الگ الگ ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے، اس لیے اگر ان ظاہری خصوصیات کا لحاظ کیا جائے تو جس طرح آج کا زمانہ پہلی صدی ہجری سے مختلف ہے۔ اسی طرح پہلی صدی ہجری کا زمانہ دور عیسوی سے اور دور عیسوی دور موسوی سے بھی مختلف تھا۔ اس لیے اگر اختلاف احوال کے باوجود تمام انبیاء نے متفقہ طور پر ہمیشہ براہ راست جدوجہد کی پالیسی اختیار کی تو اس اختلاف کے باوجود بھی جو ہمارے زمانہ اور پچھلے زمانوں میں بظاہر نظر آتا ہے، ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ یہی پالیسی اختیار کریں۔ کیونکہ اس کام کے لیے کوئی دوسرا طریقہ کبھی آزمایا ہی نہیں گیا۔ اور تمام انبیاء کا اسی طریق کار کو اختیار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس جدوجہد کا مزاج ہی اسی قسم کا ہے کہ اس کے لیے براہ راست اقدام کیا جائے۔ یہ دلیل یقین سے بڑھ کر ہم کو حق الیقین اور عین الیقین کی حد تک پہنچا دے سکتی ہے اگر ہم اس چیز کو سامنے رکھ لیں کہ بعض انبیاء کو دوسری پالیسی اختیار کرنے کے بہتر سے بہتر مواقع ہاتھ آئے مگر انھوں نے پوری صفائی کے ساتھ ان کو ٹھکرا دیا۔ سید الانبیاء صلعم کے سامنے قریش نے یہ پیش کش کی کہ آپ کو ہم اپنا بادشاہ بنائے لیتے ہیں اور اس کے لیے ہم آپ سے یہ مطالبہ بھی نہیں کرتے کہ آپ اپنی "دعوت توحید" سے دست کش ہو جائیں، آپ سے ہماری صرف اتنی گزارش ہے کہ آپ ہمارے بتوں کو برا کہنے اور ہمارے جذبات کو ٹھیس لگانے سے باز رہیں۔ غور فرمائیے کہ آج کے اہل سیاست و تدبر کے نقطۂ نظر سے یہ کتنا اچھا اور مغتنم موقع تھا کہ رسول اللہ اس پیشکش کو قبول فرما کر ایک طرف تو ان مصیبتوں اور فتنوں کا خاتمہ کر لیتے جو ان کی اور ان کے پیروؤں کی زندگی اجیرن کیے ہوئے تھے، دوسری طرف تخت حجاز پر قابض ہو کر حکمت و تدبر اور مصلحت شناسی کے ساتھ اپنے حاکمانہ اثر و اقتدار سے کام لیتے ہوئے تدریجاً اپنی منزل مقصود کی طرف مارچ کرتے اور رفتہ رفتہ دین حق کو مملکت حجاز و عرب پر قائم کر دیتے۔ مگر آپ کو معلوم ہے کہ پیغمبر عالم نے اس "مغتنم" موقع پر کیا طرز عمل اختیار کیا اور اس پیش کش کا کیا جواب دیا؟ یہ کہ "خدا کی قسم اگر میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیے جائیں تو بھی میں اپنی دعوت حق اور اپنے طریق کار سے باز نہ آؤں گا"۔ یہ کسی پرجوش اور ماؤف الدماغ انقلابی نوجوان کے الفاظ نہ تھے بلکہ اس معلم حکمت اور رازدان حقیقت کے الفاظ تھے جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ اس کے دل اور زبان پر براہ راست خدا کی نگرانی قائم تھی اور جس نے کبھی کوئی بات جذبات کے ہیجان میں نہیں کہی۔ اس لیے ایک مومن کا ذہن تو اس وہم کو اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دے گا کہ آنحضرتؐ نے اس موقع اور اس طریق کار کے ہاتھ آتے ہوئے بھی عمداً ان کو ترک کر دیا جو حصول مقصد کے لیے براہ راست جدوجہد سے زیادہ موزوں اور کارگر تھے، یا یہ کہ ان میں، نعوذ باللہ دور حاضر کے مدبروں اتنی بھی انجام بینی نہ تھی اور نہ یہ صلاحیت تھی کہ "احوال و ظروف زمانہ" کے مطالبات و مقتضیات کا اندازہ کر سکتے اور وقت و ماحول کی مصلحت سے اس پالیسی کو قبول کر لیتے۔

اب ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ انبیائے کرام کے اس اسوے اور متفقہ طریق کار کے ہوتے ہوئے ہم کو کس سوء اور لاتحمل کی ضرورت ہے۔ نظری حیثیت سے بھی دیکھیے تو اس طرز فکر اور اس نظریہ میں بے بنیاد وہموں اور طفلانہ خوش گمانیوں اور خود فریبیوں کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا۔ پھیر کے راستے اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ حق کو باطل نما بنا کر پیش کیا جائے اور جس باطل میں آپ پڑے ہوئے ہیں اس سے نکل کر حق کی طرف جانے کے بجائے ایک دوسرے باطل کے سایہ میں جا کھڑے ہوں کیونکہ اگر آپ موجودہ باطل ماحول کو ہر ہم کر کے ایک اور ماحول قائم کریں جو حق نہ ہو تو لازماً باطل ہی ہو گا۔ جس کا رنگ و روغن تو نیا ہو گا مگر فطرت بہرحال وہی ہو گی جو موجودہ باطل کی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم اس پر اثر ڈال کر اپنے نصب العین کے لیے زیادہ سازگار بنا لیں گے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ دنیائے عمل میں اس خام خیالی کی کوئی قیمت نہیں۔ باطل کبھی حق کا سازگار نہیں ہو سکتا۔ اور اس میں حق کے جو پیوند آپ بہزار وقت لگائیں گے وہ آپ کے مقصد کے لیے خالص باطل اجزاء سے زیادہ مضر ثابت ہوں گے۔ دور نہ جائیے اسی ہندوستان میں بہت سی "اسلامی ریاستیں" قائم ہیں جن میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جن کا آپ آئندہ نظام ملکی میں جوڑ لگانا چاہتے ہیں، مگر وہاں اقامت دین کا نام ہی لے کر دیکھیے، جیل کا دروازہ اپنے سامنے کھلا ہوا پائیں گے۔ آپ اپنی اس جدوجہد میں غیر ملکی حکومت ہی کو سد راہ سمجھتے ہیں اور اسی لیے اس کے ہٹ جانے کا انتظار کر رہے ہیں۔ مگر آپ شاید بھولتے ہیں کہ حضرت مسیح کے مشن کے متعلق رومی اقتدار ابھی خاموش ہی تھا کہ ان کی اپنی ہی قوم یا یوں کہیے کہ اس وقت کے "مسلمانوں" ہی نے بڑھ کر اس مشن کا گلا گھونٹ دیا۔ پھر اپنی حال ہی کی تاریخ پر نظر ڈالیے۔ شیخ عبدالوہاب نجدی کی تحریک کا متعلقہ "اسلامی" حکومتوں نے کس تپاک سے استقبال کیا۔ شیخ جمال الدین افغانی نے ایک جزئی دینی تحریک کا نام لیا اور آپ کی انہی موجودہ اسلامی حکومتوں نے انکو رہنے کے لیے جگہ دینے سے انکار کر دیا۔ اور اگر آج بھی کسی کو ہمت ہو تو ان ممالک میں جا کے یہ آواز اٹھا کر "قدر عافیت معلوم کر سکتا ہے۔"

درحقیقت یہ دفع الوقتی کی باتیں ہیں اور یہ نظریہ اسی ذہنیت کی پیداوار ہے جس نے قرآن کے احکام و مطالبات کی "ناسازگاریوں" سے گھبرا کر مطالبہ کیا تھا کہ "اس کے بجائے کوئی دوسرا قرآن لائیے یا اسی میں کچھ ایسی ترمیمیں کر دیجیے جو زمانہ اور ماحول سے ہم آہنگی پیدا کر سکیں"۔ اس طرز پر سوچنے والوں کی نگاہ شاید اس طرف نہیں جاتی کہ دنیا کے جو ہنگامے آج ہیں، کل بھی رہیں گے اور جو مصالح اور مشکلات آج ان کا راستہ روک رہی ہیں، آئندہ بھی ان میں کوئی کمی رونما نہ ہو گی، جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ یہ پھیر کی راہ اختیار کرنے کے اسباب و محرکات نہ کبھی ختم ہوں اور نہ اقامت دین کے لیے کبھی براہ راست جدوجہد کی جائے۔

(باقی آئندہ)

قانونِ بقائے انفع

اجتماعیات میں تحفظِ حق و عدل کا فطری اہتمام

(از جناب نعیم صدیقی)

(۳)

بحث کے مبادیات طے ہو چکے ہیں، اور اب ہمیں جماعتوں کی "حیاتیات" ([illegible]) کے بڑے بڑے اصولوں کی ایک جھلک دیکھ لینی چاہیے تاکہ ہمارے دعوے کی تصدیق یا تردید ہو جائے۔ اگر ہم یہ جان لیں کہ جماعتوں کا ظہور کیونکر ہوتا ہے وہ ارتقا کیسے کرتی ہیں، اقتدار سیاسی تک کیسے کام پاتی ہیں، اور ان کا خاتمہ کیونکر ہوتا ہے تو ان معلومات سے وہ اصول اخذ ہو سکتے ہیں جن کی روشنی میں ہم یہ طے کر سکیں کہ "حذرت" ان کے لیے وجہ قوت ہے یا ظلم؟

جماعتوں کا ظہور جماعتوں کا ظہور اس طرح نہیں ہوتا جیسے ایک مقررہ وقت گذرنے کے بعد کسی خاص فصل کے اگنے کا موسم آجاتا ہے اور ہمیشہ آتا رہتا ہے۔ جماعتوں کی پیدائش اصولِ تناسل پر بھی نہیں ہوتی کہ ایک جماعت سے دو اور دو سے چار بنتی چلی جا رہی ہوں، چاہے ان کی کوئی ضرورت ہو یا نہ ہو —— جماعت ایک اخلاقی ضرورت پورا کرنے کے لیے وجود میں آتی ہے، بلکہ وجود میں لائی جاتی ہے۔ کسی بھی جماعت کی علتِ ظہور دریافت کرنے کے لیے تاریخ سے سوال کیجیے، وہ آپ کو ایک ہی جواب دے گی کہ ہر جماعت کا ظہور خاص اس وقت ہوا ہے جب کسی انسانی آبادی میں نظامِ رواں کے باطل پرستی ہونے اور ظلم پر کار فرما ہونے کا احساس پھیل نکلا ہے۔ بقول چارلس ڈاونز ہیرن:-

"ہر برائی خود اپنے ازالہ کا مطالبہ کرتی ہے۔"

مرض خود مریض کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے نجات دلوائے۔ اسی طرح جب بھی کوئی نظام اپنے زیرِ اثر حلقہ میں کچھ لوگوں کو دبا کچل کر رکھتا ہے تو قانونِ فطرت کے دباؤ سے وہی لوگ اسے ختم کرنے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ مثلاً قرآن فرعون کے دور کے متعلق کہتا ہے کہ "فرعون زمین میں سرکش ہو رہا تھا اور اس نے ملک کے لوگوں کو طبقوں میں بانٹ رکھا تھا تاکہ وہ ایک گروہ کو کمزور کر رکھے اور اس غرض کے لیے وہ اس کے بیٹوں کو قتل کرا دیتا تھا اور اس کی بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتا تھا، یقیناً وہ مفسد تھا۔ پس ہم نے چاہا کہ مستضعفین یعنی مظلوموں پر احسان کریں اور انھیں ملک کی سرداری اور وراثت عطا کریں اور ان کے قدم جما دیں (تمکن فی الارض بخشیں) اور فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو وہ انجام دکھا دیں جس سے وہ خوف کھاتے تھے۔ اس ارشاد میں فطرت کا جو محکم قانون بیان ہوا ہے عین وہی اس وقت ہمارے مدنظر ہے۔ یعنی

جب کسی گروہ یا اقتدار کسی انسانی عنصر پر ظلم ڈھاتا ہے تو نظامِ فطرت اسی مظلوم عنصر کو اس کی سرکوبی کے لیے کھڑا کر دیتا ہے۔ اس طرح برائی خود اپنے ازالہ کا سامان کرتی ہے۔[1]

پس جس اقتدار نے اپنے نظام کی اساس غلط نظریات پر رکھی ہو اور انسانی فطرت کے مختلف تقاضوں کو عادلانہ طریقہ سے پورا کرنے کے لیے مناسب ضابطۂ حیات مہیا نہ کیا ہو، اس کے زیرِ اثر جو آبادی بس رہی ہے، دھیرے دھیرے اس پر زندگی تلخ ہونے لگتی ہے۔ غلط نظریات اور غلط قوانین پر کاربند رہنے کے نتائج ابھرنے لگتے ہیں اور اس وقت لوگ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ زندگی کی تنظیم میں کچھ غلطی کی گئی ہے۔ یہ احساس تحفظ حق و عدل کے فطری قانون کے ماتحت ہی رونما ہوتا ہے اور یہ جب عام ہو جاتا ہے تو تغیر کی خواہش ابھر آتی ہے اور یہ وقت ہوتا ہے کہ اجتماعی زندگی "پس چہ باید کرد" کی صدا لگانے لگتی ہے۔

اس آواز کے جواب میں اجتماعی فکر کی قوتیں اپنا سب کچھ باہر اگل دیتی ہیں اور مفکرین وقت اپنی بساط کے مطابق یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ نظامِ رواں کی اساس میں فلاں فلاں موقع پر حق کی جگہ باطل کا دخل ہو گیا ہے اور فلاں فلاں رخنوں سے ظلم گھس آیا ہے اور اب ظلم و باطل کا سدباب کرنے کے لیے ان فکری و عملی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔

یہ موقع کچھ ایسا ہوتا ہے کہ ادھر تو انسانیت کے اجتماعی دکھوں کے معالجے کے لیے دیانتدار اور اہلِ حکمت اطبا اپنی خدمات پیش کر دیتے ہیں اور ادھر پیٹ کے بندے "عطائی" اپنے تھیلے اور صندوقچے اٹھائے آموجود ہوتے ہیں اور پھر ان مختلف قسم کے معالجین کا گروہ نظمِ اجتماعی کی "بیماری" کی مختلف توجیہیں کرتا ہے کہ مریض نے فلاں فلاں بے احتیاطیاں کیں، غذا میں فلاں فلاں مضر عناصر شامل ہو گئے تھے، فلاں فلاں اعضا پر مختلف وجوہ سے زیادہ بار پڑا ہے اور اب علاج کے تقاضے یہ ہیں۔ اس طرح نظری اور عملی تغیرات کی متعدد دعوتیں نمودار ہو جاتی ہیں، ان کے علمبرداروں میں خدمت پیشہ مخلصین بھی موجود ہوتے ہیں اور انتفاع پیشہ کار بھی۔ اور یہ پبلک بہرحال ادھر کھنچتی ہے جدھر اسے حق و عدل کا عنصر زیادہ نظر آتا ہے۔[2] "ہوتا ہے" کی بات نہیں کی جا رہی ہے بلکہ "نظر آتا ہے" کے الفاظ استعمال کیے جا رہے ہیں۔ پھر اگرچہ ابتداءً متعدد گروہ نشوونما پانے لگتے ہیں مگر لوگوں کو جن کے پاس حق و عدل کی متاع نسبتاً زیادہ نظر آتی ہے وہ دوسروں کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں اور آخر کار غلبہ اسی ایک جماعت کے لیے ہوتا ہے جو "انفع" یا "انفع نما" ہو۔

آپ چھوٹے پیمانہ پر مختلف ممالک کے پارلیمنٹری انتخابات کی تاریخ پر نظر ڈالیے، کتنی ہی مختلف طاقتیں میدان میں

---

[1] یہ ایک الگ بات ہے کہ علمی اور عملی دونوں پہلوؤں سے انسان میں ایسی بڑی بڑی کمزوریاں موجود ہیں جن کے زیرِ اثر وہ مروجہ نظریاتِ باطل سے بغاوت کرنے کے لیے دوسرے نظریاتِ باطل کا مومن بن جاتا ہے یا ظالمانہ عملی نظام کو توڑنے کے بعد خود جو نظام بناتا ہے اس میں بھی ظلم ایک نئے رنگ میں آگھستا ہے لیکن اتنی بات قطعی ہے کہ انسان کی طبیعت باطل اور ظلم کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتی۔

[2] یہ ضروری نہیں کہ کسی سو فیصدی باطل کا مقابلہ کرنے کے لیے سو فیصدی حق کی متاع کسی جماعت کے پاس ہو، نہیں دس فیصدی حق بھی صفر فیصدی حق کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ اب جس جگہ دس فیصدی اور پندرہ فیصدی اور تیس فیصدی حق کی حامل جماعتیں اٹھیں وہاں تیس فیصدی حق والی آگے آجائے گی اور وہی انفع یا "انفع نما" شمار ہو گی۔ اس کے انفع یا انفع نما ہونے کا مطلب یہ نہیں ہو گا کہ اس کی متاع سو فیصدی حق و عدل کی متاع ہے۔

اتر تی ہیں مگر جھٹ سے آگے وہی جماعت آتی ہے جو ملک کی آبادی کے لیے انفع یا انفع نما ہو۔ یعنی فی الواقع اس سے زیادہ سے زیادہ خدمت کی توقع کی جاسکے یا وہ اپنے زیادہ سے زیادہ خادم ہونے کا یقین عوام کو دلانے میں کامیاب ہو چکی لیکن بعد میں جب اس کی فریب کاری کی قلعی کھل جاتی ہے تو وہ اٹھا کر الگ پھینک دی جاتی ہے اور ایک نئی طاقت آگے ہو جاتی ہے۔

بہر حال "ظہور جماعت" کی لازمی علت ظلم و باطل کے نتائج و اثرات سے بچنے کی نیم شعوری خواہش ہے جو انسان کی اجتماعی نفسیات کا ایک فطری تقاضہ ہے۔ یہ عمل اس بات پر گواہ ہے کہ انسانیت ظلم و باطل سے حق و عدل کی طرف حرکت کرنے پر مجبور ہے۔ اگر آپ کو اس سے انکار ہے تو کوئی نمایاں مثال تاریخ سے ایسی نکال کر دکھائیے کہ کسی بڑی جماعت کا ظہور اس حال میں ہوا ہو کہ نظام رواں سراسر حق و عدل کا نظام ہو اور اس کے زیر سایہ بنی آدم کی زندگی امن و مسرت کے ساتھ گذر رہی ہو۔ یا یہ کہ کسی جماعت نے اپنے وجود کا اگر یہ ہونا اس استدلال سے ثابت کیا ہو کہ چونکہ نظام رواں تمام تر حق و عدل کا مجموعہ ہے اور اس کے سایہ میں انسان امن و مسرت سے بہرہ ور ہو رہا ہے اس لیے ہم اس کو بدلنا ہے اور اس غرض کے لیے قوت و تمکن کو ایک نقطہ پر مرتکز کرنا ہے۔ یقیناً ایسی کوئی مثال تاریخ کی منڈی سے کسی قیمت پر بھی نہ مل سکے گی۔ پھر فرمائیے کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ جماعتوں کا وجود ہونا ہی ظلم اور باطل کے قلع قمع اور حق و عدل کے قیام کے لیے ہے۔ اور اسی کا وہ دعویٰ رکھتی ہیں۔ اسی وجہ سے ہم "جماعت" کو ایک اخلاقی وجود قرار دیتے ہیں جو ایک فطری خواہش کو پورا کرنے کے لیے انسانی ارادہ کے ماتحت نمودار ہوتا ہے۔

جماعتوں کی دعوت | جماعتوں کی دعوت کی فطرت کیا ہے، حمایت حق و عدل یا اعانت ظلم و باطل، ——— جیسا کہ ابھی گذشتہ سطور میں ہم عرض کر چکے ہیں، ہر جماعت زندہ رہنے اور پھیلنے اور قوت پانے کے لیے اپنی اخلاقی حیثیت کو قوی بنانے پر مجبور ہے، اس کے لیے لازم ہے کہ وہ نظام رواں کی غلطیاں اور کوتاہیوں کو جس کے نیچے مظلوم پڑے کراہ رہے ہوں ایک ایک کر کے نمایاں کرے اور صاف اور سادہ تنقید سے یہ ثابت کردے کہ اس کی تشخیص بالکل صحیح ہے، پھر جن جن غلط نظریات اور ظالمانہ ضوابط کی وہ نشاندہی کرے ان کی جگہ ایسے واضح صحیح نظریات اور عادلانہ ضوابط کا ایک نیا مجموعہ اس انداز میں پیش کرے کہ لوگ اس مجموعہ کے عادلانہ کھرے پن پر مطمئن ہو جائیں، یعنی اثباتی نظریات کے حق ہونے اور تعمیری ضوابط کے منصفانہ اور مطابق فطرت ہونے کو تسلیم کرلیں۔ فلسفہ اور علم النفس اور سیاست اور معیشت اور سائنس سارے علوم ان کی تائید کرنے والے ہوں۔ صرف یہ راستہ ہے جماعتوں کے فروغ پانے کا اور یہ ہی راستہ ہے جسے ہر جماعت نے اختیار کیا ہے۔ دعوت کا تنقیدی و تخریبی پہلو "جو کچھ ہے" کے مظالم و مفاسد کا تعین کرتا ہے اور لوگوں کو اس سے شعوری نفرت دلاتا ہے اور اس کا اثباتی و تعمیری پہلو "جو کچھ ہونا چاہیے" کی صحت و درستی کا یقین دلاتا ہے اور لوگوں کو اس کے لیے قربانیاں کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ "ہے" کی صحت و درستی ثابت کر کے اور "چاہیے" کی کوتاہی اور نادرستی کا یقین دلا کر کوئی جماعت ابھر سکے۔ نہ ایسی دعوتیں کبھی ابھری ہیں اور نہ کبھی انھیں مقبولیت حاصل ہو سکی ہے۔

یہ واضح رہے کہ "خدمت پیشہ" اور "انتفاع پیشہ" یا "نفع" اور "انفع نما" جماعتوں کے طریقِ دعوت میں ایک نازک سا فرق ہوتا ہے جسے محسوس نہ کر سکنے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ عوام دھوکا کھا جاتے ہیں بلکہ بہت سے خواص بھی اس معاملہ میں "عوام" ثابت ہوتے ہیں۔ عملی سیاست کی دنیا ہی میں نہیں، بلکہ جماعتوں کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے "محققین" تک اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پھسل جاتے ہیں۔

انفع جماعتیں چونکہ اس متاع کی سرمایہ دار ہوتی ہیں جس کی اصلاً اجتماعی ذہن میں قدر ہوتی ہے، اس لیے وہ اپنے آپ کو بالکل سادگی سے پیش کرتی ہیں۔ ان کے نظریات منطقی، اینچ پینچ سے خالی اور عقلِ عامہ کو مطمئن کر سکنے والے ہوتے ہیں اور ان کی عملی کارروائیاں ریاکاریوں سے ملوث نہیں ہوتیں اور سلیم الفطرت فرزندانِ آدم رفتہ رفتہ ان کی طرف کھنچ جاتے ہیں۔ لیکن انتفاع پیشہ یعنی "انفع نما" جماعتوں کا طریقِ دعوت سادہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ ایک ایسی متاع لیے کھڑی ہوتی ہیں جو اصلاً مقبولِ انسانیت نہیں ہے۔ وہ مجبور ہوتی ہیں کہ اپنے اصلی فلسفہ اور پروگرام پر نمائشی حرکات اور فریبکارانہ پروپیگنڈے کا ایک ایسا رنگین و نقشین خول چڑھائے رکھیں جو عوام کی "نظربندی" اس حد تک کر سکے کہ وہ ان آنکھوں کے سامنے بچھا ہو مگر نظر نہ آئے۔ ان جماعتوں کو بے انصافی اور ظلم کے اثبات، یعنی فطرتِ انسانی کے انفرادی، اجتماعی اور نوعی مطالبات کو پورا کرنے میں عدمِ توازن اور عدمِ توافق کو برحق دکھانے کے لیے کائنات، زندگی، انسان، اخلاق، تمدن، سیاست، معیشت اور معاشرت کے صحیح اساسی نظریات سے انحراف ناگزیر ہوتا ہے، اس لیے انھیں دنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کے لیے نہایت پیچیدہ اور پُراسرار فلسفے تراشنے پڑتے ہیں۔ یہ فلسفے اور استدلال اگرچہ گرہوں کو کھولنے کی جگہ ژولیدہ تر کرتے جاتے ہیں اور ان میں انسان کو مطمئن کرنے کی اہلیت ہرگز نہیں ہوتی، مگر رنگین عبارت آرائیاں، چلتے ہوئے چست فقرات اور مرعوب کن اصطلاحات جو ان میں استعمال کی جاتی ہیں، وہ ایسی تیرِ بہدف ثابت ہوتی ہیں کہ دنیا مفتوح ہو کے رہ جاتی ہے۔ — اس بری طرح مفتوح ہوتی ہے کہ فاتح شاید دل ہی دل میں اس کی حماقت پر ہنستے رہ جاتے ہیں کہ یہ انسانوں کا گلہ بھی کیسا سادہ لوح ہے کہ "زہر" کے بجائے "گڑ" سے مرا جا رہا ہے۔ لیکن انسانوں کا گلہ کرے بھی کیا کہ اس پر حملہ آور چاروں طرف سے یکبارگی حملہ کر دیتے ہیں، کوئی اپنا پیغام فلسفوں کی شکل میں، کوئی سیاسی پروگرام کی شکل میں، کوئی ادبِ لطیف کی شکل میں، کوئی منظومات کی شکل میں، سنائے چلا جا رہا ہے اور سننے والوں کو سوچنے کا موقع نہیں دیتا۔ پھر اسٹیج سے، پریس سے، سینما سے، ریڈیو سے، غرض ہر مورچہ سے تباہ کن حملے ہونے لگتے ہیں۔ آخر لوگ شکست مانتے ہیں اور رفتہ رفتہ ایک "انفع نما" جماعت تمکن کے تخت پر ظلم کی تلوار برہنہ کر کے جا بیٹھتی ہے۔

ادھر عملی سیاست کے میدان میں ایسی جماعتوں کے کارنامے کیا ہوتے ہیں؟ جلسے، جلوس، فوجی مارچنگ، بینڈ، باجے، جھنڈے، وردیاں، اعلان، بیان، تجاویز، ریزولیوشن وغیرہ کا ایک سیلاب امڈنے لگتا ہے اور اس قسم کا سیاسی مداری پن جب شہر شہر اور قریہ قریہ میں پھیل جاتا ہے تو ملک سمجھتا ہے کہ سبحان اللہ کتنی کارکن اور فعال جماعت ہے اور کس سرگرمی سے تنظیم کر رہی ہے اور بس پھر بے بس ہو کر لوگ اسی طرح اژدہام کر کے ان تنظیموں میں جذب ہونے

لگتے ہیں جس طرح کسی سرکس اور تھیٹر کے اندر لوگوں کا داخلہ ہوتا ہے۔ اب ان تنظیموں کا قدم جتنا جتنا آگے بڑھتا جاتا ہے "نمائش کاری" اتنی ہی زیادہ چمک دمک کے ساتھ جاری ہو جاتی ہے۔ اور اقتدار حاصل ہونے کے بعد تو ان میں پوری طرح آنکھیں چندھیا دینے والی براقی نمودار ہو جاتی ہے، جیسا کہ "اندھا شاہی نظام" کے متعلق گاڈون کہتا ہے کہ:-

"اندھا شاہی بہر حال ایک شر ہے۔ ان کے علمبردار تزک یا احتشام کے مظاہروں اور نمائشوں کے بل پر چل رہے جاتے ہیں اور اجتماعیات میں وہ ایک جھوٹی قدر حاصل کر لیتے ہیں"

ہمارے نزدیک یہ صورت اندھا شاہی نظام کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر اجتماعی نظام کا خاصہ یہی ہے۔ "جنانچہ" میکیاولی اقتدار ناروا کے حصول اور تحفظ کے لیے بالکل اسی اصول پر مشورہ دیتے ہیں کہ:-

"میں یہاں تک کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اپنے اندر خیر و خوبی کی مختلف اقدام کا رکھنا اور پھر ہمیشہ ان کے تحفظ کی کوشش کرنا تو مضر مقصد ہے، مگر ان کے ہونے کا عیارانہ اظہار کرنا مفید مطلب ہے ۔۔۔۔ مثلاً رحم دلی، راسخ الاعتقادی، انسانیت پروری، مذہب پسندی وغیرہ سب بڑھے چڑھے ہونے کا اظہار!

گویا یہ سیاست جدیدہ کا پدر محترم بھی یہ مانتا ہے کہ دنیا میں ان خوبیوں کی قدر ہے اور ان کے اظہار ہی سے مطلب نکالا جا سکتا ہے اور دوسری طرف اس بات کی بھی تصدیق کرتا ہے کہ انسانی ذہن دھوکا کھا سکتا ہے۔ یہی ہم کہہ رہے ہیں کہ بددیانت لوگ دیانتداری کی قبا اوڑھ کر آگے آ سکتے ہیں۔

اقتدار کی ہوس کے ماتحت انتفاع پیشہ گروہوں نے ہی جدید دور کے پروپگنڈہ کے فن کی تشکیل کی ہے اور اسے مسلسل ارتقا دیا ہے۔ یہ لوٹ مار کرنے والے، یہ غلام بنانے والے، یہ انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے والے گروہ اگر مقتدر طبقات میں تو فقط اسی نمائش، فریب اور ساحری کے بل پر جس کا ایک پہلو پروپگنڈہ ہے اور دوسرا "حکمت عملی"! اور جس قدر عناصر کسی گروہ میں زیادہ ہوتے ہیں، اتنا ہی وہ زیادہ عیار اور زیادہ مکار ہوتا ہے اور زیادہ صفائی سے اپنی بدباطنی کو چھپا کر جھوٹی قدر و قیمت حاصل کر لیتا ہے۔

ذرا ملاحظہ کیجیے یورپین اقوام کی نوآبادیاتی پالیسیوں کو، ذرا غور سے دیکھیے یک جماعتی ریاستوں کی روش کو، ذرا توجہ فرمائیے اعلانات جنگ اور مقاصد جنگ کی توضیحات پر، ذرا مطالعہ کیجیے نظام امن کی تجویزوں کا ۔۔۔ آپ دیکھیں گے کہ "اقوام شکار" اقتداروں نے اپنے اخلاقی تعفن کو عطر پاشیوں سے چھپانے میں کتنے کمالات کا مظاہرہ کیا ہے۔

آخر جس کے پاس کھرا مال ہو اسے چرب زبانی اور عیارانہ اشتہار بازی اور فریب کارانہ پیکنگ کی ضرورت کیا ہے لیکن جس کا مال کھوٹا ہے وہ اگر زبان اور دماغ سے کام لینے میں زیادہ چستی نہ دکھائے گا تو کون اس کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔ "سیاسی منڈی" کے بے ایمان تاجر مجبور ہیں کہ آدمی کی معاشی اور عقلی اور نفسیاتی اور صنفی کمزوریوں کو تاک تاک کر نشانہ بنائیں اور حکمت لادین کو آدم کشی میں استعمال کریں۔

"حکمت ارباب کیں مکر است و فن
مکر و فن؟ تخریب جاں، تعمیر تن"

پھر جب ایسے گروہ مقتدر ہو جاتے ہیں تو مکاری، عیاری اور ساحری کے ساتھ قاہری بھی آشامل ہوتی ہے اور جب یہ "شیطان زادیاں" ہاتھ میں ہاتھ ڈالے خرام ناز فرماتی ہیں تو چاروں طرف بسمل ہی بسمل نظر آتے ہیں، مگر فطرت ان کی خدائی کا نقش محو کرنے کے لیے از سر نو انسانی ارادہ کو اکسا دیتی ہے۔

طریقِ دعوت کا یہ انداز بتاتا ہے کہ دروغ کو فروغ حاصل کرنے کے لیے اور ناجائز اقتدار طلبی کو سر اٹھانے کے لیے بڑی ہی بناوٹوں اور بڑی ہی چالبازیوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ اگر اپنے آپ کو بغیر کسی دلفریب نمائش و آرائش کے پیش کر دے تو شاید کوئی اس کے منہ پر تھوکنے کے لیے بھی تیار نہ ہو۔ جیسے ایک سیدھی سادی گرہستن کو سوسائٹی میں شرف حاصل کرنے کے لیے کسی خاص کارروائی کی ضرورت نہیں، مگر ایک بیسوا کو سوسائٹی سے اپنا وجود برداشت کرانے کے لیے زرق برق لباس اور قیمتی زیورات اور غازوں اور گلگونوں کی ضرورت ہے۔

پس یہ واضح ہے کہ جو جماعت کہ ظلم اور باطل کا دشمن اور حق اور عدل کا علمبردار ہونا یا کم از کم ثابت کر دکھانا لازم ہے ورنہ اسے بقا نہیں مل سکتی۔ کیا یہ حقیقت اس دعوے پر شہادت نہیں دیتی کہ فطرتِ انسانی حق و عدل کی طلبگار اور ظلم و باطل سے نفور ہے۔

جماعتوں کا نشوو ارتقاء کسی جماعت کا وجود میں آنا تو آسان ہے مگر اس کا تنازع للبقا کی مہم سر کر لینا مشکل ہے۔ لوگ کوئی دعوت سنتے ہی نہیں لپک اٹھتے۔ بلکہ طرح طرح کے شکوک و شبہات ان کے ذہن کی تنقیدی حس کو بیدار کر دیتے ہیں اعتراضات اور شبہات کا ایک طوفان چاروں طرف اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور دعوت کے علمبرداروں کے نظریات اور پروگرام عقلِ عامہ کی کسوٹی پر مدت تک پرکھے جاتے ہیں۔ نہ صرف نظریات اور پروگرام، بلکہ ان کے علمبرداروں کا خلوص بھی ناپا تولا جاتا ہے۔ عملی میدان میں لوگ دیکھتے ہیں کہ کسی جماعت کے افراد کی زندگیاں کس نئی چیز کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ ان کے پاس موجود سے "بہتر" کیا ہے اور اپنے نصب العین کے لیے یہ کتنی قربانیاں دے سکتے ہیں یا قربانیوں سے بچنے کے لیے کہاں کہاں "سودابازی" کا طریق اختیار کرتے ہیں؟ کہاں ان کا فلسفہ ان کے عمل سے متضاد واقع ہوا ہے؟ یہ لوگ ذاتی فائدوں کے لیے مقصد کو بیچ کھاتے ہیں یا نہیں؟ ان کو کام کرنے کے جو مواقع ہیں انھیں خدمت عوام پر صرف کیا گیا یا اپنی کبریائی کا جھنڈا اونچا کرنے کی فکر کی گئی؟ وغیرہ۔

پھر عوام کی تنقید تو خیر دور رس نہیں ہوتی، مگر ہر نئی جماعت کو جن قدیم جماعت بندیوں کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے اور انھیں ختم کرنے کے لیے جو نئی جماعت بندیاں نمودار ہو جاتی ہیں ان کی طرف سے بڑے بڑے گہرے سوالات جدید دعوت کے فلسفے اور پروگرام کے خلاف اٹھائے جاتے ہیں جو رفتہ رفتہ عوام میں پھیل جاتے ہیں۔ ادھر عملی میدان میں اس حریفانہ کش کش کی وجہ سے علمبرداران دعوت کو ذاتی اور جماعتی دونوں پہلوؤں سے بڑے بڑے نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بڑے بڑے مفاد سے ہاتھ دھونے کی نوبت آتی ہے۔ یہ آزمائش کی بھٹی اس لیے سلگائی جاتی ہے کہ کھوٹ اور میل میدانِ سیاست سے الگ ہو جائے۔

اس تنقید اور کشمکش کا مدعا بھی یہی ہے کہ حق و عدل کے علمبردار ابھریں اور ظلم و باطل کے فرزند شکست کھائیں۔ عوام کی

خدمت کرنے والا گروہ آگے ہو جائے اور ان سے نفع اندوزی کرنے والے پیچھے ہٹ جائیں۔ مگر جو بات ہم نے "طریقِ دعوت" کے زیرِ عنوان عرض کی تھی اسی کو یہاں بھی مدِ نظر رکھیے۔ یعنی انفع گروہ کا سیدھا سادہ فلسفۂ تنقید کی کسوٹی پر اپنے آپ کو پیش کر دیتا ہے اور اس کی عملی سرگرمیاں بھی بے دھڑک آزمائش کی بھٹی سے گزر جاتی ہیں مگر نافع نما گروہ اپنے فلسفہ کو جانچنے کے لیے خود کسوٹی ہی کو کھوٹی ثابت کرنے کی فکر کرے گا اور عملی میدان میں بھی آزمائش کی بھٹی سے کترانے کی کوشش کرے گا کبھی اس پر تکیہ دے گا کہ بھٹی کی آنچ انسانی برداشت سے زیادہ تیز ہے اور پھر ہر آنچ کے بعد زیادہ بھڑکیلا ملمع کر کے اپنا مال بازار میں لائے گا۔ اس طرح وہ بقا کے لیے جد و جہد کرے گا۔

لیکن اس "جہد للبقا" میں "انتخابِ اقویٰ" کا قانون ہرگز کام نہیں کرتا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ مقتدر جماعتیں کبھی فنا نہ ہو سکتیں اور مظلوم عناصر کبھی مقتدر نہ ہو سکتے۔ قوی جماعتوں کا مٹ جانا اور کمزور جماعتوں کا طلوع ہونا اس دعویٰ پر گواہ ہے کہ جماعتوں کی جہد للبقا میں "انتخابِ اقویٰ کی جگہ "انتخابِ انفع" کا قانون عمل کرتا ہے۔ قوت تو منتہائے مقصود ہے اور اسی کے متعلق ہمارے سامنے یہ سوال حل طلب ہے کہ اس مقصود کو پانے کے لیے کس خصوصیت کی ضرورت ہے۔ یقیناً اس کا وہی جواب ہے جو ہم مضمون کی ابتدا میں عرض کر چکے ہیں کہ دنیا طاقت اس گروہ کے حوالے کرنا چاہتی ہے اور اسے قیادتِ علیا کا منصب تفویض کرنے پر مائل ہوتی ہے جس سے "خدمت" کی توقع ہو ــــ سب سے زیادہ خدمت کی توقع! اور جہاں بھی اس کا بس چلے وہ خدائی جانے والوں کو اقتدار کی طرف قدم بڑھانے سے روکنا چاہتی ہے۔

بہر حال جماعتیں بقا کی یہ جنگ لڑ کر اقتدار کا قلعہ بھی فتح کر سکتی ہیں کہ وہ حق و عدل کے اسلحہ استعمال کریں۔ ہاں اقتدار پانے کے بعد انفع اور انفع نما جماعت کو الگ الگ پہچاننے میں کوئی بڑی دشواری نہیں رہتی مخلص انفع جماعت نے تو اقتدار لیا ہی اس غرض کے لیے تھا کہ انسانیت کی خدمت کر سکے۔ پس وہ جس انسانی آبادی سے قوت حاصل کرتی ہے اسی کی خدمت سر انجام دے کر حساب چکاتی جاتی ہے۔ اس طرح خدمت کے "کاروبار" کا ایک چکر چلتا ہے:-

"خدمت سے قوت اور قوت سے خدمت"

لیکن انفع نما گروہ کا معاملہ دوسرا ہے۔ وہ جب غالب ہو چکتا ہے تو اس کی بد باطنی کھلتی ہے اور اس نے خدمت سے جو قوت حاصل کی ہوتی ہے اسے دوسری طرف انتفاع میں استعمال کرتا ہے۔ جیسے برٹش پارلیمنٹ عالمگیر نقطۂ نظر سے برطانیہ کی خادم ہے، نو آبادیات سے انتفاع کرتی ہے۔ امریکہ کی مقتدر قوت سرمایہ داروں کی خادم اور ادنیٰ طبقات کے لیے ظالم ہے یا کانگریس جو ہندوؤں کے لیے مفید اور مسلمانوں کے لیے مضر بننے کی سعی کر رہی ہے۔ وغیرہ۔ سو انفع نما جماعت کا عملیہ اس اصول پر ہوتا ہے:-

"خدمت سے قوت اور قوت سے انتفاع"

مگر پھر بھی "خدمت" سے قطعی خالی ہو کر کسی گروہ کا بقا پانا ناممکن التصور ہے۔ اس کی طبعی ذمہ داری ہی خدمت ہے۔ بس ظلم اس وجہ سے نمودار ہوتا ہے کہ خدمت کا دائرہ سکڑ کر پوری اولادِ آدم کو اپنے دائرہ میں لینے کے بجائے ایک محدود عنصر پر محیط

رہتا ہے۔ اور یہ تقسیم چونکہ خود ایک ظلم ہے اس وجہ سے اس کے عمل پر خدمت کا اطلاق اصولاً نہیں ہو سکتا۔

بہرحال اس محدود "خدمت" اور "انتفاع" سے تائید و مزاحمت کی جو دو متصادم اخلاقی قوتیں رونما ہوتی ہیں ان کی کمی بیشی ہی آخر میں یہ فیصلہ کر دیتی ہے کہ کسی گروہ کو اقتدار کا حق تھا یا نہیں!

جماعتوں کی فنا | خود جماعتوں کا مٹ جانا کیا شہادت دیتا ہے؟ وہ کیا چیز ہے جس کے ختم ہونے کے بعد قوموں اور ملتوں کے اجتماعی وجود دم توڑ دیتے ہیں؟ بہرحال جماعتوں کی فنا کا راز توجہ طلب ہے، جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ:۔

اَفَلَمْ یَهْدِ لَهُمْ کَمْ اَهْلَکْنَا قَبْلَهُمْ مِنَ الْقُرُوْنِ۔ کیا اس سے ان لوگوں کی رہنمائی نہیں ہوتی کہ کتنی ہی قومیں ٹھکانے لگائی جا چکی ہیں؛ ہاں فی الواقع قوموں اور گروہوں کی موت پر اگر ہم غور کریں تو وہ نکتہ پکڑ سکتے ہیں جو ان کی تباہی کا راز ہے۔

پہلی بات تو یہ کہ اگر سیاسی تمکن کی بنا اور جماعتی زندگی کی بقا محض مادی قوت پر منحصر ہوتی تو جو جماعت ایک دفعہ مادی قوت پا لیتی اس کا اقتدار دائمی ہوتا۔ پھر فراعنہ کی خدائی کبھی نہ مٹتی، نمرود کا تخت کبھی نہ الٹا جاتا، سکندر اور چنگیز کے تاج زمانے کے سیلاب میں ہرگز نہ بہہ سکتے، زار روس کا نظام کبھی درہم برہم نہ ہوتا۔ کیا وجہ ہے کہ تاجوں کے ہیروں کی چمک ماند پڑ جاتی ہے، تلواریں زنگ آلود ہو جاتی ہیں، عساکر پر شوکت درہم برہم ہو جاتے ہیں اور طاقتور "پرانے" کی جگہ کمزور "نیا" برسر اقتدار ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جماعتیں جو ایک دفعہ اقتدار کی منزل کو جا پہنچی ہیں، انھیں موقع دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے دعاوی کی صداقت و کذب اپنے کارگذاروں سے واضح کر لیں۔ انھیں ڈھیل دی جاتی ہے کہ تمدن و سیاست کی مشین کو اپنی مرضی کے مطابق چلا لیں، تاکہ ان کی پوری آزمائش ہو کر عوام پر یہ حقیقت کھل جائے کہ فلاں گروہ خدمت کا علمبردار ہے یا انتفاع کا؟ جب اس امتحان کے نتائج نکل آتے ہیں تو انسانی ارادہ یہ فیصلہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے کہ کوئی مدعی خدمت گروہ اپنے دعوی میں سچا تھا یا نہیں؟ اور اگر اس کا جھوٹ کھل جاتا ہے تو انسانی ارادہ اس کے خلاف زور کر کے اسے ختم کر دیتا ہے۔ فطرت بلا واسطہ جو فرائض سرانجام دیتی ہے ان میں اسے تجربہ کی ضرورت نہیں مگر جو معاملات انسانی شعور کے واسطے سے اسے طے کرنے ہوتے ہیں ان میں انسانی شعور کو تجربہ کرائے بغیر کام نہیں چلتا۔ چنانچہ تاریخ اس قسم کے لاکھوں تلخ تجربات کا ایک مجموعہ ہے۔ جب کبھی انسان کا اجتماعی شعور کسی گروہ کی طرف انگلی اٹھا دیتا ہے کہ ہمیں اس سے فلاح کی توقع ہے تو فطرت اجازت دیتی ہے کہ اپنے انتخاب کو آزما لو۔ لیکن اپنے ظلم و باطل کے خلاف جو شدید نفرت دلوں میں پیدا کر دی ہے وہ فطری امتحان میں ناکامیاب ہونے والے گروہ کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اسی نفرت کے ماتحت انقلابی تحریکوں اور جنگوں کا ظہور ہوتا ہے جو اصلاً ظلم و باطل کا قلع قمع کرنے کے لیے نمودار ہوتی ہیں اور اگر خدانخواستہ ظلم و باطل کے خلاف انقلاب اور لڑائی کا ظہور نہ ہوتا تو دنیا جہنم سے ہزار گنی بدتر ہوتی۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ۔ اگر خدا کا قانون ایک انسانی گروہ کو دوسرے گروہ سے متوازن دیا کرتا تو زمین بے امنی کا گھر ہوتی۔ یہ اسی قانون کا فیض ہے کہ ہر گروہ مقدر موت سے بچنے کے لیے کسی

کسی حد تک متقدمین کی تاریخ سے عبرت پکڑتا ہے اور اپنے آپ کو بہتر دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔

"انفع" گروہ جو نظام حق و عدل کا علمبردار ہو، کوئی وجہ نہیں کہ انسانیت اس کے خلاف زور کرے اور انقلاب برپا کرے۔ محدود فتنہ انگیزیاں ان لوگوں کی طرف سے ظاہر ہو سکتی ہیں جو خود انتفاع کے خوگر رہے ہوں مگر اخلاقی کمزوری کی وجہ سے یہ طاقت نہیں پکڑ سکتیں۔ زیادہ سے زیادہ خطرہ "نظام خدمت" کو ان بیرونی گروہوں سے ہو سکتا ہے جو اس سے پوری طرح متعارف نہ ہوں یا اپنی خداوندیوں کو اس کی تاخت و تاراج سے بچانے کے لیے عوام کو فریب دے کر اس سے لڑا دیں ——— مگر عین میدان جنگ میں نظام انفع اپنی اخلاقی بلندیوں سے دشمنوں کو فتح کر سکتا ہے۔ ہاں اگر نظام انفع کے علمبرداروں کے سینوں میں جذبات خدمت سرد پڑ جائیں اور جذبات خود غرضی ابھر آئیں اور وہ اپنے نظام کو انحطاط کی راہ پر اس حد تک دھکیل لے جائیں کہ وہ "غیر انفع" ہو کے رہ جائے اور ظلم و باطل کو وہ اپنے اندر جذب کر لے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ فطرت اور انسانی شعور اس سے کوئی نرمی برتے۔ اس منزل پر پہنچنے کے بعد اسے "امامت عصر" کا حق نہیں رہتا۔

دوسری طرف "انفع نما" گروہوں کی ساری انفعیت اسی وقت تک ہوتی ہے کہ انھیں تمکن مل جائے۔ اس کے بعد وہ رفتہ رفتہ اپنی انتفاعی سرگرمیوں کو آشکارا کرنے لگتے ہیں اور اس طرح جتنی جتنی مادی طاقت ان کے خزانے میں زیادہ ہوتی جاتی ہے، عاقبت اندیشی اتنی ہی کم اور عوام کے احساسات سے بے نیازی اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔ اس مادہ پرستانہ طرز عمل سے مادی قوت کا اضافہ اور اخلاقی دیوالیہ پن متوازی طور پر تکمیل کو پہنچتے ہیں۔ اخلاقی دیوالیہ پن کی تکمیل کا مطلب یہ ہے کہ ظلم اپنی انتہا کو پہنچ جائے اور مظلوم عناصر پوری اخلاقی قوت کے ساتھ انتقام کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔

یہ صورت تو اندرون خانہ نمودار ہوتی ہے مگر "ظلم بیرون خانہ" بھی اپنے قانون کو دعوت تیغ آزمائی دیتا ہے۔ نظام انتفاع اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کمزوری سے فائدہ اٹھائے۔ پس اسے جہاں بھی دنیا میں کوئی کمزور جمعیت اجتماعی نظر آتی ہے وہ اسے شکار کر لینا چاہتا ہے۔ پھر دنیا کئی ٹکڑوں میں منقسم اور کئی نظام ہائے انتفاع کا گہوارہ ہے۔ اس لیے ہر قومی گدھ کی نظر قابل صید اقوام پر رہتی ہے۔ اس طرح مختلف جماعت بندیوں کی طاقتیں ایک دوسرے کی حریف و رقیب بنتی ہیں اور مزید یہ کہ جہاں رقابت کی کوئی وجہ بالفعل نہیں ہوتی وہاں خود رقابت کا اندیشہ رقابت ہی کا نتیجہ پیدا کرتا ہے، یعنی جنگ! اس طرح نظام انتفاع ہر لحظہ خطرات میں گھرا رہتا ہے۔ یہ سب اہتمامات گواہ ہیں کہ فطرت انتفاع، ظلم اور باطل کو انسانی زندگی میں مقتدر دیکھنے پر راضی نہیں ہے۔

آپ اگر قریب ترین چند صدیوں کی جہانی تاریخ کا مطالعہ فرمائیں تو آپ کو یہ اندازہ ہوگا کہ خالص عالمگیر انسانی نقطۂ نظر سے اس طویل دور میں صرف انفع نما جماعتیں ابھرتی رہی ہیں یعنی جن کے پیش نظر خود وہ انسانوں کا مفاد تو تھا مگر ایک خاص حلقہ سے باہر کی دنیائے انسانیت ان کے لیے ایک شکارگاہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ چنانچہ دور دورِ حاضر کی پوری تاریخ انفع نما جماعتوں کی تاریخ ہے جو اساسی اصولوں میں متحد مگر عملی ضوابط میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

عالمگیر انفعیت جماعتوں کا یہ مسلک کہ ادھر خدمت ہو اور ادھر انتفاع، راست بیں انسانی نقطۂ نظر سے مدلل نہیں ہے۔

اور جب یہ روش عدل نہیں ہے تو پھر اس کی اساس جن نظریات پر قائم ہے ان کا باطل ہونا بھی از خود واضح ہے۔ عدل نام ہی اس چیز کا ہے کہ فکر و عمل کے ترازوؤں کے دونوں پلڑے برابر رکھے جائیں۔ اپنی نسل اور دوسری نسلیں، اپنی قوم اور دوسری قومیں، اپنا طبقہ اور دوسرے طبقات، اپنی برادری اور دوسری برادریاں، اپنی ذات اور دوسرے اشخاص ایک ہی کانٹے پر ایک ہی باٹ سے تلیں۔ اگر بحیرۂ روم کے اس جانب آزادی و حریت کا استحقاق بنی آدم کو حاصل ہو تو اس جانب کے انسانوں کو بھی اس کا مستحق مانا جائے۔ اگر عزت و احترام کا حقدار سفید فام امریکن ہو سکتا ہے تو ریڈ انڈین کو بھی اس میں شریک ہونے کا مساویانہ موقع حاصل ہو، پھر اگر انگلینڈ کی سطوت کو بچانے کے لیے انگریز لڑتا ہے تو اس کا فرض ہے کہ ہندوستان کی شوکت کو بحال کرنے کے لیے بھی اسی جانفشانی سے لڑے، چاہے اسے میدان جنگ میں اپنے باپ اور بھائیوں ہی پر کیوں نہ گولی چلانی پڑے۔ اسی طرح روس جو اپنے فرزندوں کو جرمنی کی دست برد سے بچانے کے لیے جان لڑاتا رہا ہے اس کو خود اپنی دست برد سے جاپان، ایران، ترکی اور یورپین ممالک کو بھی بچانا چاہیے۔ اگر اس کے ہاتھ کمزوروں کو دبوچنے کے لیے بے اختیار ہو جائیں تو اس کے لیے صحیح راستہ یہ ہے کہ وہ ان ظالم ہاتھوں کو کاٹ کے الگ پھینک دے۔ مگر نہیں ان سب گروہوں کی انفعیت محدود ہے۔

عالمگیر انفعیت کی اہمیت کو تو محسوس کیا گیا ہے، اب نہیں بلکہ گذشتہ جنگ عظیم نے ہی انسان کو اس طرف متوجہ کر دیا تھا۔ مگر آہ کہ اس کے لیے صحیح اساسی اصول نہ ملنے اور اس کے لیے پورا خلوص موجود نہ ہونے کی وجہ سے یہ نمودار نہ ہو سکی جمعیتِ اقوام نے اسی احساس کے ماتحت جنم لیا تھا مگر ناکام مقصد ہو کے آج وہ قبر عدم میں مدفون ہے۔ پھر اسی اساس سے اوقیانوس چارٹر ابھرا لیکن چارٹر کے مصنفین کے غیر مخلصانہ طرز عمل نے اسے اوقیانوس کی لہروں کی نذر کر دیا، پھر یہاں فرانسسکو میں بظاہر اکابر عالم اسی احساس کے ماتحت سر جوڑ کر بیٹھے مگر یہ کانفرنس بھی امن پسند اور اقتدار پسند عناصر کی داستانِ کشمکش سے زیادہ کچھ نہ تھی اور اس میں "نشستند و گفتند و برخاستند" سے آگے اگر کچھ ہوا بھی تھا تو اسے فاتحین عالم کی فاتحانہ حرکات نے دامن وقت سے دھو دیا ہے۔

عالمگیر انفعیت اگر کسی گروہ میں پائی جائے تو اس کی مزاحمت کسی قوت کی طرف سے محض غلط فہمیوں اور بد دیانتیوں کے ماتحت ہو گی۔ صحیح معلومات اور خلوص کے ہوتے ہوئے پوری دنیا کے مفاد کے خادموں کی مزاحمت کوئی نہیں کر سکتا اور جو وطنی اور نسلی گروہ بندیاں اس کے مقابلہ میں آتی ہیں ان کے قدم کبھی جم نہیں سکتے۔

عرب کی جماعتِ اسلامی | اب اس طرز کی جماعت کی مثال دورِ رواں میں اگر نہ مل سکے تو پھر ہمیں اجازت دیجیے کہ ذرا اور پیچھے ہٹ کر آپ کو ایک ایسی جماعت سے متعارف کرا دیں جس سے آپ کو چاہے محبت ہو یا نفرت مگر ہمارے معیار پر وہی پوری اترتی ہے۔ ہمارے پیش نظر ساڑھے تیرہ سو سال پہلے عرب میں نمودار ہونے والی جماعت اسلامی ہے۔

اس جماعت کا ظہور پوری انسانیت کو ہر نوعیت کے ظلم سے بچا کر عدل کی راہ پر چلانے کے لیے ہوا تھا اور اسی وجہ سے اس کے مسلک کا عنوان ہی "مسلک امن" (اسلام) تھا۔ اس کا بنیادی نظریہ سیدھا سادہ تھا کہ اصلاً "اقتدار" "خدا" کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے، نہ سیاست میں، نہ معیشت میں، نہ معاشرت میں ـــــ اور سب انسان اس کی رعایا ہیں جن

میں کوئی اونچ نیچ نہیں ہونی چاہیے کہ کوئی حاکم ہو کوئی محکوم، کوئی جابر ہو کوئی مجبور، کوئی ظالم کوئی مظلوم ـــــ یہ مرکزی دعوت اتنی سادہ تھی اور اتنی سادگی سے پیش کی گئی تھی کہ عرب کا ایک جاہل بدو بھی اسے دو سکنڈ میں سمجھ لیتا تھا کہ زندگی پر اس کا اثر کیا ہوگا۔ پہلے مظلوم اور محکوم اور مجبور اس دعوت کی طرف کھنچے اور ان کے ساتھ معتدین میں سے بھی سلیم الفطرت عنصر نے اس ناقابلِ انکار بنیادی صداقت کو اوائل ہی میں قبول کر لیا مگر انتفاع وظلم کے کچھ علمبردار اپنے ذاتی مفاد کے تحفظ کے لیے انسانیت کے خیرخواہوں کے مقابلہ میں بھرپور مادی قوت کے ساتھ اترے۔ مگر اس گروہ کی اخلاقی قوت نے ان کی مادی قوت کو شکست دے دی۔ اس دوران میں باصطلاحِ جدید "پروپگنڈا" نہیں کیا گیا اور کسی مظاہرہ تنظیم کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ بس ایک سیدھے سادے اصول کی تبلیغ تھی اور اسی کے مطابق تشکیل پانے والے دیانتدارانہ، کریمانہ اور فیاضانہ اخلاق کا خاموش حملہ تھا جو جوق جوق لوگوں کو فتح کرتا گیا۔

پھر جب اس گروہ کو غلبہ ملا تو اس نے اپنی عیاشی کے سامان نہیں کیے۔ اس نے اپنے معاشی مفاد کے لیے کبھی کوئی جنگ نہیں کی۔ اس نے اپنے ہم نفس اور ہم وطن بھائیوں کو خداوندی دلانے کے لیے تلوار اور قانون کو استعمال نہیں کیا۔ اس نے زیرِ اقتدار آبادی کا خون کبھی نہیں نچوڑا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ایران قومیت کے نشہ میں سرشار ہوکر اس سے لڑنے نکلا، مگر اس یقین کے ساتھ کہ میری مغلوبیت مقدر ہو چکی ہے اور ہسپانیہ نے تو خود اس گروہ کے ایک گورنر سے خواہش کی کہ آ اور مجھے فتح کر لے۔

همه آهوانِ صحرا سرِ خود نهاده بر کف
بامیدِ آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

پھر ایک مفتوح علاقہ سے جب اس گروہ کو فوجی وسیاسی تسلط اٹھانے کی ضرورت پیش آئی تو اس کے باشندے رو رو کے کہتے تھے کہ ہمیں چھوڑ کر نہ جاؤ، ہم تمہارے نظام کے ماتحت جینا چاہتے ہیں۔ پھر سیاسی تسلط اٹھانے کے ساتھ جزیہ (معاوضۂ انتظام) کی گراں بہا رقم کی واپسی نے اس گروہ کے خادمِ انسانیت ہونے کو قطعی طور پر ثابت کر دیا۔ کیا دنیا بھر کی جدید سیاسی تاریخ میں سے ایسا ایک واقعہ بھی کوئی تلاش کر کے دکھا سکتا ہے؟ پھر اس گروہ کے ایک امیر کی موت پر متعصب عیسائی پادریوں تک نے سوگ منایا۔

اس گروہ نے سوسائٹی میں توافق پیدا کرنے کے لیے یہ اہتمام کیا کہ کمزوروں کی گردن سے بار اٹھائے اور طاقتوروں کے کندھوں پر رکھ دیے۔ جو جتنا زیادہ ضعیف تھا اس کی ذمہ داریاں اتنی ہی کم اور اس کے حقوق اتنے ہی زیادہ تھے؛ اور جو جتنا قوی تھا اس کی ذمہ داریاں اتنی ہی زیادہ اور حقوق اتنے ہی کم تھے۔ چنانچہ جماعت اسلامی کے امیر کا حال یہ تھا کہ اسے عیاشی کرنے کی مہلت تو کیا ملتی، ضروری حد تک آرام کرنے کی فرصت بھی نہ تھی۔ اس کا دن پبلک کی خدمت میں اور رات خدا کی بندگی میں گزرتی تھی۔ اس کا کھانا، پہناوا اور رہن سہن عوام سے ایک بال بھر بھی بہتر نہیں ہوتا تھا، بلکہ وہ کسی ایسی چیز کے استعمال سے ہچکچاتا تھا جس کے متعلق اسے یہ یقین نہ ہو کہ یہ پبلک کے ہر ہر فرد کو میسر ہو چکی ہے۔ وہ اس کا ذمہ دار تھا کہ اس کے حدودِ انتظام میں کوئی بھوکا نہ ہو، کوئی دکھی نہ ہو، کسی کا حق نہ چھنے اور کسی پر زیادتی نہ ہونے پائے۔ کتنی ہی دفعہ ایسا ہوا کہ وہ کسی کو کھانا پہنچانے خود جا رہا ہے، کسی کا بوجھ اٹھائے ہوئے، کسی کا سودا سلف خرید رہا ہے، کسی

کی تیمارداری یا عیادت میں مصروف ہے اور کسی کوچہ میں لوگوں کی تکلیفیں معلوم کرنے کے لیے گھوم رہا ہے۔

اس گروہ نے کبھی کوئی جنگ ملک گیری، معاشی صیادی اور غلام سازی کے لیے نہیں لڑی، اس کی جنگ صرف ان نظریات سے تھی جو مختلف انتفاعی نظاموں کی اساس بنے ہوئے تھے اور اس کا تصادم ان ظالمانہ وسائلِ حیات سے تھا جنھوں نے اولادِ آدم کو مصیبتوں اور دکھوں میں مبتلا کر رکھا تھا۔

پس اس گروہ کے خلاف انقلاب اٹھانے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی گئی۔ ہاں مگر قانونِ انحطاط نے ضرور اس پر عمل کیا۔ اور بدنیت لوگوں کو جب اس کے نظامِ خدمت کے کلیدی پرزوں کو چھیڑنے کا موقع ملا تو انھوں نے تحریفی تغیرات سے اس کی چال بدل دی۔ لیکن رائے عامہ کے نمائندہ علما و ماہرینِ سیاست نے بھی ان تحریفی تغیرات کو روکنے کے لیے تجدیدی مساعی کو ہمیشہ جاری رکھا۔ انہی تجدیدی مساعی کا یہ فائدہ ہوا کہ اندرونی روحِ خدمت پژمردہ ہو جانے کے باوجود قرنوں تک اس نظامِ عدل کا بیرونی ڈھانچہ کسی نہ کسی حد تک برقرار رہا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس گروہ کو آٹھ دس سو سال تک دنیا کے مختلف گوشوں میں کام کرنے کی مہلت ملی۔ شاید اتنی مہلت پچھلے دور میں کوئی گروہ کبھی نہ پا سکا۔ تا آنکہ نظام کی روح اور ڈھانچہ دونوں قطعی طور پر متغیر ہو گئے۔ نظریاتِ حق فکرِ باطل کے عمل سے مسخ ہو گئے اور ضابطۂ عدل تو انتہائی تغیرات کی وجہ سے ظلم کا سرچشمہ بن گیا۔ اب جب اس جماعت نے عام انتفاع پیشہ گروہوں کی سطح پر گرنا پسند کر لیا تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اسے محض اس وجہ سے بحال رکھا جاتا کہ کبھی ایسا اور ایسا تھا۔ فطرت "تھا" کو نہیں "ہے" کو دیکھ کر فیصلہ کرتی ہے۔ چنانچہ اس سے جہانی امانت سلب ہو گئی اور اب دنیا جیسی کچھ ہے، آپ کے سامنے ہے۔

اس بحث سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ اے، جے، سی، برفتا کے الفاظ میں یہ ہے کہ:-

"انجام کار صرف وہ جئیں گے جو پوری انسانیت کے اصلی تقاضوں کو سمجھ لیں اور انھیں پورا کر سکیں"۔

ایسے ہی ایک گروہ کے ابھرنے کی امید پر انقلاب اور جنگیں نوعِ انسانی کو بار بار الٹ پلٹ رہی ہیں اور یہ فتنہ و فساد کی رَو اس وقت تک انسانی آبادیوں کو بلوتی رہے گی جب تک کہ ان میں سے وہی پاکیزہ اور صاف ستھرا مکھن نہ برآمد ہو جائے۔

ایک آخری سوال اب پھر وہی سوال ہمارے سامنے آتا ہے جو انفرادی اخلاقی لغزشوں کے وجوہ دریافت کرنے کے لیے اٹھا تھا کہ اگر انسانیت ظلم و باطل کی واقعتہً دشمن ہے اور حق و عدل اسے مرغوب ہیں تو پھر ظلم و باطل کو ابھر آنے کا موقع کیسے ملتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ یہاں بھی نظریوں اور ضابطوں کی ساری خرابیاں انہی وجوہ پر مبنی ہیں جن کا تذکرہ ہم نے انفرادی اخلاقی لغزشوں کے بارے میں کیا تھا۔ یعنی نظریات میں جذبہ آمیز اور خواہش پرستانہ فکر اور تجربی عقل کو مابعد الطبیعی اور تمدنی و حیاتی صداقتوں کی تلاش کے لیے کافی سمجھنا اور ظنیات کو حقائق کا درجہ دینا اور کم معلومات کی بنیاد پر کسی حقیقت کی قطعی تعبیر کر لینا باطل کو در آنے کا موقع دیتا ہے اور ادھر عملیات میں تقسیمِ انسانیت یعنی کسی گروہ کو برتر اور کسی گروہ کو فروتر قرار دینا، انسانی فطرت کو متغیر ماننا یعنی ملک ملک اور زمانہ زمانہ میں جدا جدا وسائیر وضع کرتے پھرنا اور اسی طرح اجتماعی زندگی کو واحد سلسلۂ اعمال کی حیثیت دینے کے بجائے

اس کے تقاضوں کو علیحدہ علیحدہ کر کے پیش نظر رکھنا اور ہر تقاضے کا حل یک طرفہ نگاہ سے کرنا۔ وہ لغزشیں ہیں جو ظلم کو کارفرما کرتی ہیں گرچاہے ظلم و باطل کے ظہور کی وجہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، واقعہ تو یہی ہے نا، کہ انسان کو حق و عدل کا تو صرف نام ہی مرغوب ہے ورنہ اس نام سے وہ ہر قسم کے باطل اور ہر قسم کے ظلم کو پسند کرتا ہے۔ کیا اس کو یہی مطلب نہیں ہے کہ نظام فطرت نے ظلم و باطل کی روک تھام اور حق و عدل کے تحفظ و بقا کے لیے کوئی قابل اعتماد اسباب نہیں رکھتا ؟ یہ اعتراض بجا ہوتا، اگر فطرت نے نظریات اور عملیات میں باطل اور ظلم کے در آنے کو روکنے کی کوئی صورت تجویز نہ کی ہوتی، لیکن درحقیقت اس نے جن کا اتنا قابل اعتماد سامان کیا ہے کہ اس سے متعارف ہو جانے کے بعد یہ اعتراض باقی نہیں رہتا۔ ہم جہاں انسان کے ذرائع علم کی کمزوریوں کی طرف اور عملی انضباط کے وسائل کی کوتاہیوں کی طرف بار بار اشارہ کرتے چلے آ رہے ہیں وہاں ہمارا فرض یہ بتانا بھی ہے کہ ان کمزوریوں اور کوتاہیوں کے ازالہ کے لیے فطرت کیا صورتیں مہیا کر سکی ہے۔ کیونکہ جب اجتماعیات انسانی میں اس کا سارا عمل انسانی شعور و ارادہ پر منحصر ہے تو لازم ہے کہ اسے کج روی سے روکنے کے ٹھوس وسائل مہیا کرے۔ ـــــ وہ وسائل کیا ہیں ؟ اس کا جواب ہم اپنے آئندہ مبحث "شاہراہ ارتقا" میں عرض کریں گے۔

اس بحث سے صرف یہ واضح کرنا مطلوب تھا کہ نظام ظلم و باطل اجتماعی زندگی کے لیے کبھی بھی نافع نہیں ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ انسانیت اس کے خلاف زور کرتی رہتی ہے اور دوسری طرف نظام حق و عدل اس کے لیے فطرتاً مفید ہے، اس وجہ سے وہ اپنے آپ کو اس کی طرف بڑھانے کے لیے انقلاب اور جنگ کی شاہراہ پر حرکت کرتی ہے۔ مشکل صرف یہ پیش آتی ہے کہ "نتائج بد" کے ظہور پر وہ یہ تو محسوس کر لیتی ہے کہ کسی مجموعہ افکار و ضوابط میں باطل اور ظلم کا دخل ہے مگر تعین سامنے اس کے محدود ذرائع علم پر طے نہیں کر سکتے کہ ٹھیک فلاں فلاں امور میں اتنا اتنا باطل اور ظلم دخیل ہے اور اتنا اتنا حق اور عدل کا عنصر باقی رہ گیا ہے۔ بس تاریکی میں وہ ایک طرف سے ٹھوکر کھاتی ہے تو دوسری طرف مڑ جاتی ہے، پھر ادھر سے جب پاؤں کانٹوں سے چھلنی ہوتے ہیں تو روتی چیختی تیسری طرف لپکتی ہے ـــــ مگر چراغ لے کر چلنے سے چڑتی ہے، کیونکہ "دزداں چراغ بکف" سے بہت خوفزدہ ہے، بہرحال یہ چراغ کسی طرح دور ہو جائے تو امر واقعہ یہ ہے کہ دیا، بتی، تیل سبھی کچھ فطرت نے فراہم کر رکھا ہے۔

فہرست کتب مکتبہ جماعت اسلامی

تفہیمات	مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش	پردہ	اسلام کیا ہے (انگریزی) / اسلامی حکومت کس طرح
دینیات (قسم اول)	״ ״ (حصہ دوم)	״ مجلد	جہاد فی سبیل اللہ / قائم ہوتی ہے
״ (״ دوم)	״ ״ (ہر سہ حصہ مجلد)	حقیقت توحید	اسلام اور جاہلیت / انسان کا معاشی مسئلہ
״ (انگریزی)	تجدید و احیائے دین	سلامتی کا راستہ	اسلام کا نظریہ سیاسی / اور اس کا اسلامی حل
مسئلہ جبر و قدر	روداد جماعت اسلامی (حصہ دوم)	نشان راہ	دستور جماعت اسلامی
خطبات (قسم دوم)	״ ״ (حصہ سوم)	نیا نظام تعلیم	ایک اہم استفتاء

(نوٹ :- جن کتابوں کے نام فہرست میں موجود نہیں ہیں ان کے متعلق سمجھیے کہ وہ اسٹاک میں ختم ہیں)

رسائل و مسائل

برکت بانٹنے کا فتنہ

سوال :- احادیث کا ترجمہ چھوٹے چھوٹے رسائل کی شکل میں "آسان حدیث یا انمول موتی" کے نام سے بھوپال سے شائع ہوتا ہے۔ اس کی ایک قسط میں فضیلت نبی کے عنوان سے یہ روایت درج ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب صبح کی نماز سے فارغ ہوجاتے تو مدینہ والوں کے خدمت گار اور غلام برتنوں میں پانی لے کر آتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا ہاتھ ایک ایک برتن کے پانی میں ڈالتے، حتیٰ کہ شدید سردی میں بھی، انکار نہ کرتے۔ اس کی تشریح میں یہ لکھا گیا ہے کہ بزرگ ہستیوں سے اس طریقہ سے برکت حاصل کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس معاملہ میں نبی اور ایک امتی بزرگ میں کوئی فرق نہیں ہے؟

جواب :- اس مضمون کی حدیث مسلم شریف وغیرہ میں موجود ہے، اس وجہ سے فی نفسہٖ واقعہ سے تو انکار نہیں ہوسکتا البتہ اس سے جو نتیجہ نکالا گیا ہے۔ اس کے بعض پہلو قابل غور ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ نبی اور ایک امتی میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ یعنی نبی معصوم ہوتا ہے اور اس کا صاحب فیض و برکت ہونا قطعی ہے پھر اس کا مقرب خدا ہونا خود اس کو بھی معلوم ہوتا ہے اور دوسرے اہل ایمان بھی اس کی اس حیثیت کو جانتے ہیں۔ لیکن کسی امتی کو یہ باتیں اولاً تو اس درجہ تک حاصل نہیں ہوتیں اور اگر کسی حد تک اس کو خدا کا تقرب حاصل بھی ہوتا ہے اور اس کے اثر سے وہ صاحب برکت بھی ہوتا ہے تو ہم اس کے مقرب خدا اور صاحب برکت ہونے کا صرف گمان کرسکتے ہیں، رہا یہ کہ فی الواقع وہ ایسا ہے یا نہیں، اس کی بابت نہ تو ہم کوئی قطعی علم رکھتے ہیں اور نہ کوئی بات یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ معلوم نہیں خدا کے ہاں اس کا درجہ کیا ہے اور اس کے اعمال مقبول ہیں یا مردود! چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب کسی کی نیکی اور تقویٰ کی تعریف میں یہ کہا گیا کہ فلاں ایسا اور ایسا ہے تو آپ نے فرمایا کہ اس طرح مت کہو، بلکہ یوں کہو کہ ہم نے اس کو ایسا اور ایسا پایا ہے۔ اس وجہ سے ہر عالم یا شیخ یا پیر کو ایک بت بنالینا جیسا کہ اس زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں، کوئی صحیح اور معقول صورت نہیں معلوم ہوتی۔

اور اس مسئلہ کا ایک دوسرا پہلو تو بہت زیادہ خطرناک ہے۔ عوام اگر حصول برکت کے لیے علما و مشائخ کے پاس ہجوم کرتے ہیں تو اس کو ان کی سادگی اور جہالت پر محمول کیا جاسکتا ہے اور ممکن ہے کہ ان کی سادگی اور جہالت ہی ان کے لیے اللہ کے یہاں بھی عذر بن سکے، لیکن جو حضرات کہ بے تکلف اپنے آپ کو مقرب خدا اور منبع خیر و برکت مان کر برکت تقسیم کرنا شروع کر دیتے ہیں اور بے دریغ اس جگہ بیٹھ جاتے ہیں جو صرف نبی اور کسی بشر بالجزم ہی کے لیے موزوں ہوسکتی ہے وہ تو اپنے ایمان کو سخت فتنہ میں ڈال دیتے ہیں اور اس طرح کے اشخاص سے ہمیں بدگمان کردینے کے لیے ان کی یہ جسارت کافی ہے کہ وہ خود اپنے صاحب برکت ہونے کا عملی دعویٰ رکھتے ہیں۔ آج ہر مدرسہ اور خانقاہ میں برکت حاصل کرنے اور برکت تقسیم کرنے کا بازار گرم ہے اور برکت تقسیم کرنے والے حضرات اس

طرح کی احادیث کو اپنے لیے دلیل ٹھیراتے ہیں کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے خدمتگاروں اور غلاموں کو برکت بخشتے تھے تو آخر یہی حق انہیں اپنے مریدوں اور عقیدت کیشوں کے لیے کیوں نہ حاصل ہو؟ ہمارے نزدیک تو اس طرح کے لوگ سخت فتنہ اور کبر نفس میں مبتلا ہیں۔ اور کسی محتاط اور خدا ترس آدمی کے لیے ہم یہ بات جائز نہیں سمجھتے کہ وہ اپنے ایمان کو اس طرح کی آزمائش میں ڈالے۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے حالات کا جہاں تک ہمیں علم ہے، باوجود تمام خصائص تقدس کے حامل ہونے کے "درشن دینے" اور "برکت بانٹنے" سے سخت احتراز کرتے تھے، حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جس طرز عمل سے آج ہمارے مشائخ سند پکڑتے ہیں اس کو ان حضرات نے برأی العین مشاہدہ کیا تھا، اور قرآن ان کی نیکی اور تقویٰ پر گواہ تھا۔

"اجماع" اور "سواد اعظم" کی غلط تعبیریں

سوال: ایک صاحب یہ حدیث بیان کر کے کہ "لا تجتمع امتی علی الضلالۃ" فرماتے ہیں کہ اجماع امت غلط بات پر نہیں ہو سکتا۔ پس جب علمائے ہند کی اکثریت جمعیۃ العلماء میں جذب ہو کر یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ اس وقت کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل عین اسلام کے مطابق ہے تو یہ بھی غلط نہیں ہو سکتا۔ یہ صاحب اجماع امت سے مراد علمائے امت کا ہم خیال ہونا لیتے ہیں۔ براہ کرم اس حدیث شریف کے مفہوم اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

جواب: "ان اللہ لا یجمع امتی علی الضلالۃ" والی حدیث اور اسی طرح کی دوسری حدیثیں جو اتباع سواد اعظم یا جماعت سے متعلق وارد ہیں مسلم لیگ اور کانگریس کے حامیوں کے درمیان ایک عرصے سے نہایت بے دردانہ استعمال ہو رہی ہیں۔ اور ان میں سے کسی خدا کے بندے کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ ان احادیث کے موقع و محل اور ان کے صحیح مفہوم پر غور کرلے۔ مسلم لیگ کے حامی کہتے ہیں کہ جب نبی کریمؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی امت کو ضلالت پر اکٹھا نہیں کرے گا، اور مسلمانوں کی اکثریت مسلم لیگ کے لیڈر اور مسلم لیگ کے نظریہ پر متفق ہو گئی ہے تو لازماً یہی راستہ ہدایت کا راستہ ہے اور جو مسلمان اس سے الگ ہیں وہ مفارق جماعت کے حکم میں داخل اور من شذ شذ فی النار کی وعید کے مستحق ہیں۔ اور کانگریسی حضرات کا استدلال وہی ہے جس کا آپ نے حوالہ دیا ہے۔ حالانکہ اسلام میں نہ اکثریت کا کسی بات پر متفق ہو جانا اس کے حق ہونے کی دلیل ہے، نہ اکثریت کا نام سواد اعظم ہے، نہ ہر بھیڑ جماعت کے حکم میں داخل ہے، اور نہ کسی مقام کے مولویوں کی کسی جماعت کا کسی رائے کو اختیار کر لینا اجماع ہے۔ ان ساری غلط فہمیوں سے تعرض کرنے کا یہ موقع نہیں ہے، البتہ مذکورہ بالا حدیث کا مطلب ہم بیان کیے دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا حدیث ترمذی میں ان الفاظ کے ساتھ وارد ہے "ان اللہ لا یجمع امتی او قال امۃ محمد علی ضلالۃ ویداللہ علی الجماعۃ ومن شذ شذ فی النار"۔ (اللہ تعالیٰ میری امت کو یا یوں فرمایا کہ محمدؐ کی امت کو ضلالت پر جمع نہیں کرے گا اور اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے اور جو جماعت سے الگ ہوا وہ جہنم میں پڑا۔) اس کا مطلب یہ ہے کہ اس امت پر کوئی دور ایسا نہیں آئے گا کہ یہ پوری امت گمراہی میں پڑ جائے، بلکہ اس میں ایک گروہ، خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا ہو، ہمیشہ حق پر قائم رہے گا اور وہی جماعت ہے اور اللہ کا ہاتھ اس جماعت پر ہے اور جو اس جماعت سے الگ ہوا وہ جہنم میں گرا۔ اس مطلب کی تائید اس حدیث نبوی سے ہوتی ہے جو عبداللہ ابن عمرؓ سے بایں الفاظ مروی ہے:-

ان بنی اسرائیل تفرقت علی ثنتین وسبعین ملۃ وتفترق امتی علی ثلث وسبعین ملۃ کلھم فی النار الا ملۃ واحدۃ۔ قالوا من ھی یا رسول اللہ؟ قال ما انا علیہ واصحابی!

بنی اسرائیل ۷۲ فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی جو سب کے سب جہنم میں پڑ جائیں گے، بجز ایک کے۔ لوگوں نے پوچھا یہ کون لوگ ہوں گے یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا جو میرے اور میرے اصحاب کے طریقہ پر ہوں گے۔

احمد اور ابو داؤد کے یہاں یہی روایت کسی قدر مختلف الفاظ میں ہے اور ان میں اس بات کی تصریح ہے کہ یہی فرقہ جو آپ کے اور آپ کے صحابہ کے طریق پر ہوگا، جماعت ہے اور اسی کے اوپر اللہ کی رحمت کا ہاتھ ہے۔ عن معاویۃ ثنتان وسبعون فی النار وواحدۃ فی الجنۃ، وھی الجماعۃ (معاویہؓ سے روایت ہے کہ بہتر فرقے جہنم میں ہوں گے، ایک جنت میں ہوگا اور وہی جماعت ہے)۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک زمانہ اس امت پر ایسا آئے گا جبکہ اس کے بڑے حصہ میں ضلالت کا اثر اسی طرح سرایت کر جائے گا جس طرح باؤلے کتے کے کاٹنے سے اس کا زہر آدمی کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا ہے صرف تھوڑے لوگ بچے رہیں گے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے طریق پر ہوں گے، اور وہی لوگ جماعت کے حکم میں ہوں گے۔ بعینہٖ اسی مضمون کی ایک حدیث اور بھی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:-

لا تزال طائفۃ من امتی علی الحق ...... الخ

میری امت میں ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا اور جو لوگ انھیں چھوڑ دیں گے، ان کو کچھ ضرر نہ پہنچا سکیں گے۔

ان احادیث کی روشنی میں زیر بحث حدیث کا مطلب یہ نکلا کہ یہ پوری امت کبھی گمراہ نہ ہوگی، بلکہ ایک جماعت خواہ وہ کتنی ہی مختصر ہو، حق پر قائم رہے گی اور وہی جماعت ناجی ہے، اسی کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہے، بقیہ سب جہنم میں پڑیں گے۔ ان احادیث سے یہ امر بھی بالکل واضح ہے کہ یہ گروہ نہ کثرت میں ہوگا، نہ اپنی کثرت کو اپنے برحق ہونے کی دلیل ٹھہرائے گا، بلکہ اس امت کے ۷۳ فرقوں میں سے ایک ہوگا اور اس عمورۂ دنیا میں ان کی حیثیت اجنبی اور بیگانہ لوگوں کی ہوگی، جیسا کہ فرمایا ہے "بدء الاسلام غریبا وسیعود کما بدء، فطوبی للغرباء ھم الذین یصلحون ما افسد الناس بعدی من سنتی" (اسلام غربت میں شروع ہوا اور اسی غربت میں پھر مبتلا ہو گا، پس مبارک باد ہے ان "اجنبیوں" کے لیے جو دوسروں کے بگاڑے ہوئے دین کی اصلاح کریں گے)

پس جو جماعت محض اپنی کثرت تعداد کی بنا پر اپنے آپ کو وہ جماعت قرار دے رہی ہے جس پر اللہ کا ہاتھ ہے اور جس سے علیحدہ ہونا جہنم میں داخل ہونے کے مرادف ہے، اس کے لیے تو اس حدیث میں امید کی کوئی کرن نہیں، کیونکہ اس حدیث میں اس جماعت کی دو علامتیں نمایاں طریقہ پر بیان کردی گئی ہیں، ایک تو یہ کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے طریق پر ہوگی، دوسری یہ کہ نہایت اقلیت میں ہوگی۔

رہے کانگریسی حضرات، قرآن کا استدلال بھی بالکل مہمل ہے۔ اول تو اس حدیث کا تعلق اجماع سے بالکل ہے ہی نہیں بلکہ اس کا مطلب وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کردیا ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی مقام کے چند عالموں کا کسی راہ کو اختیار کرلینا وہ اجماع نہیں ہے جو شریعت میں معتبر ہے۔ شریعت میں معتبر اجماع وہ ہے جس پر مسلمانوں کا امیر اور اس کے ارباب حل وعقد مجتمع

جائیں۔ یہی اجماع سند ہے، یہی کتاب و سنت سے ثابت ہے، یہی طریقہ سلف صالحین سے معلوم ہے اور یہی موافق عقل ہے۔ رہی مولویوں کی کثرت، وہ اولاً تو کانگریس کی تائید میں ہے نہیں، اور اگر ہو بھی تو مولویوں کی کوئی مقدار بھی کسی بات کو شرعی اجماع کی حیثیت نہیں دے سکتی جب تک اجماع کے شرائط موجود نہ ہوں۔

ہاں زیر بحث حدیث سے متعلق ایک بات اور یاد رکھیے کہ اس امت میں ایک گروہ کو، خواہ وہ کتنی ہی قلت میں ہو، حق پر قائم رکھنا مصلحت دینی کے لیے ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم فرما دی ہے، اس وجہ سے دو باتیں ضروری ہوئیں، ایک یہ کہ قرآن ہمیشہ کے لیے ہر طرح کی تغییر و تبدیل سے محفوظ کر دیا جائے، دوسری یہ کہ خلائق پر حجت تمام کرنے کے لیے اس امت کے اندر ایک جماعت حق پر ہمیشہ قائم رہے۔ اس بات کی ضمانت ہے کہ گروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے طریق پر ہو اور اپنے قول و فعل کو اس کسوٹی پر جانچنے کے لیے تیار رہے۔

ارتداد اور تبلیغ کفر کو روکنے میں جبر کا استعمال

سوال:- اسلام میں قتل مرتد کا حکم کس آیت قرآنی سے استنباط کیا گیا ہے؟ مولانا مودودی صاحب نے ایک ہندو کے سوال کے جواب میں یہ لکھا ہے کہ "ہم کسی مسلمان کو اسلامی ریاست میں رہتے ہوئے اپنا دین تبدیل کرنے کی اجازت نہ دیں گے"۔ اس جواب سے دین اسلام کے منوانے میں جبر کا جواز نکلتا ہے۔ نیز غیر مسلم اقوام کے لیے اسلام پر حملہ کرنے کے لیے ایک مضبوط مورچہ بن گئی ہے۔ آخر ایسا جبری ایمان کس کام کا؟ نیز مسلمان ریاست کے حکام کے پاس وہ کونسی روشن دلیل ہو سکتی ہے جس کی بنا پر وہ مرتد کو قتل کریں گے؟

بخلاف اس کے انگریزی راج میں ہر مذہب کے پیرووں کو تبلیغ کی آزادی ہے اور ایک قادیانی تک ۱۹۰۸ء اور ۱۹۳۴ء کے سرکاری اعلان کے تحت عین لندن میں اپنے مسیح موعود یا بروزی نبی کی دعوت پھیلا سکتا ہے۔ اسی طرح ایک مومن دین اسلام کی تبلیغ انگریزی شاہی خاندان تک میں کر سکتا ہے اور ان دونوں کی جان کی حفاظت کرنا بھی گورنمنٹ پر واجب ہو گی۔ کیا اسلامی ریاست میں بھی ایک قادیانی اپنے مذہب کی تبلیغ کر سکے گا اور اس کی جان کی حفاظت اسلامی حکومت کرے گی؟

جواب:- قتل مرتد کے حکم پر لوگوں کو جو اعتراض ہے وہ درحقیقت نتیجہ ہے اس اختلاف کا جو ہم میں اور دوسروں میں نفس دین کے بارے میں ہے۔ ہمارے ہاں دین زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ عبادت، سیاست، معیشت، کوئی چیز دین سے باہر نہیں ہے اور دوسروں کے یہاں دین محض پرائیویٹ زندگی تک محدود ہے جو چند رسموں اور چند عبادتوں پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے دوسروں کو اس بات میں کوئی زحمت نہیں ہے کہ جب چاہے کوئی شخص ان کے دین سے باہر نکل جائے، بشرطیکہ ان کے قانون سیاسی و اجتماعی (یعنی ریاستی دین) کا وفادار رہے۔ اسی طرح اس میں بھی ان کے لیے کوئی زحمت نہیں ہے کہ باہر سے آکر جو شخص چاہے ان کے ہاں اپنے دین کی اشاعت کرے، بشرطیکہ اس کا دین بھی انہی کے دین کی طرح پرائیویٹ زندگی تک محدود ہو۔ وہاں تو اجتماعی زندگی ریاستی قانون (یعنی دین ریاست) کے ماتحت ہے جس نے مذہبی دین خدا پرستی کو شکست دے کر اور اسے انفرادی زندگی کے دائرے میں محدود کر کے اس کی جگہ لے لی ہے اور اسی

وجہ سے اب سارا زور اس کی وفاداری پر صرف کیا جاتا ہے اور اسے گوارا نہیں کیا جاتا کہ کوئی شخص اس ریاستی دین یعنی نظامِ قانون کا قلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکے یا اس کے خلاف بغاوت برپا کرنے اور کسی دوسرے نظام کے قائم کرنے کے لیے تبلیغ کرے۔

ہمارے ہاں شخصی دین اور ریاستی دین الگ الگ نہیں ہے۔ ایک ہی دین ہے جس کا اتباع انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں میں مطلوب ہے۔ پس ہمارے ہاں اگر کوئی شخص دین سے نکلنے کا اعلان کرتا ہے تو وہ صرف اپنی شخصی زندگی ہی نہیں بدلتا بلکہ ہمارے ریاستی نظام سے بغاوت کرتا ہے اور ملک میں فساد برپا کرتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص باہر سے آکر اپنے دین کی تبلیغ کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہمارے اندر آکر ہمارے نظامِ اجتماعی کے خلاف ہمارے لوگوں کو بغاوت کی دعوت دیتا ہے۔ ان چیزوں کو دنیا کی کوئی ریاست گوارا نہیں کر سکتی۔ انگریز جن کی رواداری کا آپ نے حوالہ دیا ہے، کیا اس بات کو گوارا کرتے ہیں کہ ان کے ملک میں جا کر آپ ان کے نظام کو الٹنے کی دعوت لے کے کھڑے ہوں؟ بے شبہ انھیں اس بات پر کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ ایک قادیانی مشن ان کے ملک میں جا کر اپنے غیر سیاسی دین کی دعوت دے، لیکن کیا وہ ایک مسلم مشن کو بھی گوارا کر سکتے ہیں جو وہاں جا کر یہ دعوت دے کہ بادشاہِ حقیقی صرف خدا ہے اور اسی کا قانون ماننا چاہیے اور اس کے قانون کے سوا سارے قانون باطل ہیں اور جو لوگ اللہ کے قانون کے سوا کسی اور قانون کی برضا و رغبت اطاعت کرتے ہیں وہ مشرک ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ ایسی رواداری کی ان سے توقع نہیں کی جا سکتی۔

جبراً مسلمان بنانے کا بھی یہاں سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قانون میں اتمامِ حجت اور وضاحتِ حق کے بعد کسی شخص کو ضلالت پر قائم رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ چنانچہ جن قوموں میں خدا نے کسی نبی کو بھیجا اور نبی نے پورے طور پر ان پر حق واضح کر دیا، ان کے منکرین کو خدا نے ہلاک کر دیا، صرف مومنین کو باقی رکھا اور ان کو یہ حکم دیا کہ وہ خدا کی زمین پر خدا کا قانون جاری کریں اور جن لوگوں نے نبی کے دین کو قبول نہیں کیا ہے انھیں اپنی اطاعت پر مجبور کریں، تاکہ اگر ان میں کچھ صلاحیت ہو تو وہ ان کے ماتحت رہ کر دینِ حق کو قبول کریں، ورنہ کم از کم خدا کی زمین ان کے فساد سے مامون رہے۔ یہ الاؤنس کہ ان کو جینے کا موقع مل گیا، اس وجہ سے دیا جاتا ہے کہ نبی کی بعثت ان کی طرف براہِ راست نہیں ہوئی، بلکہ بالواسطہ ہوئی ہے، جس طرح کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں غیر بنی اسمٰعیل تھے جن کو ذمی بنا لیا گیا۔ باقی رہے وہ لوگ جن کی طرف نبی کی بعثت براہِ راست ہوتی ہے، چونکہ ان پر اتمامِ حجت ممکن حد تک ہو چکتا ہے اس وجہ سے ان کے لیے صرف دو صورتیں باقی رہ جاتی ہیں، یا تو اسلام لائیں یا تلوار قبول کریں۔ چنانچہ بنی اسمٰعیل کے منکرین کے ساتھ یہی ہوا۔

اس اصول کے ماتحت اب ان لوگوں کے مسئلہ پر غور کیجیے جو مسلمانوں کے اندر سے خدا کے قانون سے بغاوت کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ ان لوگوں میں داخل نہیں ہو سکتے جن کی طرف نبی کی بعثت براہِ راست نہیں ہوئی ہے کہ ذمیوں میں شمار ہو سکیں، لازماً ان لوگوں میں شمار ہوں گے جن پر حق واضح ہو چکا ہے یا جن کے لیے وضاحتِ حق کے لیے تمام وسائل موجود ہیں، کیونکہ وہ مسلمان ہو کر مسلمانوں کے اندر رہ چکے ہیں۔ اب اگر وہ خدا کے قانون سے بغاوت کرتے ہیں تو آخر خدا کا قانون ان کو کس غرض کے لیے جینے کی مہلت دے گا؟ اب ان کی ہدایت کے لیے کس چیز کا انتظار باقی ہے؟ ان لوگوں کو سورہ مائدہ کی آیت

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ۚ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا ۖ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ" کی رو سے امام قتل کر دینے کا مجاز ہے۔

نظامِ حق کے نفاذ میں تلوار کا حصہ

سوال:۔ میں نے آپ کی کتاب "جہاد فی سبیل اللہ" پڑھی۔ اس میں آپ نے لکھا ہے کہ "تلوار کے زور سے پرانے ظالمانہ نظامِ زندگی کو بدل دینا اور نیا عادلانہ نظام مرتب کرنا بھی جہاد ہے"۔ اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ قرآن کریم میں جس جہاد پر زور دیا گیا ہے وہ تو یہ ہے کہ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (فرقان) یعنی کافروں کی بات نہ مان اور اس قرآن کے ذریعے کفار کے ساتھ بہت بڑا جہاد کر۔

ورنہ کیا نعوذ باللہ قرآن مجید میں کوئی ذاتی جوہر نہیں ہے کہ لوگوں کے دل تلوار چلائے بغیر فتح نہ کیے جا سکیں؟ اسلام تو مذہب کے متعلق آزادی دیتا ہے کہ "لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۖ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ" (بقرہ) یعنی دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں ہونا چاہیے"۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو جبر سے نہیں پھیلایا اور تلوار صرف مدافعت کے لیے اٹھائی نہ کہ تبلیغ کے لیے، کیونکہ کفار کی طرف سے جنگ کا آغاز ہو گیا تھا۔ دینی جنگ کرنے کی اجازت صرف ان لوگوں کے مقابلہ میں ہے جو دین کے نام سے مسلمانوں سے جنگ کریں، مگر اس میں بھی زیادتی کی اجازت نہیں۔ "وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۚ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ"۔ (اور دین کی لڑائی ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر یہ خیال رکھو کہ زیادتی نہ کرو، بےشک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا آپ کی رائے میں اس وقت ہندوستان کا نظامِ زندگی ظالمانہ ہے؟ اور جن شرائط کے ماتحت اسلام نے جہاد بالسیف کو فرض قرار دیا ہے، وہ ہندوستان میں پیدا ہو گئے ہیں یا نہیں؟

جواب:۔ آپ کا خط غلطیوں کا مجموعہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے قرآن شریف پر بحیثیت مجموعی نہیں غور کیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جتنی آیتیں بھی آپ نے پیش کی ہیں ان میں سے کسی کا بھی صحیح محل آپ نے نہیں سمجھا ہے۔ آیت "فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا" کا تعلق ان کفار سے ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حسی معجزات کا مطالبہ کرتے تھے۔ ان کی نسبت فرمایا گیا ہے کہ ان کافروں کی بات پر دھیان نہ کرو اور ان کے ساتھ اس قرآن کے ذریعہ جہاد کرو۔ اگر ان کا کفر ٹوٹنا ہے تو اسی قرآن سے ٹوٹے گا۔ ورنہ معجزات سے ان کو کوئی نفع نہ پہنچے گا۔ ہاں تم اپنی طرف سے اس قرآن کی تبلیغ و تفہیم میں کوئی کسر نہ چھوڑو۔

جہاد کے واجب کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن مجید میں کوئی ذاتی جوہر نہیں ہے۔ قرآن مجید میں لاکھ جوہر سہی لیکن وہاں یہ جوہر کیا کام دے سکتا ہے جہاں سینوں میں دلوں کی جگہ پتھر ہوں۔ جن قلوب میں کچھ صلاحیت ہوتی ہے قرآن ان کو تو جیتا ہے

لیکن جو لوگ اپنے کان بہرے کر لیتے ہیں اور اپنی آنکھیں اندھی کر لیتے ہیں ان کا علاج کیا ہے؟ سورج میں ہزار جوہر بھی لیکن اگر کوئی شخص اپنی آنکھیں نہ کھولے تو سورج کیا کرے گا بھٹکتے ایسے ہیں جن کو پورا یقین تھا کہ قرآن حق ہے لیکن اس کے باوجود انھوں نے محض اپنے غرور اور ظلم کی وجہ سے اس کا انکار کیا۔ ایسے لوگوں کا علاج کیا ہے؟ اگر ایسے لوگوں کو یونہی چھوڑ دیا جائے اور بہ جبران کو عدل پر قائم نہ کیا جائے تو یہ دنیا کو ظلم و فساد سے بھر دیں گے۔ ایسے ہی سرکش اور شریر لوگوں کے لیے ضرورت بھی ہوا کہ قرآن کے ساتھ تلوار بھی ہو تا کہ قرآن جو نظام عدل دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے اس میں اہل فساد مزاحم نہ ہو سکیں۔ قرآن کے ساتھ تلوار کی اس ضرورت کو سورہ حدید میں پوری طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ:-

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ (حدید ۲۵)

اور ہم نے بھیجے اپنے انبیا کھلی ہوئی دلیلوں کے ساتھ اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور میزان تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں اور اتارا ہم نے لوہا اس میں سخت قوت ہے اور دوسری منفعتیں ہیں لوگوں کے لیے اور تاکہ اللہ جان لے ان لوگوں کو جو اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں غیب میں رہ کر، بیشک اللہ قوی اور غالب ہے۔

آیت "لا اکراہ فی الدین" کا مطلب بھی آپ نے نہیں سمجھا ہے۔ اس آیت میں جبر فطری کا انکار ہے، یعنی اللہ تعالے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ کسی کے دل میں ہدایت ٹھونس دے، جیسا کہ دوسرے مواقع پر فرمایا ہے:-

وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰهَا (۲۱ - ۱۵) اگر ہم چاہتے تو ہم ہر نفس کو اس کی ہدایت دیدیتے۔

لیکن یہ جبر خدا کی سنت نہیں ہے، بلکہ ہر ایک کے سامنے اس نے ہدایت و ضلالت کو واضح کر دیا ہے اور جو شخص ہدایت کا طالب ہوتا ہے اس کے لیے ہدایت کی راہ کھولی جاتی ہے اور جو شخص ضلالت کی راہ پر چلنا چاہتا ہے اس کو ضلالت کی راہ پر چلنے کی مہلت ملتی ہے۔ لیکن اس اختیار و آزادی کا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ انسان ہدایت و ضلالت کے معاملہ میں بالکل چھوٹا ہے۔ نہ آخرت میں خدا کو اس سے کوئی بحث ہوگی اور نہ دنیا میں کسی کو حق حاصل ہے کہ اس کے مفسدانہ اعمال و اخلاق سے کوئی تعرض کرے۔ جو لوگ دینی آزادی کا یہ مفہوم سمجھے ہیں نہایت غلط سمجھے ہیں۔

پیغمبر دین کے معاملہ میں بلا شبہ جبر نہیں کرتا اور یہی وجہ ہے کہ وہ مبعوث ہوتا ہے تو یہ نہیں کرتا کہ فوراً ایک جتھا بنا کر زبردستی لوگوں کو مسلمان بنانا شروع کر دے، بلکہ وہ ایک طویل مدت تک اپنی پوری قوت سے اس حق کو واضح کرتا ہے جس کو وہ لے کر آتا ہے۔ بہترین اخلاق پیش کرتا ہے، بہترین عمل دکھاتا ہے، بہترین معجزے دکھاتا ہے اور اتمام حجت اور قطع عذر کی کوئی شکل ایسی باقی نہیں رہ جاتی جس کو وہ اختیار نہ کرتا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم کے اندر کے وہ تمام افراد جن کے اخلاق میں کچھ زندگی کی رمق باقی ہوتی ہے اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ صرف وہ لوگ اس باطل نظام سے چمٹے رہ جاتے ہیں جن کا اس باطل سے مفاد وابستہ ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے پیغمبر کا اعلان یہ ہوتا ہے کہ وہ یا تو اس نظام حق کو قبول کر لیں جس کی وہ دعوت دے رہا ہے، ورنہ تلوار کو قبول کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی کیا۔ ایک طویل مدت تک بہتر سے بہتر طریق پر آپ نے اپنی دعوت و تبلیغ جاری

رکھی۔ جب تک آپ کے ساتھ کوئی جمعیت نہیں تھی، آپ اور آپ کے تھوڑے سے صحابہ کفار کے ہاتھوں ہر طرح کے مظالم جھیلتے رہے۔ مگر جب آپ کے ساتھ کچھ جمعیت ہو گئی، آپ نے کفار کے حملوں کو روکا اور تلوار کا جواب تلوار سے دیا۔ اس بیچ میں اگر آپ کو ضرورت محسوس ہوئی تو آپ نے کفار سے صلح کے معاہدے بھی کیے اور اگر ضرورت ہوئی تو جنگ بھی کی۔ آخر کار قرآن کی سورہ براءۃ میں یہ فرمان نازل ہو گیا کہ کفار کی جن جماعتوں نے اپنے معاہدے توڑے ہیں ان کے معاہدوں کے خاتمہ کا اعلان کر دیا جائے اور اشہر حرم کے ختم ہونے پر وہ جہاں پائے جائیں قتل کیے جائیں، اور جب تک وہ توبہ نہ کریں، نماز نہ قائم کریں، زکوٰۃ نہ دیں اس وقت تک ان کو امان نہ دی جائے۔

فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ (۵۔ توبہ)

پھر جب گزر جائیں یہ ماہ ہائے حرام تو قتل کرو ان مشرکوں کو جہاں پاؤ اور ان کو پکڑو اور گھیرو اور ان کی تاک میں بیٹھو ہر کمین گاہ میں، پھر اگر وہ توبہ کریں اور قائم کریں نماز اور دیا کریں زکوٰۃ تو چھوڑ دو ان کا راستہ۔

اور جن جماعتوں نے معاہدے نہیں توڑے ہیں ان کے معاہدے ان کی مدت کے بعد ختم کر دیے جائیں اور ان سے جنگ کی جائے:۔

إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ (۴۔ توبہ)

مگر جن مشرکوں سے تم نے عہد کر رکھا تھا، پھر انھوں نے تمھارے ساتھ ذرا بھی نہیں کی اور نہ مدد کی تمھارے مقابلہ میں کسی کی تو ان سے پورے کرو ان کے عہد ان کی مدت تک۔

اسی طرح مشرکین کے علاوہ اہل کتاب کے متعلق بھی آخری اعلان یہ کر دیا گیا کہ ان سے اس وقت تک جنگ کی جائے کہ وہ جزیہ دینے کی ذلت پر راضی ہوں:۔

وَقَاتِلُوا الَّذِينَ .... مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ ○

لڑو ان لوگوں سے .... وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو کتاب دی گئی ہے، یہاں تک کہ جزیہ دیں اپنے ہاتھ سے ذلیل ہو کر۔

ان صریح اعلانات کے ہوتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ اسلام نے صرف مدافعت کے طور پر تلوار اٹھانے کی اجازت دی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بلاشبہ صورت حالات یہی ہے کہ ہر جنگ کے اسباب کفار ہی نے مہیا کیے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اہل مکہ اگر نزول براءۃ کے بعد بھی کوئی معاہدہ کرنا چاہتے تو ان سے معاہدہ ہو سکتا یا اہل کتاب اگر فتنے نہ اٹھاتے تو ان سے جنگ اور جزیہ کی نوبت نہ آتی۔ کفر اور کافرانہ نظام زندگی کا وجود خود ایک مستقل سبب جہاد ہے اور جب تک یہ دنیا میں باقی ہیں اس وقت تک اگر شرائط و حالات بہم ہوں تو مسلمانوں کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ چین کی نیند سوئیں۔ چنانچہ حضرات خلفائے راشدین نے جنھوں نے قرآن اور پیغمبر کی تعلیم کو سب سے بہتر سمجھا تھا، اسی پر عمل کیا اور اپنے اپنے زمانوں میں برابر جہاد بالسیف کو دنیا میں عدل و قسط قائم کرنے کے لیے جاری رکھا، البتہ

مشرکین عرب کے علاوہ دوسری قوموں کے لیے جو اہل کتاب میں یا اہل کتاب کے حکم میں داخل تھیں اسلام اور تلوار کے سوا ایک تیسری راہ جزیہ کی ادائیگی کے ساتھ اطاعت کی بھی کھلی رکھی گئی تھی۔ اس لیے صحابہ نے ان قوموں سے جزیہ لے کر ان کو مطیع بنالیا تاکہ نبی کی بعثت ان کی طرف براہ راست نہ ہونے کی وجہ سے انھیں جو الاؤنس ملنا چاہیے وہ بھی مل جائے اور دنیا ان کے فساد سے محفوظ بھی ہوجائے۔ باقی وہ جنگ کرتے یا نہ کرتے، خلفائے راشدین ازروئے قرآن مامور تھے کہ ان سے جنگ کریں اور ان کے ہاتھوں سے طاقت چھین کر ان کو مغلوب و مطیع کرلیں۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام نے صرف مدافعت کے لیے تلوار اٹھائی وہ درحقیقت صحابہ کے غزوات کو ملوکانہ جنگوں کی حیثیت دیتے ہیں، حالانکہ یہ قرآن کے احکام کا صریح انکار اور حضرات خلفائے راشدین پر سخت ترین طعن ہے۔ یہ تمام غزوات قیام قسط کے لیے تھے جس پر یہ امت مامور ہے۔

بقرہ کی آیت "وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ" کا مطلب بھی آپ نے نہیں سمجھا ہے۔ یہ آیت اور اس کے بعد کی آیات ان مسلمانوں کے شبہات کو دور کر رہی ہیں جن پر اشہر حرم اور بلد حرام کا احترام اس قدر غالب تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ان مہینوں اور اس مقام میں کفار حملہ بھی کردیں تو ان کا دفاع نہیں کرنا چاہیے۔ قرآن نے ان کو بتایا کہ جو لوگ تم سے اشہر حرم اور بلد حرام میں لڑیں ان سے لڑو اور یہاں تک لڑو کہ "لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ" یعنی فتنہ (Persecution) کلیۃً ختم ہوجائے اور خدا کی زمین پر صرف خدا کا دین جاری و نافذ ہوجائے۔ اور اشہر حرم میں جنگ کی اس اجازت کی وجہ یہ بتائی کہ یہ تو درحقیقت اشہر حرم اور بلد حرام کی بے حرمتی کا قصاص ہے۔ انھوں نے تمھیں اس مقدس سرزمین اور ان مقدس مہینوں کے امان سے محروم کیا ہے۔ اس لیے تمھیں پورا حق ہے کہ تم بھی ان کے امان سے ان کو محروم کردو۔ البتہ اگر وہ ان مہینوں اور اس شہر میں تم پر حملہ نہ کریں تو تم اپنی طرف سے ان کی حرمت برباد کرنے کے لیے پہل نہ کرو۔

سوال کے دوسرے جز کے سلسلہ میں۔ سمجھ لیجیے کہ ہندوستان کا نظام زندگی بالکل کافرانہ اور ظالمانہ ہے لیکن وہ شرائط یہاں ابھی پورے نہیں ہیں جن کے ماتحت اسلام نے جہاد بالسیف کی اجازت دی ہے۔ جہاد بالسیف کے لیے دو شرطیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ وہ "باختیار" امیر کی قیادت میں ہو۔ کسی دوسرے نظام قاہر و مسلط کے اندر رہتے ہوئے جہاں کسی باختیار امیر کا وجود ناممکن ہے، قتال کرنا بدامنی اور فساد ہے جو جائز نہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قتال کا اعلان ہجرت کے بعد فرمایا۔ دوسرے یہ کہ جو لوگ جہاد بالسیف کے لیے اٹھیں وہ خود شائبۂ فساد و ظلم سے پاک ہوچکے ہوں کیونکہ جہاد زمین کے فساد کو مٹانے کے لیے ہے اور کسی ایسی جماعت کا جہاد کے لیے اٹھنا بالکل مہمل بات ہے جو خود فساد میں مبتلا ہو۔ اس طرح کی کوئی جماعت اور کوئی باختیار امیر چونکہ ابھی ہندوستان میں موجود نہیں ہے اس وجہ سے یہاں جہاد بالسیف روا نہیں۔

ہندوستان میں قضاء شرعی کا قضیہ

سوال:- "اہم استفسار" کو دیکھ لینے کے بعد "حقوق الزوجین" کی بعض عبارتیں بہت کھٹک رہی ہیں۔ اسی سلسلہ میں توضیح مدعا کی ضرورت ہے۔ مثلاً آپ نے لکھا ہے کہ:-

"ہندوستانی مسلمانوں کو اس میں تہذیبی خود اختیاری حاصل ہو جس کے تحت مسلمان اپنے محاکم شرعیہ قائم کرنے کے مجاز ہوں۔" (حقوق الزوجین ص۶۳)

یہ مطلوب طاغوتی نظام ہی کی نوازش سے حاصل ہوگا نا؟ اور یہ محاکم اپنے احکام کے اجرا کے لیے طاقت بھی تو طاغوت ہی سے لیں گے۔ پھر کیا اس پر اسلام مطمئن ہو سکتا ہے؟

اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ:۔

"اگر یہ چیز بھی حاصل نہ ہو تو "بر سبیل تنزل" اتنا ہی سہی، اور یہ بھی انتہائی مجبوری کی حالت میں آخری صورت ہو کہ مذہب مالکی کے مطابق ہر ضلع میں تین مسلمانوں کی ایک پنچایت مقرر کی جائے۔" (ایضاً ص۶۳ و ص۶۴)

یہ پنچایت کمیٹی جو نظام باطل کے اذن و اجازت سے اور باطل کے زیر سایہ قائم ہو گی، کیا حق تعالیٰ کو بھی منظور ہو گی؟ دراصل یہ لفظ "تنزل" اپنے مفہوم سمیت ایک جاہلی اصطلاح ہے۔ تنزل ہی کرتے کرتے مسلمان کفر کی سرحد میں داخل ہو کر بھی کثر مسلمان بنے ہوئے ہیں۔ پھر آگے یہ الفاظ نظر آتے ہیں:۔

"حکومت متسلط پر دباؤ ڈال کر اس سے پنچایتی نظام کو تسلیم کرا لیا جائے۔" (ایضاً ص۶۴)

اللہ اکبر! سارے عالم سے طاغوت کو بے دخل کرنے والا "مسلم" نظام پنچایتی پر قانع ہو جائے اور ننگ بر جراحت یہ کہ اس نظام کا قیام بھی طاغوت کی منظوری کا محتاج ہو! "حکومت متسلط پر دباؤ" بھی کیا وہ مسلمان ڈالیں گے جو اس طاغوتی نظام پہ بالکل راضی ہیں اور اسلام کا جوا اتارنے کی فکر میں ہیں۔ پھر دباؤ ڈالنے کا ہی عزم ہے تو آدھے پونے اسلام کی منظوری تک کیوں محدود ہے؟ کیوں نہیں کامل اسلام کے کامل غلبہ کی کوشش کا مشورہ دیا گیا؟

ایسے ہی اور بہت سے مقامات نظر سے گزرے ہیں جو اہم استفتا کے مباحث کی ضد ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:۔ آپ نے جن جذبات دینی کے ماتحت گرامی نامہ تحریر فرمایا ہے اور نظام باطل سے ہر قسم کے تعلق سے جس طرح براءت کا اظہار کیا ہے اس سے دلی مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کے دل میں یہی جذبات پیدا کرے۔ حقوق الزوجین میں اس قسم کی تجویزیں جو بر سبیل تنزل لکھی گئی ہیں جماعت اسلامی کے مسلک کی حیثیت نہیں رکھتیں، بلکہ ان جماعتوں کی رہنمائی کے لیے لکھی گئی ہیں جو موجودہ نظام کے تحت اپنی مذہبی مشکلات کے حل کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں۔ اس بات کی تصریح بھی نہایت واضح الفاظ میں کر دی گئی ہے، تعجب ہے کہ اس کے باوجود آپ کو یہ شبہات کیوں لاحق ہوئے۔ بعد میں ایک رفیق کے سوال کے جواب میں ترجمان القرآن کے صفحات میں بھی اس بات کی وضاحت ہو چکی ہے۔ بہر حال جماعت اسلامی کا طرز عمل بالکل غیر مشتبہ ہے اور اس طرح کے شکوک کے پیدا ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

فقہا و ائمہ سے انتساب مسلک

سوال:۔ "ان الدین عند اللہ الاسلام" کی آپ نے جو تشریح فرمائی ہے اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص کسی فقیہ یا مجتہد سے اخذ کردہ مسائل اسلام پر اس فہم کے ساتھ عمل کر رہا ہو کہ وہ مسائل اس فقیہ کی رائے

اور اس کا مذہب ہی ہے تو اس کا یہ فہم اور عمل دونوں گمراہی ہیں۔ اسے تو اس فہم و ادراک کے ساتھ عمل کرنا چاہیے کہ یہ مسائل اس فقیہہ یا مجتہد کے خانہ ساز مسائل اور ان کے خود ساختہ مذہب نہیں، بلکہ وہ خاص اسلام کے مسائل ہیں جن کا علم اسے اس فقیہہ یا مجتہد کی وساطت اور ذریعہ سے حاصل ہوا۔ کسی فقیہہ یا مجتہد سے حاصل شدہ مسئلہ اسلام کو یہ حیثیت دے کر عمل کرنا کہ یہ مسئلہ اس فقیہہ یا مجتہد کا مسئلہ اور اس کا مذہب ہے، پہلی بڑی ضلالت ہے اور ضلالۃٌ فوق ضلالۃ یہ ہے کہ اپنے عمل اور اپنے اس اتباع کو اس فقیہہ و مجتہد کی طرف منسوب بھی کر دیا جائے۔ شارع علیہ السلام کے علاوہ کسی اور کی طرف، کسے باشد، انتساب ہی غلط ہے۔ جس مسئلہ پر عمل ہو اس فہم و شعور کے ساتھ ہو کہ یہ مسئلہ اسلام کا مسئلہ ہے اور اس عمل میں ہم اتباع اسلام کر رہے ہیں۔

نیز یہ کہنا کہ میں اس مسئلہ میں فلاں فقیہہ کا پیرو ہوں اور یہ کہ اس بارے میں فلاں مجتہد صاحب کا مذہب میرا معمول بہ ہے اور کسی کا یہ طے کر دینا کہ ایک دو یا چند ایک بزرگان متقدمین کے مذاہب میں سے کسی ایک کی پیروی لازمی ہے، میرے خیال میں بوجوہ مذکورہ درست نہیں۔

میں نے اپنی سمجھ کے مطابق حقوق الزوجین اور رسائل و مسائل دینیات میں ایسے مقامات دیکھے ہیں جہاں مسائل کے اخذ اور ان کے بیان میں مذاہب کے ذکر اور ان کی طرف انتساب کو نمایاں دخل ہے۔ یعنی "یہ مسئلہ فلاں مذہب کا ہے" اور "فلاں مذہب کا یہ مسئلہ درست نہیں"، "فلاں مذہب کے مطابق عمل درست ہوگا" وغیرہ۔ یہ ہونا یوں چاہیے کہ "یہ مسئلہ اسلام کا ہے" اور "یہ مسئلہ اسلام کا نہیں، اس لیے درست نہیں" اور "اسلام ہی کے فلاں مسئلہ پر عمل درست ہوگا" وغیرہ!

اگر ان شبہات میں میں حق بجانب نہیں ہوں تو میری غلط فہمی کا ازالہ فرما دیں۔

جواب: کسی اجتہادی مسئلہ کو عین دین اسلام کہہ کر پیش کرنا یا اس پر عین شریعت اسلام سمجھ کر عمل کرنا غلط ہے۔ جس معاملہ میں نصوص شریعت موجود نہ ہوں اس میں ایک مجتہد اللہ اور اس کے رسول کے ارشادات سے اوفق بات معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جس نتیجہ پر بھی وہ پہنچتا ہے یہ اس کی اپنی رائے ہوتی ہے، جس میں خطا اور صواب دونوں کے امکانات ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی رائے کو عین اسلام کہہ کر پیش کرے۔ وہ صرف یہی کہہ کر پیش کر سکتا ہے کہ فلاں معاملہ میں اس کے نزدیک اللہ اور اس کے رسول کی مرضی سے اقرب بات یہ معلوم ہوتی ہے۔ صحابہ کرام اور ائمہ عظام تمام اجتہادی امور میں اسی طرح اپنی رائیں پیش کیا کرتے تھے، کوئی بھی یہ کہہ کر پیش نہیں کرتا تھا کہ اللہ نے یہ فرمایا ہے یا رسول کا یہ ارشاد ہے یا شریعت اسلام کا یہ حکم ہے۔

جو لوگ ان اجتہادات کو قبول کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ فلاں مسئلہ میں میں فلاں امام کا پیرو ہوں تو ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں اس امام کے اجتہاد کو اوفق بالکتاب والسنۃ پاتا ہوں اور اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ قباحت جس چیز میں ہے وہ صرف یہ ہے کہ آدمی کسی ایک امام یا عالم کا اندھا مقلد بن جائے اور حق و ہدایت کو اس کی پیروی کے اندر محصور کر دے۔ ہم خیال کرتے ہیں کہ آپ بھی یہی کہنا چاہتے ہیں، لیکن تعبیر میں بات خلط ملط ہو گئی۔

قرآن و حدیث اور سائنٹفک حقائق

سوال: قرآن و حدیث میں بہت سے امور ایسے بیان ہوئے ہیں جنھیں زمانۂ حال کی تحقیق غلط قرار دیتی ہے۔ اس صورت میں

ہم قرآن و حدیث کو مانیں یا علمی تحقیق کو؟ مثلاً :-

ا - قرآن کہتا ہے کہ نوعِ انسانی آدمؑ سے پیدا ہوئی۔ بخلاف اس کے علمائے دورِ حاضر کا دعویٰ یہ ہے کہ انسان حیوانات ہی کے کنبہ سے تعلق رکھتا ہے اور بندروں اور بن مانسوں سے ترقی کرتے کرتے آدمی بنا ہے۔

ب - قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ آفتاب حرکت کرتا ہے مگر سائنس کہتی ہے کہ نہیں آفتاب ساکن ہے۔

ج - اسی طرح بادلوں میں جو کڑک اور چمک ہوتی ہے اس کے متعلق اسلام کی رائے یہ ہے کہ یہ بادلوں کو ہنکاتے ہوئے فرشتوں کے کوڑے چلتے اور آواز نکالتے ہیں، حالانکہ زمانۂ حال کی تحقیق یہ کہتی ہے کہ رعد اور برق کا ظہور بادلوں کے ٹکرانے سے ہوتا ہے۔

د - "کانا دجال" کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کہیں مقید ہے تو آخر وہ کونسی جگہ ہے۔ آج تو دنیا کا کونہ کونہ انسان نے چھان مارا ہے پھر کیوں کانے دجال کا پتہ نہیں ملتا؟

جواب :- مجھے تو اپنی پچیس سالہ علمی تحقیق و تفتیش کے دوران میں آج تک ایک مثال بھی ایسی نہیں ملی ہے کہ سائنٹفک طریقے سے انسان نے کوئی حقیقت ایسی دریافت کی ہو جو قرآن کے خلاف ہو۔ البتہ سائنس دانوں یا فلسفیوں نے قیاس سے جو نظریے قائم کیے ہیں ان میں سے متعدد ایسے ہیں جو قرآن کے بیانات سے ٹکراتے ہیں لیکن قیاسی نظریات کی تاریخ خود اس بات پر شاہد ہے کہ ایک وقت جن نظریات کو حقیقت سمجھ کر ان پر ایمان لایا گیا دوسرے وقت خود وہی نظریات ٹوٹ گئے اور آدمی ان کے بجائے کسی دوسری چیز کو حقیقت سمجھنے لگا۔ ایسی ناپائیدار چیزوں کو ہم یہ مرتبہ دینے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ قرآن کے بیانات سے ان کی ٹکر ہوتے ہی قرآن کو چھوڑ کر ان پر ایمان لے آئیں۔ ہمارا ایمان اگر متزلزل ہو سکتا ہے تو صرف اس صورت میں جب کہ کسی ثابت شدہ حقیقت سے، یعنی ایسی چیز سے جو تجربہ و مشاہدہ سے مبرہن ہو چکی ہو، قرآن کا کوئی بیان غلط قرار پائے، مگر جیسا کہ اوپر میں لکھ چکا ہوں، ایسی کوئی چیز آج تک میرے علم میں نہیں آئی ہے۔ اب فرداً فرداً ان چیزوں کے متعلق کچھ عرض کروں جنہیں آپ نے مثال میں پیش کیا ہے :-

ا - ڈارون کا نظریۂ ارتقاء اس وقت تک محض نظریہ ہے، ثابت شدہ حقیقت نہیں۔ علی گڑھ ایک علمی مرکز ہے جہاں اس نظریہ پر ایمان لانے والوں کی اچھی خاصی تعداد آپ کو ملے گی، آپ خود ان ہی سے پوچھ لیجیے کہ یہ نظریہ (Theory) ہے یا واقعہ (Fact)؟ اگر ان میں سے کوئی صاحب اسے واقعہ قرار دیں تو ذرا ان کا اسم گرامی مجھے بھی لکھ دیجیے۔

ب - علی گڑھ میں فلکیات (Astronomy) جاننے والوں کی بھی کمی نہیں۔ ذرا ان لوگوں سے پوچھیے کہ کیا واقعی آفتاب ساکن ہے؟ اگر ایسے کوئی صاحب مل سکیں تو ان کے نام نامی سے بھی علمی دنیا کو ضرور مطلع کرنا چاہیے۔ غالباً آپ ابھی تک انیسویں صدی کی سائنس کو سائنس سمجھ رہے ہیں جبکہ آفتاب متحرک نہ تھا۔ موجودہ سائنس کا آفتاب تو اچھی خاصی تیزی کے ساتھ حرکت کر رہا ہے۔

ج - قرآن مجید کی کوئی آیت میرے علم میں ایسی نہیں ہے جس میں یہ کہا گیا ہو کہ بادلوں میں چمک اور کڑک بجلی کے بجائے فرشتوں کے کوڑے برسانے سے ہوتی ہے۔ اس کے برعکس قرآن مجید میں بارش کا جو عمل (Process) بیان

کیا گیا ہے وہ بالکل ٹھیک ٹھیک موجودہ زمانہ کی سائنٹفک تحقیقات کے مطابق ہے اور اتنا جدید (up to date) ہے کہ پچھلی صدی کے وسط تک جو معلومات انسان کے پاس بارش کے متعلق تھیں ان کی بنا پر بعض لوگوں کو ان آیات کی تفسیر میں سخت پریشانی پیش آتی تھی جن میں بارش کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔

د۔ یہ "کانا دجال" وغیرہ تو افسانے ہیں جن کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ ان چیزوں کو تلاش کرنے کی ہمیں کوئی ضرورت بھی نہیں۔ عوام میں اس قسم کی جو باتیں مشہور ہوں، ان کی کوئی ذمہ داری اسلام پر نہیں ہے، اور ان میں سے کوئی چیز اگر غلط ثابت ہو جائے تو اس سے اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

ہمہ گیر اسٹیٹ میں تحریک اسلامی کا طریق کار

سوال: یہ بات تو اب کسی مزید استدلال کی محتاج نہیں رہی کہ ایک مسلمان کے لیے، بشرطیکہ وہ اسلام کا صحیح شعور حاصل کر چکا ہو، صرف ایک ہی چیز مقصد زندگی قرار پا سکتی ہے اور وہ ہے حکومت الٰہیہ کا قیام۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے صرف وہی طریق کار اختیار کیا جا سکتا ہے جو اس کی فطرت سے عقلاً مناسبت رکھتا ہو اور جو اس کے اصلی داعیوں نے عملاً ہمیشہ اختیار کیا ہو۔ حکومت الٰہی کے نصب العین کے داعی انبیاء کرام ہیں، اس لیے طریق کار بھی ہی صحیح ہے جو انبیاء کا طریق کار ہو۔ انبیاء کی زندگیوں پر نظر ڈالتے ہوئے ہمیں فی الجملہ دو قسم کے پیغمبر دکھائی دیتے ہیں۔ ایک تو وہ جن کی دعوت کے ظہور کے وقت اسٹیٹ ایک موثر اور منظم طاقت کی حیثیت سے سوسائٹی میں کارفرما نظر آتا ہے اور اکثر حالات میں وہ ایسا اسٹیٹ ہوتا ہے جس میں اقتدار اعلیٰ کلی طور پر شخص واحد میں مرکوز ہوتا ہے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ دوسرے وہ جن کا واسطہ ایک ایسی سوسائٹی سے پڑتا ہے جس میں اسٹیٹ ابھی بالکل ابتدائی حالت میں تھا اور زیادہ سے زیادہ "سرقبیلی" (Patriarchical) قسم کا اسٹیٹ تھا، جیسے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم۔ چنانچہ دونوں صورتوں میں طریق کار کا اختلاف نمایاں ہے جو غالباً اسی سیاسی اختلاف احوال کا نتیجہ ہے۔

لیکن جتنی جامعیت اور ہمہ گیری اسٹیٹ نے اب حاصل کر لی ہے اور جس طرح اس نے آجکل فرد کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے اور جس قدر منظم، موثر اور مضبوط طاقت فکری اور عملی دونوں حیثیتوں سے اس نے اب اختیار کر لی ہے اس کی مثال شاید پچھلی تاریخ میں نہ مل سکے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہی طریق کار جو تقریباً غیر ریاستی (stateless) سوسائٹی یا حد سے حد "سرقبیلی حکومت" (Patriarchical) والی سوسائٹی میں کامیاب طور پر استعمال کیا گیا تھا، اب بھی اس قسم کی کامیابی کا ضامن ہو سکتا ہے؟ کیا آجکل کے بدلے ہوئے حالات میں اسی مقصد کے لیے کام کرنے والی پارٹی کو اپنا فن انقلاب انگیزی (Technique) کافی حد تک نہیں بدلنا پڑے گا؟

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی منظم اسٹیٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس کے برعکس حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے ایک منظم اسٹیٹ تھا۔ چنانچہ انھوں نے جب قوت متسلط (sovereign power) کو اقتدار منتقل کرنے پر آمادہ پایا تو فوراً "اجعلنی علی خزائن الارض" کہہ کر اقتدار سنبھال لیا اور اس طرح اپنا مشن پورا

کرنے کے لیے پہلے کے قائم شدہ اسٹیٹ کو استعمال میں لے آئے۔ موجودہ زمانہ کا اسٹیٹ حضرت یوسف علیہ السلام کے عہد کے اسٹیٹ سے کہیں زیادہ جامع، ہمہ گیر اور منظم ہے۔ اس کو اکھیڑ کر ایک نیا اسٹیٹ وجود میں لانے کے لیے جو انقلاب بھی ہوگا اس کا راستہ خون کے لالہ زاروں سے ہو کر گزرے گا، جیسا کہ بالشویک روس میں ہوا۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ اسلام محض توڑ پھوڑ قسم کا انقلاب نہیں چاہتا ہے، بلکہ اس کا پروگرام کچھ زیادہ نازک ہے۔ ان حالات میں تو زیادہ موزوں طریقہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ بجائے کلی انقلاب کے جتنا کچھ اقتدار حاصل ہو سکے اسے قبول کر کے کام کو آگے بڑھایا جائے۔ اگر اس پوزیشن کو قبول کر لیا جائے تو نہ صرف یہ کہ ملک کی موجودہ مسلمان جماعتوں کے خلاف کوئی کارروائی درست نہیں ہوگی بلکہ تائید بھی ضروری ہو جائے گی۔ یہ بات واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ اقتدار سے مراد سول سروس کے مناصب نہیں، جیسا کہ کسی نواب صاحب نے ترجمان کی ایک اشاعت میں یوسف علیہ السلام کے سلسلہ میں فرمایا ہے، بلکہ ایک منظم جماعت کا جدوجہد کے بعد جماعتی حیثیت سے قوتِ حاکمہ (sovereign power) سے اختیارات لے کر اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا مراد ہے۔

جواب:۔ بلاشبہہ ایسی حالت میں جبکہ اسٹیٹ ہمہ گیر ہو اس حالت کی بہ نسبت جبکہ سماجی نظام بالکل ابتدائی نوعیت کا ہو، بہت کچھ فرق واقع ہو جاتا ہے اور اس کے لحاظ سے طریق کار میں بھی کم از کم صورت کے لحاظ سے تغیر کرنا ضروری ہے، لیکن اصولی حیثیت سے طریق کار میں کسی تغیر کی ضرورت نہیں۔ سیدھی بات یہ ہے کہ پہلے ہم اپنی دعوت پیش کریں گے پھر ان لوگوں کو جو ہماری دعوت پر لبیک کہیں، منظم کرتے جائیں گے، پھر اگر رائے عام کی موافقت سے یا حالات کی تبدیلی سے کسی مرحلہ پر ایسے آثار پیدا ہو جائیں کہ موجودالوقت دستوری طریقوں ہی سے نظام حکومت کا ہمارے ہاتھوں میں آجانا ممکن ہو اور ہمیں توقع ہو کہ ہم سوسائٹی کے اخلاقی، تمدنی اور سیاسی و معاشی نظام کو اپنے اصول پر ڈھال سکیں گے تو ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں کوئی تامل نہ ہوگا، اس لیے کہ ہمیں جو کچھ بھی واسطہ ہے، اپنے مقصد سے ہے، نہ کہ کسی خاص طریق کار (Method) سے۔ لیکن اگر پرامن ذرائع سے جوہر اقتدار (substance of Power) ملنے کی کوئی توقع نہ ہو تو پھر ہم عام انقلابی دعوت جاری رکھیں گے اور تمام مشروع ذرائع سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں گے۔

موجودہ سیاسی مسائل میں جماعت اسلامی کا مسلک

سوال:۔ اس وقت مسلمانانِ ہند دو فتنوں میں مبتلا ہیں۔ اول کانگریس کی وطنی تحریک کا فتنہ جو واحد قومیت کے مفروضے اور مغربی ڈیموکریسی کے اصول پر ہندوستان کی اجتماعی زندگی کی تشکیل کرنا چاہتی ہے۔ دوم مسلم نیشنلزم کی تحریک جسے مسلم لیگ چلا رہی ہے اور جس پر ظاہر میں تو اسلام کا لیبل لگا ہوا ہے مگر باطن میں روح اسلامی سراسر مفقود ہے۔ "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے مطالعہ سے یہ بات ہم پر واضح ہو چکی ہے کہ یہ دونوں تحریکیں اسلام کے خلاف ہیں لیکن حدیث میں آیا ہے کہ انسان جب دو بلاؤں میں مبتلا ہو تو چھوٹی بلا کو قبول کرے۔ اب کانگریس کی تحریک تو سراسر کفر ہے۔ اس کا ساتھ دینا مسلمانوں کی موت کے مترادف ہے۔ اس کے مقابلہ میں لیگ کی تحریک، اگرچہ غیر اسلامی ہے، لیکن اس سے یہ خطرہ تو نہیں ہے کہ دس کروڑ مسلمانانِ ہند کی قومی ہستی ختم ہو جائے۔ لہٰذا کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم لیگ سے باہر رہتے ہوئے اس کے ساتھ ہمدردی کریں؟ اس وقت ہندوستان میں انتخابات کی مہم درپیش ہے اور یہ

انتہائی فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک طرف تمام غیر لیگی عناصر مل کر مسلم لیگ کو پچھاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں جن میں اگر وہ کامیاب ہو جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ کانگریس کی وطنی تحریک مسلمانوں پر زبردستی مسلط ہو کے رہ جائے گی۔ دوسری طرف مسلم لیگ یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ مسلمان ایک مستقل قوم ہیں اور وہ اپنی قومی حکومت قائم کرنے کے خواہشمند ہیں۔ ان دونوں کا فیصلہ رائے دہندوں کے ووٹ پر منحصر ہے۔ ایسی صورت میں ہم کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ کیا ہم لیگ کے حق میں ووٹ دیں اور دلوائیں یا خاموش بیٹھے رہیں؟ یا خود اپنے نمائندے کھڑے کریں؟

جواب:- آپ کے ذہن پر ملک کے موجودہ سیاسی حالات کا غلبہ ہے اس لیے آپ کو صرف دو ہی فتنے نظر آئے جن میں ہندوستان کے مسلمان مبتلا ہیں، حالانکہ اگر آپ ذرا وسیع نگاہ سے دیکھتے تو ان دو فتنوں کے علاوہ آپ کو اور بہت سے اخلاقی، فکری، تمدنی، مذہبی اور سیاسی و معاشی فتنے نظر آتے جو اس وقت مسلمانوں پر ہجوم کیے ہوئے ہیں۔ اور یہ ایک فطری سزا ہے جو اللہ کی طرف سے ہر اس قوم کو ملا کرتی ہے جو کتاب اللہ کی حامل ہونے کے باوجود اس کے اتباع سے منہ موڑے اور اس کے منشا کے مطابق کام کرنے سے جی چرائے۔ اس سزا سے اگر مسلمان کبھی بچ سکتے ہیں تو وہ صرف اس طرح کہ اپنے اس اصلی و بنیادی جرم سے باز آ جائیں جس کی پاداش میں ان پر یہ فتنے مسلط ہوئے ہیں اور اس کام کے لیے کھڑے ہو جائیں جس کی خاطر انھیں کتاب اللہ دی گئی تھی۔ لیکن اگر وہ اس سے منہ موڑتے ہیں تو پھر جو تدبیریں چاہیں کر کے دیکھ لیں یقین جانیے کہ کسی ایک فتنہ کا بھی سدباب نہ ہو گا بلکہ ہر تدبیر چند اور فتنے قائم کر دے گی۔

آپ نے جو سوال ہمارے سامنے پیش کیا ہے اس کے متعلق میں دو باتیں واضح طور پر عرض کیے دیتا ہوں تاکہ آپ کو اور آپ کی طرح سوچنے والے اصحاب کو آئندہ اس سلسلہ میں کوئی الجھن نہ پیش آئے۔

اول یہ کہ ہماری جماعت کے مقصد قیام کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ یہ جماعت کسی ملک یا قوم کے وقتی مسائل کو سامنے رکھ کر وقتی تدابیر سے ان کو حل کرنے کے لیے نہیں بنی ہے۔ اور نہ اس کی بنائے قیام یہ قاعدہ ہے کہ پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کے لیے جس وقت جو اصول بھی چلتے نظر آئیں ان کو اختیار کر لیا جائے۔ اس جماعت کے سامنے تو صرف ایک ہی عالمگیر و ازلی و ابدی مسئلہ ہے جس کی لپیٹ میں ہر ملک اور ہر قوم کے سارے وقتی مسائل آ جاتے ہیں اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی دنیوی فلاح اور اخروی نجات کس چیز میں ہے؟ پھر اس مسئلے کا ایک ہی حل اس جماعت کے پاس ہے، اور وہ یہ ہے کہ تمام بندگان خدا (جن میں ہندوستان کے مسلمان بھی شامل ہیں) صحیح معنوں میں خدا کی بندگی اختیار کریں اور اپنی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس کے سارے پہلوؤں سمیت ان اصولوں کی پیروی میں سپرد کر دیں جو خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں پائے جاتے ہیں۔ ہمیں اس مسئلے اور اس کے اس واحد حل کے سوا دنیا کی کسی دوسری چیز سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے اور جو شخص بھی ہمارے ساتھ چلنا چاہتا ہو اسے لازم ہے کہ ہر طرف سے نظر ہٹا کر پوری جمعیت خاطر کے ساتھ اس شاہراہ پر قدم جمائے چلتا رہے۔ اور جو شخص اتنی ذہنی و عملی یکسوئی بہم نہ پہنچا سکے، جس کے ذہن کو اپنے ملک یا اپنی قوم کے وقتی مسائل بار بار اپنی طرف کھینچتے ہوں اور جس کے قدم بار بار ڈگمگا کر ان طریقوں کی طرف پھسلتے ہوں، جو دنیا میں آج رائج ہیں، اس کے لیے زیادہ مناسب یہ ہے کہ پہلے ان ہنگامی تحریکوں میں جا کر اپنا دل بھر لے۔

دوم یہ کہ ووٹ اور الکشن کے معاملہ میں ہماری پوزیشن کو صاف صاف ذہن نشین کر لیجیے۔ پیش آمدہ انتخاب یا آئندہ آنے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ہمارے ملک پر پڑتا ہو، بہرحال ایک با اصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔ موجودہ نظام کے خلاف ہماری لڑائی ہی اس بنا پر ہے کہ یہ نظام حاکمیت جمہور کے اصول پر قائم ہوا ہے اور جمہور جس پارلیمنٹ یا اسمبلی کو منتخب کریں اس کو قانون بنانے کا غیر مشروط حق دیتا ہے جس کے لیے کوئی بالاتر سند اس کو تسلیم نہیں ہے۔ بخلاف اس کے ہمارے عقیدۂ توحید کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ حاکمیت جمہور کی نہیں بلکہ خدا کی ہو اور آخری سند خدا کی کتاب کو مانا جائے اور قانون سازی جو کچھ بھی ہو کتاب الٰہی کے تحت ہو نہ کہ اس سے بے نیاز۔ یہ ایک اصولی معاملہ ہے جس کا تعلق عین ہمارے ایمان اور ہمارے اساسی عقیدے سے ہے۔ اگر ہندوستان کے علماء اور عامۂ مسلمین اس حقیقت سے ذہول برت رہے ہیں اور وقتی مصلحتیں ان کے لیے مقتضیات ایمانی سے اہم تر بن گئی ہیں تو اس کی جوابدہی وہ خود اپنے خدا کے سامنے کریں گے۔ لیکن ہم کسی فائدے کے لالچ اور کسی نقصان کے اندیشے سے اس اصولی مسئلے میں موجودہ نظام کے ساتھ کسی قسم کی مصالحت نہیں کر سکتے۔ آپ خود ہی سوچ لیجیے کہ توحید کا یہ عقیدہ رکھتے ہوئے آخر ہم کس طرح انتخابات میں حصہ لے سکتے ہیں؟ کیا ہمارے لیے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو ہم کتاب اللہ کی سند سے آزاد ہو کر قانون سازی کرنے کو شرک قرار دیں اور دوسری طرف خود اپنے ووٹوں سے ان لوگوں کو منتخب کرنے کی کوشش کریں جو خدا کے اختیارات غصب کرنے کے لیے اسمبلی میں جانا چاہتے ہیں؟ اگر ہم اپنے عقیدے میں صادق ہیں تو ہمارے لیے اس معاملہ میں صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنا سارا زور اس اصول کے منوانے میں صرف کر دیں کہ حاکمیت صرف خدا کی ہے اور قانون سازی کتاب الٰہی کی سند پر مبنی ہونی چاہیے۔ جب تک یہ اصول نہ مان لیا جائے ہم کسی انتخاب اور کسی رائے دہی کو حلال نہیں سمجھتے۔

مطبوعات

النظر فی الحدیث :۔ تالیف مولانا ابوسعید صاحب جھکاوی۔ ضخامت ۲۲۲ صفحات ۔ قیمت دو روپے ۸ آنے

ملنے کا پتہ :۔ انجمن حزب الاسلام، مقام و ڈاک خانہ مصطفیٰ آباد ضلع سارن (بہار)

یہ کتاب اصول حدیث سے تعلق رکھتی ہے۔ جس میں علمائے محققین کی تصانیف سے مدد لیتے ہوئے موضوع سے متعلق تمام مباحث پر مفصل اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ دین میں حدیث کی حیثیت کیا ہے؟ اس کی تدوین کی تاریخ کیا ہے اور اس تدوین کا طریقہ کیا رہا ہے؟ روایت اور درایت کے اصول کیا ہیں؟ راویوں اور کتب احادیث کے کتنے طبقات و مدارج ہیں؟ مسلمانوں کے مختلف فرقے اختلافی مسائل میں حدیث کی کن اور کس درجہ کی کتابوں سے اپنے مذہب کے حق میں استدلال کرتے ہیں؟ "تمسک بالحدیث" کے بارے میں لوگوں نے کس افراط و تفریط سے کام لیا ہے اور صحیح و معتدل راہ کون سی ہے؟

مصنف نے ان تمام مباحث پر بالکل غیر جانبدارانہ اور آزادانہ نظر ڈالی ہے اور تحزب سے بالاتر ہو کر خالص علمی اور تحقیقی انداز بحث اختیار کیا ہے جس میں اجتہاد فکر کی جھلک بھی موجود ہے اور اس حقیقت کو واضح کرنے کی ایک حد تک کامیاب کوشش کی ہے کہ "باوجود ان تمام ممکن احتیاطوں اور تدبیروں کے جو محدثین کرام نے تنقید حدیث میں اختیار کیں، یہ دعویٰ کرنا عقل عام اور تجربہ کے خلاف اور بشری فہم و نظر کے منتہائے دسترس سے ناواقفیت کا ثبوت ہے کہ ان کی رائے اور تحقیق بس آخری چیز ہے اور اب ہم کو آنکھیں بند کر کے ان کے مندرجات کو فرامین رسول تسلیم کر لینا چاہیے۔ یہ محدثین اپنی تمام تر احتیاط، تحقیق، دیانت اور جلالت شان کے باوجود بہرحال انسان ہی تھے اور ان کی حیثیت فن حدیث کے "مجتہد" سے زیادہ نہیں اور مجتہد کی تعریف ہی یہ ہے کہ قد یخطی و یصیب کبھی وہ غلطی کر جاتا ہے اور کبھی صحیح رائے قائم کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو صحیح بخاری کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے، بالکل بے معنی ہوتا۔ چنانچہ علمائے سلف میں سے بعض محققین کی تحقیق کہ صحیحین میں بھی تقریباً دو سو حدیثیں ضعیف ہیں اس امر واقعہ پر ایک برہان جلی ہے"

اس سلسلہ میں وہ بحث جو صحابہ کرام کی عدالت سے متعلق ہے، بڑی حقیقت افروز ہے جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ "الصحابۃ کلھم عدول" کا قول اور اصول بالکل درست ہے مگر اندھی عقیدت میں مبتلا ہو کر لوگوں نے اس کے اصل مفہوم کو اس کی حدود سے متجاوز کر دیا ہے۔ صحابہ کے راست باز ہونے میں کلام نہیں مگر دیانت اور راست بازی کسی طرح بھی فہم کامل، تفقہ اور ضبط الفاظ و معانی کو مستلزم نہیں۔ اسی طرح اصول درایت پر جو کچھ لکھا گیا ہے، بحیثیت مجموعی بہت خوب ہے۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ ان اصولوں میں اسلام کی اصولی دعوت اور اس کے مزاج کو بھی ایک اصول اور معیار ٹھیرایا جائے اور تو احادیث اس معیار پر

پوری نہ اتریں ان کی حتی الوسع تاویل کی جائے اور اگر تاویل ممکن نہ ہو تو ان کے تسلیم کرنے میں انکار یا کم از کم توقف سے کام لیا جائے جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے۔ کتاب محققانہ اور مجتہدانہ انداز میں لکھی گئی ہے اس لیے جہاں تک مقصد بحث اور طریقۂ بحث کا تعلق ہے ہم اس کو بنظر استحسان دیکھتے اور زبان اردو میں ایک قابل قدر اضافہ سمجھتے ہیں، مگر اجتہادی آرا میں اختلاف ایک قدرتی شے ہے۔ اس لیے مصنف کی بہت سی باتوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً ان کی اس رائے سے ہمارے لیے اتفاق کرنا کسی طرح ممکن نہیں کہ اقوال رسول تو درکنار قرآن مجید تک میں ایسے امور مذکور ہیں جو اسلام کے نہیں بلکہ مخاطب اقوام کے مسلمات ہیں۔۔۔ ایسے مسلمات جو مبنی بر حقیقت و مطابق واقعہ ہیں اور ایسے مسلمات بھی جو خلاف حقیقت اور خلاف واقعہ ہیں۔۔۔ قرآن ان دونوں ہی قسم کے مسلمات کو بغیر کسی تصریح کے کہ یہ غیروں کے غلط مسلمات ہیں، اپنے طور پر ایک حقیقت ثابتہ کی حیثیت سے بیان کرکے مخاطب پر حجت قائم کرتا ہے" حالانکہ قرآن تو الگ رہا نبی اکرم نے بھی کبھی اس طرز بیان کو اختیار نہیں فرمایا۔ الغرض اور اس کا رسول اس سے بہت بلند ہے کہ غیر واقعی نظریات کو حقائق کی طرح بیان کرے اور صرف مخاطب کو خاموش کرنے کے لیے حقائق کے بجائے موہومات سے کام لے۔ گو یہ خیال نیا نہیں بلکہ پرانے اہل قلم کے ہاں بھی اس کا وجود ملتا ہے مگر یہ وہی حضرات ہیں جن کے دماغ پر قرآن کے فطری طرز استدلال کی جگہ منطقی جدلیات چھائی ہوئی تھیں۔ حاشا کہ قرآن ان اوچھے ہتھیاروں کا محتاج ہو۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن کا کام حقائق اشیا بیان کرنا نہیں۔ مگر جب کبھی وہ ان کا ذکر کرتا ہے تو صرف مخاطب کے مسلمات ہونے ہی کا لحاظ نہیں کرتا بلکہ یہ بھی دیکھ لیتا ہے کہ اسے مطابق واقعہ ہونا چاہیے۔ اور اگر کبھی وہ مخاطب پر اتمام حجت کے لیے ایسی باتیں بیان کرتا ہے جو مخاطب کے نزدیک مسلمہ تو ہوں مگر خلاف واقعہ بھی ہوں تو وہاں ایسے الفاظ اور اسالیب بیان سے کام لیتا ہے جن سے اس امر کی روز روشن کی طرح وضاحت ہو جاتی ہے کہ یہ مسلمہ قرآن کو تسلیم نہیں۔ اس مختصر تبصرہ میں ہم کوئی تفصیلی بحث نہیں کر سکتے مگر فاضل مصنف کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اگر وہ اسی آیت وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ کے الفاظ پر، جس کو انھوں نے بطور مثال پیش کیا ہے، اسی مضمون والی دیگر آیات قرآنیہ کی روشنی میں تدبر فرمائیں گے تو ان پر اپنی رائے کی غلطی خود بخود واضح ہو جائے گی۔ یہ طرز فکر تو اس مرعوب ذہنیت کی غمازی کرتا ہے جس نے جاہل مستشرقین کے اعتراضات کے آگے سپر ڈال کر یہاں تک تسلیم کر لیا کہ قرآنی قصص بھی اسرائیلیات سے لے لیے گئے ہیں، قطع نظر اس سے کہ وہ صحیح ہیں یا غلط قرآن کو تو صرف عبرت و نصیحت سے غرض تھی۔ سو اہل کتاب کے ہاں جس طرح یہ قصے مشہور تھے، لوگوں کی عبرت پذیری کے لیے جوں کے توں قرآن میں ذکر کر دیے گئے۔ معلوم نہیں لوگ اس قسم کی باتیں کہتے وقت قرآن کی اس صفت کو کیوں فراموش کر دیتے ہیں لایاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ۔ باطل کا اس کے کسی گوشہ میں وجود نہیں۔ نہ احکام میں، نہ دلائل میں۔ نہ اصلاً نہ ضمناً۔ اسی طرح آیت استخلاف نیز آیت وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ کے جو ترجمے اور مطالب بیان کیے گئے ہیں، صریحاً غلط ہیں اور ان میں حد سے زیادہ تکلف سے کام لیا گیا ہے۔

مقدمہ کتاب میں ایک جگہ "تمام مذاہب حقہ" کا جو لفظ ہے اور اس کے ضمن میں غیر مسلم اقوام سے جو مذہبی خواہش اتحاد ظاہر کی گئی ہے، اس کا مطلب ہم نہیں سمجھے، کیا خدانخواستہ اس کا مطلب یہ ہے کہ "عالمگیر سچائیاں" تمام مذاہب میں مشترک ہیں اور ہر مذہب برحق ہے؟ اگر فاضل مصنف کا یہ عقیدہ نہیں ہے جیسا کہ ہم امید رکھتے ہیں، تو ان کو ایسے مخدوش الفاظ و اسالیب کے استعمال

سے سخت احتراز کرنا چاہیے۔

کتاب کے طرز نگارش کے متعلق یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ اس میں تصنع اور الجھاؤ اور ادبی نقائص حد سے زیادہ ہیں بعض مقامات پر تضاد بیان بھی موجود ہے۔ نیز طباعت کی غیر معدود غلطیاں ان سب پر مستزاد ہیں لیکن ان سب نقائص کے باوجود اس کتاب کے افادی پہلو سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا اور ہم اہل علم سے سفارش کریں گے کہ وہ اس کا ضرور مطالعہ فرمائیں۔

گلدستۂ مدح صحابہ:۔ مرتبہ ابو داؤد صاحب لکھنوی۔ ضخامت ۱۰۴ صفحات۔

ملنے کا پتہ :۔ دفتر "الداعی" دار المبلغین لکھنؤ۔

یہ رسالہ دراصل دار المبلغین لکھنؤ کے ماہنامہ "الداعی" کا ایک خاص نمبر ہے جس میں ان تمام مدحیہ نظموں کو اکٹھا کر دیا گیا ہے جو آل انڈیا مدح صحابہ مشاعرہ ۱۳۵۸ھ میں پڑھی گئی تھیں۔ اس مجموعے میں چھوٹے بڑے تقریباً ستر شعراء کے کلام ہیں اور بعض بعض ادب و شعر کا بہترین نمونہ ہیں۔ گو موضوع کے پیش نظر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ غلو اور مبالغہ کی آمیزش سے یہ نظمیں پاک ہیں مگر "ترقی پسند ادب" کی ایسی گرم بازاری میں، جبکہ فنون لطیفہ اور ادب لطیف کے نام پر ہر طرف "فنون خبیثہ" اور "ادب خبیث" کی غلاظتیں بکھیری جا رہی ہیں، اس قسم کی نظمیں انسانی، اخلاقی اور مذہبی نقطۂ نظر سے بسا غنیمت ہیں۔

ابتداء میں صدر مشاعرہ جناب جگر مراد آبادی کا ایک مختصر خطبۂ صدارت ہے جس میں انھوں نے عام شعراء و ادباء کو قابل قدر نصیحتیں فرمائی ہیں، کاش یہ لوگ ان پر کان دھریں اور اپنے اخلاقی فرائض کو محسوس کریں۔

شعر و شاعری اور تحریک مدح صحابہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ مجموعہ خصوصیت سے جاذب نظر ہو گا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اب وہ ہم کو نبیؐ اور اصحاب نبیؐ کی مدح و منقبت بیان کرتے رہنے کی منزل سے آگے لے جائے اور ان کی شخصیتوں کی طرح ان کے کاموں کا بھی عشق عطا فرمائے۔

Registered No. L. 4186

ذیقعدہ / ذی الحجہ ۱۳۶۴

جلد ۲۷
عدد ۵، ۶

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

تالیف

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"
دارالاسلام جمال پور۔ پٹھانکوٹ

قیمت سالانہ پانچ روپے
قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

فہرست مضامین

جلد ۲۷ | ذی القعدہ و ذی الحجہ ۱۳۶۴ھ مطابق نومبر و دسمبر ۱۹۴۵ء | عدد ۶،۵

سید ابو الاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس، چمبرلین روڈ، لاہور میں چھپوا کر دار الاسلام متصل پٹھان کوٹ
سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ایک مدت سے ان صفحات میں مرکز کے حالات اور کاموں کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ حالانکہ جماعت کے ارکان اور ہمدردوں کو یہاں کے حالات کے لیے برابر انتظار بھی رہتا ہے اور ہم ان کو یہاں کے کاموں کی رفتار اور دوسری ضروری باتوں سے باخبر رکھنا ضروری بھی سمجھتے ہیں۔ اس کوتاہی کی وجہ یہ ہے کہ ہماری خواہش تھی کہ سالانہ اجتماع کے موقع پر، اس سال کے لیے جو باتیں طے ہوئی تھیں، ان کے بروئے کار آنے کی کوئی شکل پیدا ہو تو ارکان اور ہمدردوں کو ان سے مطلع کریں، صرف موانع اور عذرات کا ذکر کرنے سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ سالانہ اجتماع پر کئی مہینے گزر گئے اور اب تک ہم ان مشکلات پر قابو نہ پا سکے جو ہمارے سامنے تھیں اور نہ بظاہر حالات اس بات کی توقع ہے کہ ہم جلد ان پر قابو پا سکیں گے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ لوگوں کو صحیح صورت حالات سے آگاہ کر دیا جائے تاکہ انھیں اس بات کا علم رہے کہ تجاویز کے عمل میں آنے میں جو تاخیر ہو رہی ہے نہ وہ بلاسبب ہے اور نہ ہماری غفلت کی وجہ سے ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی قابل لحاظ بات یہ ہے کہ ایک عرصہ سے امیر جماعت مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی طبیعت برابر خراب چلی جا رہی ہے۔ سالانہ اجتماع سے پہلے ان پر بیماری کے متعدد حملے ہو چکے تھے اور وہ اس قابل نہ تھے کہ اجتماع کی کارروائیوں کی نگرانی کر سکتے لیکن اس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی اس وجہ سے انھیں مجبوراً اس سلسلہ کے سارے فرائض انجام دینے پڑے، جس کا اثر ان کی صحت پر نہایت خراب پڑا۔ اجتماع سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے چاہا کہ ان کو کچھ آرام کرنے کا موقع ملے لیکن حالات ایسے تھے کہ یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ اب تک صورت حالات یہ رہی ہے کہ جماعت کے سارے شعبے تنہا ان کی ذات سے وابستہ رہے ہیں۔ وہی جماعت کے امیر تھے، وہی ترجمان القرآن کے ایڈیٹر تھے، وہی تنظیم جماعت کے سلسلہ کے امور کی نگرانی کرتے تھے، وہی استفسارات کے جواب لکھتے تھے۔ اور وہی سارا حساب کتاب رکھتے تھے۔ تصنیف و تالیف کا مشغلہ اور درس کا سلسلہ مزید براں۔ اس وجہ سے اس بات کا موقع بالکل نہیں تھا کہ وہ مرکز سے کچھ دنوں کے لیے غیر حاضر ہو کر اپنی صحت کی فکر کر سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گرمیوں میں ان کی صحت اس قدر گر گئی کہ وہ کام کرنے کے بالکل قابل نہیں رہے اور مجبور ہوئے کہ یہاں کی ذمہ داریوں کو دوسروں پر چھوڑ کر اپنے علاج کی فکر کریں۔ اس غرض کے لیے وہ دلی گئے۔ دلی میں گرمیوں کا موسم نہایت سخت ہوتا ہے لیکن یونانی علاج جو نسبتہً ان کے مزاج کے موافق ہے، وہیں اچھا ہو سکتا تھا، اس وجہ سے کچھ دنوں وہاں قیام کیا۔ اس قیام سے انھیں تھوڑا بہت

فائدہ تو ضرور ہوا لیکن کچھ تو وہاں کے موسم کی خرابی اور کچھ مرکز کی ضروریات نے مجبور کیا اور وہ برسات کے شروع میں واپس آ گئے۔ یہاں
اس بات کی کوشش کی گئی کہ ان پر زیادہ ذمہ داریوں کا بوجھ نہ پڑنے پائے لیکن یہاں رہ کر پوری یکسوئی ممکن نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پھر
بیمار پڑ گئے۔ اس بیماری سے اٹھنے کے بعد بجائے اس کے کہ وہ آرام کرنے کی مہلت پاتے یکم اکتوبر سے باقاعدہ پھر کاموں میں مشغول
ہو گئے۔ ابھی ایک مہینہ بھی پوری پابندی سے کام نہیں کرنے پائے تھے کہ پھر صحت گرتی ہوئی نظر آئی۔ امرت سر جا کر ایکسرے سے معائنہ
کرایا تو معلوم ہوا کہ بائیں گردے میں پتھری ہے اور یہ سارے فساد ات اسی کے کرشمے ہیں۔ اب یونانی طریقہ پر اس کا علاج ہو رہا ہے
اور خدائے علیم و خبیر ہی بہتر جانتا ہے کہ پردۂ غیب میں کیا ہے اور آئندہ اس کے علاج کے سلسلہ میں کیا صورت اختیار کرنی پڑتی
ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ مرض دور ہو اور خدمت دین کا جو کام سامنے ہے اس کے کرنے کے لیے ہمت اور قوت عطا ہو۔

ان صفحات میں شخصی حالات کا کبھی ذکر نہیں آتا لیکن مولانا کی اس بیماری کا ذکر مجبوراً اس وجہ سے کرنا پڑا کہ بہت سے لوگوں کو
ترجمان القرآن کی تاخیر اشاعت سے شکایت ہے۔ بعض لوگوں کو تفہیم القرآن کا سلسلہ باقاعدہ جاری نہ رہنے پر رنج ہے۔ بعض
لوگ استفسارات کے جواب جلد نہ ملنے سے آزردہ ہو رہے ہیں، بہت سے لوگ تعلیمی اسکیم کے اب تک جاری نہ ہونے سے مایوس ہو رہے
ہیں۔ ان سب حضرات کو معلوم ہو جائے کہ ادھر ایک عرصہ سے کاموں کے تسلسل اور ان کی باضابطگی میں جو خلل پیدا ہوتا رہا ہے
اس میں جہاں وقت کے دوسرے حالات کو دخل رہا ہے وہاں امیر جماعت اور مدیر ترجمان القرآن کی علالت کو بھی بہت کچھ دخل
ہے۔ اور یہ ایسی چیز ہے جس پر بندوں کو کوئی اختیار نہیں۔ البتہ اس اثنا میں اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ یہاں کے
مختلف شعبوں کی ذمہ داریاں، جو تنہا امیر جماعت پر تھیں، تقسیم کر دی جائیں۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے بہت حد تک اس میں کامیابی ہوئی
ہے اور جو کسر اب باقی رہ گئی ہے امید ہے کہ وہ بھی بہت جلد پوری ہو جائے گی۔ اب یہاں کے وہ تمام شعبے، جن سے جماعت کے
ارکان اور ہمدردوں کو واسطہ پڑتا ہے، مختلف ذمہ دار اور قابل اطمینان ہاتھوں میں ہیں توقع ہے کہ بہت جلد لوگوں کی شکایات
دور ہو جائیں گی۔ ترجمان القرآن کو بھی وقت پر لانے کی پوری کوشش جاری ہے۔ اب اس کے لیے ایسا انتظام کر دیا گیا ہے کہ
انشاء اللہ یہ پابندی کے ساتھ ماہ بماہ خریداروں تک پہنچ جایا کرے گا، البتہ جب تک مدیر ترجمان القرآن بیمار ہیں اس وقت تک
لوگوں کو خود ان کے مضامین کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ فی الحال اگر وہ تفہیم القرآن کا سلسلہ جاری رکھ سکیں تو یہی غنیمت ہے

تعلیمی اسکیم کے سلسلہ میں، سالانہ اجتماع کے موقع پر، یہ بات طے ہوئی تھی کہ فی الحال ثانوی تعلیم کے عارضی نظام کا آغاز کیا جائے۔ یہ
فیصلہ تعمیر کی موجودہ مشکلات اور اسٹاف کی زحمتوں کو سامنے رکھ کر کیا گیا تھا۔ خیال تھا کہ بر وقت ایک مختصر اسٹاف اور طلبہ کی ایک
محدود تعداد کے قیام و تعلیم کے لیے چند جھونپڑے اور مکانات بنا لینے میں کچھ زیادہ زحمت نہ ہوگی اور اس مختصر نظام کے لیے جماعت
کے اندر اتنے آدمی بھی آسانی کے ساتھ مل جائیں گے جو کام کا آغاز کر سکیں گے۔ پھر آہستہ آہستہ انہی کی مدد سے ابتدائی تعلیم کے لیے کارکن
بھی تیار ہو جائیں گے، نصاب کی تیاری میں بھی سہولت ہوگی، اور آگے کے کاموں یعنی اعلیٰ تعلیم کے لیے بھی راہیں کھلیں گی۔ لیکن ہمارے
یہ سارے تخمینے غلط نکلے۔ یہ اندازہ لگاتے وقت ہم سب سے زیادہ پر امید اس وجہ سے تھے کہ جنگ ختم ہو رہی تھی۔ جنگ تو بلاشبہ

ختم ہوگئی لیکن اس کی پیدا کی ہوئی زحمتوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔ سارا سامان تعمیر اول تو گراں بہت زیادہ ہے۔ ثانیاً اس کے حاصل کرنے میں ایسی قانونی رکاوٹیں ہیں کہ ان سے عہدہ برآ ہونا صرف انہی لوگوں کے بس کا کام ہے جن کو نہ روپے کی پروا ہو نہ ایمان وضمیر کی۔ ہم ان دونوں چیزوں میں سے کسی چیز کی بھی فیاضی کے ساتھ قربانی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اس وجہ سے ہمارے سامنے وہ ساری مشکلیں اکٹھی ہوگئی ہیں جو ایک بگڑی ہوئی دنیا میں ان لوگوں کو پیش آیا کرتی ہیں جو اپنے اصولوں کی قربانی کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔

محض تعلیمی اسکیم جاری کرنے کے خیال سے ہم نے تعمیرات کا ایک مستقل شعبہ عرصہ ہوا قائم کر دیا ہے اور ایک ذمہ دار کارکن کو دوسری مصروفیتوں سے الگ کر کے، صرف اسی کام کے لیے خاص کر دیا ہے۔ ضرورت کی اہمیت کی وجہ سے سامان تعمیر اور لیبر (مزدور) کی غیر معمولی گرانی کا مسئلہ بھی ہم نے نظر انداز کر دیا تھا۔ صرف ایک خیال سامنے تھا کہ جس طرح اور جس قیمت پر بھی ممکن ہو، جلد سے جلد کام شروع کر دینے کی کوئی شکل پیدا ہو جائے۔ لیکن یہ سب کچھ کرنے کے باوجود افسوس ہے کہ تعمیر کا سلسلہ شروع ہو کر جاری نہ رہ سکا اور بہ ہزار دقت جو سامان تعمیر مہیا ہوا اس سے بھی پورا فائدہ اٹھایا نہ جا سکا۔ یہاں ہم ایسے جنگل میں ہیں کہ آس پاس کوئی ایسی بستی بھی نہیں ہے جہاں کرایہ کے مکانات کا بندوبست کر کے کام کا کچھ سلسلہ جاری ہو سکے اور اگر یہاں سے کچھ دور ہٹ کر اس کا بندوبست کرنے کی کوشش کی جائے تو ایک بڑی دقت یہ پیدا ہوگی کہ فوراً ہمیں درسگاہ کے لیے ایک مستقل اسٹاف کی ضرورت ہوگی۔ مرکز میں کام کرنے والے حضرات سے درسگاہ کے سلسلہ میں ہم کوئی مدد نہ حاصل کر سکیں گے۔ اور یہ ہم اسی وقت کر سکتے ہیں جب ہمارے پاس قابل اعتماد کارکن بھی کافی ہوں اور سرمایہ بھی بھرپور ہو۔ فی الحال نہ ہمارے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ ایک وسیع اسٹاف رکھ سکیں اور نہ اتنے آدمی ہی ہیں کہ ہر شعبہ کے لیے بقدر کفایت ان کی خدمات حاصل کر سکیں۔ ان حالات میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ اس وقت تک ہم مجبوراً تاخیر پر صبر کیا جائے جب تک کسی قابل اعتماد تعمیری تجربہ رکھنے والے شخص کی خدمات ہم کو حاصل نہ ہو جائیں اور سامان تعمیر کی فراہمی اور مزدوروں کے ملنے میں جو رکاوٹیں ہیں وہ دور نہ ہوں۔

تعمیر کی مشکل کے علاوہ ایک بہت بڑی مشکل ہمارے سامنے قابل اعتماد اساتذہ کی بھی ہے۔ ہمارے پیش نظر اگر محض ایک درسگاہ قائم کر دینا ہوتا تو نہایت آسانی سے ہر فن کے پڑھانے والے آدمی بکثرت مل جاتے لیکن ہم اس نصب العین کی خدمت کے لیے درسگاہ قائم کرنا چاہتے ہیں جو جماعت اسلامی کے سامنے ہے۔ اس درسگاہ کے کام کے وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اپنے فکر و عمل میں، اپنے تحقیق و تنقید کے انداز میں، اپنے طریق زندگی اور مقصد زندگی میں سو فیصدی جماعت کے نصب العین کے مطابق ہوں اور علمی و عملی دونوں اعتبارات سے ایسا ذہن اور ایسی سیرت رکھتے ہوں کہ جن لوگوں کی تربیت ان کے سپرد کی جائے ان کو پوری طرح متاثر کر سکیں۔ اس طرح کے اصحاب علم ابھی جماعت میں بہت تھوڑے ہیں اور جو ہیں ان کو مطلوبہ معیار تک پہنچنے کے لیے ابھی خود بھی تربیت پر کافی وقت خرچ کرنا پڑے گا۔ جو اشخاص نئے علوم و افکار سے باخبر ہیں ان کے پاس مذہب کا صحیح علم اتنا نہیں ہے کہ وہ اپنے افکار و نظریات پر اس کی روشنی میں تنقید کر کے اس کے کھرے کھوٹے میں امتیاز کر سکیں اور جو حضرات

مذہب سے باخبر ہیں ان کو ابھی اس بات کا موقع نہیں ملا ہے کہ وہ نئے علوم و افکار کی روشنی میں اپنی معلومات کی قدر و قیمت کا بھی طرح اندازہ کر سکے ہوں۔ ہم کو اس مشکل کا اندازہ پہلے سے تھا۔ ہم یہ توقع نہیں رکھتے تھے کہ ہمیں اپنے مقصد کے مطابق بنے بنائے آدمی باہر سے مل سکیں گے۔ چنانچہ ہم نے اس کے لیے یہ تدبیر سوچ رکھی تھی کہ جو حضرات تعلیمی اسکیم چلانے کے لیے منتخب کیے جائیں ان کو کام شروع کرنے سے پہلے ایک مدت اس مقصد کے لیے دی جائے کہ وہ مرکز میں باہمی مذاکرہ اور تبادلۂ خیالات سے علمی تعاون کی ایسی صورتیں پیدا کر لیں کہ ایک کی کمی دوسرے کی مدد سے پوری ہو سکے۔ لیکن اولاً تو ابھی تک ہم اپنے شرائط کے مطابق آدمی ہی پورے نہیں پا سکے، اور جو حضرات مل بھی سکے ہیں ان کو ابھی مکانات نہ ہونے کی وجہ سے مرکز میں جمع نہیں کر سکے کہ وہ پیش نظر اسکیم کے لیے اپنی تیاریاں شروع کر سکتے۔

سرمایہ کی کمی بھی ہمارے سامنے ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر ہمارے پاس کافی سرمایہ ہوتا تو اس میں شبہہ نہیں کہ ہم کم از کم اس بات کی تو کوئی پروا نہ کرتے کہ چیزیں گراں ہیں۔ لیکن ابھی ہمارا حال یہ نہیں ہے کہ ہم کسی مقصد کے لیے، خواہ وہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو، آزادی کے ساتھ روپیہ صرف کر سکیں۔ جماعت کا تھوڑا سا سرمایہ، جو ہمارے پاس امانت ہے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اور چونکہ جماعت کے باہر کے لوگوں سے مالی امانت کی کوئی درخواست کرنا ہمارے اصول کے بالکل خلاف ہے اس وجہ سے ہم مجبور ہیں کہ جو قدم بھی اٹھائیں وہ جماعت کی مجموعی مالی حالت کو پیش نظر رکھ کر اٹھائیں۔ اس کی وجہ سے ہمارے کاموں میں جتنی دیر بھی ہو ہم اس کو گوارا کریں گے لیکن اس بات کو کبھی گوارا نہ کریں گے کہ جو لوگ ہمارے مقصد کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں رکھتے ان کا سرمایہ ہماری سرپرستی کرے۔ ہمارے دل میں اس بات کی کوئی خواہش نہیں ہے کہ ہم جلد سے جلد لوگوں کو اپنا کوئی کارنامہ دکھا سکیں۔ ہماری کوشش صرف یہ ہے کہ جو کام بھی ہو اصول کے مطابق اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہو۔ اسی طرح کا کام موجب خیر و برکت ہوگا۔ اگر تاخیر سے گھبرا کر ہم نے اپنے اصولوں میں ذرا بھی کمزوری دکھائی تو ایک درسگاہ تو ضرور قائم ہو جائے گی لیکن یہ درسگاہ تجدیدِ انقلاب کی اس جد و جہد میں ہماری کوئی مدد نہیں کر سکے گی جس کے لیے ہم اٹھے ہیں بلکہ الٹے اس بات کا اندیشہ ہے کہ یہ درسگاہ ہمارے سارے کاموں اور سارے منصوبوں کو لے کر بیٹھ جائے گی۔ ہمارے ملک میں بعض درسگاہیں نہایت اہم اصلاحی اور انقلابی مقاصد کے لیے قائم ہوئیں لیکن چونکہ ان میں اس بات کا لحاظ نہیں رکھا گیا کہ جس طرح کے ارادے ان کی تعمیر میں شریک ہیں اسی طرح کے لوگوں کا مال ان کی کفالت کا بار اٹھائے اس وجہ سے بہت جلد ان کے مزاج میں فساد آگیا اور روپیہ دینے والوں کا بلند ہاتھ روپیہ مانگنے والوں کے پست ہاتھ پر اس طرح غالب آگیا کہ وہ سارے مقاصد خاک میں مل گئے جو ان درسگاہوں کے قیام سے پیش نظر تھے۔ ہم اس غلطی کا اعادہ نہیں کرنا چاہتے۔ ہم اس درسگاہ کو اس تحریک کے ایک جزکی حیثیت سے اور اسی کی خاطر چلانا چاہتے ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ جن لوگوں کے دل اس تحریک میں ہمارے ساتھ ہیں انہی کی جیب اس درسگاہ کی مالی ذمہ داریاں اٹھائے تاکہ یہ درسگاہ اس طرح پروان چڑھے جس طرح ایک بچہ اپنی ماں کا دودھ پی کر پروان چڑھتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ابھی جماعت کی حالت ایسی نہیں ہے کہ اس کے بل پر کوئی اس طرح کا بڑا عزم کیا جا سکے لیکن ہم

اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ گر کام کو صحیح طور پر انجام دینا مشکل ہو تو اس کو غلط ہی طور پر کرنا گوارا کر لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ اس کے لیے راہیں پیدا کرے گا۔

درسگاہ کے قیام میں جو دیر ہو رہی ہے اس کی ایک حد تک تلافی کے لیے ہم نے فی الحال یہ شکل سوچی ہے کہ جماعت کے کارکنوں کے لیے ایک عارضی تربیت گاہ جاری کر دی جائے۔ اس تربیت گاہ کا مقصد یہ ہوگا کہ جماعت کے کارکنوں کی ایک متعین تعداد مرکز میں قیام کر کے جماعت کے کاموں کے لیے علمی و عملی ٹریننگ حاصل کرے۔ ان کے درس و مطالعہ کے لیے ایک مختصر نصاب ہوگا۔ اور ایک خاص نظام کے ماتحت ان کو یہاں کے مختلف شعبوں کے فرائض کو سمجھنے اور انجام دینے کا موقع بہم پہنچایا جائے گا۔ اس کام کے لیے مدت کم سے کم رکھی جائے گی اور اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ اس مدت میں ان کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچایا جائے۔ اس وقت ہمارے پاس قیام کے لیے اتنی گنجائش ہے کہ ۱۵۔۔۲۰ آدمی بیک وقت یہاں ٹھہر سکیں گے۔ اگر ۱۵-۱۵ آدمیوں کے کم از کم تین بیچ بھی سال میں یہاں ٹھہر کر تربیت حاصل کر سکے تو بہت جلد جماعت کے اندر تجربہ کار کارکنوں کی کافی تعداد پیدا ہو جائے گی اور آئے دن تربیت نہ پائے ہوئے کارکنوں کی وجہ سے ہمیں جو زحمتیں پیش آ رہی ہیں یا دوسروں کو کبھی کبھی جماعت کے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا ہو جایا کرتی ہیں، ان میں بہت بڑی حد تک کمی ہو جائے گی اور تعلیم و دعوت کی رفتار بھی تیز ہو جائے گی۔ اس چیز کی ضرورت ہماری باہر کی شاخیں بھی محسوس کر رہی ہیں اور ہم بھی نہایت شدت کے ساتھ محسوس کر رہے ہیں لیکن ہم اس تربیت گاہ کو درسگاہ کا ایک جز بنانا چاہتے تھے اور درسگاہ کے قیام میں ہماری اسکیم کے لحاظ سے زیادہ دیر نہیں تھی اس وجہ سے اس کو ٹالتے رہے۔ اب چونکہ بظاہر حالات اس بات کی توقع نہیں ہے کہ درسگاہ اس سال جاری ہو سکے اس وجہ سے مناسب یہی معلوم ہوا کہ کارکنوں کی تربیت کا کام شروع کر دیا جائے۔ انشاء اللہ یہی چیز درسگاہ کا پیش خیمہ بن جائے گی۔ اس مقصد کے لیے پھوس کا ایک مکان موجود ہے۔ صرف فرش ٹھیک ہو جائے اور ضروری سامان اقامت مہیا ہو جائے تو اس کا اعلان کر دیا جائے گا۔

سالانہ اجتماع کا وقت قریب آ رہا ہے۔ گذشتہ اجتماع کے موقع پر ہماری جن شاخوں کی طرف سے آئندہ کے اجتماع کے لیے دعوت نامے ملے تھے ان میں سے مدراس کی جماعت کی دعوت کو خاص اہمیت دی گئی تھی۔ اس اہمیت کی وجہ یہ تھی کہ مرکز سے بہت دور ہونے کی وجہ سے مدراس اس بات کا زیادہ حقدار تھا کہ سالانہ اجتماع کے ذریعہ سے مقصد دعوت کو وہاں تقویت پہنچائی جائے۔ یہی خیال ابتک پیش نظر رہا ہے لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ مدراس میں اجتماع کرنے کی صورت میں جماعت اور ارکان جماعت کا بہت زیادہ روپیہ خرچ ہوگا۔ اب تک جماعت کے ارکان کی بڑی تعداد شمالی ہند میں ہے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ یہاں کے شرکائے اجتماع کی تعداد کسی طرح بھی پانچسو سے کم نہ ہوگی۔ اس سے زیادہ کا امکان ہے۔ اگر ارکان کی اتنی بڑی تعداد کو مدراس جیسے دور دراز علاقہ کا سفر کرنا پڑا تو آمد و رفت کے مصارف اتنے زیادہ ہوں گے کہ لوگ بار محسوس کریں گے اور بالفرض لوگ، مقصد کی محبت میں بار نہ بھی محسوس کریں جب بھی یہ بات کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی کہ بغیر کسی غیر معمولی سبب کے ارکان کو اس طرح کے ایثار پر مجبور کیا جائے

اس وجہ سے غور و فکر کے بعد یہ طے کیا گیا کہ سالانہ اجتماع تو یوپی میں ہو البتہ مرکز کے کارکنوں کا ایک وفد مدراس کا دورہ کرے۔ اس صورت میں ایک طرف تو ہر صوبہ کے ارکان کے لیے سفر نسبتاً کم خرچ اور آسان ہو جائے گا، دوسری طرف مدراس میں سالانہ اجتماع کے انعقاد سے جو غرض پیش نظر تھی وہ بھی بہتر طریق پر حاصل ہو سکے گی۔ وفد بنا کر دورہ کرنے کی صورت میں جس جزرسی اور وسعت کے ساتھ صوبہ کے حالات اور تحریک کے لیے اس کی صلاحیتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اس جزرسی اور تفصیل کے ساتھ سالانہ اجتماع کی صورت میں ممکن نہیں ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے مدراس کے رفقا بھی اس تجویز کو زیادہ پسند کریں گے اور یہ خیال نہ کریں گے کہ ان کی دعوت کی قدر نہیں کی گئی۔ اصل چیز مقصد ہے وہ جس صورت میں بہتر طریق پر حاصل ہو اس کے لیے جماعت کے ارکان کو اپنی انفرادی سہولتیں اور خواہشیں ہمیشہ قربان کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

یہ مسئلہ ابھی زیر غور ہے کہ اجتماع کے لیے یوپی کا کون سا شہر موزوں ہوگا؟ ظن غالب ہے کہ الٰہ آباد یا کانپور کا انتخاب ہوگا۔ اس بارہ میں یوپی کی جماعتوں سے مراسلت ہو رہی ہے۔ ان کی تجاویز آ جانے کے بعد مرکز کی طرف سے آخری فیصلہ ہوگا۔ اور اس کا ان صفحات میں اعلان کر دیا جائے گا۔

اجتماع سے متعلق ضروری ہدایات اس سے پہلے کے اجتماعات کے موقع پر دی گئی ہیں۔ اس موقع پر مزید جن ہدایات کی ضرورت سمجھی جائے گی وہ بھی شائع ہو جائیں گی۔ بروقت صرف یوپی کے ارکان جماعت سے یہ کہنا ہے کہ وہ جس حد تک اس دعوت کو پھیلانے میں کوشش کر سکتے ہوں اسے اٹھا نہ رکھیں۔ سالانہ اجتماع کا اصلی فائدہ اسی صورت میں حاصل ہو سکے گا جب اجتماع سے پہلے ایک وسیع حلقہ کے ذہن کو اچھی طرح تحریک کے مالہ وماعلیہ سے آشنا کر دیا جائے۔ اس کا آسان طریقہ لٹریچر کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا ہے۔ جن لوگوں تک ہمارا لٹریچر پہنچ جائے گا ان میں بڑی تعداد ان شاء اللہ ایسے لوگوں کی نکلے گی جو جماعت کے نصب العین سے قریب آ جائیں گے اور سالانہ اجتماع کے موقع پر اگر ان میں سے کچھ لوگ اپنے شبہات و شکوک دور کرنا چاہیں گے تو نہایت آسانی کے ساتھ کر سکیں گے۔ درحقیقت اسی طرح کے لوگوں تک پہنچنے اور ان کے ذہنوں میں اپنے مقصد کو اتارنے کے لیے یہ صورت اختیار کی گئی ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں اجتماعات کیے جائیں۔ اگر یہ چیز مد نظر نہ ہوتی تو اجتماعات کو ہم اپنے پروگرام سے بالکل خارج کر دیتے۔ اس امر سے پہلے سے اس وجہ سے آگاہ کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ بالکل خالی الذہن ہمارے اجتماعات میں شریک ہوتے ہیں وہ ان سے بالکل فائدہ نہیں اٹھا سکتے بلکہ بسا اوقات اس بات کا اندیشہ رہتا ہے کہ وہ کسی غلط فہمی میں پڑ جائیں۔

تفہیم القرآن

(۳۱)

التوبہ

(از وسط رکوع ۱۳ تا وسط رکوع ۱۴)

کچھ اور لوگ ہیں جنھوں نے ایک مسجد بنائی اس غرض کے لیے کہ (دعوت حق کو) نقصان پہنچائیں، اور (خدا کی بندگی کرنے کے بجائے) کفر کریں، اور اہل ایمان میں پھوٹ ڈالیں، اور (اس بظاہر عبادت گاہ کو) اس شخص کے لیے کمینگاہ بنائیں جو اس سے پہلے خدا اور اس کے رسول کے خلاف برسرِ پیکار رہ چکا ہے۔ وہ ضرور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا نہ تھا مگر اللہ گواہ ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔ تم ہرگز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا۔ جو مسجد اول روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی وہی اس کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہو، اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں۔[۱۰۵] پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے

---

۱۰۵ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینے تشریف لے جانے سے پہلے قبیلۂ خزرج میں ایک شخص ابوعامر نامی تھا جو زمانۂ جاہلیت میں عیسائی راہب بن گیا تھا۔ اس کا شمار علمائے اہل کتاب میں ہوتا تھا اور رہبانیت کی وجہ سے اس کے علمی وقار کے ساتھ ساتھ اس کی درویشی کا سکہ بھی مدینے اور اس کے اطراف کے جاہل عربوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے پہنچے تو اس کی مشیخت وہاں خوب چل رہی تھی۔ مگر یہ علم اور یہ درویشی اس کے اندر حق شناسی اور حق جوئی پیدا کرنے کے بجائے الٹی اس کے لیے ایک زبردست حجاب بن گئی اور اس حجاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضور کی تشریف آوری کے بعد وہ محض نعمت ایمان ہی سے محروم نہ رہا بلکہ آپ کو اپنی مشیخت کا حریف اور اپنے کاروبار درویشی کا دشمن سمجھ کر آپ کی اور آپ کے کام کی مخالفت پر کمربستہ ہوگیا۔ پہلے دو سال تک تو اسے یہ امید رہی کہ کفار قریش کی طاقت ہی اسلام کو مٹانے کے لیے کافی ثابت ہوگی۔ لیکن جنگ بدر میں جب قریش نے شکست فاش کھائی تو اسے یارائے ضبط نہ رہا۔ اسی سال وہ مدینہ سے نکل کھڑا ہوا اور اس نے قریش اور دوسرے عرب قبائل میں اسلام کے خلاف تبلیغ شروع کردی۔ جنگ احد جن لوگوں کی سعی سے برپا ہوئی ان میں یہ بھی شامل تھا اور کہا جاتا ہے کہ احد کے میدان جنگ میں اسی نے وہ گڑھے کھدوائے تھے جن میں سے ایک میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم گر کر زخمی ہوئے۔ پھر جنگ احزاب میں جو لشکر ہر طرف سے مدینہ پر چڑھ آئے تھے ان کو چڑھا لانے میں بھی اس کا حصہ نمایاں تھا۔ اس کے بعد جنگ حنین تک جتنی لڑائیاں مشرکین عرب اور مسلمانوں کے درمیان ہوئیں ان سب میں یہ عیسائی درویش اسلام کے خلاف شرک کا سرگرم حامی رہا۔ آخرکار اسے اس بات سے مایوسی ہوگئی کہ عرب کی کوئی طاقت اسلام کے سیلاب کو روک سکے گی، اس لیے عرب کو چھوڑ کر اس نے روم کا رخ کیا تاکہ قیصر کو اس "خطرے" سے آگاہ کرے جو عرب سے سر اٹھا رہا تھا۔ یہ وہی موقع تھا جب مدینہ میں (باقی حاشیہ صفحہ ...)

اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر پر اٹھائی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸) یہ اطلاعات پہنچیں کہ قیصر عرب پر چڑھائی کی تیاریاں کر رہا ہے اور اسی کی روک تھام کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تبوک کی مہم پر جانا پڑا۔

ابو عامر راہب کی ان تمام سرگرمیوں میں مدینہ کے منافقین کا ایک گروہ اس کے ساتھ شریک سازش تھا، اور اس آخری تجویز میں بھی یہ لوگ اس کے ہم نوا تھے کہ وہ اپنے مذہبی اثر کو استعمال کر کے اسلام کے خلاف قیصر روم اور شمالی عرب کی عیسائی ریاستوں سے فوجی امداد حاصل کرے۔ جب وہ روم کی طرف روانہ ہونے لگا تو اس کے اور ان منافقوں کے درمیان یہ قرارداد ہوئی کہ مدینہ میں یہ لوگ اپنی ایک الگ مسجد بنا لیں گے تاکہ عام مسلمانوں سے بچ کر منافق مسلمانوں کی علیحدہ جتھہ بندی اس طرح کی جا سکے کہ اس پر مذہب کا پردہ پڑا رہے اور آسانی سے اس پر کوئی شبہ نہ کیا جا سکے، اور وہاں نہ صرف یہ کہ منافقین منظم ہو سکیں اور آئندہ کارروائیوں کے لیے مشورے کر سکیں بلکہ ابو عامر کے پاس سے جو ایجنٹ خبریں اور ہدایات لے کر آئیں وہ بھی غیر مشتبہ فقیروں اور مسافروں کی حیثیت سے اس مسجد میں ٹھہر سکیں۔ یہ تھی وہ ناپاک سازش جس کے مطابق وہ مسجد تیار کی گئی جس کا ان آیات میں ذکر کیا گیا ہے۔

مدینہ میں اس وقت دو مسجدیں تھیں، ایک مسجد قبا جو شہر کے مضافات میں تھی، دوسری مسجد نبوی جو شہر کے اندر تھی۔ ان دو مسجدوں کی موجودگی میں ایک تیسری مسجد بنانے کی کوئی ضرورت نہ تھی، اور وہ زمانہ ایسی احمقانہ مذہبیت کا نہ تھا کہ مسجد کے نام سے ایک عمارت بنا دینا بجائے خود کار ثواب ہو، قطع نظر اس سے کہ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ بلکہ اس کے برعکس ایک نئی مسجد بننے کے معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کی جماعت میں خواہ مخواہ تفریق رونما ہو جسے ایک صالح اسلامی نظام کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا۔ اسی لیے یہ لوگ مجبور ہوئے کہ اپنی علیحدہ مسجد بنانے سے پہلے اس کی ضرورت ثابت کریں۔ چنانچہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور اس تعمیر نو کے لیے یہ ضرورت پیش کی کہ بارش میں اور جاڑے کی راتوں میں عام لوگوں کو اور خصوصاً ضعیفوں اور معذوروں کو، جو ان دونوں مسجدوں سے دور رہتے ہیں، پانچوں وقت حاضری دینی مشکل ہوتی ہے، لہٰذا ہم محض نمازیوں کی آسانی کے لیے یہ ایک نئی مسجد تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔

ان پاکیزہ ارادوں کی نمائش کے ساتھ جب یہ مسجد ضرار بن کر تیار ہو گئی تو یہ اشرار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے درخواست کی کہ آپ ایک مرتبہ خود نماز پڑھا کر ہماری مسجد کا افتتاح فرما دیں۔ مگر آپ نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "اس وقت میں جنگ کی تیاری میں مشغول ہوں اور ایک بڑی مہم درپیش ہے۔ اس مہم سے واپس آ کر دیکھوں گا"۔ اس کے بعد آپ تبوک کی طرف روانہ ہو گئے اور آپ کے پیچھے یہ لوگ اس مسجد میں اپنی جتھہ بندی اور سازش کرتے رہے، حتیٰ کہ انھوں نے یہاں تک طے کر لیا کہ اُدھر رومیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قلع قمع ہو اور اِدھر یہ فوراً ہی عبداللہ ابن اُبی کے سر پر تاج شاہی رکھ دیں۔ لیکن تبوک میں جو معاملہ پیش آیا اس نے ان کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ واپسی پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے قریب ذی اَوان کے مقام پر پہنچے تو یہ آیات نازل ہوئیں اور آپ نے اسی وقت چند آدمیوں کو مدینہ کی طرف بھیج دیا تاکہ آپ کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے پہلے وہ اس مسجد ضرار کو مسمار کر دیں۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ۱۰۵ متن میں لفظ "جُرُف" استعمال ہوا ہے جس کا اطلاق عربی زبان میں کسی ندی یا دریا کے اس کنارے پر ہوتا ہے جس کے نیچے کی مٹی کو پانی نے کاٹ کاٹ کر بہا دیا ہو اور اوپر کا حصہ بے سہارا کھڑا ہو۔ جو لوگ اپنے عمل کی بنیاد خدا سے بے خوفی اور اس کی رضا سے بے نیازی پر رکھتے ہیں ان کی تعمیر حیات کو یہاں اس عمارت سے تشبیہ دی گئی ہے جو ایسے ایک کھوکھلے بے ثبات کنارۂ دریا پر اٹھائی گئی ہو۔ یہ ایک بے نظیر تشبیہ ہے جس سے زیادہ بہتر طریقے سے اس صورت حال کا نقشہ کشی نہیں کی جا سکتی۔ اس کی پوری معنویت ذہن نشین کرنے کے لیے یوں سمجھیے کہ دنیوی زندگی کی وہ ظاہری سطح جس پر مومن، منافق، کافر، صالح، فاجر، غرض تمام انسان کام کرتے ہیں، مٹی کی اُس اوپری تہ کے مانند ہے جس پر دنیا میں ساری (باقی حاشیہ صفحہ ۱۰ پر)

اور وہ اسے لے کر سیدھی جہنم کی آگ میں جا گری؟ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا[۱]۔ یہ عمارت جو انھوں نے بنائی ہے، ہمیشہ ان کے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بنی رہے گی (جس کے نکلنے کی اب کوئی صورت نہیں) بجز اس کے کہ ان کے دل ہی پارہ پارہ ہو جائیں[۲]۔ اللہ نہایت باخبر اور حکیم و دانا ہے۔ ع

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں[۳]۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹) عمارتیں بنائی جاتی ہیں۔ یہ تو اپنے اندر خود کوئی پائیداری نہیں رکھتی، بلکہ اس کی پائیداری کا انحصار اس پر ہے کہ اس کے نیچے ٹھوس زمین موجود ہو۔ اگر کوئی تہ ایسی ہو جس کے نیچے کی زمین کسی چیز، مثلاً دریا کے پانی سے کٹ چکی ہو تو ہونا واقف انسان اس کی ظاہری حالت سے دھوکا کھا کر اس پر اپنا مکان بنائے گا اُسے وہ اس کے مکان سمیت لے بیٹھے گی اور وہ نہ صرف خود ہلاک ہوگا بلکہ اس ناپائیدار بنیاد پر اعتماد کر کے اپنا جو کچھ سرمایۂ زندگی وہ اس عمارت میں جمع کرے گا وہ بھی برباد ہو جائے گا۔ بالکل اسی مثال کے مطابق حیات دنیا کی وہ ظاہری سطح بھی جس پر ہم سب اپنے کارنامۂ زندگی کی عمارت اٹھاتے ہیں، بجائے خود کوئی ثبات و قرار نہیں رکھتی بلکہ اس کی مضبوطی و پائیداری کا انحصار اس پر ہے کہ اس کے نیچے خدا کے خوف، اُس کے حضور جوابدہی کے احساس اور اُسکی مرضی کے اتباع کی ٹھوس چٹان موجود ہو۔ جو نادان آدمی محض حیات دنیا کے ظاہری پہلو پر اعتماد کر لیتا ہے اور دنیا میں خدا سے بے خوف اور اس کی رضا سے بے پروا ہو کر کام کرتا ہے وہ دراصل خود اپنی تعمیر زندگی کے نیچے سے اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے اور اس کا آخری انجام اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ بے بنیاد سطح جس پر اس نے اپنی عمر بھر کا سرمایۂ عمل جمع کیا ہے ایک دن یکایک گر جائے اور اسے اس کے پورے سرمایے سمیت لے بیٹھے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] "سیدھی راہ" یعنی وہ راہ جس سے انسان بامراد ہوتا اور حقیقی کامیابی کی منزل پر پہنچتا ہے۔

[۲] یعنی ان لوگوں نے منافقانہ مکر و دغا کے اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کر کے اپنے دلوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایمان کی صلاحیت سے محروم کر لیا ہے اور بے ایمانی کا روگ اس طرح ان کے دلوں کے ریشے ریشے میں پیوست ہو گیا ہے کہ جب تک ان کے دل باقی ہیں یہ روگ بھی ان میں موجود رہے گا۔ خدا سے کفر کرنے کے لیے جو شخص علانیہ بت خانہ بنائے یا اس کے دین سے لڑنے کے لیے کھلم کھلا مورچے اور دمدمے تیار کرے اس کی ہدایت تو کسی نہ کسی وقت ممکن ہے، کیونکہ اس کے اندر راستبازی، اخلاص اور اخلاقی جرأت کا وہ جوہر تو بنیادی طور پر محفوظ رہتا ہے جو حق پرستی کے لیے بھی اسی طرح کام آسکتا ہے جس طرح باطل پرستی کے کام آتا ہے۔ لیکن جو بزدل جھوٹا اور مکار انسان کفر کے لیے مسجد بنائے اور خدا کے دین سے لڑنے کے لیے خدا پرستی کا پُرفریب لبادہ اوڑھے اس کی سیرت کو تو نفاق کی دیمک کھا چکی ہوتی ہے۔ اس میں یہ طاقت ہی کہاں باقی رہ سکتی ہے کہ مخلصانہ ایمان کا بوجھ سہار سکے۔

[۳] یہاں ایمان کے اُس معاملے کو جو خدا اور بندے کے درمیان طے ہوتا ہے، بیع سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایمان محض ایک مابعد الطبیعیاتی عقیدہ نہیں ہے بلکہ فی الواقع وہ ایک معاہدہ ہے جس کی رو سے بندہ اپنا نفس اور اپنا مال خدا کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے اور اس کے معاوضہ میں خدا کی طرف سے اس وعدے کو قبول کر لیتا ہے کہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں وہ اسے جنت عطا کرے گا۔ اس اہم مضمون کے تضمنات کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس بیع کی حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔

جہاں تک اصل حقیقت کا تعلق ہے، اُس کے لحاظ سے تو انسان کی جان و مال کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے کیونکہ وہی اس کا اور ان ساری چیزوں کا خالق ہے جو اس کے پاس ہیں اور اسی نے وہ سب کچھ اسے بخشا ہے جس پر وہ تصرف کر رہا ہے، لہٰذا اس حیثیت سے تو خرید و فروخت کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا نہ انسان کا اپنا کچھ ہے کہ وہ اسے بیچے، نہ کوئی چیز خدا کی ملکیت سے خارج ہے کہ وہ اسے خریدے۔ لیکن ایک چیز انسان (باقی حاشیہ صفحہ ۱۱ پر)

اور مارتے اور مرتے ہیں، ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمّے ایک پختہ وعدہ ہے توراۃ و انجیل

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰) کے اندر ایسی بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے کلیۃً اس کے حوالے کردیا ہے، اور وہ ہے اس کا اختیار، یعنی اس کا اپنے انتخاب و ارادہ میں آزاد ہونا (free will + freedom of choice) اس اختیار کی بنا پر حقیقت نفس الامری تو نہیں بدلتی مگر انسان کو ... امر کی خودمختاری حاصل ہو جاتی ہے کہ چاہے تو حقیقت کو تسلیم کرے ورنہ انکار کردے۔ بالفاظ دیگر اس اختیار کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان فی الحقیقت اپنے نفس کا اور اپنے ذہن و جسم کی قوتوں کا اور ان اقتدارات کا جو اسے دنیا میں حاصل ہیں، مالک ہو گیا ہے اور اسے یہ حق مل گیا ہے کہ ان چیزوں کو جس طرح چاہے استعمال کرے، بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اسے اس امر کی آزادی دیدی گئی ہے کہ خدا کی طرف سے کسی جبر کے بغیر وہ خود ہی اپنی ذات پر اور اپنی ہر چیز پر خدا کے حقوق مالکانہ کو تسلیم کرنا چاہے تو کرے، ورنہ آپ ہی اپنا مالک بن بیٹھے اور اپنے زعم میں یہ خیال کرے کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر اپنے حدود اختیار میں اپنے حسب منشا تصرف کرنے کا حق رکھتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے بیع کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ دراصل یہ بیع اس معنی میں نہیں ہے کہ جو چیز انسان کی ہے خدا اسے خریدنا چاہتا ہے، بلکہ اس معاملہ کی صحیح نوعیت یہ ہے کہ جو چیز خدا کی ہے اور جسے اس نے امانت کے طور پر انسان کے حوالے کیا ہے اور جس میں امین رہنے یا خائن بن جانے کی آزادی اس نے انسان کو دے رکھی ہے، اس کے بارے میں وہ انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ تو برضا و رغبت (نہ کہ بمجبوری) میری چیز کو میری ہی چیز مان لے، اور زندگی بھر اس میں خود مختار مالک کی حیثیت سے نہیں بلکہ امین ہونے کی حیثیت سے تصرف کرنا قبول کر، اور خیانت کی جو آزادی تجھے حاصل ہے اس سے خود بخود دست بردار ہو جا۔ اس طرح اگر تو دنیا کی موجودہ عارضی زندگی میں اپنی خود مختاری کو (جو تیری حاصل کردہ نہیں بلکہ میری عطا کردہ ہے) میرے ہاتھ فروخت کر دے گا تو میں تجھے بعد کی جاودانی زندگی میں اس کی قیمت بصورت جنت ادا کروں گا۔ جو انسان خدا کے ساتھ بیع کا یہ معاملہ طے کرلے وہ مومن ہے اور ایمان دراصل اسی بیع ہی کا دوسرا نام ہے، اور جو شخص اس سے انکار کر دے، یا اقرار کرنے کے باوجود ایسا رویہ اختیار کرے جو بیع نہ کرنے کی صورت ہی میں اختیار کیا جا سکتا ہے، وہ کافر ہے اور اس بیع ہی سے گریز کا اصطلاحی نام کفر ہے۔

بیع کی اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب اس کے تضمنات کا تجزیہ کیجیے:-

(۱) اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو بہت بڑی آزمائشوں میں ڈالا ہے۔ پہلی آزمائش اس امر کی کہ آزاد چھوڑ دیے جانے پر یہ اتنی شرافت دکھاتا ہے یا نہیں کہ مالک ہی کو مالک سمجھے اور نمک حرامی و بغاوت پر نہ اتر آئے۔ دوسری آزمائش اس امر کی کہ یہ اپنے خدا پر اتنا اعتماد کرتا ہے یا نہیں کہ جو قیمت آج نقد نہیں مل رہی ہے بلکہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں جس کے ادا کرنے کا خدا کی طرف سے وعدہ ہے اس کے عوض اپنی آج کی خود مختاری اور اس کے مزے بیچ دینے پر بخوشی راضی ہو جائے۔

(۲) دنیا میں جس فقہی قانون پر اسلامی سوسائٹی مبنی ہے اس کی رو سے تو ایمان بس چند عقائد کے اقرار کا نام ہے جس کے بعد کوئی قاضی شرع کسی کے غیر مومن یا خارج از ملت ہونے کا حکم نہیں لگا سکتا جب تک اس امر کا کوئی صریح ثبوت اسے نہ مل جائے کہ وہ اپنے اقرار میں جھوٹا ہے۔ لیکن خدا کے ہاں جو ایمان معتبر ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ خیال اور عمل دونوں میں اپنی آزادی و خود مختاری کو خدا کے ہاتھ بیچ دے اور اس کے حق میں اپنے ادعائے ملکیت سے کلیۃً دست بردار ہو جائے۔ پس اگر کوئی شخص کلمۂ اسلام کا اقرار کرتا ہو اور صوم و صلوٰۃ وغیرہ احکام کا بھی پابند ہو لیکن اپنے جسم و جان کا، اپنے دل و دماغ اور بدن کی قوتوں کا، اپنے مال اور وسائل و ذرائع کا، اور اپنے قبضہ و اختیار کی ساری چیزوں کا، مالک اپنے آپ ہی کو سمجھتا ہو، اور ان میں اپنے حسب منشا تصرف کرنے کی آزادی اپنے لیے محفوظ رکھتا ہو، تو ہو سکتا ہے کہ دنیا میں وہ مومن سمجھا جاتا رہے مگر خدا کے ہاں یقیناً وہ غیر مومن ہی قرار پائے گا کیونکہ اس نے خدا کے ساتھ وہ بیع کا معاملہ سرے سے کیا ہی نہیں ہے جو قرآن کی رو سے ایمان کی اصل حقیقت ہے۔ جہاں خدا کی مرضی ہو وہاں جان و مال کھپانے سے دریغ کرنا (باقی صفحہ ۱۲ پر)

اور قرآن میں[۵]۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھکر اپنے عہد کو پورا کرنے والا ہو۔ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱) اور جہاں اس کی مرضی نہ ہو وہاں جان و مال کھپانا، یہ دونوں طرزِ عمل ایسے ہیں جو اس بات کا قطعی فیصلہ کر دیتے ہیں کہ مدعی ایمان نے یا تو جان و مال کو خدا کے ہاتھ بیچا ہی نہیں ہے، یا بیع کا معاہدہ کر لینے کے بعد بھی وہ بکی ہوئی چیز کو بدستور اپنی سمجھ رہا ہے۔

(۳) ایمان کی یہ حقیقت اسلامی رویۂ زندگی اور کافرانہ رویۂ زندگی کو شروع سے آخر تک بالکل ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہے۔ مسلم جو صحیح معنی میں خدا پر ایمان لایا ہو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں خدا کی مرضی کا تابع بن کر کام کرتا ہے اور اس کے رویہ میں کسی جگہ بھی خود مختاری کا رنگ نہیں آنے پاتا۔ الا یہ کہ عارضی طور پر کسی وقت اس پر غفلت طاری ہو جائے اور وہ خدا کے ساتھ اپنے معاہدۂ بیع کو بھول کر کوئی خود مختارانہ حرکت کر بیٹھے۔ اسی طرح جو گروہ اہل ایمان سے مرکب ہو وہ اجتماعی طور پر بھی کوئی پالیسی، کوئی سیاست، کوئی طرزِ تمدن و تہذیب، کوئی طریق معیشت و معاشرت اور کوئی بین الاقوامی رویہ خدا کی مرضی اور اس کے قانونِ شرعی کی پابندی سے آزاد ہو کر اختیار نہیں کر سکتا، اور اگر کسی عارضی غفلت کی بنا پر اختیار کر بھی جائے تو جس وقت اسے تنبہ ہو اسی وقت وہ آزادی کا رویہ چھوڑ کر بندگی کے رویہ کی طرف پلٹ آتا ہے۔ خدا سے آزاد ہو کر کام کرنا اور اپنے نفس و متعلقاتِ نفس کے بارے میں خود یہ فیصلہ کرنا کہ ہم کیا کریں اور کیا نہ کریں، بہرحال ایک کافرانہ رویۂ زندگی ہے خواہ اس پر چلنے والے لوگ "مسلمان" کے نام سے موسوم ہوں یا "غیر مسلم" کے نام سے۔

(۴) اس بیع کی رو سے خدا کی جس مرضی کا اتباع مومن پر لازم آتا ہے وہ اس کی اپنی تجویز کردہ مرضی نہیں بلکہ وہ مرضی ہے جو خدا خود بتائے۔ اپنے آپ کسی چیز کو خدا کی مرضی ٹھیرا لینا اور اس کا اتباع کرنا خدا کی مرضی کا نہیں بلکہ اپنی ہی مرضی کا اتباع ہے اور یہ معاہدۂ بیع کے قطعی خلاف ہے۔ خدا کے ساتھ اپنے معاہدۂ بیع پر صرف وہی شخص اور وہی گروہ قائم سمجھا جائے گا جو اپنا پورا رویۂ زندگی خدا کی کتاب اور اس کے پیغمبر کی ہدایت سے اخذ کرتا ہو۔

یہ اس بیع کے تضمنات ہیں، اور ان کو سمجھ لینے کے بعد یہ بات بھی خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس خرید و فروخت کے معاملہ میں قیمت (یعنی جنت) کو موجودہ دنیوی زندگی کے خاتمہ پر کیوں موخر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جنت صرف اس اقرار کا معاوضہ نہیں ہے کہ "بائع نے اپنا نفس و مال خدا کے ہاتھ بیچ دیا" بلکہ اس عمل کا معاوضہ ہے کہ "بائع اپنی دنیوی زندگی میں اس بکی ہوئی چیز پر خود مختارانہ تصرف چھوڑ دے اور خدا کا امین بن کر اس کی مرضی کے مطابق تصرف کرے"۔ لہٰذا یہ فروخت مکمل ہی اس وقت ہوگی جب کہ بائع کی دنیوی زندگی ختم ہو جائے اور فی الواقع یہ ثابت ہو کہ اس نے معاہدۂ بیع کرنے کے بعد سے اپنی دنیوی زندگی کے آخری لمحہ تک بیع کی شرائط پوری کی ہیں۔ اس سے پہلے وہ ازروئے انصاف قیمت پانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

ان امور کی توضیح کے ساتھ یہ بھی جان لینا چاہیے کہ اس سلسلہ بیان میں یہ مضمون کس مناسبت سے آیا ہے۔ اوپر سے جو سلسلۂ تقریر چل رہا تھا اس میں ان لوگوں کا ذکر تھا جنھوں نے ایمان لانے کا اقرار کیا تھا مگر جب امتحان کا نازک موقع آیا تو ان میں سے بعض نے تساہل کی بنا پر، بعض نے اخلاص کی کمی کی وجہ سے، اور بعض نے قطعی منافقت کی راہ سے خدا اور اس کے دین کی خاطر اپنے وقت، اپنے مال، اپنے مفاد اور اپنی جان کو قربان کرنے میں دریغ کیا۔ لہٰذا ان مختلف اشخاص اور طبقوں کے رویہ پر تنقید کرنے کے بعد اب ان کو صاف صاف بتایا جا رہا ہے کہ وہ ایمان جسے قبول کرنے کا تم نے اقرار کیا ہے محض یہ مان لینے کا نام نہیں ہے کہ خدا ہے اور وہ ایک ہے، بلکہ دراصل وہ اس امر کا اقرار ہے کہ خدا ہی تمہارے نفس اور تمہارے مال کا مالک ہے۔ پس یہ اقرار کرنے کے بعد اگر تم اس نفس و مال کو خدا کے حکم پر قربان کرنے سے جی چراتے ہو اور اپنے نفس کی قوتوں کو، نیز اپنے ذرائع کو اس کے منشا کے خلاف استعمال کرتے ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم اپنے اقرار میں جھوٹے ہو۔ سچے اہل ایمان صرف وہ لوگ ہیں جو واقعی اپنا نفس و مال خدا کے ہاتھ بیچ چکے ہیں اور اسی کو ان چیزوں کا مالک سمجھتے ہیں، جہاں اس کا حکم ہوتا ہے وہاں انھیں بے دریغ قربان کرتے ہیں، اور جہاں اس کا حکم نہیں ہوتا وہاں نفس کی طاقتوں کا کوئی ادنیٰ سا جز اور مالی ذرائع کا کوئی ذرا سا حصہ بھی خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۵] اس امر پر بہت اعتراضات کیے گئے ہیں کہ جس وعدے کا یہاں ذکر ہے وہ توراۃ اور انجیل میں موجود نہیں ہے۔ مگر جہاں تک (باقی صفحہ ۱۳ پر)

سے چکا گیا ہے، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے[۱]، اس کی بندگی بجا لانے والے، اس کی تعریف

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۲) انجیل کا تعلق ہے یہ اعتراضات بے بنیاد ہیں۔ جو اناجیل اس وقت دنیا میں موجود ہیں ان میں حضرت مسیح علیہ السلام کے متعدد اقوال ہم کو ایسے ملتے ہیں جو اس آیت کے ہم معنی ہیں، مثلاً:

"مبارک ہیں وہ جو راستبازی کے سبب ستائے گئے ہیں، کیونکہ آسمان کی بادشاہت انہی کی ہے" (متی ۵ : ۱۰)

"جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اسے کھوئے گا اور جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھوتا ہے اسے بچائے گا" (متی ۱۰ : ۳۹)

"جس کسی نے گھروں یا بھائیوں یا بہنوں یا باپ یا ماں یا بچوں یا کھیتوں کو میرے نام کی خاطر چھوڑ دیا ہے اس کو سو گنا ملے گا اور ہمیشہ کی زندگی کا وارث ہوگا۔" (متی ۱۹ : ۲۹، ۳۰)

البتہ تورات جس صورت میں اس وقت موجود ہے اس میں بلاشبہ یہ مضمون نہیں پایا جاتا، اور یہی مضمون کیا، وہ تو حیات بعد الموت اور یوم الحساب اور اخروی جزا و سزا کے تصور ہی سے خالی ہے، حالانکہ یہ عقیدہ ہمیشہ سے دین حق کا جزو لاینفک رہا ہے۔ لیکن موجودہ تورات میں اس مضمون کے نہ پائے جانے سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ واقعی توراۃ اس سے خالی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہود اپنے زمانۂ تنزل میں کچھ ایسے مادہ پرست اور دنیا کی خوشحالی کے بھوکے ہوگئے تھے کہ ان کے نزدیک نعمت اور انعام کے کوئی معنی اس کے سوا نہ رہے تھے کہ وہ اسی دنیا میں حاصل ہو۔ اسی لیے کتاب الٰہی میں بندگی و اطاعت کے بدلے جن جن انعامات کے وعدے ان سے کیے گئے تھے ان سب کو وہ دنیا ہی میں اتار لائے اور جنت کی ہر تعریف کو انہوں نے فلسطین کی سرزمین پر چسپاں کر دیا جس کے وہ امیدوار تھے۔ مثال کے طور پر توراۃ میں متعدد مقامات پر ہم کو یہ مضمون ملتا ہے:-

"سن اے اسرائیل: خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔ تو اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری طاقت سے خداوند اپنے خدا سے محبت کر" (استثناء ۶ : ۴، ۵)

لیکن اس عمل کی جو جزا بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ تم اُس ملک کے مالک ہو جاؤ گے جس میں دودھ اور شہد بہتا ہے یعنی فلسطین۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ توراۃ جس صورت میں اس وقت پائی جاتی ہے وہ خالص کلام الٰہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سا تفسیری کلام بھی خدا کے کلام کے ساتھ ساتھ شامل کر دیا گیا ہے۔ اور یہودیوں کی قومی روایات، ان کے نسلی تعصبات، ان کے اوہام، ان کی آرزوؤں اور تمناؤں، ان کی غلط فہمیوں، اور ان کے فقہی اجتہادات کا ایک معتدبہ حصہ ایک ہی سلسلۂ عبارت میں کلام الٰہی کے ساتھ کچھ اس طرح رل مل گیا ہے کہ اکثر مقامات پر اصل کلام کو ان زوائد سے ممیز کرنا قطعاً غیر ممکن ہو جاتا ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] متن میں لفظ التائبون استعمال ہوا ہے جس کا لفظی ترجمہ "توبہ کرنے والے" ہے۔ لیکن جس انداز کلام میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ توبہ کرنا اہل ایمان کی مستقل صفات میں سے ہے، اس لیے اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ وہ ایک ہی مرتبہ توبہ نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ توبہ کرتے رہتے ہیں، اور توبہ کے اصل معنی رجوع کرنے یا پلٹنے کے ہیں، لہٰذا اس لفظ کی حقیقی روح ظاہر کرنے کے لیے ہم نے اس کا تشریحی ترجمہ یوں کیا ہے کہ "وہ اللہ کی طرف بار بار پلٹتے ہیں"۔ مومن اگرچہ اپنے پورے شعور و ارادہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اپنے نفس و مال کی بیع کا معاملہ کرتا ہے، لیکن چونکہ ظاہر حال کے لحاظ سے محسوس یہی ہوتا ہے کہ نفس اس کا اپنا ہے اور مال اس کا اپنا ہے، اور یہ بات کہ اصل نفس و مال کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے ایک امر محسوس نہیں بلکہ محض ایک امر معقول ہے، اس لیے مومن کی زندگی میں بارہا ایسے مواقع پیش آتے رہتے ہیں جبکہ وہ عارضی طور پر خدا کے ساتھ اپنے معاملۂ بیع کو بھول جاتا ہے اور اس سے غافل ہو کر کوئی خود مختارانہ طرز عمل اختیار کر بیٹھتا ہے۔ مگر ایک حقیقی مومن کی صفت یہ ہے کہ جب بھی اس کی یہ عارضی بھول دور ہوتی ہے اور وہ اپنی غفلت سے چونکتا ہے اور اس کو یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ غیر شعوری طور پر وہ اپنے عہد کی خلاف ورزی کر گزرا ہے تو (باقی صفحہ ۲۱۴ پر)

کے گن گانے والے، اس کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے[۵۱]، اس کے آگے رکوع اور سجدے کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، بدی سے روکنے والے، اور اللہ کے حدود کی حفاظت کرنے والے[۵۲]، (اس شان کے ہوتے ہیں وہ مومن جو اللہ سے خرید و فروخت کا یہ معاملہ طے کرتے ہیں) اور اے نبی ان مومنوں کو خوشخبری دیدو۔

نبی کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، زیبا نہیں ہے کہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا کریں، چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، جبکہ ان پر یہ بات کھل چکی ہے کہ وہ جہنم کے مستحق ہیں[۵۳]۔ ابراہیم نے اپنے باپ کے لیے جو دعائے مغفرت کی تھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۳) اسے ندامت لاحق ہوتی ہے اور شرمندگی کے ساتھ وہ اپنے خدا کی طرف پلٹتا ہے، معافی مانگتا ہے اور اپنے عہد کو پھر سے تازہ کر لیتا ہے۔ یہی بار بار کی توبہ اور یہی رہ رہ کر خدا کی طرف پلٹنا اور ہر لغزش کے بعد وفاداری کی راہ پر واپس آنا ہی ایمان کے دوام و ثبات کا ضامن ہے، ورنہ انسان جن بشری کمزوریوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے ان کی موجودگی میں تو یہ بات اس کے بس میں نہیں ہے کہ خدا کے ہاتھ ایک دفعہ نفس و مال بیچ دینے کے بعد ہمیشہ کامل شعوری حالت میں اس بیع کے تقاضوں کو پورا کرتا رہے اور کسی وقت بھی غفلت و نسیان اس پر طاری نہ ہونے پائے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ مومن کی تعریف میں یہ نہیں فرماتا کہ وہ بندگی کی راہ پر اگر کبھی اس سے پھسلتا ہی نہیں ہے، بلکہ اس کی قابل تعریف صفت یہ قرار دیتا ہے کہ وہ پھسل پھسل کر بار بار اسی راہ کی طرف آتا ہے، اور یہی وہ بڑی سے بڑی خوبی ہے جس پر انسان قادر ہے۔

پھر اس موقع پر مومنین کی صفات میں سب سے پہلے توبہ کا ذکر کرنے کی ایک اور مصلحت بھی ہے۔ اوپر سے جو سلسلۂ کلام چلا آ رہا ہے اس میں روئے سخن ان لوگوں کی طرف ہے جن سے ایمان کے منافی افعال کا ظہور ہوا تھا۔ لہٰذا ان کو ایمان کی حقیقت اور اس کا بنیادی مقتضیٰ بتانے کے بعد اب یہ تلقین جاری ہے کہ ایمان لانے والوں میں لازمی طور پر جو صفات ہونی چاہئیں ان میں سے اولین صفت یہ ہے کہ جب بھی ان کا قدم راہ بندگی سے پھسل جائے وہ فوراً اس کی طرف پلٹ آئیں، نہ یہ کہ اپنے انحراف پر جمے رہیں اور زیادہ دور نکلتے چلے جائیں۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۵۱] متن میں لفظ السائحون استعمال ہوا ہے جس کی تفسیر بعض مفسرین نے الصائمون (روزہ رکھنے والے) سے کی ہے، لیکن سیاحت کے معنی روزہ، مجازی معنی ہیں، اصل لغت میں اس کے یہ معنی نہیں ہیں۔ اور جس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس لفظ کے یہ معنی ارشاد فرمائے ہیں اس کی نسبت حضور کی طرف درست نہیں ہے۔ اس لیے ہم اس لفظ کو اصل لغوی معنی ہی میں لینا زیادہ صحیح سمجھتے ہیں۔ پھر جس طرح قرآن میں بکثرت مواقع پر مطلقاً انفاق کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی خرچ کرنے کے ہیں اور مراد اس سے راہ خدا میں خرچ کرنا ہے، اسی طرح یہاں بھی سیاحت سے مراد محض گھومنا پھرنا نہیں ہے بلکہ ایسے مقاصد کے لیے زمین میں نقل و حرکت کرنا ہے جو پاک اور بلند ہوں اور جن میں اللہ کی رضا مطلوب ہو۔ مثلاً اقامت دین کے لیے جہاد، کفر زدہ علاقوں سے ہجرت، دعوت دین، اصلاح خلق، طلب علم صالح، مشاہدۂ آثار الٰہی اور تلاش رزق حلال۔ اس صفت کو یہاں مومنین کی صفات میں خاص طور پر اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود جہاد کی پکار پر گھر سے نہیں نکلے تھے ان کو یہ بتانا مقصود ہے کہ حقیقی مومن ایمان کا دعویٰ کر کے اپنی جگہ چین سے بیٹھا نہیں رہ جاتا بلکہ وہ خدا کے دین کو قبول کرنے کے بعد اس کو بول بالا کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس کے تقاضے پورے کرنے کے لیے دنیا میں دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کرتا پھرتا ہے۔ [۵۲] یعنی اللہ تعالیٰ نے عقائد، عبادات، اخلاق، معاشرت، تمدن، معیشت، سیاست، عدالت اور صلح و جنگ کے معاملات میں جو حدیں مقرر کر دی ہیں وہ ان کو پوری پابندی کے ساتھ ملحوظ رکھتے ہیں، اپنے انفرادی و اجتماعی عمل کو انہی حدود کے اندر محدود رکھتے ہیں، اور کبھی ان سے تجاوز کر کے نہ تو من مانی کارروائیاں کرنے لگتے ہیں اور نہ خدائی قوانین کے بجائے خود ساختہ قوانین یا انسانی ساخت کے دوسرے قوانین کو اپنی زندگی کا ضابطہ بناتے ہیں۔ اس کے علاوہ خدا کے حدود کی حفاظت میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ ان حدود کو قائم کیا جائے، انھیں ٹوٹنے نہ دیا جائے۔ لہٰذا سچے اہل ایمان کی تعریف صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ وہ خود حدود اللہ کی پابندی کرتے ہیں بلکہ مزید برآں ان کی یہ صفت بھی ہے کہ وہ دنیا میں اللہ کی مقرر کردہ حدود کو قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی نگہبانی کرتے ہیں، اور اپنا پورا زور اس سعی میں لگا دیتے ہیں کہ یہ حدیں ٹوٹنے نہ پائیں۔

[۵۳] کسی شخص کے لیے معافی کی درخواست لازماً یہ معنی رکھتی ہے کہ اول تو ہم اس کے ساتھ ہمدردی و محبت رکھتے ہیں، دوسرے یہ کہ ہم اس کے قصور کو قابل معافی (باقی صفحہ ۲۰۷)

وہ تو اس وعدے کی وجہ سے تھی جو اس نے اپنے باپ سے کیا تھا،[112] مگر جب اس پر یہ بات کھل گئی کہ اس کا باپ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گیا، حق یہ ہے کہ ابراہیمؑ بڑا رقیق القلب و خدا ترس اور بردبار آدمی تھا[113]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۱) سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں اُس شخص کے معاملہ میں تو درست ہیں جو وفاداروں کے زمرے میں شامل ہو اور صرف گناہ گار ہو، لیکن جو شخص کھلا ہوا باغی ہو اس کے ساتھ ہمدردی و محبت رکھنا اور اس کے جرم کو قابلِ معافی سمجھنا نہ صرف یہ کہ اصولاً غلط ہے بلکہ اس سے خود ہماری اپنی وفاداری مشتبہ ہو جاتی ہے۔ اور اگر ہم محض اس بنا پر کہ وہ ہمارا رشتہ دار ہے یہ چاہیں کہ اسے معاف کر دیا جائے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے نزدیک رشتہ داری کا تعلق خدا کی وفاداری کے مقتضیات کی بہ نسبت زیادہ قیمتی ہے، اور یہ کہ خدا اور اس کے دین کے ساتھ ہماری محبت بے لاگ نہیں ہے، اور یہ کہ جو لاگ ہم نے خدا کے باغیوں کے ساتھ لگا رکھی ہے ہم چاہتے ہیں کہ خدا خود بھی اسی لاگ کو قبول کر لے اور ہمارے رشتہ دار کو تو ضرور بخش دے خواہ اسی جرم کا ارتکاب کرنے والے دوسرے مجرموں کو جہنم میں پھینک دے۔ یہ تمام باتیں غلط ہیں، اخلاص اور وفاداری کے خلاف ہیں اور اس ایمان کے منافی ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ خدا اور اس کے دین کے ساتھ ہماری محبت بالکل بے لاگ ہو، خدا کا دوست ہمارا دوست ہو اور اس کا دشمن ہمارا دشمن۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ "مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا نہ کرو" بلکہ یوں فرمایا ہے کہ "تمہارے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ تم ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو"۔ یعنی ہمارے منع کرنے سے اگر تم باز رہے تو کچھ بات نہیں، تم میں تو خود وفاداری کی حس اتنی تیز ہونی چاہیے کہ جو ہمارا باغی ہے اس کے ساتھ ہمدردی رکھنا اور اس کے جرم کو قابلِ معافی سمجھنا تم کو اپنے لیے نازیبا محسوس ہو۔

یہاں اتنا اور سمجھ لینا چاہیے کہ خدا کے باغیوں کے ساتھ جو ہمدردی ممنوع ہے وہ صرف وہ ہمدردی ہے جو دین کے معاملہ میں دخل انداز ہوتی ہو۔ رہی انسانی ہمدردی اور دنیوی تعلقات میں صلۂ رحمی، مواسات، اور رحمت و شفقت کا برتاؤ، تو یہ ممنوع نہیں ہے بلکہ محمود ہے۔ رشتہ دار خواہ کافر ہو یا مومن، اس کے دنیوی حقوق ضرور ادا کیے جائیں گے۔ مصیبت زدہ انسان کی بہرحال مدد کی جائے گی، حاجت مند آدمی کو بہر صورت سہارا دیا جائے گا، بیمار اور زخمی کے ساتھ ہمدردی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے گی، یتیم کے سر پر یقیناً شفقت کا ہاتھ رکھا جائے گا، اور ایسے معاملات میں ہرگز یہ امتیاز نہ کیا جائے گا کہ کون مسلم ہے اور کون غیر مسلم۔

(حواشی صفحہ ہذا)[112] اشارہ ہے اُس بات کی طرف جو اپنے مشرک باپ سے تعلقات منقطع کرتے ہوئے حضرت ابراہیمؑ نے کہی تھی کہ سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا (مریم۔ ۳) "آپ کو سلام ہے، میں آپ کے لیے اپنے رب سے دعا کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے، وہ میرے اوپر نہایت مہربان ہے"۔ اور لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ (الممتحنہ۔ ۱) "میں آپ کے لیے معافی ضرور چاہوں گا، اور میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے کہ آپ کو اللہ کی پکڑ سے بچوا لوں"۔ چنانچہ اسی وعدے کی بنا پر آنجناب نے اپنے باپ کے لیے یہ دعا مانگی تھی کہ: وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (الشعراء۔ ۵) "اور میرے باپ کو معاف کر دے، بے شک وہ گمراہ لوگوں میں سے تھا، اور اس دن مجھے رسوا نہ کر جبکہ سب انسان اٹھائے جائیں گے جبکہ نہ مال کسی کے کچھ کام آئے گا نہ اولاد، نجات صرف وہ پائے گا جو اپنے خدا کے حضور بغاوت سے پاک دل لے کر حاضر ہوا ہو"۔ یہ دعا اول تو خود انتہائی محتاط لہجے میں تھی، مگر اس کے بعد جب حضرت ابراہیمؑ کی نظر اس طرف گئی کہ میں جس شخص کے لیے دعا کر رہا ہوں وہ تو خدا کا کھلا باغی تھا اور اس کے دین سے سخت دشمنی رکھتا تھا تو وہ اس سے بھی باز آگئے اور ایک سچے وفادار مومن کی طرح انہوں نے باغی کی ہمدردی سے صاف صاف تبرّی کر دی اگرچہ وہ باغی ان کا باپ تھا جس نے کبھی محبت سے ان کو پالا پوسا تھا۔

[113] متن میں اوّاہ اور حلیم کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اوّاہ کے معنی ہیں بہت آہیں بھرنے والا، زاری کرنے والا، ڈرنے والا، حسرت کرنے والا۔ اور حلیم اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے مزاج پر قابو رکھتا ہو، نہ غصے اور دشمنی اور مخالفت میں آپے سے باہر ہو، نہ محبت اور دوستی اور تعلقِ خاطر میں حدِ اعتدال سے تجاوز کر جائے۔ یہ دونوں لفظ اس مقام پر دوہرے معنی دے رہے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت کی کیونکہ وہ نہایت رقیق القلب آدمی تھے، اس خیال سے کانپ اٹھتے تھے کہ میرا یہ باپ جہنم کا ایندھن بن جائے گا، اور حلیم تھے، اس ظلم و ستم کے باوجود جو ان کے باپ نے (باقی صفحہ ۱۶۱ پر)

اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ لوگوں کو ہدایت دینے کے بعد پھر گمراہی میں مبتلا کرے جب تک کہ انھیں صاف صاف بتا نہ دے کہ انھیں کن چیزوں سے بچنا چاہیے[۱۱۵]۔ درحقیقت اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اللہ ہی کے قبضہ میں آسمان و زمین کی سلطنت ہے، اسی کے اختیار میں زندگی و موت ہے، اور تمھارا کوئی حامی و مددگار ایسا نہیں ہے جو تمھیں اس سے بچا سکے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۵) اسلام سے ان کو روکنے کے لیے اُن پر ڈھاتے تھے ان کی زبان اس کے حق میں دعا ہی کے لیے کھلی۔ پھر انھوں نے یہ دیکھ کر کہ ان کا باپ خدا کا دشمن ہے اس سے تبرّی کی، کیونکہ وہ خدا سے ڈرنے والے انسان تھے اور کسی کی محبت میں حد سے تجاوز کر جانے والے نہ تھے۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) ۱۱۵ یعنی اللہ پہلے یہ بتا دیتا ہے کہ لوگوں کو کن خیالات، کن اعمال اور کن طریقوں سے بچنا چاہیے۔ پھر جب وہ نہیں باز آتے اور غلط فکری و غلط کاری ہی پر اصرار کیے چلے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی ان کی ہدایت و رہنمائی سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور اس غلط راہ پر انھیں دھکیل دیتا ہے جس پر وہ خود جانا چاہتے ہیں۔

یہ ارشاد ایک قاعدۂ کلیہ بیان کرتا ہے جس سے قرآن مجید کے وہ تمام مقامات اچھی طرح سمجھے جا سکتے ہیں جہاں ہدایت دینے اور گمراہ کرنے کو اللہ تعالیٰ نے اپنا فعل بتایا ہے۔ خدا کا ہدایت دینا یہ ہے کہ وہ صحیح طریق فکر و عمل اپنے انبیاء اور اپنی کتابوں کے ذریعہ سے لوگوں کے سامنے واضح طور پر پیش کر دیتا ہے، پھر جو لوگ اس طریقہ پر خود چلنے کے لیے آمادہ ہوں انھیں اس کی توفیق بخشتا ہے۔ اور خدا کا گمراہی میں ڈالنا یہ ہے کہ جو صحیح طریق فکر و عمل اس نے بتا دیا ہے اگر ان کے خلاف چلنے ہی پر کوئی اصرار کرے اور سیدھا نہ چلنا چاہے تو خدا اس کو زبردستی راست بیں اور راست رو نہیں بناتا بلکہ جدھر وہ خود جانا چاہتا ہے اسی طرف اس کو جانے کی توفیق دے دیتا ہے۔

اس خاص سلسلۂ کلام میں یہ بات جس مناسبت سے بیان ہوئی ہے وہ پچھلی تقریر اور بعد کی تقریر پر غور کرنے سے بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ یہ ایک طرح کی تنبیہ ہے جو نہایت موزوں طریقہ سے پچھلے بیان کا خاتمہ بھی قرار پا سکتی ہے اور آگے جو بیان آ رہا ہے اس کی تمہید بھی۔

مقالات

اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ

(از افادات حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی)

مترجمہ مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی

حمد و صلوٰۃ کے بعد:

ایک وقت اللہ تعالیٰ نے میرے قلب میں ایک ایسی میزان حق و عدل کا القا فرمایا جس سے میں امت محمدیہ کے مابین واقع ہونے والے تمام اختلافات کے اسباب معلوم کر سکوں اور جان لوں کہ اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک حق کیا ہے۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے مجھ کو وہ قدرت بیان عطا فرمائی جس سے کام لے کر میں اس مسئلہ کی ایسی وضاحت کر دوں کہ پھر کوئی شک اور اشکال باقی نہ رہ جائے۔ بعد ازاں مجھ سے یہ دریافت کیا گیا کہ صحابہ کرام اور ان کے بعد کے اکابرین ملت کے درمیان اختلاف کی — خاص کر احکام فقہیہ میں اختلاف کی — وجہ کیا ہے؟ میں وقت کی گنجائش اور سائل کی قوت فہم و حفظ کا لحاظ کرتے ہوئے اسی آن ان حقائق کا، جو اللہ تعالیٰ کی عنایت خاص سے مجھ پر کھولے گئے تھے، ایک حصہ بیان کرنے پر آمادہ ہو گیا اور اس مسئلہ پر ایک مفید رسالہ تیار ہو گیا جس کا نام میں نے "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" رکھا۔

دور نبوی میں فقہی مباحث کا فقدان

معلوم ہونا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں فقہ ایک فن کی طرح مدون نہیں تھی، اور نہ اس وقت احکام کے باب میں بحث کا یہ طریقہ تھا جو اب ہمارے فقہا میں رائج ہے کہ وہ اپنی انتہائی دماغی قابلیتیں صرف کر کے ایک ایک چیز کے علیحدہ علیحدہ ارکان و شرائط اور آداب، دلائل کے ساتھ بیان کرتے ہیں، مسائل کی فرضی صورتیں سامنے رکھ کر ان پر بحث کرتے ہیں، جن چیزوں کی تعریف کی جا سکتی ہو ان کی منطقیانہ تعریف بیان کرتے ہیں، اور جن کا حصر بیان کیا جا سکتا ہو ان کا حصر واضح کرتے ہیں، وغیر ذلک۔ اس کے بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ آپ مثلاً وضو فرماتے اور صحابہ کرام آپ کا طریقہ وضو دیکھ کر اسے اختیار کر لیتے، بغیر اس کے کہ حضور اس بات کی توضیح فرمائیں کہ یہ وضو کا رکن ہے اور فلاں چیز اس کے آداب میں سے ہے۔ اسی طرح آپ نماز پڑھتے، لوگ آپ کے نماز پڑھنے کا ڈھنگ دیکھ لیتے اور اسی طرح خود پڑھنے لگتے۔ آپ نے حج ادا فرمایا، لوگوں نے آپ کے حج کرنے کے طریقے اور مراسم دیکھے اور اسی طرح خود حج کرنے لگے۔ الغرض آنحضرت صلعم کا عام طریقہ تعلیم یہی تھا۔ آپ نے کبھی یہ توضیح نہیں فرمائی کہ وضو میں چار فرض ہیں یا چھ، اور نہ کبھی آپ نے یہ خیال کیا کہ ہو سکتا ہے کہ کبھی کوئی آدمی اعضائے وضو کو لگاتار نہ دھوئے اس لیے اس طرح کے وضو کے ہونے یا نہ ہونے کا پیشگی حکم دے دینا چاہیے۔ اس قسم کی فرضی اور غیر واقعی صورتوں کے احکام کی بابت آپ نے شاذ و نادر ہی کبھی کچھ فرمایا ہے۔ دوسری طرف اصحاب رسول کا بھی حال یہ تھا کہ وہ اس طرح کی باتوں کے

متعلق آنحضرت صلعم سے بہت کم سوال کرتے تھے، چنانچہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ "میں نے اصحاب رسول سے بہتر کسی جماعت کو نہیں پایا۔ انھوں نے رسول خدا کی پوری زندگی میں آپ سے صرف تیرہ سوال کیے جو سب کے سب قرآن میں مذکور ہیں۔ مثلاً يَسْئَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ (اے نبی یہ لوگ تم سے حرمت کے مہینوں میں جنگ کرنے کی بابت دریافت کرتے ہیں۔) اور يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ (تم سے حالت حیض کے احکام پوچھتے ہیں) وغیرہ۔" اس کے بعد حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ صحابہ صرف انہی مسائل کو پوچھتے تھے جو ان کے لیے نفع رساں ہوتے۔" حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ "کسی ایسی بات کے متعلق سوال نہ کرو جو فی الواقع پیش نہ آئی ہو کیونکہ میں نے عمرؓ بن الخطاب کو اس شخص پر لعنت بھیجتے ہوئے سنا ہے جو اس طرح کے سوالات کرے۔" قاسمؒ نے لوگوں کو مخاطب کرکے فرمایا کہ "تم لوگ ایسی چیزوں کی بابت سوال کرتے ہو جن کی بابت ہم نے کبھی زبان استفسار نہیں کھولی۔ نیز تم ایسی باتوں کی کھود کرید کرتے ہو جن کے متعلق مجھے کوئی علم و واقفیت نہیں، اور اگر ہم کو ان کے بارے میں کوئی علم ہوتا تو (حسب فرمان نبویؐ[1]) ہم تمھیں ضرور بتا دیتے۔" عمر بن اسحاق کا قول ہے کہ "مجھ کو آدھے سے زائد اصحاب رسول سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، میں نے اس گروہ سے بڑھ کر کسی گروہ کو اینچ پینچ سے خالی اور تشدد سے مجتنب نہیں پایا۔" عبادہ بن بسر کندی سے یہ فتویٰ پوچھا گیا کہ "اگر کسی عورت کا ایسی جگہ انتقال ہو جائے جہاں اس کا کوئی ولی نہ ہو تو اس کو غسل کیونکر دیا جائے گا؟" آپ نے جواب دیا کہ "میں ایسے لوگوں[2] سے ملا ہوں جو تمھاری طرح تشدد نہیں کرتے تھے نہ تم لوگوں کی طرح (فرضی) مسائل کے متعلق سوالات کرتے تھے۔" (ان تمام آثار کو دارمی نے نقل کیا ہے)

الغرض آنحضرت صلعم کے زمانہ میں استفتاء اور افتا کا دستور صرف یہی تھا کہ لوگ پیش آمدہ واقعات کے متعلق آپ سے استفسار کرتے اور آپ ان کا حکم بیان فرما دیتے۔ اسی طرح معاملات و مقدمات آپ کے سامنے پیش ہوتے تو آپ ان کا فیصلہ کر دیتے۔ لوگوں کو اچھے کام کرتے دیکھتے تو ان کی مدح و منقبت فرماتے اور برے کام کرتے دیکھ کر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے

شیخین کا طرز عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ ساری باتیں بالعموم اجتماع عام میں ہوتی تھیں یہی وجہ ہے کہ جب حضرات شیخین (ابو بکرؓ و عمرؓ) کو کسی مسئلہ میں حکم شریعت معلوم نہ ہوتا تو وہ دوسرے صحابہ سے دریافت فرماتے کہ کیا تم میں سے کسی نے اس امر کے متعلق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فرمان سنا ہے؟ چنانچہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے سامنے جب دادی (یا نانی) کی وراثت کا مسئلہ پیش ہوا تو آپ نے فرمایا کہ "میں نے اس کے حصہ کے بارے میں رسول اللہ کا کوئی ارشاد نہیں سنا ہے، اس لیے میں اس کے متعلق اوروں سے پوچھتا ہوں۔" جب نماز ظہر آپ نے ادا کر لی تو لوگوں سے پوچھا کہ "کیا تم میں سے کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دادی کے حق وراثت کے بارے میں کچھ فرماتے سنا ہے؟" مغیرہؓ ابن شعبہ نے کہا کہ "ہاں! میں نے سنا ہے" پوچھا "کیا سنا ہے؟" جواب دیا کہ "رسول خدا نے جدہ کو میت کے مال کا چھٹا حصہ دیا ہے" حضرت ابو بکرؓ نے پھر پوچھا "یہ بات تمھارے سوا اور کسی کو بھی معلوم ہے؟" محمد بن مسلمہؓ نے کہا "مغیرہؓ صحیح فرماتے ہیں۔" یہ سن کر حضرت ابو بکرؓ نے اس عورت کو (جس کا معاملہ پیش تھا، اس کے پوتے یا نواسے کے

---

[1] آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے کہ اس عالم کے منہ میں قیامت کے دن آگ کی لگام لگائی جائے گی جو کسی چیز کا علم رکھتا ہو مگر پوچھنے والے کو بتانے سے انکار کر دے۔

[2] مراد صحابہ کرام سے ہے۔ (مترجم)

ترکہ میں سے) چھٹا حصہ دے دیا۔ اسی طرح "غزہ" (جنین کے خوں بہا)[51] کے بارے میں حضرت عمرؓ کا عام لوگوں سے استفسار کے بعد مغیرہ بن شعبہ کی روایت پر عمل پیرا ہونا اور وبا[52] کے متعلق حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف کے بیان کردہ ارشاد نبوی کے مطابق فیصلہ کرنا۔ مجوسیوں[53] کے معاملہ میں انہی عبدالرحمٰن ابن عوف کی بیان کی ہوئی حدیث پر اپنے فیصلہ کی بنیاد رکھنا، حضرت عبداللہ[54] ابن مسعودؓ کا معقل بن یسار کی روایت، جو ان کی رائے کے بالکل مطابق نکلی سن کر خوش ہونا اور حضرت ابو موسیٰ[55] اشعری کا فاروق اعظم کے دروازے سے واپس جانے کے بعد ان کا ابو موسیٰ سے اس حدیث کا دریافت کرنا جس کی بنا پر وہ ان کے دروازہ سے واپس چلے گئے تھے، اور پھر حضرت ابو سعید کا حضرت ابو موسیٰ کے حق میں شہادت دینا وغیرہ بے شمار واقعات مشہور و معروف اور صحیحین اور سنن کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

بنائے اختلاف مختصر یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور مبارک بالعموم یہی تھا کہ آپ مسائل و احکام شرع مجامع عام میں بیان فرمایا کرتے تھے۔ اب ہر صحابی نے آپ کی عبادت کے انہی طریقوں، آپ کے انہی فتووں اور فیصلوں کو یاد کر لیا جن کو اسے دیکھنے اور سننے کا موقع نصیب ہوا، پھر ان میں سے ہر حکم کی قرائن حال پر نظر ڈال کر علت متعین کی اور موقع و محل کے ان قرائن و علامات کو سامنے رکھ کر جو اس کے نزدیک تعیین علت و مقصد کے لیے کافی اور اطمینان بخش تھے۔ اس نے کسی حکم کو اباحت پر محمول کیا، کسی کو استحباب پر اور کسی کو نسخ پر۔ اس باب میں ان لوگوں کا اعتماد صرف اپنے اطمینان قلب اور شرح صدر پر تھا۔ استدلال کے (پرپیچ منطقیانہ) طریقوں سے ان کے ذہن آشنا نہ تھے۔ جیسا کہ تم دیہاتی باشندوں کو دیکھتے ہو کہ وہ آپس کی گفتگوؤں کا مدعا سمجھتے جاتے ہیں (ان گفتگوؤں کے دوران میں استعمال کیے ہوئے) اشارات و کنایات اور تصریحات سے ان کے دلوں کو فہم مطالب کے سلسلے میں اس طرح طمانیت حاصل ہوتی جاتی ہے کہ ان کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔

---

[51] حضرت عمر کے سامنے جنین کے خوں بہا کا مسئلہ آیا تو چونکہ آپ کو اس بارے میں کوئی نص شرعی معلوم نہ تھی اس لیے آپ نے صحابہ سے مشورہ اور استفسار کیا۔ مغیرہ ابن شعبہ نے فرمایا کہ "پیغمبر صلعم نے اس کا خوں بہا 'غزہ' مقرر کیا ہے"۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اس کے مطابق فیصلہ دے دیا۔

"غزہ" کا مطلب یہ ہے کہ ایک غلام آزاد کیا جائے، یا جنین کے ولی کو پچاس دینار یا پانچ سو درہم دیے جائیں۔

[52] حضرت عمرؓ کے واقعہ سفر شام کی طرف اشارہ ہے جبکہ آپ شام پر حملہ آور ہونے کے لیے لشکر لیے جا رہے تھے اور راستہ میں معلوم ہوا کہ وہاں وبا پھیلی ہوئی ہے تو لوگوں سے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے، کوئی بات طے نہیں ہو رہی تھی کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے آ کر یہ روایت بیان کی کہ آنحضرت نے وبائی مقامات پر جانے سے منع فرمایا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمر نے لشکر کو واپسی کا حکم دے دیا۔

[53] حضرت عمر اپنے زمانۂ خلافت میں مجوسیوں سے جزیہ نہیں لیتے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف نے یہ بتایا کہ آنحضرت ہجر کے مجوسیوں سے جزیہ لیتے تھے تو آپ نے بھی ان پر جزیہ لگا دیا۔ [54] یہ ایک ایسی عورت کا معاملہ ہے جس کا شوہر اس حال میں مر گیا تھا کہ ابھی نہ تو اس نے اس کا مہر مقرر کیا تھا نہ اس سے مقاربت کی تھی۔ اس واقعہ کی تشریح آگے آتی ہے۔ [55] حضرت ابو موسیٰ حضرت عمرؓ کے دروازے پر گئے اور جب تین بار آواز دینے کے باوجود کوئی جواب اندر سے نہ ملا تو واپس چلے، چند قدم گئے ہوں گے کہ حضرت عمر نے خادم سے کہا کہ ان کو اندر بلا لو، مگر خادم نے باہر آ کر ابو موسیٰ کو دروازہ پر نہ پایا۔ حضرت عمرؓ نے ان کو بکار کر بلوایا اور واپس جانے کی علت پوچھی۔ انھوں نے کہا کہ آنحضرت کا ارشاد ہے کہ "جب تین آوازیں دینے کے باوجود اجازت نہ ملے تو دروازے سے ہٹ جاؤ"۔ حضرت عمر نے کہا کہ اپنی اس روایت پر کوئی گواہ لاؤ ورنہ ٹھیک نہ ہوگا۔ چنانچہ جب حضرت ابو سعید خدریؓ نے ابو موسیٰ کی توثیق کی تو حضرت عمرؓ نے اس کو تسلیم کر لیا۔ (مترجم)

آغاز اختلاف

عہد رسالت تک تو لوگوں کا یہی حال رہا۔ اس کے بعد یہ حضرات مختلف اطراف و ممالک میں پھیل گئے اور ان میں سے ہر ایک الگ الگ خطۂ ارض میں عوام کا رہنما بن گیا۔ اب ان کے سامنے زندگی کے بے شمار واقعات اور مسائل پیش ہونے شروع ہوئے جن میں ان سے فتوے پوچھے جاتے تھے۔ ہر صحابی ان کے جواب میں اپنی منصوص معلومات یا اپنے استنباط کے مطابق جوابات دیتا۔ اگر اس کو اپنے ذخیرۂ معلومات و استنباط میں کوئی چیز ایسی نہ ملتی جس سے وہ مسئلہ کا جواب دے سکتا تو اپنی رائے سے اجتہاد کرتا اور اس علت کو معلوم کرتا جس پر رسول اللہ صلعم نے اپنے منصوص احکام کی بنیاد رکھی تھی اور جس مقام پر اس کو وہ علت نظر آتی وہاں وہی حکم لگا دیتا۔ مگر ایسے قیاسات کرتے وقت یہ لوگ رسول خدا صلعم کے مقصد کا لحاظ کرنے میں اپنے مقدور بھر کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔ اب یہاں سے ان کے درمیان اختلاف کا آغاز ہوتا ہے جس کی مختلف بنیادیں تھیں :-

(۱) حدیث نبوی سے واقفیت اور عدم واقفیت کا اختلاف

ایک یہ کہ ایک صحابی نے رسول اکرم سے کسی معاملہ کا فیصلہ یا کوئی فتویٰ سن رکھا تھا لیکن دوسرا اس سے نابلد تھا اس لیے اس نے اس امر میں اپنے اجتہاد سے کام لیا۔ پھر اس کی بھی چند صورتیں تھیں:

اولاً یہ کہ یہ اجتہاد حدیث نبوی کے عین مطابق نکلا۔ جس کی مثال وہ روایت ہے جس کو امام نسائی وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود سے ایک ایسی عورت کے (حق مہر وغیرہ کے) بارے میں استفسار کیا گیا جس کا شوہر مہر مقرر کرنے اور اس سے مقاربت کرنے سے پہلے ہی وفات پا گیا تھا۔ آپ نے جواب دیا کہ ایسے معاملہ میں پیغمبر صلعم کا کوئی فیصلہ مجھے معلوم نہیں۔ لوگ مہینہ بھر ان کے ہاں آتے اور اصرار کرتے رہے کہ کوئی حکم بیان کر دیں۔ تب انھوں نے اجتہاد کر کے یہ فیصلہ دے دیا کہ اس عورت کو اتنا مہر ملنا چاہیے جتنا اس کی ہم مرتبہ عورتوں کا ہوا کرتا ہے۔ نہ کم نہ زیادہ، نیز اس کو مدت گذارنی ہوگی اور شوہر کے ترکہ میں سے حصہ پائے گی۔ یہ سن کر معقل بن یسارؓ اٹھ کھڑے ہوئے اور بطور شہادت فرمایا کہ رسول اللہ صلعم نے ہمارے قبیلہ کی ایک عورت کے بارے میں ایسا ہی حکم دیا تھا" حضرت ابن مسعودؓ کو یہ معلوم کر کے اتنی مسرت ہوئی کہ شرف باسلام ہونے کے بعد سے اب تک ایسی مسرت ان پر کبھی بھی نہ طاری ہوئی تھی۔

ثانیاً یہ کہ دو صحابیوں میں کسی مسئلہ کے متعلق بحث ہوئی اور اس سلسلہ میں اس طریقہ سے کوئی حدیث نبوی سامنے آئی جس سے اس کی صحت کا ظن غالب ہوتا تھا۔ اس لیے مجتہد نے اپنے اجتہاد کو چھوڑ کر حدیث رسول کو اختیار کر لیا۔ مثال کے طور پر اس روایت کو لے لو جس کو ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ کا خیال تھا کہ جو شخص طلوع صبح کے وقت جنبی رہا اس کا روزہ نہیں ہوتا، لیکن جب کچھ ازواج مطہرات نے رسول اللہ کا عمل اس خیال کے خلاف بیان کیا تو حضرت ابو ہریرہؓ نے اپنے خیال سے رجوع کر لیا۔

ثالثاً یہ کہ اجتہاد کرنے والے صحابی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث تو پہنچی مگر ایسے قابل اطمینان طریقے سے نہیں پہنچی کہ اس کے صحیح ہونے کا گمان غالب ہوتا، اس لیے مجتہد نے حدیث کو ناقابل اعتبار سمجھتے ہوئے اپنے اجتہاد ہی پر عمل کیا۔ اس کی مثال فاطمہ بنت قیس کی اس حدیث سے ملتی ہے جس کو اصحاب اصول (یعنی صحاح ستہ کے مولفین) نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے کہ "فاطمہ نے حضرت عمرؓ کے روبرو آ کر کہا کہ "مجھ کو تین طلاقیں دی گئی تھیں، رسول اللہ صلعم نے نہ تو مجھ کو زمانۂ عدت کا نفقہ دلایا اور نہ مکان"۔ آپ نے اس کی گواہی ماننے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ "ہم ایک عورت کے قول کی بنا پر کتاب الٰہی کو نہیں چھوڑ سکتے۔"

(حاشیہ صفحہ ۲۱ پر)

جس کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ وہ صحیح کہہ رہی ہے یا غلط۔ تین طلاقیں پانے والی عورت کو نفقہ بھی ملنا چاہیے اور قیام گاہ بھی۔" نیز فاطمہ بنت قیس کے قول "لا نفقۃ لھا ولا سکنیٰ" کو سن کر حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ "فاطمہ کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اللہ کا خوف نہیں کرتی۔"

دوسری مثال بخاری و مسلم کی اس روایت میں موجود ہے کہ "عمرؓ بن خطاب کا خیال تھا کہ اگر جُنبی کو غسل کے لیے پانی نہ ملے تو وہ تیمم سے پاکی حاصل نہیں کر سکتا۔ حضرت عمار بن یاسر نے ان کے سامنے اپنا واقعہ بیان کیا کہ میں ایک مرتبہ رسول اللہ صلعم کا ہم سفر تھا، مجھ کو غسل کی حاجت ہو گئی۔ لیکن پانی نہ پا سکا، اس لیے (تیمم کی خاطر) دھول میں لوٹ پوٹ لیا۔ پھر آنحضرت صلعم سے اپنی اس کارروائی کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ تم کو صرف اتنا کر لینا کافی تھا، (یہ کہتے ہوئے) آپ نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارے اور ان کو اپنے منہ اور اپنے ہاتھوں پر مل لیا۔ حضرت عمرؓ نے عمارؓ کے اس بیان کو قبول نہیں کیا اور کسی پوشیدہ ضعف کی بنا پر جو ان کو اس روایت میں نظر آیا، ان کے نزدیک یہ روایت حجت نہیں ٹھیری۔ اگرچہ آگے چل کر دوسرے طبقہ میں یہ حدیث بہت سے طریقوں سے مشہور ہو گئی اور اس کے ضعیف ہونے کا گمان ماند پڑ گیا اس لیے لوگ اس پر عمل پیرا ہو گئے۔

رابعاً یہ کہ اجتہاد کرنے والے صحابی کو حدیث سرے سے پہنچی ہی نہیں۔ مثلاً مسلم کی یہ روایت کہ "حضرت ابن عمرؓ عورتوں کو یہ حکم دیتے تھے کہ وہ جب غسل کریں تو اپنے سروں کے بال کھول لیں۔ حضرت عائشہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے فرمایا کہ تعجب ہے ابن عمر پر کہ وہ عورتوں کو بال کھول ڈالنے کا حکم دیتے ہیں! اگر ایسا ہی ہے تو سیدھے سے یہی کیوں نہیں کہہ دیتے کہ عورتیں اپنے سر ہی منڈا ڈالیں! حالانکہ میں اور رسول اللہ صلعم ایک ہی برتن سے غسل کرتے تھے اور میں اپنے بالوں کے معاملہ میں اس کے سوا کچھ نہیں کرتی تھی کہ ان پر تین بار پانی بہا دیتی تھی (اور کبھی ان کو کھولتی نہیں تھی)

دوسری مثال امام زہری کے بیان کردہ اس واقعہ میں ہے کہ "ہندؓ کو یہ اطلاع نہ تھی کہ آنحضرتؐ نے مستحاضہ کو استحاضہ کی حالت میں بھی نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے، اس لیے وہ اس حالت میں نماز نہ پڑھتیں اور (ترک نماز کے غم سے) رویا کرتیں۔

(حاشیہ صفحہ ۲۰) [1] قرآن مجید کی آیت وَلَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ اور آیت اَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُجْدِكُمْ سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلقہ عورت کو زمانہ عدت تک گھر سے نہیں نکالنا چاہیے بلکہ شوہر پر لازم ہے کہ اتنے وقت کے لیے اس کے لیے مکان مہیا کرے۔ پھر آیت وَاَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ عورت کو زمانۂ عدت تک نفقہ بھی ملنا چاہیے۔ یہ آیات اپنے مفہوم میں بالکل مطلق اور عام ہیں، ان میں طلاق دی جانے والی عورت کی کوئی تخصیص موجود نہیں ہے، اس لیے ان کا حکم ہر قسم کی مطلقہ عورتوں کے حق میں عام اور نافذ العمل ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے قرآن کے اسی عموم کو سامنے رکھتے ہوئے فاطمہ بنت قیس کی روایت رد کر دی کیونکہ وہ آیات قرآنی کے خلاف پڑتی تھی۔

یہیں سے ایک بات اور بھی واضح ہو گئی۔ ظاہر ہے فاطمہ صحابیہ تھیں۔ اصول حدیث کی رو سے "الصحابۃ کلھم عدول" سے خارج نہ تھیں۔ لیکن اس کے باوجود جب قرآن کے متبادر مفہوم سے ان کی روایت ٹکرائی تو حضرت عمرؓ نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔ معلوم ہوا کہ احادیث میں صرف سند ہی قابل لحاظ شے نہیں ہے بلکہ متن بھی دیکھا جانا چاہیے۔ سند بالکل سلسلۃ الذہب ہی کیوں نہ ہو، پھر بھی حدیث میں غلطی کا امکان ہو سکتا ہے۔ سند کی صحت، صحت حدیث کو مستلزم نہیں۔ آخر فاطمہ بنت قیس کی روایت میں ضعف اسناد کا کون سا احتمال تھا۔ (مترجم)

(۲) فعل رسول کی تعیین نوعیت میں اختلاف

اختلاف صحابہ کی دوسری اساس یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک کام کرتے تو سب نے دیکھا (مگر افکار بشری میں فطری تفاوت کی وجہ سے اس فعل کی نوعیت کی تعیین میں اختلاف ہو گیا) پھر کسی نے تو اس فعل رسول کو عبادت سمجھا اور کسی نے اس کو صرف اباحت پر محمول کیا۔ مثلاً "تحصیب" یعنی سفر حج میں ابطح (نامی وادی مکہ) میں آنحضرت کا اترنا اس کو اصحاب اصول نے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلعم اس جگہ نزول فرما ہوئے تھے، اگر یہ نزول حضرت ابوہریرہؓ اور ابن عمرؓ کے نزدیک بحیثیت عبادت تھا، اس لیے یہ لوگ اس کو حج کی سنتوں میں شمار کرتے ہیں۔ لیکن حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ کے خیال میں اترنا محض بطور اتفاق تھا، کسی سنت کی ادائگی کی حیثیت سے۔

دوسری مثال:۔

"جمہور کے نزدیک خانہ کعبہ کا طواف کرتے وقت رَمَل، یعنی اکڑ کر چلنا سنت ہے، لیکن حضرت ابن عباس کا فرمانا یہ ہے کہ نبی صلعم نے جو رمل کیا تھا وہ محض اتفاقی طور پر اور عارضی سبب سے تھا، یعنی مشرکین مکہ کا یہ طعن کہ "مسلمانوں کو مدینہ کے بخار نے بالکل چور کر ڈالا ہے" (اسی طعن کے جواب میں پیغمبر صلعم نے مسلمانوں کو اکڑ کر چلنے کا وقتی حکم دیا تھا ورنہ) یہ فعل حج کی کوئی مستقل سنت نہیں ہے۔

(۳) وہم تعبیر کا اختلاف

تیسری اساس اختلاف یہ ہے کہ افعال رسول کے بیان کرنے میں لوگوں نے مختلف گمانوں سے کام لیا۔ مثلاً:۔

"رسول خدا صلعم نے حج ادا فرمایا اور تمام صحابہ نے اس کا مشاہدہ کیا، لیکن اس حج کی نوعیت بیان کرتے وقت کسی نے کہا کہ آنحضرت صلعم نے حج تمتع[۱] کیا تھا، کسی نے کہا آپ نے حج قران[۲] ادا کیا تھا اور کسی کا خیال یہ تھا کہ آپ کا حج، حج افراد[۳] تھا۔"

دوسری مثال، حضرت سعیدؓ ابن جبیر کی روایت، جس کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے کہ:۔

"میں نے (حضرت سعیدؓ نے) عبداللہ ابن عباسؓ سے کہا کہ اے ابوالعباسؓ! اس اختلاف کو دیکھ کر مجھے حیرانی ہوتی ہے جو رسول اللہ صلعم کے احرام حج باندھ لینے کے بعد تلبیہ کرنے کے متعلق اصحاب رسول میں موجود ہے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ میں اس واقعہ کی حقیقت سب سے بہتر جانتا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے صرف ایک ہی حج ادا فرمایا اس لیے لوگوں میں اس کے متعلق (قدرتی طور پر) اختلاف ہو گیا۔ صورت واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم حج کی خاطر مدینہ سے چلے اور جب مسجد ذی الحلیفہ میں آپ نے دوگانہ احرام ادا فرمایا تو اسی جگہ حج کا احرام باندھا اور فوراً تلبیہ[۴] کیا۔ اس تلبیہ کی آواز کچھ لوگوں کے کانوں تک پہنچی جنھوں نے اس کو یاد کر لیا۔ اس کے بعد آپ اونٹنی پر سوار ہو گئے، جب اونٹنی آپ کو لے کر اٹھی تو آپ نے پھر تلبیہ کیا اور اس تلبیہ کو بھی کچھ دوسرے لوگوں نے سنا۔ بات یہ تھی کہ لوگ مختلف گروہوں کی شکل میں خدمت رسالت میں چلے آتے

---

[۱] حج تمتع کی شکل یہ ہوتی ہے کہ آدمی حج کے مہینوں میں جا کر عمرہ ادا کرے اور سر منڈا کر احرام کھول دے۔ پھر ذی الحجہ کی آٹھویں تاریخ کو از سر نو حج کا احرام باندھے اور حج ادا کرے۔ [۲] قران کی شکل یہ ہے کہ آدمی عمرہ اور حج دونوں کا احرام بیک وقت باندھے اور دونوں کو ادا کر کے احرام کھول دے۔

[۳] افراد مطلق حج ادا کرنے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ عمرہ نہ کیا جائے۔

[۴] تلبیۂ حج یہ ہے:۔ لبیک، اللھم لبیک، لبیک، لاشریک لک لبیک، ان الحمد والنعمۃ لک والملک، لاشریک لک۔ (مترجم)

تھے، سو جب ایک گروہ نے اونٹنی کے کھڑے ہونے کے وقت آپ کو تلبیہ کرتے سنا تو یہ سمجھ بیٹھا کہ رسول اللہ صلعم نے تلبیہ صرف اس وقت کیا جب ناقہ آپ کو لے کر اٹھی۔ پھر آنحضرت اس جگہ سے آگے بڑھے، جب بیدا (نامی مقام) کی بلندی پر چڑھے تو آپ نے پھر تلبیہ کیا۔ کچھ لوگوں نے آپ کو یہ تلبیہ کرتے ہوئے سنا اور یہ خیال کر بیٹھے کہ آپ نے تلبیہ صرف اس وقت کیا جب بیدا کی بلندی پر چڑھ رہے تھے۔ حالانکہ بخدا آپ نے اپنی جائے نماز ہی پر حج کی نیت کر لی تھی اور جب آپ کو لے کر اونٹنی کھڑی ہوئی اس وقت بھی آپ نے تلبیہ کیا اور جب بیدا کی بلندی پر چڑھے اس وقت بھی کیا۔

(۴) سہو و نسیان کا اختلاف اختلاف صحابہ کی چوتھی اساس سہو و نسیان ہے۔ جس کی مثال حضرت ابن عمر کے متعلق اس روایت میں موجود ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ آنحضرت صلعم نے ایک عمرہ ماہ رجب میں کیا ہے۔ حضرت عائشہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ ابن عمر کو سہو ہو رہا ہے (آنحضرت نے رجب میں کوئی عمرہ نہیں کیا)

(۵) ضبط مدعائے حدیث کا اختلاف پانچویں اساس، ارشاد نبوی کے مقصود کے فہم و ضبط کا اختلاف ہے۔ مثلاً جب حضرت ابن عمرؓ نے آنحضرت صلعم سے یہ روایت بیان کی کہ "میت کے پسماندگان کے نوحہ کرنے سے اس پر عذاب ہوتا ہے" حضرت عائشہ نے ان کے یہ الفاظ سنے تو فرمایا کہ "ابن عمر نے ارشاد رسالت کو اس کے اپنے صحیح موقع و محل اور مدعا کے ساتھ محفوظ نہیں رکھا۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم ایک یہودی عورت کی قبر سے گزرے جس کے اعزہ رو دھو رہے تھے، آپ نے فرمایا یہ لوگ یہاں اس کا نوحہ و ماتم کر رہے ہیں اور وہ قبر میں مبتلائے عذاب ہے۔"

(دیکھو کہ واقعہ کس طرح ایک خاص میت سے متعلق تھا لیکن قول رسول کے اس خصوصی محل کو ذہن سے نکال دینے کے باعث ابن عمرؓ اعزہ کی گریہ وزاری ہی کو میت پر عذاب کی علت گمان کر بیٹھے اور اس بات کو انھوں نے ہر میت کے لیے ایک عام اصول کی حیثیت دیدی۔

(۶) تعیین علت کا اختلاف چھٹی اساس صحابہ کا احکام شرع کی تعیین علت میں مختلف الخیال ہو جانا ہے۔ جیسے جنازہ کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کا مسئلہ۔ بعض صحابہ کا کہنا یہ ہے کہ ایسا فرشتوں کی تعظیم میں کیا جاتا ہے۔ (کیونکہ ہر جنازہ کے ساتھ فرشتے ہوتے ہیں) تو اس خیال کے مطابق ہر جنازہ کے لیے کھڑا ہو جانا چاہیے، خواہ مومن کا جنازہ ہو یا کافر کا۔ کسی کا خیال یہ ہے کہ یہ قیام، موت کے ہول کی وجہ سے ہے، تو اس صورت میں بھی یہ حکم قیام ہر جنازہ کے لیے عام ہوگا۔ لیکن کچھ حضرات کا فرمانا یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی کا جنازہ آنحضرت صلعم کے قریب سے گذرا تو آپ کو اس بات سے تنفر ہوا کہ ایک یہودی لاش میرے سر سے اونچی ہو کر گذرے، اس لیے آپ کھڑے ہو گئے۔ اگر اس علت قیام کو صحیح مانا جائے تو یہ قیام صرف جنازۂ کفار کے لیے مخصوص ہوگا۔

(۷) مطابقت احکام مختلفہ میں اختلاف ساتویں اساس، صحابہ کا وہ اختلاف رائے ہے جو وہ مختلف احکام شرع کے درمیان مطابقت دینے میں پیش آیا۔ مثلاً یہ کہ جنگ خیبر کے موقع پر آنحضرت نے متعہ کی اجازت دی، بعد میں اس کی ممانعت کر دی۔ پھر جنگ اوطاس کے زمانہ میں دوبارہ یہ رخصت عطا فرمائی، اس کے بعد پھر اس سے روک دیا۔ اب حضرت ابن عباس کا یہ کہنا ہے کہ ضرورت کی بنا پر یہ اجازت دی گئی تھی اور جب ضرورت جاتی رہی تو یہ اجازت بھی واپس لے لی گئی۔ مگر حکم اپنی جگہ باقی ہے۔ لیکن جمہور کا یہ کہنا ہے کہ یہ رخصت متعہ بطور اباحت تھی جس کو ممانعت نے ہمیشہ کے لیے منسوخ کر دیا۔

دوسری مثال :-

"رسول اکرم صلعم نے استنجا کرتے وقت قبلہ رو ہونے سے منع فرمایا ہے۔ اس کے متعلق بعض صحابہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ حکم بالکل عام اور غیر منسوخ ہے۔ لیکن حضرت جابرؓ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو وصال سے ایک سال قبل قبلہ کی طرف منہ کرکے پیشاب کرتے دیکھا، اس لیے ان کا خیال یہ ہے کہ آپ کے اس فعل نے اس پہلی ممانعت کو منسوخ کر دیا۔ اسی طرح حضرت ابن عمرؓ نے آنحضرت کو قبلہ کی طرف پشت اور شام کی طرف منہ کرکے قضائے حاجت فرماتے ہوئے دیکھا تھا اس لیے انھوں نے آنحضرت کے اس فعل سے ان لوگوں کے قول کی تردید فرمائی (جو کہتے تھے کہ قبلہ کی طرف پشت کرکے استنجا کرنا شرعاً ممنوع ہے) پھر کچھ لوگوں نے دونوں روایتوں کو جمع کرنے کی سعی کی۔ سو شعبی وغیرہ نے یہ رائے قائم کی کہ نہی کھلے میدانوں سے مخصوص ہے، لہٰذا اگر آدمی پاخانہ کے اندر ہو تو اس کے لیے قبلہ کی طرف پشت یا رخ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اور بعض دوسرے حضرات اس طرف گئے ہیں کہ آنحضرت کا قول (جس میں نہی موجود ہے) اپنی جگہ بالکل قائم و ثابت ہے اور اس کا حکم عام ہے۔ رہ گیا آپ کا فعل، سو ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کے مخصوصات میں سے ہو۔ اس طرح یہ فعل، ارشاد نبوی کا نہ تو ناسخ ہوگا نہ مخصص۔

عہد تابعین | الغرض اس طرح صحابہ کرام کے مذاہب مختلف ہوگئے۔ پھر یہی اختلافات وراثتاً تابعین تک پہنچے۔ ہر تابعی کو جو کچھ مل سکا اسی کو اس نے اپنا لیا اور آنحضرت کی جو حدیثیں اور صحابہ کے جو مذاہب اس نے سنے ان کو محفوظ اور ذہن نشین کر لیا۔ اور جو مختلف اقوال اس کے سامنے آئے اس نے اپنی فہم کی حد تک ان میں مطابقت پیدا کی اور بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دی۔ پھر ایسا بھی ہوا کہ بعض اقوال ان کی نگاہوں میں بالکل ہی ناقابل اعتنا ہو کر رہ گئے، اگرچہ وہ اجلۂ صحابہ سے مروی تھے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ و ابن مسعودؓ کا یہ قول کہ جنابت کے لیے تیمم نہیں ہے، تابعین تک پہنچا مگر ان احادیث کی بنا پر ان کے نزدیک وہ کوئی اہمیت نہ حاصل کر سکا جو عمارؓ اور عمران بن حصین وغیرہ اصحاب سے مروی ہو کر مشہور ہو چکی تھیں۔ پس اس حالت میں قدرتی طور پر علمائے تابعین میں سے ہر ایک کا علٰحدہ مذہب ہو گیا اور مختلف شہروں میں مختلف ائمہ کی علٰحدہ علٰحدہ امامتیں قائم ہوگئیں۔ مثلاً مدینہ میں سعید ابن مسیب اور سالم ابن عبد اللہ عوام کے مرجع و امام بن گئے، پھر ان کے بعد زہری اور قاضی یحییٰ ابن سعید اور ربیعہ ابن عبد الرحمٰن نے یہ حیثیت حاصل کی۔ مکہ میں عطاء ابن ابی رباح اور کوفہ میں ابراہیم نخعی اور شعبی نے مسند امامت سنبھالی۔ اسی طرح حسن بصری بصرہ میں، طاؤس بن کیسان یمن میں اور مکحول شام میں پیشوائے دین اور ترجمانِ شرع تسلیم کیے گئے۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے کچھ دلوں میں ان حضرات کے علوم و معارف کی پیاس پیدا کی اور انھیں ان علوم کی تحصیل کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ انھوں نے ان علمائے کبار سے رسول اللہ کی حدیثیں، صحابہ کے اقوال و فتاویٰ اور خود ان کے اپنے مذاہب اور تحقیقات لے کر جمع کیں۔ پوچھنے والوں نے ان سے فتوے پوچھے (زندگی کے بے شمار) مسائل ان کے سامنے آئے اور کتنے ہی معاملات ان کے روبرو پیش ہوئے۔ (جن میں انھیں فتوے دینے پڑے)

تدوین فقہ کی ابتدا | سعید ابن مسیب اور ابراہیم نخعی وغیرہ نے باقاعدہ فقہ کے تمام ابواب جمع کیے۔ ہر باب میں وہ اپنے کچھ اصول رکھتے تھے جن کو انھوں نے سلف سے حاصل کیا تھا۔

سعید ابن مسیب اور ان کے تلامذہ اس امر کے قائل تھے کہ حرمین کے باشندے تفقہ میں سب سے بلند مقام رکھتے ہیں۔

اس لیے ان کے مذہب کی بنیاد حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے فتاویٰ اور احکام نیز حضرت عبداللہ ابن عمرؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے فتووں اور قضاۃ مدینہ کے فیصلوں پر قائم ہے۔ چنانچہ جہاں تک اللہ تعالیٰ نے ان کو توفیق عطا فرمائی انھوں نے ان احکام اور فتاویٰ کو جمع کیا۔ پھر ان پر بصیرت اور تحقیق کی نگاہ ڈال کر ان کا جائزہ لیا جس شے پر علمائے مدینہ کا اتفاق نظر آیا اس پر تو پوری مضبوطی سے جم گئے، اور جس چیز میں ان کا اختلاف دکھائی دیا اس کے متعلق وہ قول اختیار کر لیا جو زیادہ قوی اور راجح تھا۔ یہ قوت اور راجحیت خواہ کسی بنا پر ہو، چاہے اس بنا پر کہ یہ اکثر علما کا اختیار کردہ قول ہے، یا اس بنا پر کہ وہ کسی مضبوط قیاس یا کتاب و سنت کے کسی صریح استنباط کے موافق پڑتا ہے، یا کسی اور بنا پر۔ اور جب ان لوگوں کو علمائے مدینہ سے حاصل کیے ہوئے مجموعۂ فتاویٰ میں کسی مسئلہ کا جواب نہ ملتا تو ان کے فرمودات سے استنباط کرتے اور ان کے اقوال کے اشارات اور مقتضیات کا سراغ لگاتے۔ اس طرح ان کے ہاں ہر ہر باب کے متعلق مسائل کا انبار لگ گیا۔

ابراہیم نخعی اور ان کے تلامذہ کا خیال تھا کہ عبداللہ ابن مسعودؓ اور ان کے فیض یافتگان فقاہت میں سب سے ممتاز ہیں جیسا کہ علقمہ نے مسروق سے کہا تھا کہ "کیا کوئی صحابی عبداللہ ابن مسعودؓ سے بھی بڑا فقیہ ہے؟" نیز امام ابوحنیفہ نے امام اوزاعی سے فرمایا کہ "ابراہیم نخعی، سالم ابن عبداللہ سے زیادہ فقیہ ہیں اور اگر عبداللہ ابن عمرؓ کو صحابیت کا شرف حاصل نہ ہوتا تو میں کہہ دیتا کہ علقمہ ان سے زیادہ فقیہ ہیں۔ رہے عبداللہ ابن مسعودؓ تو وہ تو عبداللہ ابن مسعود ہی ہیں، ان کا کیا پوچھنا۔" ان حضرات کے مسلک فقہی کی بنیاد حضرت عبداللہ ابن مسعود اور حضرت علی کے فتووں اور فیصلوں پر، نیز قاضی شریح وغیرہ قضاۃ کوفہ کے فیصلوں پر ہے۔ ابراہیم نخعی نے اپنے مقدور بھر ان احکام و فتاویٰ کو اکٹھا کیا اور ان کے ساتھ وہی طرز عمل اختیار کیا جو سعید بن مسیب وغیرہ نے علمائے مدینہ کے آثار و اقوال کے متعلق اختیار کیا تھا، نیز اس ذخیرہ سے اسی طرح مزید مسائل کی تخریج کی جس طرح انھوں نے کی تھی۔ انجام کار ان کے پاس بھی فقہ کے ایک ایک باب میں بے شمار مسائل منضبط ہو گئے۔

سعید ابن مسیب فقہائے مدینہ کے نفس ناطقہ اور ان میں حضرت عمرؓ کے فیصلوں اور حضرت ابوہریرہ کی روایتوں کے سب سے بڑے حافظ تھے۔ اور ابراہیم نخعی فقہائے کوفہ کے ترجمان۔ جب یہ دونوں حضرات کسی کی طرف منسوب کیے بغیر کوئی مسئلہ بیان کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ فی الواقع وہ مسئلہ کسی کی طرف منسوب نہیں اور بہر حال ان کا اپنا ہی اجتہاد ہے، بلکہ ایسے مسائل بالعموم کسی نہ کسی فقیہ سابق سے اشارۃً یا صراحۃً ضرور منسوب ہوتے ہیں۔ بالآخر یہ دونوں اپنے اپنے قرب و جوار کے فقہا کا مرکز بن گئے جنھوں نے ان سے فقہ کا علم حاصل کیا، اس میں تفکر کیا اور اس سے مزید مسائل اور جزئیات نکالے۔

مذاہب فقہا کے اسبابِ اختلاف

تبع تابعین کا دور عہد تابعین کے اختتام پر اللہ تعالیٰ نے خدام علم دین کا ایک گروہ پیدا کر دیا تاکہ وہ وعدہ پورا ہو جو اللہ کے رسول کی زبان سے اس علم کے متعلق نکلا تھا کہ "آنے والی نسلوں میں سے ہر نسل کے عادل لوگ اس علم کے حامل ہوں گے۔" چنانچہ ان خدام نے ایسا ہی کیا۔ انھوں نے ان علمائے تابعین سے، جن سے وہ مل سکے، وضو، غسل، نماز، حج، نکاح، بیع و شرا وغیرہ ان تمام مسائل کے جو زندگی میں عام طور سے پیش آتے ہیں، مشروع طریقے اخذ کیے، رسول خدا کی حدیثیں نقل کیں، مختلف شہروں

کے قاضیوں کے فیصلے اور مفتیوں کے فتوے جمع کئے، مسائل دریافت کیے اور ان سارے امور میں بطور خود اجتہاد کیا، پھر ایک گروہ کے پیشوا اور امور شرعیہ میں مستند قرار پا گئے۔ یہ لوگ بھی اپنے اپنے شیوخ کے نہج پر چلے اور سلف کے اقوال و فتاویٰ کے اشارات اور مقتضیات معلوم کرنے میں پوری دیدہ ریزی سے کام لیا۔ لوگوں کو فتوے دیے، احکام سنائے، روایتیں بیان کیں اور علم سکھائے۔

ان علماء کا طرز فکر و استدلال | اس طبقہ کے علماء کا طرز فکر بالکل ایک ہے جس کی اجمالی تشریح یہ ہے کہ:-

(۱) مسند اور مرسل[1] دونوں ہی قسم کی احادیث قابل تمسک ہیں۔

(۲) صحابہ و تابعین کے اقوال سے شرعی استدلال ہو سکتا ہے کیونکہ ان بزرگوں کے متعلق یہ معلوم ہے کہ ان کے اقوال کی دو ہی حیثیتیں ہو سکتی ہیں: یا تو وہ فی نفسہٖ رسول اللہ صلعم سے نقل کی ہوئی حدیثیں ہیں جن کو انھوں نے (بعض مصالح کا لحاظ کرتے ہوئے) مختصر کر کے موقوف[2] بنا لیا۔ چنانچہ جب ابراہیم نخعی نے آنحضرت کی محاقلہ[3] اور مزابنہ[4] سے ممانعت والی روایت بیان کی تو ان سے کہا گیا کہ کیا آپ کو اس کے سوا رسول اللہ کی کوئی حدیث (مرفوع) یاد نہیں ؟ انھوں نے فرمایا کہ "یاد کیوں نہیں ہے مگر میں حدیث مرفوع بیان کرنے کے مقابلہ میں یوں کہنا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں کہ "عبد اللہ نے یہ فرمایا ہے" یا "علقمہ کا یہ قول ہے"۔" اسی طرح شعبی سے جب ایک حدیث کے متعلق استفسار کیا گیا اور یہ کہا گیا کہ اس کی سند کو براہ راست پیغمبر صلعم تک پہنچایا جاتا ہے تو انھوں نے جواب دیا "ایسا کرنا ٹھیک نہیں بلکہ ہم کو زیادہ مناسب (اور محتاط) طریقہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ سند روایت کو صحابہ تک پہنچا کر چھوڑ دیا جائے تاکہ اگر اس کے الفاظ میں کوئی کمی بیشی ہو گئی ہو تو آنحضرت کی طرف منسوب نہ ہو سکے بلکہ صحابہ ہی پر ختم ہو جائے"۔ یا یہ اقوال کتاب و سنت کے نصوص سے ان کے اپنے استنباط کیے ہوئے احکام ہیں۔ یا پھر وہ ان کی اپنی اجتہادی رائیں ہیں (لیکن اس استنباط اور اجتہاد کے سلسلہ میں یہ بھولنا نہ چاہیے کہ) یہ نفوس قدسیہ ان امور میں طرز عمل کی جو خوبی اور فکر و رائے کی جو درستگی رکھتے تھے اس میں بعد کے آنے والے حضرات ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے، نیز وہ ان سے باعتبار زمانہ مقدم اور باعتبار علم افضل بھی تھے۔ اس لیے ان کے اقوال پر عمل کرنا کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا جس میں دو رائیں ہوتیں، بجز اس صورت کے جبکہ ان میں خود اختلاف رائے ہو جائے اور حدیث نبوی ان کے اقوال کے بالکل مخالف واقع ہو۔

(۳) اگر کسی مسئلہ میں احادیث باہم مختلف ہوتیں تو یہ حاملین علم دین اقوال صحابہ کی طرف رجوع کرتے۔ اگر وہاں یہ نظر آتا کہ صحابہ نے کسی حدیث کو منسوخ یا قابل تاویل قرار دیا ہے۔ یا نسخ و تاویل کی کسی تصریح کے بغیر ہی اس کے ترک کر دینے اور اس پر عمل نہ کرنے پر متفق الرائے ہو گئے ہیں ——— کہ اس کا مطلب بھی در اصل حدیث کو ضعیف یا منسوخ یا مأوّل ہی قرار دینا ہے ——— تو ان تمام صورتوں میں یہ علماء اقوال صحابہ کا اتباع کرتے اور اس حدیث کو وہی حیثیت اور وزن دیتے جو صحابہ کے یہاں پاتے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو کتے کے جھوٹے برتن کا حکم بیان کرنے والی حدیث[5] کے متعلق حضرت امام مالک کے منہ سے نکلی تھی کہ یہ حدیث

---

[1] مسند وہ حدیث ہے جس کی سند بیان کی جائے اور مرسل وہ جس کی سند بیان کیے بغیر کوئی تابعی یا تبع تابعی یوں کہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا یا ایسا کیا ہے۔

[2] موقوف، مرفوع کے بالمقابل حدیث کی ایک قسم کا نام ہے۔ مرفوع وہ روایت ہے جس میں تصریح ہو کہ حضور نے ایسا فرمایا ہے، اور موقوف وہ جس میں صحابی ایک بات کہے اور صراحت کے ساتھ اسے حضور کی طرف منسوب نہ کرے۔ [3] محاقلہ کے معنی ہیں کہ خوشوں سمیت گندم کو صاف کی ہوئی گندم کے عوض بیچا جائے یا کچی کھیتی بیچنا۔ [4] مزابنہ کے معنی ہیں درخت پر لگی ہوئی تر کھجوروں کو توڑی ہوئی خشک کھجوروں کے عوض بیچنا۔ [5] حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ جب کتا کسی برتن میں منہ ڈال دے تو اسے سات بار دھوؤ اور اس کے بعد ایک بار مٹی سے مانجھ کر صاف کرو۔ (مترجم)

وہ بات تو ہوئی ہے مگر میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کی حقیقت کیا ہے"۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں نے اس پر فقہا کو عمل کرتے ہوئے نہیں پایا۔

(۴) اگر صحابہ اور تابعین کے درمیان کسی مسئلہ میں اختلاف رائے پایا جاتا تو ہر عالم اس رائے اور مسلک کو اختیار کرتا جو اس کے اپنے شہر کے علماء اور اس کے شیوخ کا مسلک ہوتا کیونکہ وہ ان کے اقوال کے سقم و صواب سے زیادہ باخبر اور ان اقوال سے مناسبت رکھنے والے اصولوں کا بہتر راز داں ہوتا۔ نیز اس لیے کہ اس کا دل اپنے اساتذہ کے فضل و کمال اور تبحر علمی سے زیادہ متاثر ہوتا چنانچہ حضرت عمرؓ، عثمانؓ، ابن عمرؓ، عائشہ صدیقہؓ، ابن عباسؓ، زید بن ثابتؓ وغیرہ صحابہ عظام اور ان کے شاگردانِ جلیل مثلاً سعید ابن مسیب (جو حضرت عمرؓ کے فیصلوں اور حضرت ابوہریرہ کی روایتوں کے سب سے بڑے حافظ تھے) اور عروہ، سالم، عطاء، عکرمہ اور عبیداللہ ابن عبداللہ وغیرہ کا مذہب اہل مدینہ کے لیے دوسرے مذاہب کی بہ نسبت زیادہ قابل قبول و مستحق اتباع ٹھہرا۔ اس وجہ سے بھی کہ آنحضرتؐ نے مدینہ کے بڑے فضائل بیان فرمائے ہیں[1] اور اس سبب سے بھی کہ مدینہ ہر زمانہ میں فقہا اور علماء کا مرکز رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالک علماء مدینہ کی شاہراہ سے ہٹ کر کبھی کوئی قدم نہیں اٹھاتے اور ان کے متعلق یہاں تک مشہور ہے کہ وہ اہل مدینہ کے اجماع کو حجت شرعی مانتے تھے۔ اسی طرح امام بخاری نے اپنی کتاب میں ایک باب باندھا ہے جس کا نام ہے "باب فی الاخذ بما اتفق علیہ الحرمان"۔ یعنی جس بات پر اہل مکہ اور اہل مدینہ دونوں کا اتفاق ہو، اس کو اختیار کر لینا چاہیے۔ اس کے بالمقابل حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کے تلامذہ کا مذہب اور حضرت علی اور قاضی شریح اور شعبی کے فیصلے اور ابراہیم نخعی کے فتاوٰی اہل کوفہ کی نگاہ میں دوسرے اقوال و مذاہب کی بہ نسبت زیادہ مختار اور لائق اتباع قرار پائے۔ چنانچہ یہی بنائے ترجیح تھی جس کے اثر کے تحت علقمہ نے تشریک[2] کے مسئلہ میں مسروق کو زید بن ثابت کے قول کی طرف مائل دیکھ کر یہ الفاظ کہے تھے کہ "کیا کوئی صحابی عبداللہ بن مسعود سے زیادہ علم و تفقہ رکھتا ہے"؟ مسروق نے جواب دیا کہ نہیں، ایسا تو نہیں ہے، لیکن میں نے زید بن ثابت اور دوسرے باشندگان مدینہ کو تشریک کرتے دیکھا ہے (اس لیے میرا خیال ہوا کہ یہ جائز ہے)۔ الغرض ہر عالم کے نزدیک اس کے اپنے ہی شیوخ اور علمائے شہر کے اختیار کردہ اقوال مرجح اور قابل اخذ و اتباع ہوتے تھے۔ اگر اہل شہر کسی امر پر متفق ہوتے تو یہ علماء اس کو دانتوں سے پکڑ لیتے۔ چنانچہ امام مالک ایسے ہی مسائل کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ "جس سنت میں (اہل مدینہ کا) کوئی اختلاف نہیں ہے وہ ہمارے نزدیک ایسی اور ایسی ہے" (یعنی بالکل ثابت اور واجب العمل ہے)۔ اور اگر اہل شہر کسی مسئلہ میں مختلف الرائے ہوتے تو ان مختلف رایوں میں سے یہ حضرات اس رائے کو اختیار کرتے جو زیادہ مضبوط اور راجح نظر آتی۔ اس امر کا فیصلہ کہ کونسی رائے مضبوط اور راجح ہے اس بات سے ہوتا کہ اکثریت کس طرف ہے، یا یہ کہ کونسا قول مضبوط قیاس پر مبنی ہے، یا یہ کہ کونسا مذہب کتاب و سنت کی تخریجات سے اوفق ہے۔ جہاں امام مالک یوں فرماتے ہیں کہ "یہ بات ان تمام باتوں میں سب سے بہتر ہے جو اس مسئلہ کے متعلق میرے علم میں آئی ہیں" تو در اصل اسی طریق فکر و طرز عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ پھر اگر یہ علماء صحابہ اور تابعین کے مجموعۂ اقوال میں کسی مسئلہ کا جواب نہ پاتے تو انہی اقوال کو بنیاد قرار دے کر اس سے استنباط کرتے اور ان کے اشارات و مقتضیات کی پوری جستجو کرکے جواب مسئلہ کا سراغ لگاتے۔

[1] آپ نے فرمایا تھا کہ جلد ہی لوگ طلب علم کی خاطر سواریاں دوڑائیں گے اور مدینہ کے عالم سے بڑھ کر کوئی صاحب علم و فضل نہ پائیں گے۔

[2] تشریک کا مطلب یہ ہے کہ مالک زمین اپنی زمین بٹائی پر کاشت کرنے کے لیے دوسرے کو دیدے۔ (مترجم)

مذاہب اربعہ کا ظہور یہی وہ طبقہ ہے جس کے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ فقہ پر کتابیں مرتب کی جائیں۔ چنانچہ مدینہ میں امام مالک اور محمد ابن عبدالرحمٰن ابن ابی ذئب نے مکہ میں ابن جریج اور ابن عُیینہ نے، کوفہ میں امام ثوری نے اور بصرہ میں ربیع ابن صبیح نے فقہ میں مستقل کتابیں لکھیں۔ ان تمام حضرات کا طریقۂ تدوین وہی تھا جس کی تفصیل اوپر بیان ہو چکی ہے۔

امام مالک اور مذہب مالکی خلیفہ منصور جب حج کے لیے گیا تو اس نے امام مالک سے کہا کہ "میرا قصد یہ ہے کہ آپ کی تصنیفات کے متعدد نسخے نقل کراؤں اور مسلمانوں کے ہر ہر شہر میں ایک ایک نسخہ بھجوا دوں اور حکم دے دوں کہ سب لوگ بس انہی کتابوں کے مطابق عمل کریں اور ان کو چھوڑ کر کسی اور طرف نہ جائیں۔" امام مالک نے جواب دیا کہ "اے امیرالمومنین! ایسا نہ کر کیونکہ لوگوں میں (سلف کے مختلف) اقوال پھیل چکے ہیں اور (مختلف اقسام کی) حدیثیں ان تک پہنچ چکی ہیں۔ ان مختلف اقوال و احادیث میں سے ہر گروہ ان چیزوں پر عمل پیرا ہے جو اس کے کانوں میں پہلے پڑ گئیں۔ پس لوگوں کو آزاد چھوڑ دے اور ہر بستی کے مسلمانوں کو اسی مسلک پر عمل کرنے دے جو انھوں نے اپنے لیے اختیار کر لیا ہے"۔

بعض لوگوں نے اس قصہ کو منصور کے بجائے ہارون الرشید کی طرف منسوب کیا ہے اور اس کی روایت اس طرح کی ہے کہ ہارون نے امام مالک سے بطور مشورہ پوچھا کہ "کیا آپ کی موطا خانہ کعبہ میں آویزاں کر دی جائے اور لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ تمام اختلافات چھوڑ کر اسی کے مطابق عمل کریں"؟ امام مالکؒ نے فرمایا کہ "ایسا نہ کرو (یہ اختلاف صحابہؓ کے زمانہ سے چلا آ رہا ہے)، فروع میں صحابہ خود مختلف الرائے تھے اور وہ (اپنے مختلف مذاہب لیے ہوئے) اطراف ملک میں بکھر گئے اور ہر ایک کا طریقہ مختلف علاقوں میں اب چل پڑا ہے۔" یہ سن کر ہارون الرشید نے کہا "اے ابوعبداللہ! اللہ تم کو حکمت دین کی) اور زیادہ توفیق دے"۔ اس واقعہ کو امام سیوطی نے نقل کیا ہے۔

امام مالک اُن احادیث کے سب سے بڑے عالم ہیں جو اہل مدینہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں۔ اور بلحاظ اسناد وہ سب سے زیادہ معتبر ہیں۔ نیز وہ حضرت عمرؓ کے فیصلوں اور عبداللہ ابن عمرؓ و عائشہ صدیقہؓ اور ان حضرات کے ساتوں شاگردوں[1] کے اقوال کے سب سے بڑے عالم اور جامع ہیں۔ اسی ہستی اور اسی جیسی دُوسری مبارک ہستیوں کے ہاتھوں علم روایت و فتویٰ کی بنیاد پڑی۔ مسند علم و ارشاد پر متمکن ہونے کے بعد امام موصوف نے روایت حدیث، افتاء اور افادۂ علمی کے وہ عظیم الشان کارنامے انجام دیے جن کے باعث آنحضرت کی اس پیشنگوئی کے مصداق سمجھے گئے کہ "زمانہ قریب ہے کہ لوگ اونٹوں پر سوار ہو کر علم کی جستجو میں دوڑ دھوپ کریں گے، سو اس وقت وہ مدینہ کے عالم سے بڑھ کر کسی کو صاحب علم و فضل نہیں پائیں گے۔" ابن عیینہ اور عبدالرزاق کا خیال ہے کہ یہ پیشنگوئی امام مالک پر صادق آتی ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی اصابت رائے مسلم ہے۔ پھر امام مالک کے تلامذہ نے ان کی روایات اور مختارات کو اکٹھا کیا، ان کی تلخیص اور تنقیح کی، شرحیں بیان کیں، ان کے اصول و دلائل پر بحثیں کیں، ان کی بنیاد پر مزید مسائل کی تخریج کی اور ان چیزوں کو لے کر یہ لوگ مختلف ممالک میں خصوصاً مغرب کی طرف

---

[1] ان شاگردوں کو فقہائے سبعہ کہا جاتا ہے، ان کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) سعید ابن مسیب (۲) عروہ ابن زبیر (۳) قاسم ابن محمد ابن ابوبکر صدیق (۴) ابوبکر ابن عبدالرحمٰن مخزومی (۵) خارجہ ابن زید ابن ثابت (۶) عبیداللہ ابن عبداللہ ابن عتبہ مسعودی (۷) سلیمان ابن یسار ہلالی۔ (مترجم)

پھیل گئے اور ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے کتنی ہی مخلوق کو نفع پہنچایا۔ ہم نے مذہب مالکی کی جو اصلیت بیان کی ہے اگر تم اس کی صداقت معلوم کرنی چاہتے ہو تو "موطا امام مالک" کو نظر غائر سے دیکھو۔ تم پر یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جائے گی۔

امام ابوحنیفہ اور مسلک حنفی امام ابوحنیفہ، ابراہیم نخعی اور ان کے ہم خیال علمائے تابعین کے مسلک پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے اور شاید ہی کبھی اس سے اختلاف وانحراف کرتے ہوں۔ اس مذہب کی بنیادوں پر مسائل کی تخریج کرنے میں ان کو بڑا کمال حاصل تھا۔ تخریجات کے طریقوں میں وہ انتہائی دقت نظر سے کام لیتے تھے اور انھوں نے اپنی پوری توجہ جزئیات کی توضیح واستنباط میں لگا رکھی تھی۔ اگر تم ہماری اس بات کی تصدیق چاہتے ہو تو امام محمد کی کتاب الآثار، عبدالرزاق کی جامع اور ابوبکر ابن ابی شیبہ کی مصنف میں سے ابراہیم نخعی کے اقوال چن کر جمع کرلو، پھر امام ابوحنیفہ کے مذہب سے ان کا مقابلہ کرو تو تم دیکھو گے کہ سوائے چند مقامات کے کہیں بھی اُن کا قدم ابراہیم نخعی کے جادۂ فقہی سے ہٹ کر نہیں پڑتا۔ اور یہ چند مقامات بھی ایسے نہیں ہیں کہ امام مذکور نے ان میں کوئی اپنی الگ راہ نکالی ہو، بلکہ ان میں بھی دیگر فقہائے کوفہ میں سے کوئی نہ کوئی ان کے آگے موجود ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں میں سب سے زیادہ مشہور ابو یوسف ہیں جو ہارون الرشید کے عہد حکومت میں قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) مقرر ہوئے تھے۔ ان کا یہی منصب تھا جس کے باعث حنفی مذہب ہر چہار طرف پھیل نکلا اور عراق، خراسان اور توران کے حدود میں حکومت کا آئین قرار پاگیا۔

دوسرے شاگرد جو تصنیف و تالیف کے لحاظ سے تمام تلامذہ میں ممتاز اور حصول علم میں سب سے زیادہ انہماک رکھنے والے تھے، امام محمد بن حسن ہیں۔ انھوں نے پہلے تو امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف سے فقہ حاصل کی، پھر مدینہ جاکر امام مالک سے موطا پڑھی۔ اس کے بعد بطور خود تفکر شروع کیا اور اپنے شیوخ کے مذہب کے ایک ایک مسئلہ کا موطا سے مقابلہ کرکے دیکھا، اگر اس کے مطابق نظر آیا تو خیر، ورنہ (اختلاف کی شکل میں) صحابہ اور تابعین کے مذاہب واقوال کی جستجو کی، اگر کسی گروہ کے ہاں اپنے مذہب کے موافق قول مل گیا تو اس صورت میں وہ مذہب حنفی پر قائم رہے، لیکن اگر کوئی مسئلہ ایسا نکلا جس کی بنیاد کسی کمزور قیاس یا بے جان استنباط پر تھی اور اکثر علما کے عمل سے یا کسی ایسی حدیث صحیح سے اس کی مخالفت بھی ہو رہی تھی جس پر فقہا نے عام طور سے عمل کیا ہو تو ایسی حالت میں انھوں نے اپنی رائے بدل دی اور امام ابوحنیفہ اور ابو یوسف کے مذہب سے ہٹ کر مذاہب سلف میں سے کسی ایسے مذہب کو اختیار کرلیا جو ان کی نگاہ میں سب سے زیادہ فائق اور مرجح نظر آیا۔

امام ابوحنیفہ کے ان دونوں تلامذہ نے بھی ابراہیم نخعی کے مذہب کی حتی الامکان اسی طرح پیروی کی جس طرح امام ابوحنیفہؒ نے کی تھی۔ صرف دو نقطہ ہائے اختلاف تھے جو استاد اور ان کے تلامذہ کے مابین واقع ہوتے تھے۔ کبھی تو ایسا ہوتا کہ امام ابوحنیفہ نے ابراہیم نخعی کے مذہب پر کسی مسئلہ کی تخریج کی، لیکن امام ابو یوسف اور امام محمد نے اس تخریج کو تسلیم نہیں کیا۔ اور کبھی یہ صورت ہوتی کہ ابراہیم نخعی وغیرہ فقہائے کوفہ کے کسی مسئلہ میں مختلف اقوال ہوتے تو ان اقوال میں سے کسی ایک قول کو سند انتخاب وترجیح دینے میں یہ دونوں، امام موصوف کی مخالفت کر جاتے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، امام محمد نے تصنیف و تدوین کی طرف توجہ کی اور ان تینوں فقہا کے اقوال اکٹھے مرتب کیے، جس سے

بے شمار لوگوں کو فائدہ پہنچا۔ پھر بعد کے علمائے حنفیہ امام محمد کی ان تصانیف کی طرف پوری سنجیدگی سے متوجہ ہوئے۔ ان کو حفظ کیا اور ان کی شرحیں لکھیں۔ ان کے مطالب کی وضاحت کر کے ان کو قریب الفہم بنایا، ان کی بنیاد پر فروعی مسائل کا استنباط کیا اور ان کو دلائل سے مبرہن کیا۔ پھر یہ لوگ (ان تمام تصانیف کو لے کر) خراسان اور توران کی طرف جا نکلے اور ان تصانیف کے سارے مسائل امام ابوحنیفہ کا مذہب کہے جانے لگے۔ اس طرح امام ابویوسف اور امام محمد کے مذاہب بھی امام ابوحنیفہ کے مذہب کے ساتھ مل گئے اور ان سب کو ایک ہی مذہب شمار کیا گیا، حالانکہ یہ دونوں حضرات بجائے خود مجتہد مطلق ہیں اور امام ابوحنیفہ سے ان کے اختلافات کی فہرست کافی طویل ہے، نہ صرف فروع میں بلکہ اصول میں بھی۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ مذکورہ بالا اصل ان تینوں میں مشترک ہے (یعنی یہ تینوں ہی حضرت ابراہیم نخعی کے مذہب کو اپنی بنیاد قرار دیتے ہیں۔) اور دوسرے یہ کہ مبسوط اور جامع کبیر میں ان تینوں مذاہب کو ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

امام شافعی اور مسلک شافعی | ان دونوں مذاہب۔ مذہب مالکی اور مذہب حنفی ۔ کی شہرت و اشاعت اور ان کے اصول و فروع کی ترتیب کا آغاز تھا کہ اس بزم میں ایک تیسرے امام، امام شافعی تشریف لائے۔ آپ نے اگلے لوگوں کے طریق فکر و استنباط کا گہری نظر سے جائزہ لیا تو اس میں ایسی قابل اعتراض باتیں نظر آئیں جنھوں نے ان کو اس راہ پر گامزن ہونے سے روک دیا۔ ان باتوں کا ذکر امام موصوف نے اپنی تصنیف "کتاب الام" کے ابتدائی اوراق میں (بڑی وضاحت سے) کیا ہے۔ ان کے اعتراضات کا ماحصل یہ ہے:۔

(۱) یہ لوگ (فقہائے مدینہ اور فقہائے کوفہ) مرسل اور منقطع احادیث کو بھی لے لیتے ہیں جن کی وجہ سے ان کے اقوال میں لغزشیں راہ پالیتی ہیں، کیونکہ جب حدیث کے تمام طریقوں کو جمع کیا جاتا ہے (اور محدثانہ چھان بین کی جاتی ہے) تو معلوم ہوتا ہے کہ کتنی ہی مرسل حدیثیں ایسی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں اور کتنی ہی ایسی ہیں جو مسند اور مرفوع احادیث کے خلاف پڑتی ہیں۔ اس لیے امام شافعی نے فیصلہ کیا کہ مرسل روایتوں کو اس وقت تک قبول نہ کریں گے جب تک کہ ان میں چند خاص شرطیں نہ پائی جائیں۔ ان شرطوں کی تفصیل کتب اصول میں موجود ہے۔

(۲) ان حضرات کے ہاں مختلف نصوص میں تطبیق دینے کے قواعد منضبط نہ تھے جس کے باعث ان کے اجتہادات غلطیوں سے محفوظ نہ رہ سکتے تھے۔ اس لیے امام شافعی نے پہلے یہ اصول و قواعد وضع کیے اور ان کو باقاعدہ ایک کتاب کی شکل میں مرتب کیا۔ اصول فقہ کی یہ پہلی کتاب ہے جو عالم وجود میں آئی۔ اس امر کی مثال (کہ امام شافعی کے خیال کے مطابق پچھلے فقہا کے اجتہادات اصول تطبیق کی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے راہ راست سے ہٹ جاتے تھے) اس واقعہ میں موجود ہے کہ ایک دن امام شافعی امام محمد کے ہاں آئے۔ امام محمد اپنی تقریر میں فقہائے مدینہ پر اعتراض کر رہے تھے کہ یہ لوگ فصل مقدمات کے لیے دو گواہوں کی شہادت ضروری نہیں سمجھتے بلکہ صرف ایک ہی گواہ کی گواہی اور مدعی کی قسم پر بھی فیصلہ کر دیتے ہیں، حالانکہ یہ کتاب اللہ پر اضافہ[۱] ہے

[۱] اضافہ کا مطلب یہ ہے کہ اس سے قرآن کے حکم پر ٹھیک ٹھیک عمل نہیں ہو سکتا بلکہ اس میں کسی نہ کسی طرح کی ترمیم یا تخصیص کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً یہی شہادت کا مسئلہ ہے جس کی بابت قرآن میں عام حکم ہے کہ فصل مقدمات کے لیے دو شاہد چاہییں۔ مگر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر دو شاہد مہیا نہ ہو سکیں تو مدعی کا قسم اور ایک گواہ کی گواہی بھی کافی ہے۔ گویا حلف دوسرے گواہ کا قائم مقام ہو جاتی ہے۔ (مترجم)

امام شافعی نے یہ تقریر سن کر کہا کہ "کیا آپ کے نزدیک یہ طے شدہ ہے کہ خبرِ واحد سے کتاب اللہ پر اضافہ جائز نہیں؟" انھوں نے فرمایا کہ "ہاں"۔ امام شافعی نے کہا "تو پھر آپ حدیث لاوصیۃ لوارث کو لے کر، جو ایک خبرِ واحد ہے، یہ کیوں کہتے ہیں کہ وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں، حالانکہ کتاب اللہ کہتی ہے کہ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۨ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ (تم پر یہ فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آئے تو وہ اگر اس نے مال چھوڑا ہو — اپنے والدین اور رشتہ داروں کے حق میں وصیت کردے) کیا یہ خبرِ واحد سے کتاب اللہ پر اضافہ نہیں ہے؟" اس کے بعد انھوں نے اسی طرح کے اور بھی چند اعتراضات امام محمد پر کیے، جن کے جواب میں امام محمد کو انجام کار خاموش ہونا پڑا۔

(۳) وہ علمائے تابعین، جن کو فتویٰ دینے کی خدمت سپرد تھی، بعض صحیح حدیثوں سے لاعلم تھے اس لیے انھوں نے مسائلِ پیش آمدہ میں یا تو اپنی رائے سے اجتہاد کیا یا عام خیالات کو لے لیا یا اگلے صحابہ کے طرزِ عمل کو اختیار کرلیا اور اسی کے مطابق فتویٰ دیدیا پھر کبھی ایسا ہوا کہ آگے چل کر تیسرے طبقہ میں وہ حدیثیں منظرِ عام پر آئیں لیکن پھر بھی ان فقہا نے ان کو چھوڑے ہی رکھا اور ان پر صرف اس خیال سے عمل نہیں کیا کہ یہ حدیثیں ہمارے علمائے شہر کے عمل اور مذہب کے، جس سے ہم کوئی اختلاف نہیں رکھتے، مخالف ہیں، اور یہ مخالفت بتاتی ہے کہ ان حدیثوں میں کوئی نہ کوئی کمزوری اور علت ضرور موجود ہے جس نے ان کو مرتبۂ قبول اور پایۂ اعتبار سے گرادیا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوا کہ یہ احادیث تیسرے طبقہ میں بھی شہرتِ عام حاصل نہ کرسکیں بلکہ اس کے بعد کے زمانوں میں مشہور ہوئیں جبکہ علمائے حدیث نے اسناد و طرقِ حدیث کو جمع کرنے میں پوری کاوش دکھلائی اور اس کے لیے زمین کا ایک ایک گوشہ چھان کر اربابِ علم کا کھوج لگایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیشتر حدیثیں ایسی ہیں جن کے روایت کرنے والے صحابہ کی تعداد ایک یا دو سے اوپر نہیں، پھر ان صحابہ سے یہ حدیثیں سن کر دوسروں سے بیان کرنے والے بھی دو ہی ایک آدمی ہیں، اور اسی طرح آگے تک راویوں کی یہ قلت تعداد چلی گئی جس کے سبب سے یہ احادیث عام اہلِ فقہ کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ گئیں اور ان حفاظِ حدیث کے زمانہ میں پردۂ خفا سے باہر نکلیں جنھوں نے حدیث کو ان کے طرق و اسانید کے ساتھ جمع کیا۔ پھر ایک دوسری شکل یہ بھی تھی کہ کتنی ہی حدیثیں ایسی ہیں جن کے روایت کرنے والے صرف ایک خاص خطۂ ملک کے لوگ ہیں، مثلاً اہلِ بصرہ نے ایک حدیث روایت کی اور باقی تمام دیگر مقامات کے لوگ ان سے بالکل بےخبر رہ گئے۔ ان حقائق کے پیشِ نظر امام شافعی کا کہنا یہ ہے کہ علمائے صحابہ و تابعین کا برابر یہ دستور رہا ہے کہ جب ان کے سامنے کوئی مسئلہ آتا تو پہلے وہ رسول اللہ کی حدیث تلاش کرتے، اگر کوئی حدیث نہ ملتی تب جاکر کسی اور طریقۂ استدلال سے کام لیتے۔ مگر اس کے بعد بھی قبولِ حدیث کا دروازہ اپنے اوپر بند نہیں کرلیتے تھے بلکہ بعد میں جب بھی کوئی حدیث ان کو مل جاتی تو اپنے اجتہاد کو ترک کردیتے اور حدیث کو اختیار کرلیتے۔ جب صورتِ واقعہ یہ ہے تو ان علماء کا کسی حدیث سے تمسک نہ کرنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ حدیث ہی کمزور ہے۔ الا آنکہ انھوں نے صراحت کے ساتھ اس کی تضعیف اور تنقیص کردی ہو۔ حدیث "قلتین"[1] اس کی ایک واضح مثال ہے۔ یہ ایک صحیح حدیث ہے جو بہت سی سندوں سے مروی ہے، جن میں سے اکثر کا سررشتہ اس سلسلۂ روایت سے بندھا ہے کہ یہ حدیث ولید بن کثیر نے محمد ابن جعفر ابن زبیر سے یا محمد ابن

---

[1] اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں: — اذا کان الماء قلتین لم یحمل خبثا — یعنی جب پانی "دو قلہ" ہو تو وہ کسی نجاست کے پڑنے سے ناپاک نہیں ہوتا۔
"قلہ" اس بڑے مٹکے کو کہتے ہیں جس میں پانچ سو رطل یعنی سوا چھ من پانی آسکے، یا بقول بعض دو مشک پانی آئے۔ (مترجم)

عباد ابن جعفر سے روایت کی اور انھوں نے عبید اللہ ابن عبد اللہ سے نقل کی اور عبید اللہ نے ابن عمرؓ سے بیان کی۔ بعد میں چل کر اس سلسلۂ اسناد سے شاخ در شاخ بہت سے سلسلہ ہائے سند پیدا ہوگئے۔ یہ دونوں راوی (محمد ابن جعفر اور محمد ابن عباد) اگرچہ پوری طرح قابل اعتبار ہیں مگر یہ ان لوگوں میں نہیں ہیں جو فتوی دینے کے منصب پر سرفراز اور مرجع عوام تھے اس وجہ سے یہ حدیث نہ تو سعید ابن مسیبؒ کے زمانہ میں مشہور ہو سکی نہ ہی امام زہری کے زمانہ میں۔ اور نہ تو مالکیہ نے اس پر عمل کیا نہ حنفیہ نے۔ مگر امام شافعی (کے زمانہ میں یہ حدیث مشہور ہو چکی تھی، اس لیے انھوں) نے اس کو قابل عمل ٹھیرایا۔

ایک اور مثال "خیار مجلس"[1] والی حدیث کی ہے جو ایک صحیح حدیث ہے اور بہت سے طریقوں سے روایت ہوئی ہے اور صحابہ میں سے حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ نے اس پر عمل بھی کیا ہے۔ لیکن "فقہائے سبعہ" اور ان کے ہم عصر دوسرے علما تک نہ پہنچ سکی، اس لیے انھوں نے اس کو اختیار نہیں کیا اور یہ چیز امام مالک اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک حدیث میں قدح کی علت بن گئی۔ لیکن امام شافعی نے اس پر عمل کیا۔

(۴) صحابہ کے اقوال امام شافعی کے زمانہ میں کثرت سے اکٹھا ہوئے جن میں کافی اختلاف اور انتشار تھا۔ آپ نے ان پر تنقید و تحقیق کی نگاہ ڈالی تو ان کا ایک بڑا حصہ احادیث صحیحہ کا مخالف نظر آیا جس کی وجہ یہ تھی کہ صحابہ کو یہ حدیثیں پہنچی ہی نہ تھیں۔ پھر علمائے سلف کو دیکھا کہ اس معاملہ میں وہ برابر اقوال صحابہ کو چھوڑ کر احادیث صحیحہ کی طرف رجوع کرتے رہے ہیں، اس لیے انھوں نے ان اقوال کو تو قابل حجت و عمل مانا جن پر صحابہ کا اتفاق تھا۔ مگر باقی کو لائق تمسک تسلیم کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "صحابہ بھی انسان تھے اور ہم بھی (انھی کی طرح کے) انسان ہیں"[2]۔

(۵) امام شافعیؒ نے دیکھا کہ فقہا کا ایک گروہ "رائے" کو جس کو شریعت نے جائز قرار نہیں دیا ہے، قیاس کے ساتھ جس کو شریعت میں اعتبار کا مقام حاصل ہے، گڈمڈ کر رہا ہے اور ان میں فرق و امتیاز نہیں کرتا۔ یہ لوگ اس "رائے" کو کبھی استحسان بھی کہتے ہیں ——"رائے" سے میری مراد یہ ہے کہ کسی نقصان یا کسی مصلحت کے مظنہ کو کسی حکم کی علت ٹھیرا دیا جائے، اور قیاس یہ ہے کہ ایک حکم منصوص کی علت دریافت کی جائے اور اس علت کی بنا پر دوسرے معاملات میں بھی وہی حکم لگایا جائے۔ امام شافعی نے فقہا کے اس طرز عمل کا پوری قوت سے ابطال کیا اور کہا کہ "جو استحسان یعنی رائے سے کام لیتا ہے وہ دراصل شارع بننا چاہتا ہے"۔ اس قول کو عضد نے "مختصر الاصول" کی شرح میں درج کیا ہے۔ اس کی مثال "رشد یتیم" کا مسئلہ ہے۔ یتیم کا معاملہ فہم ہو جانا ایک مخفی امر ہے (جس کے لیے کوئی متعین تاریخ نہیں بتائی جا سکتی) لیکن فقہا نے یہ دیکھ کر بالعموم پچیس سال کی عمر میں انسان کے اندر معاملہ فہمی آجاتی ہے، اس "مظنۂ رشد" (یعنی پچیس سالہ عمر) کو اس کا قائم مقام قرار دے کر یہ اصول بنا دیا کہ "جب یتیم کی عمر پچیس سال کی ہو جائے تو اس کا مال اس کے حوالہ کر دیا جائے"۔ اور کہا کہ یہ "استحسان ہے"۔ اس کے بالمقابل اس مسئلہ میں قیاس یہ ہے کہ مال

---

[1] وہ حدیث یہ ہے کہ "جب تک خریدار اور فروخت کنندہ باہم الگ نہ ہو جائیں، اس وقت تک دونوں میں سے ہر ایک کو معاملۂ بیع فسخ کر دینے کا اختیار ہے۔

[2] یعنی ہماری ہی طرح وہ بھی فہم و نظر کی فطری لغزشوں سے مامون نہ تھے کہ ان کے اقوال کو ایک نبی معصوم کے کلام کی طرح آنکھیں بند کر کے مان لیا جائے۔ نصوص کتاب و سنت سے جس طرح وہ مسائل کا استنباط کر سکتے تھے ہم بھی کر سکتے ہیں، ان کے استنباط کے ہم پابند کیوں ہوں۔ (مترجم)

اس کو سپرد نہ کیا جائے (تا وقتیکہ وہ واقعتہً معاملہ فہم اور صاحب عقل و رشد نہ ہو جائے)۔

مختصر یہ کہ جب امام شافعی نے اپنے پیشروؤں میں اس قسم کی باتیں دیکھیں تو (ان سے نامطمئن ہو کر) انھوں نے علم فقہ پر نئے سرے سے نظر ڈالی اور بطور خود اس کے اصول مرتب کیے اور ان اصولوں پر جزئیات کا استنباط کیا، اس فن پر مستقل اور بہترین کتابیں لکھیں جو لوگوں کی فیضیابی کا ذریعہ بنیں۔ فقہائے وقت آپ کے ارگرد جمع ہو گئے اور آپ کی تصنیفات کو لے کر ان کا اختصار کیا، ان کی شرحیں لکھیں۔ ان سے دلیلیں اخذ کیں، اور ان کو سامنے رکھ کر مزید مسائل مستنبط کیے۔ پھر (ان سب چیزوں کو لے کر) مختلف ممالک میں منتشر ہو گئے۔ اس طرح یہ فقہ کا ایک الگ اسکول قرار پایا جس کی نسبت امام شافعی کی طرف تھی۔

(باقی)

فہرست مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش	حصہ اول	۱۲ر	مجلد	۲ر
" " "	دوم	۱ر	"	۱ر
تفہیمات		۸ر	"	۱۲ر
خطبات	قسم اول	۱۲ر	"	۱ر
"	دوم	۱۲ر		
رسالہ دینیات	اول	۸ر	"	۱۲ر
"	دوم	۱۲ر		
مسئلہ جبر و قدر		۱۲ر		
تجدید و احیائے دین		۱۲ر	"	۱۳ر
پردہ		۸ر	"	۸ر
حقیقت توحید		۱۲ر	"	۱۲ر
روداد جماعت اسلامی	دوم	۹ر		
" "	سوم	۱۲ر	"	۱۳ر
مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش	ہر سہ حصہ		"	۱۲ر

نوٹ:۔ جن کتابوں کا نام فہرست میں درج نہیں ہے۔ وہ ختم ہو چکی ہیں۔
مجلد کتب پر کمیشن نہیں دیا جائے گا۔

"منیجر"

حضرت موسیٰ نیشنلسٹ لیڈر تھے
یا
نبی اور رسول؟

ہمارے ایک رفیق نے کسی عالم دین کی ایک تحریر یا تقریر کے کچھ اقتباسات ہم کو بھیجے ہیں اور ان پر چند سوالات کیے ہیں۔ یہ اقتباسات اور سوالات یہاں نقل کرکے ہم ان پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ اقتباسات یہ ہیں:۔

"بنی اسرائیل کو فرعون اور قبطیوں کی غلامی کرتے ہوئے جب ایک مدت گزر گئی تو رحمت خداوندی جوش میں آئی اور موسیٰ علیہ السلام کی ذات بابرکات کو یہ غلامی شکن حکم ملا کہ اِذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ (فرعون کے پاس جاؤ، وہ حد سے نکل گیا ہے) اس کے حد سے نکل جانے کی سب سے بڑی صورت یہ تھی کہ اس نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا۔"

"ادھر جبکہ بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے ہی کے لیے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس بھیجا گیا یعنی ان کی بعثت کی اولین غرض ہی یہ تھی کہ فرعون کے پاس جاکر کہو اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ (کہ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور غلامی کے عذاب سے نجات دے) تو آیت سے صراحتاً یہی واضح ہوا کہ غلامی سے استخلاص اور اس کے لیے جدوجہد ایک مذہبی فریضہ ہے جس کے لیے متفقاً ایک جلیل القدر پیغمبر کی بعثت عمل میں آئی۔ کیا اس آیت کی رو سے ہمارے لیے استخلاص اور تحصیل آزادی کی جدوجہد تقریباً ضروری، اور ایک دینی وظیفہ نہیں ٹھیرتی؟

ساتھ ہی یہ چیز بھی نمایاں ہوگئی کہ مسلمانوں کے لیے بنیادی مسئلہ نہ رفع جہالت کا ہے، نہ اقتصادیات کا۔ نہ اپنے اور ابنائے وطن کے تعلقات کا، نہ منصبی اور عرفی حیثیت کا، بلکہ اصل مسئلہ ان سب مصائب کی بنیاد کو اکھاڑ پھینکنے کا ہے اور وہ غلامی ہے جس کا ایک سرا ہندوستان کے گلے میں پڑا ہوا ہے اور دوسرا پوری دنیائے اسلام کے گلے میں ہے۔"

"یہی ہے موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لیے نہ ورود تورات اترنے کی دعا کی جس سے ان کا تعلیمی مسئلہ متعلق تھا، نہ ان کی اقتصادی حالت کی طرف کچھ زیادہ توجہ فرمائی جس سے مالی حالت درست ہوتی اور نہ اور ہی امور کی طرف زیادہ التفات فرمایا جن سے حیثیت وعزت کا تعلق تھا بلکہ سب سے اول ان مفاسد کے سرچشمے (غلامی) کی جڑ پر تیشہ لگایا اور فرعون کو خطاب کیا کہ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ تاکہ یہ آزادانہ زندگی بسر کرسکیں اور اپنی مذہبی اور سیاسی تعمیر باختیار خود کرنے پر قادر ہوجائیں۔"

"پس آج بھی ہندوستانیوں کے لیے بنیادی مسئلہ آزادی ہند اور آزادی دنیائے اسلام کا ہے جو آزادی ہند ہی سے متعلق ہے۔۔۔۔۔۔پس مسلمانوں کے لیے حصول آزادی کی جدوجہد کوئی رسمی سیاست نہیں بلکہ ایک مذہبی فریضہ ہے جس کے لیے انھیں اپنی پوری اجتماعی قوت صرف کرنے کی ضرورت ہے۔"

مذکورہ بالا اقتباسات پیش کرکے ہمارے بھائی نے ہم سے مندرجہ ذیل سوالات کیے ہیں:۔

"کیا موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کی اولین غرض بنی اسرائیل کو آزاد کرانا تھا؟ کیا تمام انبیاء علیہم السلام کی بعثت کی غرض ایک نہیں ہے؟ اگر موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کی غرض آزادیٔ بنی اسرائیل تھی جیسا کہ مولانا نے فَأْتِيَاهُ فَقُولَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ (اس کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم تیرے رب کے رسول ہیں پس ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دے) سے استدلال کیا ہے تو پھر ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ اہم بات آزادی کی جدوجہد ثابت ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لیے رفع جہالت کا مسئلہ کوئی بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آپ نے اس سے مختلف راستہ اختیار کیا؟ آپ بھی آزادی کی جدوجہد میں، دوسرے علمائے کرام کی طرح، کیوں نہیں لگ جاتے؟ آخر آپ ایک بنیادی مسئلہ کو چھوڑ کر ایک غیر ضروری، ضمنی اور بالکل ہی غیر بنیادی مسئلہ (رفع جہالت مسلمین) میں اپنی اور اپنے رفقا کی قوت و قابلیت کیوں صرف فرماتے ہیں؟ اور اگر ان پیدا شدہ سوالات کی بنیاد آپ کے نزدیک غلط ہے تو پھر ضروری ہے کہ اس معروضہ پر پوری تفصیل کے ساتھ کلام فرمائیے۔ ایک طرف اس عالم دین کی شخصیت ہے جو علم و تقویٰ میں کل ہند شہرت رکھتی ہے دوسری طرف اس کے یہ ارشادات ہیں جن کے نتائج سے دل لرزتا ہے۔ ہمیں بتائیے کہ کیا موسیٰ علیہ السلام فی الواقع کوئی "نیشنلسٹ لیڈر" تھے یا "نبی اور رسول" تھے؟

ہمارے یہی بھائی ایک دوسرے گرامی نامہ میں ایک اور سوال دریافت فرماتے ہیں جو اسی سلسلہ سے تعلق رکھتا ہے بلکہ اس سے اوپر کی غلط فہمیوں کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے اس وجہ سے ہم اسے بھی یہیں درج کیے دیتے ہیں تاکہ اسی ضمن میں اس کا بھی جواب ہو جائے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"۱۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے تو اس وقت بنی اسرائیل ان ہی حالات میں گرفتار تھے جن میں آج ہندی مسلمان گرفتار ہیں لیکن حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کی اخلاقی تربیت پر زیادہ زور نہیں دیا اور اگر دیا بھی تو انھوں نے اپنی قوم کے صالحین کو چھانٹ کر الگ ایک جتھا نہیں بنایا یہاں تک کہ جب وہ نکلے ہیں تو کوئی بھی اسرائیلی پیچھے نہیں رہا۔

"۲۔ صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر میں باب کے خاتمہ کے قریب ایک حدیث آئی ہے کہ جب آپ بدر کی مہم پر روانہ ہوئے تو راستہ میں ایک بہادر جری آدمی ملا اور اس نے کہا "جئت لاتبعك واصيب معك" لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے "ایمان باللہ والرسول" سے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ مسلم نہیں ہے اس پر آپ نے فرمایا "ارجع فلن استعين بمشرك"۔ اسی طرح کئی بار سوال و جواب ہوا بالآخر اس نے ایمان باللہ والرسول کا اقرار کیا تو اسے "مومن" کی حیثیت سے "جہاد" میں شرکت کی اجازت دی اور وہ مجاہدین کے ساتھ چل پڑا۔

نمبر اول سے معلوم ہوتا ہے کہ دور غلامی میں کچھ بہت زیادہ کچے اور پکے لوگوں کو چھانٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اتنا کافی ہے کہ وہ جس درجہ پر بھی ایمان کے ہوں انھیں لے کر آزادی کے حصول کی کوشش شروع کر دی جائے پھر آزاد ہونے کے بعد تزکیہ وغیرہ کا کام شروع کیا جائے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا۔

نمبر ۲ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پرانے مسلمان تو خیر پرانے ہیں جو آج ہی ایمان لائے ہوں اور تطہیر و تزکیہ ان کا بالکل نہ ہوا ہو

انھیں بھی بغیر کسی تیاری کے جہاد میں تحریک کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر جماعت اسلامی اپنے اس ابتدائی مرحلہ پر کن وجوہ سے کاٹ چھانٹ کرتی ہے، ہندوستان کے مسلمان بنی اسرائیل سے اور اس نو مسلم سے زیادہ بگڑے ہوئے تو نہیں ہیں؟"

تین غلط فہمیاں یہ سارا استدلال درحقیقت تین غلط فہمیوں پر مبنی ہے:-

۱۔ پہلی غلط فہمی یہ ہے کہ یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ فرعون اور اس کی قوم سے صرف یہ تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو آزاد کر دے۔ ان بزرگوں کے خیال میں حضرت موسیٰ علیہ السلام یا تو فرعون اور اس کی قوم کی طرف بحیثیت رسول سرے سے بھیجے ہی نہیں گئے تھے، یا بھیجے گئے تھے تو بعد کے تمام رسولوں کے طریقہ کے خلاف، فرعون اور اس کی قوم کے لیے ان پر یہ ذمہ داری نہیں ڈالی گئی تھی کہ ان کو ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرت کی دعوت دیں، ان پر اللہ کی حجت تمام کریں، ان کو خدا سے ڈرائیں اور تذکیر و تبلیغ کا وہ فرض انجام دیں جو ہر نبی اور رسول ان لوگوں کے اندر انجام دیتا ہے جن کی طرف وہ بھیجا جاتا ہے۔ یہ ساری ذمہ داریاں ان کے اوپر صرف بنی اسرائیل کے لیے تھیں۔ فرعون اور اس کی قوم کی ہدایت و ضلالت سے ان کو کوئی سروکار نہ تھا۔ فرعون سے ان کا معاملہ صرف یہ تھا کہ اپنی قوم کو اس کی غلامی سے چھڑا لیں۔ بس اسی کام پر اللہ تعالیٰ نے ان کو مامور کیا تھا چنانچہ جاتے ہی انھوں نے یہ مطالبہ فرعون کے سامنے پیش کر دیا اور اسی طرح پیش کر دیا جس طرح کانگریس نے "ہندوستان کو خالی کر دو" (Quit India) کا رزولیوشن پاس کر دیا۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ کانگریس نے یہ تجویز نصف صدی سے زیادہ کی جد و جہد کے بعد پاس کرنے کی جرأت کی لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ خدا کی طرف سے صرف بنی اسرائیل کو آزادی ہی دلانے کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے اس وجہ سے بے خوف و خطر انھوں نے اپنا مطالبہ، پہلی ہی ملاقات میں، فرعون اور اس کی قوم کے سامنے رکھ دیا۔ اور ان کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ وہ بنی اسرائیل کی آزادی کی مہم پر خدا کی طرف سے بھیجے گئے ہیں انھوں نے متعدد معجزات دکھائے لیکن یہ لوگ، ان معجزات کے بعد بھی، بنی اسرائیل کو غلام بنانے ہی پر اڑے رہے۔ بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے روانہ ہو گئے اور فرعون اور اس کی ساری فوج ان کا تعاقب کرتے ہوئے بحر قلزم میں غرق ہو گئی۔

۲۔ دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ یہ حضرات بنی اسرائیل کے اندر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کو دو مختلف حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک دور ان کی مصر کی زندگی کا۔ دوسرا دور ان کے مصر سے نکلنے کے بعد کی زندگی کا۔ اور ان دونوں دوروں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کام بنی اسرائیل کے اندر، ان لوگوں کے نزدیک، دو بالکل مختلف نوعیتیں رکھتا ہے۔ پہلے دور میں ان کے نزدیک اصلی کام بنی اسرائیل کی آزادی کا تھا اور اسی پر انھوں نے اپنی ساری توجہ مرکوز کی۔ اس دور میں انھوں نے نہ ان کے عقائد و ایمانیات کا سوال چھیڑا اور نہ ان کی تربیت و تزکیہ کی طرف کچھ ایسی توجہ کی۔ صرف نسلی عصبیت کے نعرہ پر، جس طرح ایک نیشنلسٹ لیڈر کرتا ہے انھوں نے تمام بنی اسرائیل کے اندر آزادی کی ایک لگن پیدا کر دی اور ان کو اپنی قیادت پر جمع کر لیا۔ اس سے قطع نظر کہ کوئی شخص خدا کو مانتا ہے یا نہیں، آخرت پر اس کا ایمان ہے یا نہیں، ان کی رسالت پر اس کو عقیدہ ہے یا نہیں، ہر اسرائیلی ان کی فوج کا سپاہی اور ان کی جماعت کا ایک رکن تھا اور ان سب کو بلا فرق و تمیز وہ مصر سے لے کر نکلے۔ ان کے مومن و منافق اور کافر و فاسق میں انھوں نے کوئی امتیاز نہیں کیا۔ جب فرعون کی غلامی سے باہر نکل آئے، تب انھوں نے ان کی تربیت و تعلیم اور اصلاح و تزکیہ کی طرف توجہ فرمائی اور ان کو خدا اور اس کے قانون سے آشنا کیا۔ اس طرح

ان حضرات کے خیال میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کام، ان کی زندگی کے پہلے دور میں، ایک نیشنلسٹ لیڈر کے کام سے کچھ مختلف نہیں ہے اور مصر میں انھوں نے فرعون سے جو لڑائی لڑی وہ شرک و توحید اور کفر و اسلام کی جنگ نہ تھی بلکہ قبطیت اور اسرائیلیت کی جنگ تھی۔ ایک قوم پرست لیڈر کو جس طرح اپنی قوم کی آزادی عزیز ہوتی ہے اسی طرح ان کو بھی اپنی قوم کی آزادی عزیز تھی جس طرح ہر شخص جو نسل و خون اور وطنیت و قومیت میں اس لیڈر کا شریک ہوتا ہے، ان کے مفاد کے لیے وہ سر دھڑ کی بازی لگاتا ہے اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی ہر اسرائیلی کی آزادی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائی۔ اور جس طرح ایک نیشنلسٹ لیڈر اشتراک اور ہم جنسی کے ان بنیادی اصولوں کے سوا جن پر اس کی قوم کی قومیت قائم ہوتی ہے، اور کسی چیز کو اہمیت نہیں دیتا اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی قبطیت اور اسرائیلیت کے اس معرکہ میں، اسرائیلیت کے سوا کسی چیز کو اہمیت نہیں دی۔

۳۔ تیسری غلط فہمی یہ ہے کہ ان بزرگوں کے نزدیک ساری برائیوں کی جڑ غلامی اور ساری خوبیوں اور برکتوں کا سرچشمہ آزادی ہے۔ غلامی سے، ان حضرات کے نزدیک، مراد یہ ہے کہ کوئی قوم جو نسل و زبان، تہذیب و معاشرت اور جغرافیائی حدود کے اعتبار سے ایک علیحدہ قوم گنی جاتی ہو وہ کسی ایسی قوم کی محکوم ہو جائے جو ان اعتبارات سے ایک علیحدہ حیثیت رکھتی ہو۔ اور آزادی کا مفہوم، ان کے نزدیک، یہ ہے کہ اس طرح کے اجنبی اقتدار سے محکوم قوم آزاد ہو کر اپنی تعمیر باختیار خود کر سکے۔ یہ آزادی اور اپنی تعمیر باختیار خود کر سکنے کا حق ان کے نزدیک تمام بھلائیوں کی بنیاد ہے۔ جب تک کسی قوم کو یہ خود مختاری نہ حاصل ہو اس وقت تک وہ نیکی کی راہ میں ایک قدم بھی نہیں بڑھ سکتی۔ اس وجہ سے، ان کے نزدیک یہ ضروری ہوا کہ اگر کوئی قوم غلام ہو تو اس کی اصلاح کے سلسلہ میں پہلا قدم یہ ہے کہ اس کو آزاد کیا جائے اور جب تک اس کو آزادی نہ حاصل ہو جائے اس وقت تک اس کی اصلاح و تربیت کے سارے کام ملتوی رکھے جائیں۔ ان حضرات کے نزدیک چونکہ یہ آزادی وجود و بقا کی تمام برکتوں کا سرچشمہ ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ اس مقصد کے لیے انبیاء مبعوث فرماتا ہے۔ اور یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ کسی غلام قوم کے لیڈروں کا سب سے بڑا، سب سے مقدس اور سب سے مقدم فرض اپنی قوم کو آزاد کرانا ہے۔

غلط فہمیوں کے تین سبب ان غلط فہمیوں پر تنقید کرنے سے پہلے، بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ ان میں مبتلا ہونے والے حضرات معمولی لوگ نہیں بلکہ عالی مقام بزرگان دین ہیں، ضروری ہے کہ ان کے پیدا ہونے کے اسباب کا بھی ذکر کر دیا جائے۔ ہمارے خیال میں ان کے پیدا ہونے کے بھی تین سبب ہیں۔

(الف) پہلا سبب یہ ہے کہ تورات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ساری جد و جہد جو انھوں نے مصر میں کی ہے، اصول و عقائد کی جنگ کے بجائے ایک قومی و نسلی نزاع کے رنگ میں پیش کی گئی ہے۔ جو شخص بھی تنقید کی گہری نظر کے بغیر اس کو پڑھے گا وہ اس کو ایک پیغمبر کی دعوت ایمان و اسلام سے زیادہ ایک نیشنلسٹ لیڈر کی تحریک آزادی سے زیادہ مشابہ پائے گا۔ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ساری توجہ کا مرکز یہی نقطہ معلوم ہوتا ہے کہ "بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دو"۔ ساری داستان میں یہ بات کہیں نہیں نمایاں ہوتی کہ حضرت موسیٰؑ فرعون اور اس کی قوم کو اللہ، روز آخرت اور اس کے بھیجے ہوئے ہادی پر دل سوزی کے ساتھ ایمان لانے کی دعوت دے رہے ہوں اور فرعون اور اس کی قوم سے کسی اصول و

نبی کی جدوجہد کے نیو بالکل دوسرے محرکات کے تحت ڈال دیا اور اب کہ ایک غلط راہ کی بہت سی منزلیں طے کر چکنے کے بعد انھیں محسوس ہو رہا ہے کہ وہ بالکل ایک غلط راہ پڑ لیے ہیں تو بجائے اس کے کہ الٹے پاؤں واپس لوٹیں اس بات کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کسی طرح قرآن و حدیث سے ان کی یہ غلط روی ہدایت ثابت ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی کوشش کا نتیجہ یہ ہونے نکلنے سے رہا کہ غلط فہمیاں دور ہوں اس کا نتیجہ تو یہی ہو سکتا ہے کہ جتنا ہی یہ حضرات اپنی غلطی کو صحیح ثابت کرنے کے لیے زور لگائیں گے اتنا ہی حق سے یہ اور دور ہٹتے جائیں گے۔ ہاں اگر ان کے اندر یہ ہمت ہوتی کہ حق کی خاطر اپنی قیادت کے پندار کو مجروح کر سکتے تو ہمیں یقین ہے کہ اس غلط رنگ آمیزی کے باوجود، جو علمائے یہود نے اپنی تاریخ پیش کرنے میں کی ہے، اور اس ایجاز کے باوجود جو قرآن مجید میں پایا جاتا ہے، بالکل پہلی نظر میں ان کے سامنے اصل حقیقت بالکل روشن ہو کر آجاتی۔

ایک نبی اور ایک نیشنلسٹ لیڈر کے بنیادی اختلافات

شاید ان حضرات نے کبھی سکون کے ساتھ اس مسئلہ پر غور نہیں فرمایا کہ ایک نبی کی دعوت اور ایک قوم پرست لیڈر کی تحریک میں ایسے بنیادی اختلافات ہیں کہ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ ایک نبی کے نزدیک تمام خرابیوں کی جڑ انسان کی خود مختاری اور آزادی ہے اور تمام بھلائیوں کا سرچشمہ اللہ کی بندگی اور تنہا اسی کی اطاعت ہے۔ اس کے بالکل برعکس ایک قوم پرست لیڈر ساری خرابیوں کی جڑ غلامی کو قرار دیتا ہے اور ساری ترقیوں کا منبع اپنی تعمیر بااختیار خود کرنے کے حق کو سمجھتا ہے۔ ایک نبی کی قوم ایمان و اسلام کے اصولوں پر ایمان لانے سے بنتی ہے اور ایک قومی لیڈر کی قوم نسل و نسب اور وطنیت کے مسالہ سے تعمیر ہوتی ہے۔ ایک نبی کی ساری لڑائی اصول و عقائد سے ہوتی ہے۔ جو عقائد اس کے عقائد کے خلاف ہوتے ہیں ان سے وہ جنگ کرتا ہے، خواہ وہ اس کی قوم کے اندر پائے جاتے ہوں یا کسی دوسری قوم کے اندر اور جو لوگ اس کے اصولوں کو مان لیتے ہیں وہ ان سے اپنی جماعت بنا لیتا ہے، خواہ وہ اس کی قوم کے اندر سے آئے ہوں یا اس کے باہر سے۔ اس کے بالکل برعکس ایک قومی لیڈر کا سارا جھگڑا اس قوم سے ہوتا ہے جو نسل و نسب یا وطنیت اور رنگ میں اس کی مخالف ہے اور چونکہ یہ اختلاف بہر شکل باقی رہتا ہے اس وجہ سے اس کا اختلاف بھی بہر حال قائم رہتا ہے۔ ایک نبی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے وہ نظام پیش کرتا ہے جو تمام بنی آدم کے لیے یکساں مفید ہو اور ایک قومی لیڈر زندگی کے سارے نقشے اپنی قوم کے مفاد کو سامنے رکھ کر بناتا ہے۔ یہ بنیادی اختلافات اتنے اہم ہیں کہ اگر مذہب کی زبان میں ان کو تعبیر کیا جائے تو ایک کفر ہے، دوسرا ایمان، ایک توحید ہے دوسرا شرک۔ اس وجہ سے اس کا امکان بالکل نہیں ہے کہ ایک شخص نبی اور رسول بھی ہو اور قومی لیڈر بھی، یا ایک نبی اپنی زندگی کے کسی دور میں تو ایک قومی لیڈر کے اصولوں پر کام کرے اور دوسرے دور میں ایک نبی کے اصولوں پر۔ کیونکہ ایسا فرض کرنا درحقیقت اس بات کو فرض کرنا ہے کہ العیاذ باللہ ایک نبی اپنی ایک ہی زندگی کے اندر کفر و اسلام دونوں کے اصول جمع کرے یا اپنی زندگی کے ایک دور میں تو وہ شرک کا داعی ہو اور دوسرے دور میں توحید کا۔ یہ باتیں اتنی واضح ہیں کہ کوئی صاحب فہم ایک لمحہ کے لیے بھی اس غلطی میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص کو پیغمبر بھی مانے اور پھر اس کی طرف ایک قومی لیڈر کی خصوصیات بھی منسوب کر دے۔ لیکن بدقسمتی سے چونکہ بہت سے علمائے دین اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہیں اس وجہ سے ہم قرآن مجید کی روشنی میں یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام صرف نبی اور رسول تھے۔ اپنی بعثت کے شروع میں بھی اور بعثت کے آخر میں بھی، فرعون کے لیے بھی اور بنی اسرائیل کے لیے بھی، اور

اس واقعہ سے کہ ان کی قوم کسی اور قوم کی غلام تھی۔ ان کے پیغام اور ان کے کام میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا۔ جو دعوت تمام انبیاء کرام نے اپنی اپنی قوموں کو دی وہی دعوت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو دی، جو ڈراوا ہر پیغمبر نے اپنی قوم کے ارباب اقتدار (ملأ مستکبرین) کو سنایا وہی ڈراوا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے ارباب اقتدار اور ملأ مستکبرین کو سنایا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ دوسرے انبیاء کی قوموں کے ارباب اقتدار ان کی اپنی قوم کے اندر ہی کے لوگ ہوتے تھے، بنی اسرائیل کے ارباب اقتدار ان کے باہر کے یعنی قبطی تھے لیکن اس اختلاف سے کوئی ایسا جوہری فرق نہیں واقع ہوتا کہ ایک نبی کے اصول دعوت میں فرق پیدا ہو جائے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو دعوت حق دی، ان سے مناظرے کیے، ان کو معجزے دکھائے، ان پر اللہ کی حجت تمام کی، یہاں تک کہ ان کے اندر سے کچھ اہل حق ایمان بھی لائے لیکن جیسا کہ ہر نبی کی قوم کے ارباب اقتدار کی اکثریت نے نبی کی تکذیب کی اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد کے ملأ مستکبرین نے بھی ان کی تکذیب کی اور پھر جس طرح ہر نبی نے اپنی طرف سے اتمام دعوت اور مستکبرین کی طرف سے تکذیب اور قتل کی دھمکی کے بعد ہجرت کی اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے زمانہ کے مستکبرین کی طرف سے مایوس ہو جانے کے بعد ہجرت فرمائی اور جس طرح ہر نبی کے جھٹلانے والے، نبی کی ہجرت کے بعد، خدا کے عذاب میں گرفتار ہوئے اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعداء بھی ان کی ہجرت کے بعد گرفتار عذاب ہوئے۔ یہ ساری تفصیلات قرآن میں موجود ہیں ہر شخص قرآن کو پڑھ کر دیکھ سکتا ہے کہ اس امر واقعہ کی وجہ سے کہ حضرت موسیٰؑ کی قوم کسی دوسری قوم کی غلام تھی، نہ نبی کے فرائض رسالت کی نوعیت میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی نہ انبیاء کے لیے اور ان کے جھٹلانے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے جو مقررہ قوانین ہیں ان میں سر مو کوئی فرق ہوا۔ ایک ہی ضابطہ جو آدم سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جاری رہا وہی ہم یہاں بھی جاری دیکھتے ہیں۔ اور فرق ہو بھی کیا سکتا تھا؟ مستکبرین کی نسل بدل جانے سے ان کی ذہنیت میں تو کوئی تبدیلی ہوتی نہیں۔ قریش کے ارباب اقتدار ابو جہل اور ابو لہب ہوں یا بنی اسرائیل کے ارباب اقتدار فرعون و ہامان دونوں ایک ہی بیماری میں مبتلا تھے پھر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک کے پاس تو اللہ کا رسول یہ دعوت لے کر آئے کہ ایمان لاؤ، اور عمل صالح اختیار کرو اور دوسرے کے پاس محض بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ۔ آخر مستکبرین اور مستضعفین کی نسل مختلف ہونے کی وجہ سے خدا کے انبیاء کا رویہ کیوں بدل جائے؟ کیا العیاذ باللہ انبیاء بھی نسل و نسب کی اسی عصبیت میں گرفتار ہوتے ہیں جس میں ہمارے ہندوستان کے برہمن گرفتار تھے کہ شودر کے کان میں وید کا کوئی کلمہ نہ پڑنے پائے اور کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے کوئی نسلی پرخاش تھی کہ اگر وہ اللہ پر ایمان بھی لاتا جب بھی وہ یہی چاہتے کہ اس کی قوم الگ اور ان کی قوم علیحدہ رہے؟

اسی طرح بنی اسرائیل کے لیے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت وہی تھی جو ہر نبی اپنی قوم کو دیتا ہے۔ یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرت کی دعوت۔ کسی دوسری قوم کے زیر اقتدار ہونے کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہرگز یہ نہیں کیا کہ ان کو نسلی عصبیت کے نعرے پر جمع کر کے پہلے فرعون سے آزادی حاصل کرنے کی دعوت دیں اور اس کام سے فارغ ہونے کے بعد ایمان و اسلام کا درس شروع کریں۔ ان کی مصر کی زندگی اور مصر سے نکلنے کی بعد کی زندگی میں جو کچھ فرق ہے وہ صرف اجمال و تفصیل کا ہے۔ یعنی مصر کی زندگی میں انھوں نے اپنی قوم کو صرف اصول دین کی تعلیم دی۔ عقائد میں سے اللہ، رسول اور آخرت پر ایمان کی، عبادات میں سے نماز اور قربانی کی، اخلاق و اعمال میں سے توکل، صبر، اور حق پر استقامت کی۔ اور

مصر سے نکلنے کے بعد ان سارے اصولوں کی شرح فرمائی اور ان کے مطابق ان کی تربیت کی۔ یہ بعینہٖ اسی طرح کا تدریجی ارتقاء ہے جو ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قبل ہجرت اور بعد ہجرت کی دعوت میں پاتے ہیں۔ جس طرح آنحضرت صلعم کی مکی اور مدنی زندگی بالکل ہم آہنگ اور مربوط ہے، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے دونوں دور بالکل ہم آہنگ اور مربوط ہیں۔ یہ ان کے اوپر نہایت بدترین تہمت ہے کہ وہ مصر میں تو نسل و نسب کے دعوائے جاہلیت کے علمبردار تھے، لیکن سینا میں آکر خدا کے داعی بن گئے۔ البتہ طبیعت میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام محض قومیت کے نعرہ پر لوگوں کو جمع نہیں کر رہے تھے بلکہ ایمان و اسلام کے اصولوں پر جمع کر رہے تھے تو آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جب وہ مصر سے نکلے تو ان کی ساری قوم ان کے ساتھ تھی۔ لیکن اولاً تو یہ بیان تورات کا ہے جس کی نسبت ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ اس میں بنی اسرائیل کی ساری تاریخ نسلی استحقاق اور خاندانی فضیلت کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے، ثانیاً یہ امر بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ دنیا میں کسی نبی کی تکذیب بھی کمزوروں اور مظلوموں نے نہیں کی ہے۔ صرف قوم کے ارباب جاہ نے کی ہے۔ بنی اسرائیل من حیث القوم ارباب جاہ میں شامل نہیں تھے بلکہ مستضعفین یعنی مظلوموں میں تھے۔ ان کے لیے کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں خدا کے اتنے عجائب اور اس کی قدرت کے اتنے کرشمے دیکھ کر بھی ایمان نہ لاتے درانحالیکہ ان کو ایمان سے پھیرنے والے ارباب اقتدار اپنے مظالم اور اپنی نسلی عصبیت و اجنبیت کی وجہ سے اپنا اعتماد ان کے اندر بالکل کھو چکے ہوں۔ اور خوف کے سوا کوئی دوسری کشش بھی بنی اسرائیل کو ان کی طرف کھینچنے والی نہ ہو۔

حضرت موسیٰؑ کا مطالبہ فرعون اور اس کی قوم سے

یہ محض اجمالی بیان تھا۔ اب کسی قدر تفصیل سے اصل صورت حالات کو قرآن مجید کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیے۔ اور پہلے یہ دیکھیے کہ فرعون اور اس کی قوم کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تعلق کی نوعیت کیا تھی؟ کیا وہ محض ایک نیشنلسٹ لیڈر کی حیثیت سے ان کے پاس محض یہ مقصد لے کر گئے تھے کہ ان کی غلامی سے اپنی قوم کو چھڑائیں یا بحیثیت رسول کے اس حیثیت سے کہ ان کو خدا پر ایمان لانے، خدا سے ڈرنے اور اپنی زندگیوں کو پاک کرنے کی دعوت دیں؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلی اصولی بات قرآن مجید نے یہ بتائی ہے:-

إِنَّآ أَرْسَلْنَآ إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ	ہم نے تمہاری طرف بھیجا ہے ایک رسول تم پر گواہ بنا کر جس طرح
كَمَآ أَرْسَلْنَآ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ	ہم نے بھیجا تھا ایک رسول فرعون کی طرف گواہ بنا کر تو فرعون نے اس رسول
الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا - (۱۵، ۱۶ مزمل)	کی نافرمانی کی تو ہم نے اس کو سخت عذاب میں پکڑا

اس آیت میں مخاطب قریش ہیں۔ ان سے یہ بات کہی جا رہی ہے کہ جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول، دین حق کی دعوت دینے کے لیے، بھیجا تھا اسی طرح تمہاری طرف ایک رسول، اللہ کے دین کی دعوت کے لیے بھیجا ہے۔ فرعون نے اس رسول کی دعوت قبول نہ کی تو وہ عذاب میں پکڑا گیا، اسی طرح اگر تم اس رسول کی بات نہ سنو گے تو عذاب میں گرفتار ہو گے۔

اس سے چند باتیں بالکل صاف ہو گئیں۔ پہلی یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون اور اس کی قوم کے پاس اسی طرح رسول بنا کر بھیجے گئے تھے جس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قریش کی طرف بھیجے گئے تھے۔ دوسری یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی فرعون اور اس کی قوم کی طرف اسی طرح شاہد، یعنی اللہ کے دین کے داعی بنا کر بھیجے گئے تھے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اہل عرب

کی طرف اللہ کے دین کے داعی بنا کر بھیجے گئے تھے۔ تیسری یہ کہ فرعون اور اس کی قوم کا جرم بھی بعینہ وہی ہے جو آنحضرت صلعم کی قوم کا تھا۔ یعنی جس طرح قریش نے اللہ کے رسول کی دعوت نہ مانی اسی طرح فرعون اور اس کی قوم نے بھی اللہ کے رسول کی بات نہ مانی۔

دوسری جگہ اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ بات بھی قرآن نے بیان کر دی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس ایمان، تزکیہ اور خشیت الٰہی کی دعوت دینے کے لیے بھیجے گئے تھے۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۔ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى (النازعات ۱۷۔۱۹)

فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اور اس سے کہو کیا تجھ میں کچھ رغبت ہے کہ تو پاکی حاصل کرے اور میں تجھے تیرے رب کی راہ بتاؤں تو اس سے ڈرے۔

اس آیت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس اس لیے بھیجے گئے تھے کہ اس کے اندر اگر نیک اور پاکباز انسان بننے کا کچھ وہم داعیہ ہو تو اس کو پاکیزہ زندگی کا طریقہ بتائیں اور اگر خدا شناسی کا کچھ میلان ہو تو اس کو خدا کی صفتوں اور اس کے حکموں کی تعلیم دیں تاکہ وہ خدا سے ڈرے۔ نیز اسی آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ قرآن کی اصطلاح میں طغیان کا مطلب یہ ہے کہ آدمی میں خدا سے بے پروائی پیدا ہو جائے۔

یہی بات ایک اور مقام میں بیان ہوئی ہے۔ اور وہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ نہایت نرمی اور بھلائی کے ساتھ فرعون کو تبلیغ حق کی جائے تاکہ تذکر اور خشیت کی راہ اختیار کرنے میں اس کے لیے داعی کی طرف سے کوئی چیز مانع نہ ہو۔

اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۔ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۔ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى

تم اور تمہارے بھائی دونوں میری نشانیوں کے کر جاؤ اور میرا ذکر بلند کرنے میں ڈھیلے نہ پڑنا، فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو گیا ہے اور اس کو نرمی کے ساتھ تبلیغ کرو تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کرے یا ڈرے۔

اسی سلسلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام خود فرعون سے فرماتے ہیں:

قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۔ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى

ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے ایک نشانی لے کر آئے ہیں اور سلامتی ہے اس کے لیے جو اللہ کے طریقہ کی پیروی کرے۔ ہمارے پاس یہ وحی آئی ہے کہ خدا کا عذاب اس پر آئے گا جو جھٹلائے گا اور منہ موڑے گا۔

"الہدیٰ" کے معنی اللہ کی ہدایت کے ہیں جیسا کہ فرمایا ہے (قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى) جس سے صاف واضح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس صرف بنی اسرائیل کو آزاد کرانے کے لیے نہیں گئے تھے بلکہ اللہ کی ہدایت لے کر گئے تھے جس کو قبول کرنے کی صورت میں فرعون کے لیے اللہ کی رحمت تھی اور جس سے اعراض کرنے کی صورت میں اس کا قہر و عذاب۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کی قوم کے سامنے توحید و معاد پر تقریریں بھی کیں۔

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ۔ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۔ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ۔ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ

اس نے پوچھا تمہارا رب کون ہے اے موسیٰ؟ جواب دیا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو پہلے اس کی خلقت عطا فرمائی پھر اس کو ہدایت بخشی۔ پوچھا گزشتہ قوموں کا کیا حال ہے؟ جواب دیا ان کا حال میرے رب کے علم میں ہے ایک کتاب

رَبِّي وَلَا يَنسَى ۔ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا وَسَلَكَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّن نَّبَاتٍ شَتَّىٰ ۔ كُلُوا وَارْعَوْا أَنْعَامَكُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النُّهَىٰ ۔ مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ (طٰہٰ)

میں لکھا ہوا۔ نہ میرا رب بھٹکے گا نہ بھولے گا جس نے تمھارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا، اس میں تمھارے لیے راہیں نکالیں اور آسمان سے پانی اتارا پس ہم نے پیدا کیں، اس سے طرح طرح کی نباتات، کھاؤ اور چراؤ اپنے مویشیوں کو۔ بے شک اس کے اندر دلیلیں ہیں عقلمندوں کے لیے۔ اسی سے ہم نے تم کو پیدا کیا، اسی میں لوٹائیں گے، اور پھر اسی سے دوبارہ پیدا کریں گے۔

. . . .

قرآن نے توحید پر بعض مناظرے بھی نقل کیے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان ہوئے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعَالَمِينَ ۔ قَالَ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِن كُنتُم مُّوقِنِينَ ۔ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهُ أَلَا تَسْتَمِعُونَ ۔ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ ۔ قَالَ إِنَّ رَسُولَكُمُ الَّذِي أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ لَمَجْنُونٌ ۔ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِن كُنتُمْ تَعْقِلُونَ ۔ قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ إِلَٰهًا غَيْرِي لَأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُونِينَ (شعراء)

فرعون نے پوچھا اور یہ رب العالمین کیا ہے؟ جواب دیا آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب۔ بشرطیکہ تم یقین کرو۔ اس نے اپنے درباریوں سے کہا، سنتے ہو؟ کہا تمھارا بھی رب اور تمھارے پچھلے بزرگوں کا بھی رب۔ کہا یہ رسول، جو تمھاری طرف بھیجا گیا ہے، یہ تو پاگل معلوم ہوتا ہے۔ اس نے کہا مشرق اور مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب۔ بشرطیکہ تم سمجھو۔ بولا اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو میں تمھیں قید خانے کے حوالے کر دوں گا

فرعون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ شکایت بھی تھی کہ یہ جس بات کی دعوت دے رہے ہیں ہم نے اپنے بزرگوں سے نہیں سنی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے جواب میں یہ فرماتے کہ میں تمھارے پاس اللہ کی ہدایت لے کر آیا ہوں۔ یہ بعینہٖ وہی شکایت ہے جو ہر نبی کی قوم نے اس کی دعوت کے متعلق کی ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جواب بھی بعینہٖ وہی ہے جو ہر نبی نے قوم کے اس اعتراض کے جواب میں دیا ہے۔

وَمَا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ ۔ وَقَالَ مُوسَىٰ رَبِّي أَعْلَمُ بِمَن جَاءَ بِالْهُدَىٰ مِنْ عِندِهِ وَمَن تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ۔ وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي

اور ہم نے تو یہ بات (توحید) اپنے اگلوں میں نہیں سنی اور موسیٰ نے کہا میرا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون اس کے پاس سے ہدایت لے کر آیا ہے اور انجام کار کی کامیابی کس کو حاصل ہوگی۔ یقیناً ظالم فلاح نہیں پائیں گے۔ اور فرعون نے کہا اے لوگو میں تمھارے لیے اپنے سوا کسی معبود سے واقف نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سارا جھگڑا فرعون سے بنی اسرائیل کی آزادی ہی کے لیے تھا تو فرعون کے اس اعتراض کا کیا مطلب کہ حضرت موسیٰ آبا و اجداد کے طریقہ کے خلاف ایک بدعت پھیلا رہے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس جواب کا کیا موقع پیدا ہوا کہ میں اگرچہ اپنی دعوت کی تائید میں آبا و اجداد کے طریقہ کی سند نہیں رکھتا لیکن اللہ تعالیٰ کی سند رکھتا ہوں؟ اور پھر اس بات کی ضرورت کیا پیش آئی کہ فرعون اپنے تمام ارباب حل و عقد کو اس بات پر متنبہ کرے کہ میرے سوا کسی کو

الٰہ نہ ماننا؟

اس سے زیادہ واضح بات ایک یہ ہے کہ فرعون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے جو سب سے بڑا اندیشہ تھا وہ یہ نہ تھا کہ بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ لے کر اٹھے ہیں بلکہ یہ تھا کہ یہ کہیں اس کی قوم کا دین نہ بدل دیں اور ملک میں اس کی خدائی کے خلاف بغاوت نہ برپا کر دیں۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِى الْاَرْضِ الْفَسَادَ (المومن)

اور فرعون نے کہا مجھے چھوڑو میں موسیٰ کو قتل کیے دیتا ہوں اور وہ اپنی مدد کے لیے اپنے رب کو بلائے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ تمہارا دین نہ بدل دے یا ملک میں فساد برپا کر دے۔

اور فرعون کا یہ اندیشہ بالکل بجا تھا۔ قبطیوں کے اندر بہت سے لوگ کھلم کھلا حضرت موسیٰ پر ایمان لا چکے تھے جن میں سب سے زیادہ حق پرست اور جری وہ لوگ تھے جو اپنے سحر سے حضرت موسیٰ کے معجزات کا مقابلہ کرنے آئے تھے اور بالآخر حق کی طاقت سے مغلوب ہو کر سحر سے تائب ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو فرعون کے جبر و ظلم کی وجہ سے اپنے ایمان کو چھپاتے تھے۔ چنانچہ ان کے اندر سے ایک شخص نے اس وقت اپنے ایمان کا اعلان کیا جب ان کی قوم نے حضرت موسیٰ کے قتل کا ارادہ کیا ہے اور اس وقت اس نے فرعون اور اس کی قوم کے سامنے دعوت ایمان پر ایک تقریر کی ہے جو قرآن مجید میں نقل ہوئی ہے۔ اس تقریر کو پڑھ کر ہر شخص معلوم کر سکتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے درمیان اصلی کشمکش بنی اسرائیل کی آزادی کے لیے نہیں تھی بلکہ ایمان باللہ، ایمان بالرسول، ایمان بالآخرت کے لیے تھی۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ ساری چیزیں ٹھیک انہی دلائل اور انہی تفصیلات کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے سامنے پیش کی تھیں جن دلائل و تفصیلات کے ساتھ ہر نبی نے اپنی قوم کے سامنے پیش کیں۔ اس پوری تقریر کو پڑھیے۔ یہ مرد حق عین موقع کا گواہ بھی ہے اور آل فرعون میں سے بھی ہے۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی دعوت کو جس صورت میں پیش کرتا ہے وہ کتنی مختلف ہے اس صورت سے جس صورت میں ہمارے یہ بزرگان دین حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیش کرتے ہیں۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِى الْاَرْضِ الْفَسَادَ ۝ وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنِّىْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ۝ وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ڰ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَاۗءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۝ يٰقَوْمِ

اور فرعون نے کہا مجھے چھوڑو میں موسیٰ کو قتل کر دوں اور وہ پکارے اپنے رب کو (اپنی مدد کے لیے) مجھے ڈر ہے کہ وہ تمہارے دین کو بدل دے یا ملک میں فساد برپا کر دے۔ اور موسیٰ نے کہا میں نے ہر متکبر سے جو روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا، اپنے اور تمہارے رب کی پناہ پکڑی۔ اور ایک مومن نے جو آل فرعون میں سے تھا اور اب تک اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا کہا کیا تم ایک ایسے شخص کو قتل کر دو گے جو یہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور حال یہ ہے کہ وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آیا ہے؟ اور اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ کا وبال اس پر آئے گا اور اگر سچا ہے تو جس عذاب کی دھمکی تم کو سنا رہا ہے اس کا

لكم الملك اليوم ظاهرين في الارض فمن ينصرنا من
باس الله ان جاءنا قال فرعون ما اريكم الا ما ارى وما
اهديكم الا سبيل الرشاد ۝ وقال الذي امن يقوم
اني اخاف عليكم مثل يوم الاحزاب ۝ مثل داب قوم
نوح وعاد وثمود والذين من بعدهم وما الله يريد
ظلما للعباد ۝ ويقوم اني اخاف عليكم يوم التناد ۝
يوم تولون مدبرين ما لكم من الله من عاصم ومن
يضلل الله فما له من هاد ۝ ولقد جاءكم يوسف
من قبل بالبينت فما زلتم في شك مما جاءكم به
حتى اذا هلك قلتم لن يبعث الله من بعده رسولا
كذلك يضل الله من هو مسرف مرتاب ۝ الذين
يجادلون في ايات الله بغير سلطان اتاهم كبر
مقتا عند الله وعند الذين امنوا كذلك يطبع
الله على كل قلب متكبر جبار ۝ وقال فرعون
يهامان ابن لي صرحا لعلي ابلغ الاسباب
اسباب السموت فاطلع الى اله موسى واني
لاظنه كاذبا وكذلك زين لفرعون سوء عمله
وصد عن السبيل وما كيد فرعون الا في تباب ۝
وقال الذي امن يقوم اتبعون اهدكم سبيل الرشاد
يقوم انما هذه الحيوة الدنيا متاع وان الاخرة
هي دار القرار من عمل سيئة فلا يجزى الا مثلها
ومن عمل صالحا من ذكر او انثى وهو مؤمن فاولئك
يدخلون الجنة يرزقون فيها بغير حساب ۝ ويقوم
ما لي ادعوكم الى النجوة وتدعونني الى النار ۝ تدعونني
لاكفر بالله واشرك به ما ليس لي به علم وانا
ادعوكم الى العزيز الغفار ۝ لا جرم انما تدعونني
اليه ليس له دعوة في الدنيا ولا في الاخرة وان

کوئی حصہ تم پر آکے رہے گا۔ اللہ اس شخص کو کامیاب نہیں کرتا جو حد سے بڑھ جانے والا اور جھوٹا ہے۔ اے میری قوم کے لوگو! آج تم کو اختیار حاصل ہے اور ملک میں غالب ہو (اس وجہ سے موسیٰ کو قتل کر سکتے ہو) لیکن اللہ کے عذاب سے ہم کو کون بچا سکے گا اگر وہ آگیا؟ فرعون نے کہا میں تم کو وہی مشورہ دے رہا ہوں (موسیٰ کے قتل کے بارہ میں) جو میرے نزدیک صحیح ہے اور میں ٹھیک راستہ کی طرف تمہاری رہبری کر رہا ہوں۔ اور جو شخص ایمان لایا تھا اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو (اگر تم نے موسیٰ پر ہاتھ اٹھایا) تو تم پر بھی ویسا ہی عذاب آئے گا جیسا کہ گزشتہ جماعتوں پر آیا۔ (اور وہی حال ہوگا) جو نوح کی قوم اور عاد و ثمود اور ان لوگوں کا ہوا جو ان کے بعد آئے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم نہیں چاہتا اور اے میری قوم کے لوگو مجھے ڈر ہے کہ تم پر ہانک پکار کا دن آدھمکے جس دن تم پیٹھ پھیر کر بھاگو گے اور تم کو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا۔ اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے تو اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ اور اس سے پہلے یوسف تمہارے پاس کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آیا تو تم اس کی لائی ہوئی باتوں کے متعلق برابر شک میں پڑے رہے یہاں تک کہ جب وہ مر گیا تو تم نے کہا اب اس کے بعد اللہ کوئی رسول نہیں بھیجے گا۔ اسی طرح اللہ گمراہ کر دیتا ہے ان لوگوں کو جو زیادتی کرنے والے اور شک میں پڑنے والے ہوتے ہیں۔ جو لوگ اللہ کی آیات کے بارہ میں بغیر کسی دلیل کے جو ان کے پاس آئی ہو، ہٹ دھرمی کرتے ہیں، ان کا یہ رویہ اللہ اور اہل ایمان کے نزدیک نہایت مبغوض ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ مہر کر دیتا ہے ہر متکبر اور سرکش کے دل پر۔ اور فرعون نے کہا اے ہامان میرے لیے ایک محل بنوا تاکہ میں بلندیوں پر پہنچوں، آسمانوں کی بلندیوں پر۔ اور موسیٰ کے رب کو دیکھوں۔ میں تو اس کو بالکل جھوٹا خیال کرتا ہوں۔ اس طرح فرعون کی نظروں میں اس کی بدعملی کھبا دی گئی اور وہ راہ حق سے روک دیا گیا اور فرعون کی مکاری کو نابود ہی ہونا تھا۔ اور جو ایمان لایا تھا اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو میری پیروی کرو کہ میں تمہاری رہنمائی راہ حق کی طرف کروں۔ اے میری قوم یہ دنیا کی زندگی تو چند روزہ ہے۔ ہمیشگی کا گھر تو آخرت ہے۔ جس نے کوئی بدی کی تو صرف اس کے مانند بدلہ دیا جائے گا۔

مَرَدَّنَآ اِلَى اللّٰهِ وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ
فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ
اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا
وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ○ (المومن)

جس نے نیکی کمائی، خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو وہی لوگ جنت میں جائیں گے اور اس میں ... حساب روزی پائیں گے۔ اے میری قوم کے لوگو کیا بات ہے، میں تمھیں نجات کے راستہ کی طرف بلا رہا ہوں اور تم مجھے جہنم کی طرف پکار رہے ہو؟ تم مجھے دعوت دے رہے ہو کہ میں اللہ کا انکار کروں اور اس کا کسی ایسی چیز کو ساجھی قرار دوں جس کے بارہ میں مجھے کوئی علم نہیں اور میں تم کو خدائے عزیز و غفار کی طرف دعوت دے رہا ہوں۔ بلاشبہ جس چیز کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو اس کا بلاوا کہیں نہیں ہے۔ نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ ہمارا لوٹنا تو اللہ کی طرف ہوگا اور زیادتی کرنے والے جہنم میں ہوں گے۔ تو اس وقت تم یاد کروگے جو کچھ میں کہتا ہوں اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ بے شک اللہ بندوں کا نگراں حال ہے۔ پس اللہ نے اس کو ان کی تدبیروں کے شر سے بچایا اور آل فرعون کو برے عذاب نے گھیر لیا۔

یہ پوری تقریر جو عین فرعون کے دربار میں ہوئی ہے اور ایک ایسے شخص نے کی ہے جو آل فرعون میں سے ہے، بار بار پڑھیے۔ اس میں بیچ بیچ میں فرعون کی طرف سے مداخلتیں بھی ہوئی ہیں، ان کو بھی پیش نظر رکھیے اور پھر غور کیجیے کہ فی الواقع حضرت موسیٰ اور فرعون کی یہ ساری کشمکش بنی اسرائیل کی آزادی کے لیے تھی یا یہ کفر و ایمان، توحید و شرک اور حب دنیا اور ایمان بالآخرۃ کی وہی کشمکش ہے جو ہر نبی اور اس کی قوم کے مستکبرین کے درمیان برپا ہوتی رہی ہے؟ اس میں تو بنی اسرائیل کی آزادی و غلامی کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں آتا۔ نہ استغاثہ کی طرف سے نہ صفائی کی طرف سے۔ فرعون حضرت موسیٰ پر یہ الزام لگاتا ہے کہ یہ قوم کا (قبطیوں کا) دین بگاڑ رہے ہیں اور اس کی خدائی کے خلاف بغاوت برپا کر رہے ہیں اس وجہ سے مستحق ہیں کہ قتل کر دیے جائیں۔ یہ مرد حق اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ایک شخص کو محض اس جرم میں قتل کرنا کہ وہ صرف اللہ واحد کو اپنا رب مانتا ہے، کوئی انصاف کی بات نہیں ہے، درانحالیکہ اس کے پاس خدا کی نشانیاں بھی موجود ہیں۔ اگر یہ زیادتی کی گئی تو اس کا وبال پوری قوم پر آکے رہے گا۔ فرعون کہتا ہے رائے صائب وہی ہے جو میں دے رہا ہوں۔ مرد مومن اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اگر اس رائے پر عمل کیا گیا تو قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود اور دوسری معذب قوموں کے انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہیے۔ پھر یہ بھی واضح کر دیتے ہیں کہ موسیٰ ہمارے پاس اسی طرح کی دعوت حق لے کر آئے ہیں جیسی حضرت یوسف لے کر آئے تھے لیکن آپ لوگوں کا دل ان کی دعوت پر بھی نہیں جما اور پھر اپنے لیے کسی رسول کی بعثت کی طرف سے آپ لوگ بالکل بے فکر ہو کے بیٹھ گئے اور اب اللہ کی آیات کے بارہ میں خواہ مخواہ کی ہٹ دھرمی سے کام لے رہے ہیں۔ پھر اس کے بعد اپنی پوری قوم کے سامنے آخرت پر، جنت و دوزخ پر، کفر و شرک پر نہایت موثر خطبہ دیتے ہیں اور لوگوں کو نجات کے راستہ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ پھر آخر میں ان سے مایوس ہو کر اپنا معاملہ اللہ کے حوالہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بہت جلد میری نصیحتوں کو یاد کروگے اور اپنی غلطی پر پچھتاؤگے۔ اس کے بعد اس بات کا بھی ذکر آتا ہے کہ ان کی قوم نے ان کے قتل کی بھی تدبیریں کیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو بچایا اور اغلب ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ انھوں نے بھی ہجرت فرمائی۔

اگر یہ سارا جھگڑا بنی اسرائیل کی آزادی ہی کے لیے تھا اور کفر و ایمان اور شرک و توحید کے بجائے حاکم و محکوم محض اس بات کے لیے لڑ رہے تھے کہ محکوم قوم کو اپنی تعمیر باختیار خود کرنے کا حق ملنا چاہیے تو اس طرح کی آویزش کا نتیجہ یہ تو ہرگز نہیں ہو سکتا کہ

قبطیوں کے اندر ایسے ایسے کامل الایمان اور صدیق پیدا ہوں۔ اس طرح کی نزاع، جو دو قوموں میں محض سیاسی برتری کے لیے برپا ہو اور جو خالص نسلی فرق و امتیاز کے مطالبات پر قائم ہو، اس کا لازمی نتیجہ تو یہ ہونا تھا کہ ایک قوم دوسری قوم کی من حیث القوم دشمن ہو اور اس کے مذہب اور اس کی روایات سے نفرت کرے۔ اور اگر محض انسانی ہمدردی کے داعیہ کی وجہ سے کچھ افراد ایسے نکل بھی آئیں جن کو مظلوم کے مطالبات سے کچھ ہمدردی ہو جائے تو وہ ہمدردی زیادہ سے زیادہ اس نوعیت کی ہو سکتی ہے جس طرح کی ہمدردی بعض نیک مزاج انگریز ہندوستانیوں کے مطالبات کے ساتھ کرتے ہیں لیکن یہ تو عجیب بات ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام قبطیوں سے لڑائی تو محض بنی اسرائیل کی سیاسی آزادی کے لیے لڑیں لیکن اس لڑائی کے نتیجہ کے طور پر قبطیوں کے اندر اس طرح کے اہل الایمان پیدا ہوں جس طرح کے اہل الایمان آنحضرت صلعم کی دعوت سے قریش کے اندر پیدا ہوئے۔

اس سلسلہ کی آخری بات حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مصر سے ہجرت اور فرعون اور اس کی فوج کا غرق ہونا ہے۔ جس وقت فرعون موجوں کے گھیرے میں آجاتا ہے اس وقت بے تحاشا اس کی زبان سے وہ بات نکل جاتی ہے جس کی حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کو دعوت دے رہے تھے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی انتہائی جد و جہد کے باوجود وہ اس کے ماننے پر اڑا رہا۔ یعنی اللہ کی توحید اور اس کی اطاعت کی دعوت۔

حَتّٰیٓ اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ. آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ (یونس)

یہاں تک کہ جب وہ غرق ہونے لگا تو پکار اٹھا کہ میں ایمان لایا اس بات پر کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ جس پر ایمان لائے ہیں بنی اسرائیل اور میں اطاعت کرنے والوں میں ہوں۔ اب! حالانکہ تم نے اس سے پہلے نافرمانی کی اور تم فساد برپا کرنے والوں میں تھے۔

اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس ایمان و اسلام کی دعوت لے کر نہیں گئے تھے، صرف بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ لے کر گئے تھے تو اس کو آخری وقت میں ایمان و اسلام کے اقرار کے بجائے یہ کہنا تھا کہ "ہائے میری بدبختی! میں نے بنی اسرائیل کو رہا کیوں نہ کیا!" یہ ایمان و اسلام کا اقرار تو صاف اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ ساری کشمکش درحقیقت ایمان و اسلام کے لیے تھی نہ کہ بنی اسرائیل کی سیاسی آزادی کے لیے۔

ان تمام باتوں پر غور کیجیے تو حقیقت واضح ہو جائے گی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک قوم پرست لیڈر کی طرح فرعون اور اس کی قوم کے پاس اپنی قوم کی آزادی کے لیے نہیں بلکہ وہ دعوت لے کر گئے تھے جو حضرات انبیائے کرام ہمیشہ اپنی اپنی قوموں کے مستکبرین کے پاس لے کر گئے۔ یہ دعوت انھوں نے پیش کی۔ اس کے لیے انھوں نے مناظرے اور مجادلے کیے۔ معجزات دکھائے۔ اللہ تعالیٰ کی حجت تمام کی۔ یہاں تک کہ یہ حجت اس قدر واضح ہوئی کہ مستکبرین کے اندر سے جو لوگ نیک فطرت کے تھے انھوں نے بھی اس کو قبول کر لیا اور پھر پوری قوت کے ساتھ اس دعوت کو بلند کرنے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دیا۔ لیکن جب خود اپنے ضمیر کی آواز سن لینے کے بعد بھی فرعون اور اس کے مفسد ارکان و اعیان نہ صرف اپنے کفر و شرک ہی پر اڑے رہے بلکہ انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا بھی ارادہ کر لیا تو اللہ تعالیٰ کی اس سنت کے مطابق جو اس نے انبیاء کے لیے

مقرر کر رکھی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اہل ایمان کے ساتھ ہجرت فرمائی اور فرعون اور اس کی قوم پر خدا کا عذاب آگیا۔ اللہ تعالیٰ کی یہی سنت تمام انبیاء اور ان کے جھٹلانے والوں کے اندر جاری رہی ہے اور یہی ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے جھٹلانے والوں کے درمیان دیکھتے ہیں۔ دوسرے انبیاء اور ان میں اگر فرق ہے تو دعوت اور مقاصد دعوت میں نہیں ہے اور نہ دعوت کے مدارج و مراحل میں ہے۔ صرف اس بات میں فرق ہے کہ ان کی قوم کے مستکبرین و مترفین نسل کے لحاظ سے مختلف تھے اور دوسرے انبیاء کی قوموں کے مستکبرین خود انہی کے اندر کے تھے لیکن یہ کوئی ایسا جوہری فرق نہیں کہ اس کی وجہ سے نبی کی دعوت میں کوئی فرق پیدا ہو جائے۔ اور وہ اللہ کے رسول کی جگہ ایک نیشلسٹ لیڈر کی پوزیشن اختیار کرلے۔

حضرت موسیٰؑ کا کام بنی اسرائیل کے اندر

اب اسی طرح اس سوال پر غور کیجیے کہ مصر کی زندگی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے اندر کیا کام کیا؟ کیا کفر و اسلام اور شرک و توحید کا سوال چھیڑے بغیر انھوں نے ہر اسرائیلی کو آزادی کے مطالبہ پر جمع کرلیا اور ان کے کافر و مومن میں کوئی فرق نہیں کیا یا تمام انبیاء کی طرح انھوں نے بھی اپنی قوم کو ایمان و اسلام کی دعوت دی اور جن لوگوں نے ان کی دعوت قبول کی انہی سے اپنی جماعت بنائی؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلا حکم جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا وہ یہ ہے:-

وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحٰى ۝ اِنَّنِيْ اَنَا	اور میں نے تم کو انتخاب کیا تو سنو وہ بات جو تم پر وحی کی جاتی ہے-
اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ	لاریب میں ہی اللہ ہوں، نہیں ہے کوئی معبود مگر میں پس میری ہی بندگی
لِذِكْرِيْ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ	کرو اور میرے ذکر کے لیے نماز قائم کرو۔ قیامت آکے رہے گی-

یہ توحید، معاد اور قیام نماز کا وہی حکم ہے جو ہر نبی کو اول اول بطور اصول دین تلقین کیا جاتا ہے۔ اور اسی کو لے کر وہ اپنی قوم میں جاتا ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ احکام ملیں اور وہ ان کی پرواکیے بغیر بنی اسرائیل کو محض نسلی عصبیت کے نعرہ پر، فرعون اور اس کی قوم سے آزادی کی لڑائی لڑنے کے لیے جمع کرنا شروع کردیں۔

اس سلسلہ کی دوسری نہایت اہم آیت یہ ہے:-

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ	اور ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی آیتوں کے ساتھ کہ نکالو اپنی قوم
قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ اِنَّ	کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف اور ان کو یاد دلاؤ اللہ کی نعمت و نقمت
فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ	کے دن۔ بے شک اس کے اندر ہیں دلیلیں ہر ثابت قدم اور شکر گذار کے لیے-

اپنی قوم کو تاریکی سے نکال کر روشنی کی طرف لیجانا ہر پیغمبر کا فرض منصبی ہے اور تقریباً انہی الفاظ میں قرآن مجید نے ہر نبی کی صفت بیان کی ہے کہ وہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لیجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تاریکی سے مراد عقائد و اعمال کی ظلمت اور روشنی سے مراد ایمان و اسلام کی روشنی ہے۔ اور جب اسی مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو ان کی قوم کی طرف بھیجا تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ قوم کو عقائد و اعمال کی تاریکیوں میں چھوڑ کر صرف اس کی سیاسی آزادی کی فکر میں پڑ جاتے۔

اب اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان کاموں کو دیکھیے جو انھوں نے مصر کی بالکل ابتدائی زندگی میں اپنی قوم کے اندر کیے۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰىٓ اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۭ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ۝ فَقَالُوْا عَلَي اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ

پس موسیٰ پر ایمان نہ لائے مگر اس کی قوم کے کچھ نوجوان فرعون اور اپنے سرداروں سے ڈرتے ہوئے کہ کہیں وہ کسی آفت میں نہ ڈال دیں۔ بے شک فرعون ملک میں مستبد اور زیادتی کرنے والا تھا۔ اور موسیٰ نے کہا اے میری قوم کے لوگو اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اسی پر توکل کرو اگر تم مسلم ہو۔ انھوں نے کہا ہم نے اللہ ہی پر توکل کیا۔ اے ہمارے پروردگار ہم کو ظالموں کے فتنہ کا نشانہ نہ بنا اور ہم کو اپنی رحمت سے کافروں کی قوم سے نجات دے۔ اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کے پاس وحی بھیجی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں گھر بناؤ اور اپنے گھروں کو قبلہ بناؤ اور نماز قائم کرو اور ایمان والوں کو خوش خبری دو۔ اور موسیٰ نے کہا اے ہمارے پروردگار تو نے فرعون اور اس کے درباریوں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور مال دیا ہے تاکہ وہ تیری راہ سے لوگوں کو بھٹکائیں ....

یہ اس وقت کا حال بیان ہوا ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت شروع ہوئی ہے۔ اس کا تجزیہ کرکے دیکھیے کہ مصر کی ابتدائی زندگی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اردگرد بنی اسرائیل کے جو افراد اکٹھے ہوئے تھے وہ کس دعوت پر جمع ہوئے تھے؟ ان کے سامنے اخلاق و عمل کے کیا اصول تھے؟ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے کس اعتبار سے علیحدہ سمجھتے تھے؟ مصر کی زندگی میں ان کو خاص تربیت کس بات کی دی جارہی تھی؟ اور فرعون اور اس کی قوم سے ان کی لڑائی کس بات کے لیے تھی؟

الف۔ ان آیات سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابتدائے دعوت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر صرف تھوڑے سے نوجوان ایمان لائے۔ اور انھی مومنین سے ان کی جماعت بنی۔ یہ نہیں ہوا کہ محض قومی نعرہ پر انھوں نے ہر اسرائیلی کو اپنے پیچھے لگا لینے کی کوشش کی ہو۔

ب۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام مناسب مواقع پر اپنے صحابہ کو ایمان و اسلام کے مقتضیات و مطالبات سمجھاتے رہتے تھے چنانچہ ابتدائی دور میں جب اندیشہ ہوا کہ فرعون کی طرف سے ان کے ساتھیوں پر سختیاں ہوں گی تو انھوں نے لوگوں کو ایمان و اسلام کی حقیقت سمجھائی کہ اگر ایمان و اسلام کا دعویٰ لیکر اٹھے ہو تو خدا پر پورا بھروسہ رکھو اور ان کے صحابہ نے یہ کہا کہ ہم اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ بعینہٖ یہی بات سورہ اعراف میں بھی بیان ہوئی ہے۔ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۣ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، اللہ تعالیٰ سے مدد چاہو اور ثابت قدم رہو۔ بے شک ملک اللہ کا ہے جس کو چاہے اپنے بندوں میں سے دے اور انجام کار کی کامیابی اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے ہے)

ج۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحابہ نسلی قومیت کے اختلاف کی وجہ سے فرعون اور اس کی قوم سے نجات نہیں چاہتے

تھے بلکہ قوم کافر کے ظلم و ستم سے نجات چاہتے تھے (وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ) جس کے معنی یہ ہیں کہ قبطیوں سے ان کی نزاع عقائد و اصول کی نزاع تھی نہ نسل و نسب کی۔ اور سیاسی و معاشی مفاد کی۔

د۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصر کی ابتدائی زندگی ہی میں حکم ملا مصر میں مختلف مسجدیں تعمیر کرکے اور (غالباً) اپنی مسجد کو مرکز بنا کر نماز کا اہتمام کریں۔ یہ وہی تربیت و تزکیہ ہے جو ہر نبی کی دعوت میں ہم کو سب سے مقدم اور سب سے زیادہ اہم جز کی حیثیت سے نظر آتی ہے۔

ہ۔ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ نماز قائم کرنے والے اہل ایمان کو اللہ کی تائید و نصرت کی بشارت دو (وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ)۔ نہیں کہا گیا کہ بنی اسرائیل کو بشارت دو۔

و۔ آخر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے جو دعا کی ہے اس میں فرعون کی یہ شکایت نہیں کی ہے کہ اس نے اقتدار پاکر ان کی قوم کی خود مختاری چھین لی ہے بلکہ یہ شکایت کی ہے کہ (رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَن سَبِيلِكَ) اے پروردگار ان کا مال و جاہ اس لیے ہے کہ وہ تیری راہ سے لوگوں کو بھٹکائیں۔

ان ساری باتوں کو سامنے رکھ کر غور کیجیے کہ کیا یہ بعینہٖ وہی دعوت نہیں ہے جو مکہ کی زندگی میں آنحضرت صلعم نے دی اور کیا یہ وہی تربیت نہیں ہے جو ہجرت سے پہلے صحابہ کو دی گئی؟ کیا ان واضح دلائل کے بعد بھی اس غلط فہمی میں پڑنے کا کوئی موقع ہے کہ مصر کی زندگی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے کافر و مومن میں کوئی فرق نہیں کیا بلکہ ان کو بحیثیت بنی اسرائیل آزادی کے مطالبہ پر متفق کرنے کی کوشش کی؟

اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تنظیم، بلا لحاظ کفر و ایمان، مجرد نسلی قومیت پر مبنی ہوتی تو مشہور اسرائیلی سرمایہ دار، قارون اس سے الگ نہ رکھا جاتا بلکہ جس طرح وطنی اور نسلی قومیت کی اساس پر اٹھنے والی تحریکیں برلا، دلمیا، بجاج اور سیٹھوں، مہاجنوں، بینکروں اور تعلقہ داروں کو اپنانے کی کوشش کرتی ہیں اور آسانی سے اپنا لیتی ہیں اسی طرح حضرت موسیٰؑ بھی نہایت آسانی سے اس کو اپنی تحریک کا ایک لیڈر بنا لیتے لیکن ہوا یہ کہ آل فرعون کا ایک مومن جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی تنظیم میں داخل ہوجاتا ہے لیکن بنی اسرائیل کا یہ "سب سے بڑا آدمی" فرعون و ہامان کے زمرہ میں داخل کردیا جاتا ہے وَقَارُونَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامَانَ ۖ وَلَقَدْ جَاءَهُم مُّوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانُوا سَابِقِينَ (اور قارون، فرعون اور ہامان کو یاد کرو۔ ان کے پاس موسیٰ کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آیا تو انھوں نے ملک میں سرکشی کی اور ہم سے بھاگ نہ سکے) دوسری جگہ ہے۔ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَسُلْطَانٍ مُّبِينٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَقَارُونَ فَقَالُوا سَاحِرٌ كَذَّابٌ (اور ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور کھلی ہوئی حجت کے ساتھ، فرعون و ہامان و قارون کی طرف تو انھوں نے کہا یہ جھوٹا ساحر ہے) اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی اپنی قوم کے اس سب سے بڑے آدمی پر یہ الزام نہیں لگاتے کہ یہ "سرکار پرست" ہے، "قومی غدار ہے"، "رجعت پسند" ہے، "اسرائیلی لیگ کا دشمن" ہے بلکہ اس پر یہ الزام ہے کہ "خدا کا باغی" ہے، "مغرور و متکبر" ہے، "آخرت کا منکر" ہے، خدا کی نعمتوں کو اپنی لیاقت کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اور اس کو جو دعوت دی گئی وہ بھی یہ نہیں ہے کہ اگر "اسرائیلی ہے تو بنی اسرائیل کے ساتھ آ" اگر "ہماری قوم میں سے

ہے تو قوم کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ نے، بلکہ اس کو یہ دعوت دی گئی کہ "زمین میں غرور نہ کر" "اللہ کی نعمتوں کو حصول آخرت کا ذریعہ بنا" "جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے تو خلق پر احسان کر" "زمین میں خدا سے بغاوت نہ کر"۔ سورہ قصص میں پوری تفصیل پڑھ لیجیے۔ ہم صرف چند آیات نقل کریں گے۔

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ۝ وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ ۖ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا ۖ وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ ۖ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ۝ قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي ۚ

بے شک قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا تو اس نے ان پر سرکشی کی اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دیے جن کی کنجیاں ایک طاقتور جماعت سے اٹھتی تھیں۔ یاد کرو جب اس سے اس کی قوم نے کہا (یعنی قوم کے اہل ایمان نے) اترا مت۔ اللہ اترانے والوں کو دوست نہیں رکھتا اور جو دولت تجھے خدا نے دے رکھی ہے اس میں دار آخرت کا سامان کر اور دنیا میں سے اپنا حصہ نہ بھول اور احسان کر جیسا کہ اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے اور زمین میں فساد نہ چاہ۔ اللہ تعالیٰ فساد برپا کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ بولا یہ سب تو مجھے اپنے علم کی بدولت ملا ہے۔

ایک دن اس کی شان و عظمت دیکھ کر بنی اسرائیل کے بعض کمزور لوگوں نے جب یہ خواہش کی کہ کاش یہی شان و عظمت انھیں بھی حاصل ہوتی تو اہل ایمان نے انھیں سمجھایا کہ "وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِّمَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الصَّابِرُونَ" (تم پر افسوس ہے، اللہ کا اجر زیادہ بہتر ہے ان لوگوں کیلئے جو ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کیے اور یہ حکمت صرف صابروں کو ملتی ہے) پھر قارون کی ساری عظمت و شوکت کی تباہی کا جب تماشا دیکھ لیا تو وہی لوگ جو اس کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے، پکار اٹھے "لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ" (کافر فلاح نہیں پاتے) اس سے معلوم ہوا کہ قارون سے، باوجودیکہ وہ ایک اسرائیلی تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اختلاف محض کفر و ایمان کی بنا پر تھا۔

کیا اس تفصیل کے بعد بھی کوئی شخص یہ گمان کر سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مصر میں بنی اسرائیل کے کفر و ایمان سے کوئی تعرض نہیں کیا اور صرف اسرائیلیت کی اساس پر انھوں نے بنی اسرائیل کی تنظیم محض اس مقصد کے لیے کی کہ اپنی قوم کو فرعون کی غلامی سے آزاد کر لیں؟

مصر کی ابتدائی زندگی میں، بعثت سے پہلے، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک ایسا فعل صادر ہو گیا جو قومی غیرت و حمیت کے نقطۂ نگاہ سے نہایت محمود تھا، اور اگر وہ ایک نیشنلسٹ لیڈر ہوتے تو ان کا یہ کام نہایت شاندار کارناموں میں گنا جاتا کیونکہ قومی حمیت کے اعتبار سے کوئی شخص بھی اس کو مذموم نہیں قرار دے سکتا لیکن خدا کے انبیا کسی قوم کے حریف یا کسی قوم کے دوست بن کر نہیں آتے بلکہ صرف باطل کے حریف اور حق کے دوست بن کر آتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کا یہی فعل، جو قومی حمیت کے نقطۂ نگاہ سے نہایت قابل تعریف تھا، ان کی نظر میں شدید گناہ قرار پایا اور بار بار توبہ کرنے کے باوجود ان کے دل سے اس گناہ کی کھٹک نہیں نکلی۔

وَدَخَلَ الْمَدِينَةَ عَلَىٰ حِينِ غَفْلَةٍ مِّنْ أَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ هَٰذَا مِن شِيعَتِهِ

اور موسیٰ شہر میں ایسے وقت داخل ہوا کہ شہر کے باشندے ابھی غافل ہی تھے تو دیکھا کہ وہاں دو شخص لڑ رہے ہیں، ایک اس کی قوم

وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ
عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ
قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ
قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ اِنَّهٗ
هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ
اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ

(بنی اسرائیل) کا ہے اور دوسرا اس کے دشمنوں (قبطیوں) میں سے ہے تو اس سے مدد چاہی اس کی قوم کے آدمی نے اس شخص کے خلاف جو اس کے دشمنوں میں سے تھا تو موسیٰ نے اس کے تھپڑ ماری اور اس کا خاتمہ ہوگیا۔ موسیٰ فوراً پکار اٹھا، شیطانی کام ہوگیا، بے شک شیطان کھلا ہوا گمراہ کرنے والا ہے اور دعا کی کہ اے میرے پروردگار میں نے اپنی جان پر ظلم ڈھایا، تو مجھے معاف کر، تو اللہ نے اس کو معاف کیا، بے شک وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ پھر کہا اے میرے پروردگار چونکہ تو نے مجھ پر فضل فرمایا ہے اس لیے اب میں مجرموں کا مددگار کبھی نہ بنوں گا۔

اس واقعہ کے دوسرے ہی دن حضرت موسیٰ علیہ السلام پھر شہر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہی اسرائیلی جو کل ایک قبطی سے لڑ رہا تھا آج ایک دوسرے قبطی کے ساتھ الجھا ہوا ہے اور اس نے ان کو دیکھتے ہی پھر مدد کے لیے پکارا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو سختی سے ڈانٹا کہ "انک لغوی مبین" تو نہایت کھلا ہوا شریر ہے اور مجرموں کی مدد نہ کرنے کا جو وعدہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا اس پر قائم رہے۔

یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے پہلے کی زندگی کا ہے جبکہ ان پر ایمان و عدل کے اصول ابھی الہام بھی نہیں ہوئے تھے اور ایک غیور نوجوان ہونے کے لحاظ سے قومی حمیت ان کے لیے سب سے زیادہ قوی محرک ہو سکتی تھی بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ ان کی قوم مصر میں قبطیوں کے ہاتھوں اس سے زیادہ ذلیل ہو رہی تھی جتنے کہ امریکنوں کے ہاتھوں ریڈ انڈین یا انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستانی تھے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے کسی قوم کے بحیثیت قوم حامی اور کسی قوم کے بحیثیت قوم حریف بننے سے انکار کیا اور اللہ تعالیٰ سے صرف حق و عدل کا ساتھ دینے کا عہد باندھا اور اس عہد کی جانچ کا اتفاق دوسرے ہی دن جب موقع پیدا ہوگیا تو وہ اللہ کی توفیق سے اس عہد پر قائم رہے۔ غور کا مقام ہے کہ جو حضرت موسیٰ اپنی بعثت سے پہلے کی زندگی میں، اپنے اللہ سے اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ میں کسی مجرم کا حامی نہ بنوں گا، خواہ وہ میری قوم کا آدمی ہو، انہی حضرت موسیٰ پر ہمارے بزرگان دین یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ بعثت کے بعد کی زندگی میں اپنی قوم کے بحیثیت قوم حامی بن گئے۔ ان کے کافر و مومن اور نیکوکار و بدکار میں انھوں نے کوئی فرق نہیں کیا۔

أَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ کی صحیح تفسیر

اس ساری بحث کے بعد ان حضرات کی تیسری غلط فہمی سے تعرض کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ قومی آزادی کے ایک مقدس فریضہ ہونے کی ساری دلیل درحقیقت انہی دو بنیادی غلط فہمیوں پر قائم تھی جن کی نہایت تفصیل کے ساتھ ہم تردید کر چکے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت اور ان کے کاموں کی صحیح نوعیت واضح ہو جانے کے بعد یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ دنیا میں جتنے نبی بھی آئے وہ ایک ہی مقصد کی دعوت لے کر آئے۔ یعنی خالص اللہ کی بندگی اور اطاعت کی دعوت۔ ان سب کے نزدیک تمام نیکیوں اور سعادتوں کا سرچشمہ اللہ کی بندگی اور اطاعت ہے اور تمام برائیوں کی جڑ خدا کی بندگی اور اطاعت سے انحراف ہے۔ ان کے نزدیک آزادی کا بھی مفہوم یہ ہے کہ کسی انسان کی گردن میں اللہ کی اطاعت کے سوا کسی دوسرے کی اطاعت کا قلادہ نہ ہو اگرچہ وہ "اور" انسان کی

خواہ اپنی ہی قوم، یا اپنا ہی قبیلہ بلکہ اپنا ہی نفس ہو اور غلامی کا مفہوم ہے کہ انسان غیر اللہ کی بندگی اور اطاعت کرے اگرچہ وہ غیر اپنی ہی قوم، اپنا ہی قبیلہ اور اپنا ہی نفس ہو۔ ان کے نزدیک یہ ظلم کبیر ہے کہ کوئی قوم کسی قوم سے بجبر اپنی اطاعت کرائے اور یہ ظلم اکبر ہے کہ کوئی قوم باختیار خود اپنے بنائے ہوئے قانون کی اطاعت کرے۔ یہ دونوں ہی باتیں شرک ہیں اور انبیاء کا طریقہ ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ ایک ظلم کبیر کی مخالفت کریں اور دوسرے ظلم اکبر کو برپا کرنے کے لیے خود قیادت کا علم لے کر اٹھیں۔ پس اس بات کے لیے تو کوئی وجہ جواز نہیں ہو سکتی کہ جس فساد میں فرعون اور اس کی قوم کے لوگ مبتلا تھے اسی فساد کا حق اپنی قوم کے لیے حاصل کرنے کی تحریک حضرت موسیٰ علیہ السلام اٹھائیں۔ وہ اگر کر سکتے تھے تو صرف یہ کام کر سکتے تھے کہ حاکم و محکوم دونوں کو احکم الحاکمین کی بندگی و اطاعت کی دعوت دیں۔ اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ انھوں نے یہ کام نہ کیا ہو۔ فرعون اور اس کی قوم سے بنی اسرائیل کی علیحدگی کی کوئی وجہ اگر ہو سکتی تھی تو یہ نہیں کہ یہ علیحدہ قوم ہیں اور وہ علیحدہ۔ بلکہ صرف یہ ہو سکتی تھی کہ یہ مومن ہیں اور وہ کافر۔ دو قوموں کا مجرد نسلی اور وطنی امتیازات کی بنا پر الگ الگ اپنی حاکمیت کا علم کھڑا کرنا تو وہ عصبیت جاہلیت ہے جس پر انبیاء لعنت کرنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں نہ کہ اس کی تحریک چلانے کے لیے۔ پس فرعون اور اس کی قوم کے لوگ اگر ایمان لاتے اور اپنی حاکمیت کے دعوے سے اللہ واحد کے حق میں دست بردار ہو جاتے تو بنی اسرائیل اور وہ ایک باپ کے بیٹوں اور ایک خدا کے بندوں کی طرح ایک گھر میں بس سکتے تھے۔ سوچنے کی بات ہے کہ آخر جھگڑا کس بات کا تھا؟ اس بات کا کہ فرعون اور اس کی قوم کے لوگ کیوں حاکم ہیں، بنی اسرائیل کیوں حاکم نہیں ہیں یا اس بات کا کہ اللہ واحد کی حکومت کیوں نہیں ہے، فرعون کی حکومت اور خدائی کیوں ہے؟ اگر جھگڑا موخر الذکر بات کے لیے تھا اور یقیناً اسی بات کے لیے ہو سکتا تھا تو ٹھیک راہ یہی تھی کہ حضرت موسیٰ اپنے عہد کے مستکبرین کو دعوت ایمان و اسلام دیتے اور قرآن مجید سے ثابت ہے کہ یہی انھوں نے کیا اور ان کی دعوت کی یہی کشش تھی کہ فرعون کی قوم کے اہل حق ان کی بات پر ایمان لائے ورنہ اگر ایک نسلی نزاع ہوتی تو حضرت موسیٰ کی بات ان کے قومی دشمنوں کو کیوں اپیل کرتی؟

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب اس بات پر غور کیجیے کہ حضرت موسیٰ اور ہارون نے فرعون سے یہ جو مطالبہ کیا کہ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دو) اس کا مطلب کیا ہے؟ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگذشت بیان کرتے ہوئے کئی جگہ ان کے اس مطالبہ کا ذکر ہوا ہے لیکن جس طرح بنی اسرائیل کی تاریخ کے واقعات ہر جگہ قرآن میں اختصار و اجمال کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اسی طرح یہ بات بھی اجمال ہی کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ کسی جگہ بھی اس بات کی تشریح نہیں ہوئی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو کس مقصد کے لیے اور کہاں لیجانا چاہتے تھے۔ البتہ اتنی بات قرآن مجید اور تورات دونوں سے واضح ہے کہ یہ مطالبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بالکل ابتدائی مطالبات میں سے ہے۔ ہمارے یہ علماء جو نیشنلزم کو بھی انبیاء کا لایا ہوا دین سمجھتے ہیں، کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو مصر سے نکال کر دوسرے ملک میں لے جانا چاہتے تھے لیکن اوپر کے مباحث سے یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب فرعون اور اس کی قوم کی طرف بحیثیت رسول اور شاہد کے آئے تھے اور یہی حیثیت ان کی بنی اسرائیل کے لیے بھی تھی تو کوئی نبی اتمام حجت و دعوت کے بغیر، ان لوگوں کو نہیں چھوڑ سکتا جن کی طرف وہ رسول بنا کر بھیجا گیا ہو۔ ہر پیغمبر کے فرائض رسالت میں سے یہ بات ہے کہ وہ لوگوں کو دعوت حق دے۔ اس دعوت کو پھیلانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائے

اپنی دعوت کو قوم کے ایک ایک فرد کے کانوں تک پہنچائے۔ اور حق کو واضح کرنے کے لیے تمام ممکن وسائل استعمال کرے اور ایک مدت تک اپنی بہترین عملی سیرت اور بہترین قولی تبلیغ سے حق کو اتنا آشکارا کردے کہ جو لوگ اس کا انکار کرنا چاہیں ان کے پاس ضد اور ہٹ دھرمی کے سوا کوئی اور پناہ باقی نہ رہ جائے۔ یہ سارے جتن کرنے کے بعد جب وہ ان کے قبول حق سے بالکل مایوس ہو جائے اور قوم اس کی جان کے درپے ہو جائے تب وہ اللہ کے اذن سے ان کو چھوڑ کر ہجرت کرے۔ لیکن اَرْسِلْ مَعَنَا کی جو تفسیر یہ حضرات کرتے ہیں اس تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نہ فرعون کے کفر و ایمان سے بحث تھی نہ بنی اسرائیل کی تعلیم و تربیت کوئی غرض تھی بلکہ وہ آنے سے پہلے ہی جانے کا پروانہ کر آئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے پہنچتے ہی فرعون کے سامنے یہ مطالبہ رکھ دیا کہ بنی اسرائیل کو آزاد کر۔ یہ بات تمام انبیاء کی سنت کے بھی خلاف ہے اور قرآن کے بیان کے بھی، جیسا کہ اوپر واضح ہو چکا ہے، بالکل خلاف ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس آیت کا صحیح مطلب معلوم کیا جائے۔

ہمارے نزدیک اصول یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی تاریخ کے جو واقعات قرآن مجید میں مجمل بیان ہوئے ہیں ان کی وضاحت کے لیے توریت کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور توریت کا بیان اگر قرآن کے بیان یا اس کے کسی اصول کے خلاف نہ پڑے تو اس توضیح کو قبول کرنا چاہیے۔ اور بالخصوص ان مواقع میں تو توریت کا بیان بالکل غیر مشتبہ ماننا چاہیے جہاں کوئی بات مرتبین توریت کی خواہش کے بالکل خلاف مسخ و تحریف سے بچ رہی ہے۔ اوپر ہم لکھ چکے ہیں کہ توریت میں بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کی تاریخ بالکل ایک قومی آزادی کی جدوجہد کے رنگ میں پیش کی گئی ہے۔ اور اس کو پڑھتے ہوئے بار بار ایسا گمان ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ جو مطالبہ کرتے ہیں کہ "میرے لوگوں کو جانے دے" تو ان کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ان کو آزاد کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس ذوق کے لوگوں کے لیے یہ بات بڑی ہی اپیل کرنے والی ہو سکتی تھی کہ خدا کا ایک جلیل القدر پیغمبر ان کی آزادی کا مطالبہ لے کر مبعوث ہوا۔ چنانچہ اپنی بے خبری کے نشہ میں انھوں نے بہت سی باتوں کو جو ایک بالکل ہی مختلف پہلو رکھتی تھیں، بالکل قومی رنگ دے دیا ہے لیکن تعجب ہے کہ ارسل معنا کی تفسیر توریت میں اس سے بالکل مختلف ہے جو یہ حضرات بیان کرتے ہیں۔ اور یہ تفسیر ایسی ہے کہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کا انکار کیا جائے۔ ہم پہلے ایک مناسب ترتیب کے ساتھ اس کے متعلق توریت میں جو کچھ ہے اس کو پیش کرتے ہیں اس کے بعد اس کے متعلق اپنی رائے ظاہر کریں گے۔

توریت کی کتاب الخروج میں اس مطالبہ کا ذکر بار بار آیا ہے۔ بعض جگہ تو جس طرح قرآن مجید میں مجمل ہے اسی طرح تورات میں بھی مجمل ہے لیکن پھر دوسرے مقامات میں ایسی تفصیلات آگئی ہیں کہ پوری بات صاف ہو جاتی ہے۔ کتاب الخروج باب ۳ ۱۸-۲۰ میں خداوند خدا حضرت موسیٰ اور ہارون کو فرعون سے یہ مطالبہ کرنے کا حکم دیتا ہے:-

"اب تو ہم کو تین دن کی منزل بیابان میں جانے دے تاکہ ہم خداوند اپنے خدا کے لیے قربانی کریں اور میں جانتا ہوں کہ مصر کا بادشاہ نہ تم کو یوں جانے دے گا نہ بڑے زور سے۔ سو میں اپنا ہاتھ بڑھاؤں گا اور مصر کو ان سب عجائب سے جو میں اس میں کروں گا، مصیبت میں ڈالوں گا۔ اس کے بعد وہ تم کو جانے دے گا۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام قربانی کرنے کے لیے پوری قوم کے ساتھ کسی ایسے مقام پر جانا چاہتے تھے جو بیابان میں تین دن کی منزل پر تھا۔ اس مقام کے بارہ میں محققین میں اختلاف ہے اور ہم یہاں اس بحث میں نہیں

پڑتا چاہیے۔ اس کے بعد اس کی کچھ مزید تفصیل آتی ہے۔

"خداوند خدا اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ میرے لوگوں کو جانے دے تاکہ وہ بیابان میں میرے لیے عید کریں۔ فرعون نے کہا کہ خداوند کون ہے کہ میں اس کی بات کو مان کر اسرائیل کو جانے دوں۔ میں خداوند کو نہیں جانتا اور میں اسرائیل کو جانے بھی نہیں دوں گا۔ تب انھوں نے کہا عبرانیوں کا خدا ہم سے ملا ہے سو ہم کو اجازت دے کہ ہم تین دن کی منزل بیابان میں جاکر خداوند اپنے خدا کے لیے قربانی کریں تا ہو کہ وہ ہم میں وبا بھیجے یا ہم کو تلوار سے مروا دے۔ تب مصر کے بادشاہ نے ان کو کہا اے موسیٰ اور اے ہارون تم کیوں ان لوگوں کو ان کے کام سے چھڑواتے ہو۔ تم جاکر اپنے اپنے بوجھ کو اٹھاؤ اور فرعون نے یہ بھی کہا دیکھو یہ لوگ اس ملک میں بہت ہو گئے ہیں اور تم ان کو ان کے کام سے بٹھاتے ہو اور اسی دن فرعون نے بیگار لینے والوں اور داروغوں کو جو لوگوں پر تھے حکم کیا کہ اب آگے کو تم ان لوگوں کو اینٹیں بنانے کے لیے بھس نہ دینا جیسے اب تک دیتے رہے ہو۔ وہ خود ہی جاکر بھس بٹوریں اور ان سے اتنی اینٹیں بنوانا جتنی وہ اب تک بناتے آئے ہیں۔ تم اس میں سے کچھ نہ گھٹانا کیونکہ وہ کاہل ہو گئے ہیں۔ اسی لیے چلا چلا کر کہتے ہیں ہم کو جانے دو کہ ہم اپنے خدا کے لیے قربانی کریں۔" (خروج باب ۵: ۱ - ۵)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جس قربانی کے لیے جانا چاہتے تھے وہ اجتماعی قربانی تھی اور اس کی حیثیت عید کی تھی جس میں بنی اسرائیل کے ہر خرد و کلاں کی شرکت مطلوب تھی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ فرعون کو جس سبب سے ان کو جانے دینے سے انکار تھا وہ یہ تھا کہ جو خدمت ان لوگوں کے سپرد تھی اس میں حرج ہوگا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کے عذاب سے وہ تنگ آگیا تب ایک حد تک راضی ہوا۔

"تب فرعون نے موسیٰ اور ہارون کو بلوا کر کہا تم جاؤ اور اپنے خدا کے لیے اسی ملک میں قربانی کرو۔ موسیٰ نے کہا ایسا کرنا مناسب نہیں کیونکہ ہم خداوند اپنے خدا کے لیے اس چیز کی قربانی کریں گے جس سے مصری نفرت رکھتے ہیں سو اگر ہم مصریوں کی آنکھوں کے آگے اس چیز کی قربانی کریں جس سے مصری نفرت رکھتے ہیں تو کیا وہ ہم کو سنگسار نہ کر ڈالیں گے؟ فرعون نے کہا میں تم کو جانے دوں گا تاکہ خداوند اپنے خدا کے لیے بیابان میں قربانی کرو لیکن تم بہت دور مت جانا۔" (خروج ۸: ۲۵-۲۹)

اس سے معلوم ہوا کہ مصر سے باہر بیابان میں جاکر قربانی کرنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ گائے کی قربانی کرنا چاہتے تھے اور مصری گائے کو، ہمارے ملک کے ہندوؤں کی طرح مقدس اور معبود خیال کرتے تھے اور چونکہ ان کے ہاتھ میں پورا اقتدار تھا اس وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اندیشہ تھا کہ اگر انھوں نے گائے کی قربانی مصر میں کی اور وہ بھی اجتماعی شکل میں تو مصری ان کو سنگسار کر دیں گے۔ یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ یہ اجتماعی قربانی موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں قدیم سے جاری رہی ہوگی لیکن مصریوں نے گائے کے تقدس کی وجہ سے اس کو بند کر دیا ہوگا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس قربانی کی تجدید کرنا چاہتے ہوں گے۔ اس تجدید کی تو فرعون نے مجبور ہو کر اجازت دے دی لیکن چونکہ یہ اجتماعی قربانی تھی، جس طرح ہمارے یہاں عید اضحیٰ، اس وجہ سے آگے چل کر ایک اور جھگڑا پیدا ہو گیا۔

"تب موسیٰ اور ہارون پھر بلائے گئے اور اس نے ان کو کہا جاؤ، اور خداوند اپنے خدا کی عبادت کرو پر وہ کون کون ہیں جو

جائیں گے؟۔ موسیٰ نے کہا ہم اپنے جوانوں اور بڈھوں اور ہم اپنے بیٹوں اور بیٹیوں اور اپنی بھیڑ بکریوں اور اپنے گائے بیلوں سمیت جائیں گے کیونکہ ہم کو اپنے خدا کی عید کرنی ہے۔ تب اس نے ان کو کہا کہ خداوند ہی تمہارے ساتھ رہے۔ میں تو ضرور ہی تم کو بچوں سمیت جانے دوں گا۔ خبردار ہو جاؤ، اس میں تمہاری خرابی ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہونے پائے گا۔ تم مرد ہی مر جا کر خداوند کی عبادت کرو کیونکہ تم یہی چاہتے تھے اور وہ فرعون کے پاس سے نکال دیے گئے۔" (خروج ۱۰: ۸ - ۱۱)

اس سے معلوم ہوا کہ چونکہ یہ قربانی، ہماری عید اضحیٰ کی طرح، عام قربانی کے ایک تہوار کی تجدید تھی اس وجہ سے حضرت موسیٰؑ کا مطالبہ یہ تھا کہ اس میں پوری قوم کو شرکت کی اجازت دی جائے اور قربانی کے لیے جانور بھی لے جانے کی اجازت دی جائے۔ فرعون نے بالآخر، خدا کے عذاب سے تنگ آکر، مطالبہ کا پہلا حصہ منظور کیا لیکن دوسرے حصہ کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔

"تب فرعون نے موسیٰ کو بلوا کر کہا تم جاؤ اور خداوند کی عبادت کرو فقط اپنی بھیڑ بکریوں اور گائے بیلوں کو یہیں چھوڑ جاؤ اور جو تمہارے بال بچے ہیں ان کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ موسیٰ نے کہا تجھے ہم کو قربانیوں اور سوختنی قربانیوں کے لیے جانور دینے پڑیں گے تاکہ ہم خداوند اپنے خدا کے آگے قربانی کریں سو ہمارے چوپائے بھی ہمارے ساتھ جائیں گے اور ان کا ایک کھر تک بھی پیچھے نہیں چھوڑا جائے گا کیونکہ ان ہی میں سے ہم کو خداوند اپنے خدا کی عبادت کا سامان لینا پڑے گا اور جب تک ہم وہاں نہ پہنچ جائیں ہم نہیں جانتے کہ کیا لے کر ہم کو خداوند کی عبادت کرنی ہوگی۔" (خروج ۱۰: ۲۴ - ۲۶)

بالآخر یہ قصہ یہاں تک بڑھا اور مصر اس اثنا میں خداوند تعالیٰ کی بھیجی ہوئی آفتوں سے اس قدر تباہ ہوا کہ مصریوں نے فرعون پر زور ڈالنا شروع کر دیا کہ ان لوگوں کو مصر سے بالکل نکال دیا جائے۔ چنانچہ یہی مطالبہ مصر سے بنی اسرائیل کی ہجرت کا سبب بن گیا

"تب اس نے رات ہی رات موسیٰ اور ہارون کو بلوا کر کہا کہ تم بنی اسرائیل کو لے کر لوگوں میں سے نکل جاؤ اور جیسا کہتے ہو جا کر خداوند کی عبادت کرو اور اپنے کہنے کے مطابق اپنے بھیڑ بکریاں اور گائے بیل بھی لیتے جاؤ اور میرے لیے بھی دعا کرنا اور مصری ان لوگوں سے بجد ہونے لگے تاکہ ان کو ملک مصر سے جلد باہر چلتا کریں کیونکہ وہ سمجھے کہ ہم سب مر جائیں گے۔ سو ان لوگوں نے اپنے گندھے گندھائے آٹے کو بغیر خمیر دیے لگنوں سمیت کپڑوں میں باندھ کر اپنے کندھوں پر دھر لیا۔" (خروج ۱۲: ۳۴ - ۳۵)

"اور انھوں نے اس گندھے ہوئے آٹے کی جسے وہ مصر سے لائے تھے بے خمیری روٹیاں پکائیں کیونکہ وہ اس میں خمیر دینے نہ پائے تھے اس لیے کہ وہ مصر سے ایسے جبراً نکال دیے گئے کہ وہاں ٹھہر نہ سکے اور نہ کچھ کھانا اپنے لیے تیار کرنے پائے۔" (خروج ۱۲: ۴۰)

بنی اسرائیل کو مصر سے جبراً نکالنے کے بعد ان کے تعاقب کی وجہ توریت میں یہ بیان ہوئی ہے:-

"جب مصر کے بادشاہ کو خبر ملی کہ وہ لوگ چل دیے تو فرعون اور اس کے خادموں کا دل ان لوگوں کی طرف سے پھر گیا اور وہ کہنے لگے کہ ہم نے یہ کیا کیا کہ اسرائیلیوں کو اپنی خدمت سے چھٹی دے کر ان کو جانے دیا۔ تب اس نے اپنا رتھ تیار کروایا اور اپنی قوم کے لوگوں کو ساتھ لیا۔" (خروج ۱۴: ۵ - ۶)

توریت کے ان بیانات سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے یہ جو مطالبہ کیا کہ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے، یہ آزادی کا مطالبہ نہیں تھا بلکہ ان کے ہاں اجتماعی قربانی کی جو عبادت حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیہم السلام کے وقت سے جاری تھی[۱] اور جو مصر میں، گائے کے تقدس کی وجہ سے، بند کر دی گئی تھی اس کی تجدید کا مطالبہ تھا۔

یہ معلوم ہے کہ بنی اسرائیل اپنے پاس ایک دین رکھتے تھے، جس میں ہر چند مصر کی غلامی کی وجہ سے بہت سی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں، لیکن وہ انبیاء کا دین تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ضروری تھا کہ پہلے اس کی تجدید کی جدوجہد کریں۔ بنی اسرائیل کے یہاں عبادات میں قربانی کو جو اہمیت حاصل ہے وہ معلوم ہے۔ اور یہ اہمیت اس وقت ہزار گنا بڑھ جاتی ہے جب کہ حاکم قوم کی طرف سے وہ چیز روک دی گئی ہو۔ اس وجہ سے اس کو زندہ کرنے کی کوشش ان کے مقدم ترین فرائض میں تھی۔ پس موسیٰ علیہ السلام نے ایک طرف تو حاکم قوم کو دعوت ایمان و اسلام دی اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے دعوائے حاکمیت سے احکم الحاکمین کے حق میں دست بردار ہو جائیں اور دوسری طرف بنی اسرائیل کو اللہ کی بندگی و اطاعت کی دعوت دی اور کوشش کی کہ ان کو اس بندگی و اطاعت کے لیے پوری آزادی حاصل ہو جائے۔ اگر حاکم قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت قبول کر لیتی تو سارا جھگڑا ختم تھا، لیکن جیسا کہ ہر نبی کے زمانہ کے مستکبرین نے اپنے نبیوں کا انکار کیا اور اتمام حجت کے بعد ان کو ہجرت کرنی پڑی اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے مستکبرین نے بھی ان کا انکار کیا اور وہ ان لوگوں کے ساتھ ہجرت کر گئے جو ان پر ایمان لائے۔ ان ایمان لانے والوں میں مصری بھی تھے اور اسرائیلی بھی۔ اور جن لوگوں نے ان کی تکذیب کی وہ تباہ ہو گئے اور ان تباہ ہونے والوں میں بھی دونوں ہی شامل تھے۔ اسرائیلی بھی اور قبطی بھی۔ البتہ بنی اسرائیل من حیث القوم حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے۔ اس کی بڑی وجہ تو وہی تھی جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ یہ لوگ ارباب اقتدار میں نہیں تھے کہ مفاد پرستی اور غرور ان کے ایمان کی راہ میں حائل ہوتا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کے اندر دین حق کے اجزا موجود تھے جو مصری زندگی میں دب تو ضرور گئے تھے، لیکن فنا نہیں ہوئے تھے اس وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت ان کے لیے بیگانہ چیز نہیں تھی۔ اس کے بالکل برعکس قبطی ملأ مستکبرین کی حیثیت رکھتے تھے اس وجہ سے وہ حق کو حق جانتے ہوئے بھی، جیسا کہ قرآن اور تورات دونوں سے واضح ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب پر اڑے رہے۔ صرف تھوڑے سے لوگ، جو بیدار ضمیر رکھتے تھے، ایمان لائے۔[۲]

اس پوری بحث کو ٹھنڈے دل سے مطالعہ کرنے کے بعد، غور فرمائیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسوہ کی پیروی وہ لوگ

---

[۱] ہماری تحقیق یہ ہے کہ اس طرح کی اجتماعی قربانی بنی اسرائیل میں قدیم زمانہ سے جاری تھی لیکن یہاں اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ توریت کی کتاب پیدائش میں اس کے دلائل موجود ہیں۔

[۲] یہاں کسی کو یہ شبہہ نہیں ہونا چاہیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام غیر قبطی ہونے کی وجہ سے قبطیوں پر حجت تمام نہیں کر سکتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بلاشبہہ اسرائیلی تھے لیکن ان کی پرورش فرعون کے محل میں ہوئی تھی اس وجہ سے وہ ان کی زبان اور روایات ہر چیز سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ قبطیوں کے لیے اسی طرح رسول تھے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام۔ (امین احسن)

کر رہے ہیں جو وطنی یا تہذیبی اشتراک کی بنا پر ہندی نیشنلزم یا مسلمان نیشنلزم کا فتنہ اٹھا رہے ہیں اور انگریزوں سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ جو فساد دنیا میں تم کر رہے ہو وہ فساد کرنا ہمارا بھی "پیدائشی حق" ہے یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسوہ کی پیروی جماعت اسلامی کر رہی جو حاکم و محکوم دونوں کو صرف احکم الحاکمین کی بندگی کی دعوت دے رہی ہے اور تمام بنی آدم کو یکساں پکار رہی ہے کہ اللہ واحد کے سوا کسی کی بندگی جائز ہے نہ اطاعت؟ اور پھر اس بات پر غور فرمائیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسوہ کی پیروی وہ لوگ کر رہے ہیں جو مسلمانوں کو مسلمان قوم کے نعرہ پر جمع کر رہے ہیں قطع نظر اس سے کہ ان میں کون اسلام کے اصولوں پر ایمان رکھتا ہے اور کون نہیں یا جماعت اسلامی کر رہی ہے جو مسلمانوں کے اندر ایمان و اسلام اور توحید و آخرت کے مقتضیات کا شعور پیدا کر کے اسلامی اصولوں کے مطابق ان کی تربیت کرنا چاہتی ہے؟

آخر میں محترم مستفسر نے مسلم شریف کی جو روایت نقل کی ہے اس کے متعلق گذارش ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اگر کوئی تربیت یافتہ جماعت جہاد کے لیے اٹھ رہی ہو اور وہ اپنے ساتھ بعض ایسے افراد بھی لے لے ... ہرج نہیں جن کی پوری تربیت نہ ہوئی ہو لیکن اس بات کا ثبوت ہرگز نہیں ملتا کہ ناتربیت یافتوں کی ایک فوج مرتب کر کے جہاد کیا جا سکتا ہے۔ بدر کی لڑائی جن لوگوں کے ذریعہ سے لڑی گئی وہ پوری تاریخ انسانی میں نوع انسانی کے گل سرسبد تھے۔ اگر ان کے ساتھ کوئی ناتربیت یافتہ مسلم بھی شامل ہو گیا تو اس سے کیا بن بگڑ سکتا تھا!

تبلیغی پمفلٹ

- سلامتی کا راستہ ۶/
- ایک نہایت ہی اہم استفتا ۲/
- اسلام کا نظریۂ سیاسی ۶/
- اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر ۶/
- اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے ۶/
- دین حق ۶/
- انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل ۶/
- نشان راہ ۶/
- اسلام اور جاہلیت ۶/
- جہاد فی سبیل اللہ ۶/
- نیا نظام تعلیم ۶/
- دستور جماعت اسلامی ۲/

انگریزی مطبوعات

(1) Towards Understanding Islam. Rs3/-

(2) What is Islam? Rs1/8/-

مکتبہ جماعت اسلامی، دار الاسلام، پٹھان کوٹ (پنجاب)

فریضۂ اقامت دین

از
جناب مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی

(۳) گرفتاران یاس دائمی

تیسرا گروہ جو کچھ کہتا ہے اور اس کے نظریات اور دلائل کی جو فہرست ہے، اس کا بڑا حصہ تو وہی ہے جو دوسرے گروہ کی زبانی گذشتہ بحث میں آپ سن چکے ہیں۔ اس لیے ان کو دوبارہ نقل کرنے اور ان کی غلطی واضح کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن بعض حیثیتوں سے یہ لوگ ان کی بہ نسبت ایک قدم آگے ہیں اور ترکِ فرض اور فراموشیٔ عہد کی جو بیماری وہاں سیاسی تدبر اور زمان و مکان کی مصلحتوں کے پردوں میں چھپا دی گئی تھی، یہاں صاف گوئی اور "جرأت" کے ساتھ علانیہ ظاہر کر دی گئی ہے اس لیے ان لوگوں کے ظاہر و باطن کی یکرنگی کا ہم اعتراف کرتے ہیں۔ گو اس قلت حیائے ایمانی کا احساس دل پر چوٹ لگاتا ہے جو اس اظہار "جرأت" کے نیچے کام کر رہی ہے اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ان لوگوں نے اپنے جسم سے کپڑے اتار کر پھینک دیے ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان میں سے کتنوں نے یہ حیاکشی ہوش و بیداری کے عالم میں کی ہے اور کتنوں نے غفلت و بے ہوشی کی حالت میں، ایک طرف اقامت دین کی اس اہمیت کو سامنے رکھیے کہ اسلام اور قیام دین کی سعی و جہد میں باہم وہی تعلق ہے جو ایک زندہ انسان کی زندگی اور اس کی حرکت قلب میں ہے جیسا کہ ہم اوپر دلائل کی روشنی میں واضح کر چکے ہیں، پھر اس کے بعد ان لوگوں کی ان —— بظاہر عاجزانہ مگر فی الواقع باغیانہ —— باتوں کا گہری نظر سے تجزیہ کیجیے کہ "یہ نصب العین ہے تو بالکل برحق مگر ہم جیسے کمزور لوگوں کے بس کا یہ کام نہیں ہے۔ جس مشن کو پیغمبر کی تربیت یافتہ جماعت بھی تیس برس سے زیادہ نہ چلا سکی اس کے لیے ہم جیسے ضعیف الایمان لوگوں کا دم خم دکھانا تقدیر سے لڑنا ہے۔ اب وہ زمانہ واپس نہیں آسکتا جو تیرہ سو برس پہلے گزر چکا" توقع ہے کہ اس تجزیے سے آپ پر بھی وہی حقیقت منکشف ہوگی جو ہم کہنی چاہتے ہیں۔ جب اقامت دین کی جد و جہد سے برضا و رغبت کنارہ کش ہو کر، اور باطل کے مقابلہ اور منکرات کے ماحول میں عدم مداخلت اور صلح کل کی پالیسی اختیار کر کے انسان پیروان اسلام کی صفِ پائیں میں بھی جگہ نہیں پا سکتا اور اللہ کے رسول نے ایسے انسان کو ایمان کے آخری ذرے سے بھی محروم قرار دیا ہے تو بڑی سے بڑی کمزوری اور مایوسی بھی اس فرض کی انجام دہی سے ایک لمحہ کے لیے بے تعلق نہیں کر سکتی اور اگر کہیں یہ بے تعلقی ہے تو وہاں کسی کمزور سے کمزور ایمان کی تلاش بھی بے سود ہے۔ اسلام نے اپنا کوئی ایسا "سستا ایڈیشن" شائع نہیں کیا ہے جس کے تحت اس "دم خم دکھانے" اور "تقدیر سے لڑنے" سے نجات ممکن ہو۔ وہ شخص دھوکے میں ہے جو یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ اس لازمۂ ایمانی سے بے بہرہ رہ کر بھی ایمان و رضائے الٰہی کی کوئی مقدار حاصل کی جا سکتی ہے۔[۵]

تاریخ خلافت کی غیر متعلق بحث ان لوگوں کے فکر و عمل کی بنیادوں میں سب سے زیادہ اہمیت اور مرکزیت جس چیز کو حاصل ہے اور جس کا گذشتہ مباحث میں ابھی تک تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ "جو چیز صحابہ کے ہاتھوں بھی تیس برس سے زیادہ قائم رہ سکی اس کے لیے کوئی سعی بالکل لاحاصل ہے۔" یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں مایوسی اور دل شکستگی کا زہر پیدا کرنے میں اس فقرہ نے جتنا موثر پارٹ ادا کیا ہے، اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس حقیقت کی المناکی کا صحیح ادراک اسی وقت ہو سکتا ہے جب یہ معلوم ہو جائے کہ جس چیز کو بنیاد قرار دے کر اقامت دین کے فرض کو ساقط سمجھ لیا گیا ہے، اس کا اس فرض کی ادائگی سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ ذرا سوچیے تو سہی کہ کسی نظریہ، کسی اصول اور کسی نصب العین پر ایمان لانے کا دعویٰ کرنا اور ساتھ ہی اس کے اتباع سے اور اس کے مقتضیات ادا کرنے سے اس بنا پر انکار کر دینا کہ اس نصب العین کو کبھی زمانہ دراز تک برقرار نہیں رکھا جا سکا، اپنے اندر معقولیت کا کوئی شمہ رکھتا ہے؟ اس سے بڑھ کر قول و عمل کے تضاد کی مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟ سوال یہ ہے کہ آپ نے اس سے کو اس لیے اپنا مقصد زندگی ٹھیرایا ہے کہ وہ فی نفسہ حق ہے اور اس کی حقانیت کا علم و یقین اس کو اپنانے پر مجبور کر رہا ہے یا اس کا کوئی دوسرا سبب ہے؟ اگر کوئی دوسرا سبب ہے تو پھر آپ سے کوئی مطالبہ ہی نہ آپ پر کسی جد و جہد کے ترک کرنے کا الزام۔ لیکن اگر پہلی بات ہے، جیسا کہ توقع کی جانی چاہیے، تو ایک کا ذہنی ابتدا کر دہ طرز استدلال اختیار کرنے میں حق بجانب نہیں قرار دے سکتا۔ تیس اور چالیس برس تو نہیں اگر ایک دن بھی یہ مشن کامیابی کے ساتھ نہ چل سکا تو اس سے آپ کی ذمہ داریوں میں ذرہ بھر بھی تخفیف نہیں ہو سکتی۔ اس نتیجے سے سر دھڑ کی بازی لگا دیجیے۔ اس لیے کہ آپ نے اس کو حق کہا ہے اور اس کی علمبرداری کا دعویٰ کیا ہے، یہ دیکھنے کی گنجائش کہاں ہے کہ اس راہ میں کس نے کیا کیا اور کب کیا کیا گیا؟ آپ کے فرائض کی تعیین وہ نصب العین کرے گا جس کو حق سمجھ کر آپ نے قبول کیا ہے، تاریخ نہیں کرے گی۔

لیکن اگر آپ کو اپنی "اس دلیل" پر گہرا اعتماد اور اصرار ہے اور اس میں اتنا وزن محسوس کرتے ہیں کہ وہ اقامت دین کی جد و جہد سے سبکدوش کر دینے کے لیے کافی ہے تو ہم گذارش کریں گے کہ ذرا اس کو اور وسعت دیجیے اور اسی اصول پر یوں سوچنا شروع کیجیے کہ مسلمان کی جو صفات و خصوصیات کتاب و سنت میں بیان کی گئی ہیں اور ایمان و اسلام کا جو معیار اللہ اور اس کے رسول نے پیش کیا ہے اس معیار پر پورے اترنے والے اور ان صفات و خصوصیات کے حامل انسان ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی، علی مرتضیٰ، ابوذر غفاری، سلمان فارسی، صہیب رومی، بلال حبشی رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ان ہی کی طرح کے چند سو یا چند ہزار سے زیادہ نہیں پیدا ہو سکے، اور اس وقت تو اس معیار کے مسلمانوں کا عالم تصور میں بھی وجود ممکن نہیں اس لیے اب اپنے معیار دینی کا ذکر اور خیال ہی چھوڑ دینا چاہیے اور اسلام کی ان مطلوبہ صفات و خصوصیات کے لیے سعی و جہد کرنا بالکل لاحاصل ہے۔ یہ "ہم جیسے کمزور انسانوں کے بس کا کام نہیں ہے۔" اگر اجتماعی میدان میں خلافت راشدہ کی قلت عمر اس امر کا حق دے سکتی ہے کہ اب قیامت تک کے لیے قیام دین کے تصور سے ذہنوں کو خالی کر لیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ انفرادی

(حاشیہ صفحہ ۶۰) [1] اس موقع پر "امکان و عدم امکان" "کامیابی کا اسلامی تصور" اور "اقامت دین کے سلسلہ میں بندوں کی ذمہ داری" وغیرہ بحثوں کو جو گذشتہ نمبر میں گذر چکی ہیں ذہن میں رکھنا چاہیے۔ ورنہ یہاں اس اجمالی بیان سے غلط فہمی پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ (ص)

زندگی میں بھی اس استحقاق معنوی کو قبول نہ کیا جائے۔ لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ باوجود اس کے کہ اب ایک ابوبکر بھی پیدا نہیں ہو رہا ہے آپ نہ صرف خود کمالِ ایمانی کے حصول سے مایوس ہو کر اسلام سے علیحدگی پر تیار نہیں بلکہ گمراہوں کو راہ یاب، جاہلوں کو دین آگاہ اور غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کے لیے زندگیاں وقف کیے ہوئے ہیں، تبلیغی انجمنیں قائم کرتے ہیں، اشاعت دین کے ادارے کھولتے ہیں، تعلیم کتاب و سنت کے لیے درسگاہیں جاری کرتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ کیوں نہیں ایسا ہوتا کہ صدیقؓ و فاروقؓ کی سی اسلامیت کے حصول سے، کہ قرآن کا معیارِ مطلوب یہی ہے، مایوس ہونے کے باعث اسلام کا نام لینا چھوڑ دیا جاتا؟ آپ کہیں گے کہ ابوبکر صدیق اور عمر فاروق اسلام کے کامل المعیار اور اعلیٰ نمونے تھے، ان کے مقابل کا ایمان و تقویٰ اگر ہم نہیں پیدا کر سکتے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سرے سے اسلام ہی کو چھوڑ دیں، بلکہ ان نمونوں کو سامنے رکھ کر ہم اپنی استطاعت کے مطابق کوشش کریں گے کہ جہاں تک ہو سکے انہی کی طرح کا تدین اپنے اندر پیدا کریں، تاریخ نے ہمارے سامنے اسلام کے یہ اعلیٰ ترین نمونے رکھ دیے ہیں تاکہ اپنے امکان بھر ہم اپنے کو ان پر ڈھالنے کی سعی کریں۔ اب جس کو اللہ تعالیٰ جتنی توفیق دے اس حد تک اس رنگ میں اپنے آپ کو رنگنے کی کوشش کرے اور ان کے مقامِ ایمانی کی طرف جتنے قدم بڑھا سکتا ہے بڑھاتا رہے۔ ہم اس طرزِ فکر سے سو فیصدی اتفاق کرتے ہیں۔ ہماری گذارش بالکل اسی طرزِ فکر پر مبنی ہے فرق صرف یہ ہے کہ آپ اس کو انفرادیت کے ایک محدود دائرہ میں رکھنا چاہتے ہیں اور ہم اسی کو اجتماعیت تک پھیلا دینا چاہتے ہیں۔ ہمارا مدعا یہ ہے کہ اسی نقطۂ نگاہ سے آپ کو خلافتِ راشدہ کے اوراقِ تاریخ کو بھی دیکھنا چاہیے۔ ابوبکر اور عمر اور عثمان و علی رضوان اللہ علیہم کی انفرادی زندگیوں کی طرح ان کا طرزِ خلافت اور ان کی نیابتِ رسول بھی ایک اعلیٰ معیار تھی جسے اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیت نے تاریخ کے سینہ میں محفوظ کر دیا ہے تاکہ دعوتِ قرآنی کے علم بردار اپنی جدوجہد کے سلسلہ میں اپنے سامنے ایک عملی اور معیاری نمونہ رکھ سکیں اور جس حد تک ان کے دست و بازو میں خدا نے توانائی بخشی ہو اس نمونہ کے اتباع میں صرف کریں اور اس وقت تک اطمینان کا سانس نہ لیں جب تک کہ اللہ کا دین اپنی رحمتوں کے ساتھ اس زمین پر اسی طرح نہ چھا جائے جس طرح خیر القرون میں چھا گیا تھا حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ۔ پس اس تیس سالہ دورِ خلافت کو اپنے لیے مثال اور ایک اسوہ بنائیے اور اس کے جمالِ جہاں آرا کے عشق سے ہمہ دم اپنے سینوں کو گرم رکھیے۔ حیف ہے اگر اس کے نام سے دلوں میں مایوسی اور افسردگی کی لہریں اٹھیں۔ اس نام میں تو بلا کی کشش اور اس کشش میں طوفان کا سا جوش بھرا ہوا ہے۔ اگر ہمارا یقین ہے کہ دنیا کو فلاح و سعادت صرف دینِ حق کے قائم ہونے ہی پر مل سکتی ہے، اور اگر ہمارے قلوب اس مبارک زمانہ کی سچی قدر اور محبت رکھتے ہیں جبکہ دنیا میں خلافتِ راشدہ قائم تھی تو اس یقین اور اس محبت کا فطری تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ دل اس افسانۂ کہن کو از سرِ نو عالمِ واقعات میں دیکھنے کے لیے ٹھیک اسی طرح بے قرار رہے جیسے کہ کسی کی کوئی عزیز ترین شے کھو گئی ہو اور وہ اس کی جستجو میں دیوانہ وار سرگرداں پھر رہا ہو۔ جس شخص کے ایمان میں یہ شورش نہ ہو وہ دراصل ایمان ہی نہیں، بلکہ تصورات کا ایک تبکدہ ہے۔

نظام اسلامی پر ایک شدید بہتان

سطورِ بالا میں ہم نے اسلام کے انفرادی اور اجتماعی معیاروں پر جو اشارات کیے ہیں ان سے یہ حقیقت بھی بے نقاب ہو جاتی ہے کہ روئے زمین پر صرف تیس سال نظامِ اسلامی کو برقرار سمجھنا تاریخِ اسلامی کے

غلط مطالعہ کا نتیجہ ہے اور اس خیال کے پیدا کرنے میں چالاک دشمنوں کی عیاری اور نادان دوستوں کی سادہ لوحی دونوں ہی شامل ہیں۔ اگر حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے بعد بھی مسلمان پیدا ہوئے اور برابر پیدا ہوتے رہے تو ان کی خلافتوں کے بعد بھی نظام اسلامی قائم رہا فرق صرف یہ تھا کہ جس طرح ان کی شخصیتیں بے داغ تھیں اسی طرح ان کی خلافتیں بھی خیر کامل کا نمونہ تھیں۔ اور اس دور سعید کے ختم ہونے کے بعد جس طرح شخصیتیں ناقص تھیں، مگر پھر بھی مسلمان تھیں، اسی طرح اس وقت کے نظامہائے اجتماعی بھی ناقص تھے مگر پھر بھی بالکل غیر اسلامی نہ تھے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ جس طرح افراد میں اسلامیت کے مدارج مختلف ہوتے ہیں اسی طرح نظامہائے سیاست کے بھی دینی نقطۂ نظر سے مختلف مدارج ہوتے ہیں جس طرح اشخاص میں کمزوریاں ہوتی ہیں اسی طرح اسٹیٹ میں بھی ہوتی ہیں۔ خود اسی زمانۂ خلافت راشدہ کے تمام ادوار اپنی روح میں یکساں نہ تھے بلکہ عثمانی اور علوی دور خلافت، صدیقی اور فاروقی ادوار سے فروتر تھے جس پر احادیث اور تاریخ دونوں شاہد ہیں۔ اس لیے جب ہم افراد کی کمزوریوں پر تنقید تو کرتے ہیں مگر ان کو دائرۂ اسلام سے خارج نہیں سمجھتے اسی طرح دور خلافت کے بعد قائم رہنے والے سیاسی ڈھانچہ پر سخت سے سخت تنقید تو کر سکتے ہیں اور اس کو جاہلیت کے عناصر سے مخلوط بھی کہہ سکتے ہیں مگر انتہائی زیادتی ہوگی اگر اس کو بالکل غیر اسلامی قرار دیا جائے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جس طرح علمائے حق ضعیف الایمان اور گنہ گار انسانوں کی ہدایت و ارشاد کا فرض ادا کرتے تھے اسی طرح حکمران وقت اور اس کے سیاسی نظم و نسق پر بھی اظہار نکیر کرتے رہے اور افراد کی طرح حکومتوں کی اصلاح احوال کی کوشش بھی ان کی زندگی کا مستقل مشن تھا۔ لیکن انھوں نے کسی زمانہ میں کسی حکمران کے خلاف یہ فتویٰ صادر نہیں کیا کہ اس کی حکومت سراسر غیر اسلامی اور کافرانہ ہے۔ ہاں اس کے اندر جو بگاڑ تھا اپنی مقدرت کے مطابق اس کے سدھار کی سعی کرتے رہے، جس کی وجہ یہی ہے کہ خلافت راشدہ کے خاتمہ کے بعد بھی مدتوں جو نظام سیاست ممالک اسلامی میں جاری رہا وہ کسی نہ کسی حد تک اسلامی تھا۔ عدالتیں اسلامی قوانین کے مطابق فیصلے کرتی تھیں، سزائیں آئین شرع کے ماتحت دی جاتی تھیں، جائدادیں احکامِ دین کی رو سے تقسیم کی جاتی تھیں، غرض زندگی کے عام معاملات میں اتھارٹی عملاً کتاب و سنت ہی کو حاصل تھی، جو کچھ خرابی تھی حکمرانوں کی ذات میں تھی مگر نظام دین کی بالادستی اس طرح گوشہ گوشہ پر چھائی ہوئی تھی اور اس کا پُر جلال وقار، ذہن عام کو اس طرح اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا کہ ان حکمرانوں کو بھی اپنی کوئی غیر اسلامی کارروائی انجام دینے کے لیے چہرے پر شرع کی نقاب ڈالنی پڑتی تھی اور اس بات کا وہ تصور تک نہیں کر سکتے تھے کہ خدا کے دین اور قانون کی جگہ اپنا دین اور قانون چلا دیں۔

استدراک لیکن ہماری اس تقریر سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہم ان تمام حکمرانوں کی حکومتوں کو خالص اسلامی نظام سمجھتے ہیں اور اقامت دین کا فرض یاد دلانے کا مقصد یہ ہے کہ معتصم باللہ یا ہارون الرشید کی طرح کی کوئی حکومت قائم کرنے کی دعوت دینے اور اس پر مطمئن ہو جانے کی تلقین کرتے ہیں، بلکہ دکھانا یہ مقصود ہے کہ خلافت راشدہ کے اختتام کے بعد بھی ایک مدت دراز تک اللہ کا دین دنیا میں قائم و نافذ رہا، اگرچہ اپنے مظاہر کے اعتبار سے بھی ناقص تھا اور اپنی روح کے اعتبار سے بھی۔ اس لیے اس خیال کو اپنے ذہن میں جگہ دینا کہ یہ نظام صرف چند دنوں ہی قائم رہا، نہ صرف اسلام سے لوگوں کو دور کرنا ہے بلکہ تاریخی بددیانتی بھی ہے، اور ہمارا فرض ہے کہ اپنے علمی، دماغی، مالی اور جسمانی ذرائع سے کام لیتے ہوئے اپنے اس

مقصدِ زندگی کی خاطر مسلسل جد و جہد کرتے رہیں۔ نمونۂ کمال کے طور پر سامنے خلافتِ راشدہ کی مثال ہو، پھر اس مثال کی جہاں تک عملی پیروی ہماری حدِ استطاعت میں ہو اسے سرانجام دے دیں، بس اسی پر ہماری مسؤلیت ختم ہو جاتی ہے۔ جس طرح صدیق و فاروق بن جانا ہم پر فرض نہیں بلکہ ان کے نمونوں کو سامنے رکھ کر حتی الامکان زیادہ سے زیادہ ان سے مماثلت پیدا کرنا ہمارا فرض ہے، اسی طرح، بہر حال، ان ہی کی طرح کی خلافت قائم کر دینا ہماری ذمہ داری نہیں ہے بلکہ ہماری اصل ذمہ داری یہ ہے کہ ہم سے جہاں تک ہو سکے ان کی قائم کردہ خلافتوں سے بیش از بیش مشابہت رکھنے والا نظام اجتماعی قائم کرنے کی سعی کریں۔ البتہ آگے آنے والی نسلیں یکے بعد دیگرے اس مشابہت کے رنگ کو نمایاں سے نمایاں تر کرتی رہیں۔

متربصین کا گروہ

اب ان حضرات کے اندازِ استدلال کا جائزہ لیجیے جو انتظار اور تربص کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں اور خود سلامتی و بے فکری کے محفوظ گوشوں میں بیٹھے ہوئے دوسروں کی ثبات قدمی اور تیز گامی کا حساب لگا رہے ہیں اور اس نصب العین ہی کو اپنی زندگیوں کا تنہا مقصد سمجھنے کے باوجود میدانِ سعی و عمل میں اس لیے نہیں اترتے کہ پہلے سے اس میدان میں اترے ہوئے لوگوں کی عزیمت انھیں مشکوک نظر آتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر امام صالح اور متقی اور مقبول الصلوٰۃ نہ ہو تو یہ حضرات نہ صرف یہ کہ اس کے پیچھے ہی نماز پڑھنے سے انکار کر دیں گے بلکہ سرے سے نماز ہی ترک کر دیں گے اور غالباً اس یقین کے ساتھ ترک کر دیں گے کہ کل داورِ محشر کے سامنے یہ کہہ کر بری الذمہ ہو جائیں گے کہ خدایا! ہم تو نماز کو فرضِ عین ہی سمجھتے تھے اور چوبیس گھنٹے اس کے لیے باوضو رہتے تھے مگر موذن کی صداؤں اور امامِ محلہ کی نمازوں میں ہم کو خلوص و للہیت کی روح نظر نہیں آتی تھی اس لیے ہم نے نماز نہیں پڑھی۔ ہم باوجود غور و فکر کے اس طرزِ فکر و استدلال کی کوئی شرعی یا عقلی بنیاد نہیں پا سکے۔ فرض کیجیے کہ زید اقامتِ دین کی دعوت دے رہا ہے اور ان لوگوں کو، جو اتباعِ قرآن اور علمبرداریِ اسلام کے مدعی ہیں، ان کی فرض ناشناسیوں پر جھنجھوڑ کر اور غفلت شعاریوں سے بیدار کر کے ان کا فرضِ زندگی یاد دلا رہا ہے اور اپنے طور پر اس راہ میں قدم بھی رکھ دیتا ہے لیکن جہاں تک اس کی عملی صلاحیت، خلوص اور عزیمت کا تعلق ہے آپ کے قلب کو پورا اطمینان نہیں ہوتا بلکہ وہ اور اس کے سارے ہم سفر نااہل، بے عمل، غیر مخلص اور غیر متقی دکھائی پڑتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ ان کی یہ ساری خامیاں آپ کے فرض کو ساقط اور آپ کو اس کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کس طرح کر دیں گی۔ کیا آپ نے اس امر کو اس لیے حق مانا ہے کہ زید اور اس کے ساتھیوں کی یہی رائے ہے؟ کیا آپ نے دینِ حق کی اقامت کا فریضہ اس شرط کے ساتھ اپنا مقصدِ زندگی تسلیم کیا ہے کہ پہلے زید اور اس کے ہمراہی ادائے فرض کا عملی ثبوت دے لیں تو ہم اپنے نرم گرم بستروں سے اٹھیں اور اپنی خوابگاہوں سے باہر قدم نکالیں گے؟ کیا قرآن کی مرکزی دعوت کے آپ اسی وقت مکلف ہیں جب دوسروں کو اس کی راہ میں قربانیاں کرتے دیکھ لیں؟ اگر ایسا نہیں ہے، اور قرآن گواہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ ہر فرد اپنی استطاعت کے مطابق اس فریضہ کی بجا آوری کا بطور خود ہر حال میں ذمہ دار اور مسئول ہے، تو اپنے نفس کی حیلہ سازیاں اور غفلتیں کیا کم ہیں کہ دوسروں کی کمزوریاں ٹٹولنے کی آپ کو فرصت مل جاتی ہے۔ دوسرے اگر فی الواقع ایسے ہی ہیں جیسا کہ آپ کا گمان ہے تو خدا کے روبرو اس کے جوابدہ وہ خود ہوں گے

آپ اس کھود کرید کی زحمت بلا وجہ کیوں اٹھاتے ہیں، آپ اپنے نامۂ اعمال کی فکر کیجیے۔ ہاں اگر ان کے حالات سے کچھ درس ملتا ہے تو اس کو لے لیجیے۔ لقمان حکیم سے پوچھا گیا "تم نے ادب کس سے سیکھا" جواب دیا "بے ادبوں سے"۔ مومن کو بھی اللہ تعالیٰ نے حکیم پیدا کیا ہے اور ایسی ہی باتیں ہیں، عبرت پذیر اور حکمت پسند نگاہوں سے کام لینے کی تاکید کی ہے۔ سارا قرآن اس نے مغضوب اور گمراہ قوموں کے تفصیلی تذکروں سے اسی لیے تو بھر دیا ہے کہ مسلمان ان جیسی حرکتوں کے ارتکاب سے بچیں۔ اس لیے آپ کا اس صورت حال میں جو فرض ہونا چاہیے وہ صرف یہی ہے کہ ان کی تمام بیماریوں، نظرا ندازیوں اور غلط کاریوں سے اپنے دامن بچا کر خالص للہیت اور عزیمت کے ساتھ اس جھنڈے کو لے کر آگے بڑھیں اور اگر ہو سکے تو ان کے لیے ہدایت، عزیمت، خلوص اور توفیق عمل کی دعا بھی کرتے جائیں کہ بہرحال ان کی چیخ پکار، اگرچہ ان کی اپنی حد تک محض "زبانی تعلیم" تھی مگر آپ کے حق میں ہادی اور مذکر ثابت ہوئی۔ اس لیے وہ آپ کے شکریے کے مستحق ہیں کہ خاص طور پر قرآن کے انہی "زبانی تقاضوں" نے غفلت کے پردے چاک کر دیے اور آپ کو بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا۔ اس خود ان بد نصیب انسان پر جو تاریکیوں کے ہجوم میں سر راہ چراغ لے کر کھڑا ہو اور دوسروں کو قرآن کی منزل مقصود دکھا رہا ہو مگر خود اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی ہو، آپ کو ترس تو ضرور آنا چاہیے مگر اس پر آوازے کستے اور اعتراضات کرتے رہنا بے انصافی، اور اس کی پیروی میں چراغ کی روشنی سے فائدہ نہ اٹھانا اور پشت بمنزل ہو رہنا حماقت اور دیوانگی ہے۔ سعید وہ ہے جو دوسروں سے عبرت اور نصیحت حاصل کرے اور دانائی کا تقاضا یہ ہے کہ قائل کی شخصیت کے بجائے اس کے قول کو دیکھا جائے۔ پس اقامت حق کی پکار سن کر ان بندگان خدا کا طرز عمل اختیار کیجیے جو سعید ہوں، جو دانا اور حقیقت جو ہوں اور جن کی تعریف قرآن کی زبان میں یہ ہے کہ:

اَلَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۔ جو باتوں کو کان لگا کر سنتے ہیں اور ان میں سے بہتر باتوں کو اپنے عمل و اتباع کے لیے منتخب کر لیتے ہیں۔

. . . .

اس لیے اس "قول" — دعوت اقامت دین — پر اس پہلو سے بحث تو کی جا سکتی ہے کہ آیا وہ "احسن القول" ہے یا نہیں؟ لیکن جب آپ اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس قول کے احسن ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور اس کا ہر مسلمان کا تنہا فریضۂ زندگی ہونا شک و ریب سے بالاتر ہے تو پھر اس پر لبیک کہیے اور اگر ساری دنیا بھی اس کے اتباع سے جی چرا رہی ہو تو یقین کیجیے کہ اس سے آپ کی اپنی ذمہ داری میں کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی اور نہ آپ کو یہ حق حاصل ہو سکتا ہے کہ دوسروں کے عمل اور عزم کا انتظار کرتے رہیں۔ یہ انتظار تو حق پرستی کی ضد ہے اور جو شخص حق کو مانتے ہوئے انتظار کی پالیسی اختیار کرتا ہے وہ دراصل حق کو بدنام کرتا اور اس کی بے حرمتی اور تضحیک کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اگر ہمیں صاف گوئی پر معاف کیا جائے تو ہم اس موقع پر اس رسوائے عالم گروہ کی عادات و خصوصیات کو یاد دلائیں جس نے رسول ؐ اور اصحاب رسول کے مجاہدات اقامت دین کے سلسلہ میں یہی تربص کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی جس کے واسطے مسلمانوں کا ساتھ دینے کے لیے یہ احساس فرض کافی نہ تھا کہ یہ لوگ جس امر حق کے لیے جانفروشی کر رہے ہیں اسی کو ہم نے بھی اختیار کیا ہے اس لیے ان کے پہلو بہ پہلو چل کر اپنے فرض کو ادا کریں۔ ان ترکیب پسند لوگوں کا وطیرہ یہ تھا کہ اس کشمکش سے علیحدہ رہ کر اس کے نتائج کا اندازہ لگاتے رہتے اور اس وقت مسلمانوں کی جماعت میں

آتے جب ان کی فتح کے جھنڈے لہراتے دیکھ لیتے۔ (اَلَّذِیۡنَ یَتَرَبَّصُوۡنَ بِکُمۡ فَاِنۡ کَانَ لَکُمۡ فَتۡحٌ مِّنَ اللّٰہِ قَالُوۡۤا اَلَمۡ نَکُنۡ مَّعَکُمۡ)
غور فرمائیے کہ ان لوگوں کی ذہنیت، جو اقامت دین کو اپنا فرض منصبی سمجھتے ہوئے بھی اس کے لیے آمادۂ عمل نہیں ہوتے، کتنی بنیادی مشابہت رکھتی ہے اُس ذہنیت کے ساتھ جس پر منافقوں کے طرز عمل کی اساس تھی؟ جس طرح وہ حق کی حمایت حق کی خاطر نہیں کرتے تھے اسی طرح ان لوگوں کے نزدیک بھی حق کا مجرد حق ہونا ہی آمادگی عمل کے لیے کافی نہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ وہ لوگ مسلمانوں کی فتح کا انتظار کیا کرتے تھے اور یہ حضرات قیام دین کے داعیوں کے عزم و اخلاص کے بارے میں کسی "شرح صدر" کے منتظر ہیں۔ لیکن اتباع حق اور ادائے فرض سے بھاگنے میں دونوں مشترک ہیں۔

بدبختی کی انتہا کاش معاملہ یہیں ختم ہو جاتا اور ان سب لوگوں نے انتظار اور تربص کے صرف سلبی پہلو پر ہی اکتفا کر لیا ہوتا، مگر یہ دیکھ کر صبر و ضبط کا دامن سنبھالنا دشوار ہو جاتا ہے کہ خدا پرستی، اتباع قرآنی اور عشق محمدی کی دعویدار امت میں ایسے افراد بھی موجود ہیں جو اس ساعت ہمایوں کے انتظار میں شوق مجسم بنے بیٹھے ہیں جب طاغوتی اقتدار کی لال پیلی آنکھیں دیکھ کر اقامت دین کے "جھوٹے مدعی" میدان سے بھاگ کھڑے ہوں گے اور انھیں اپنے جذبات طعن و تشنیع کی تسکین دہی کا موقع نصیب ہوگا۔ یہ حضرات ایک سنجیدہ تبسم کے ساتھ یہ فرما کر گویا اپنی ذمہ داریوں کا حق ادا کر دیتے ہیں کہ ہوش سے عاری اور جوش کے اندھے لوگوں کا ایک گروہ ہے جو قیام دین کا شور مچا رہا ہے، حوادث و مشکلات خود ہی ان کا ناطقہ بند کر دیں گے۔ لیکن شاید انھیں خبر نہیں کہ ان کے اس نشتر طعن کی زد خود ان کی اپنی رگ گلو تک جا پہنچتی ہے۔ افسوس! مسلمان کا دل اب قیام دین کی حسرتوں سے بھی اس درجہ محروم ہو گیا ہے کہ اگر خود نہیں کچھ کر سکتا تو دوسروں کا کچھ کرنا بھی اس کو گوارا نہیں رہا اور نہ اس کی نیک خواہشات کا اس کے دل میں گذر باقی رہا۔ آخر یہ باور کرنے کے لیے کہاں سے دل و دماغ لائے جائیں کہ جو سینہ، دین حق کی محبت اور فدویت کا امین بنایا گیا تھا اب اس میں ان آرزوؤں کی پرورش کی جا رہی ہے جو صرف مساعی کفر کے خلاف مخصوص ہونی چاہیے تھیں۔ حالانکہ اگر میرے اندر اتنی غیرت اور ہمت موجود نہیں ہے کہ اللہ کے دین کو زندہ اور قائم کرنے کے لیے قدم بڑھا سکوں تو میرے ایمان کا کم سے کم تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ اس کی تمنا سے اپنے قلب و دماغ کو ایک لمحہ کے لیے بھی خالی نہ ہونے دوں اور اگر کچھ اللہ کے بندے اس کے لیے قدم اٹھا رہے ہوں تو ان کے لیے اخلاص عمل، ثبات قدم، نصرت حق، حسن انجام اور فوز مرام کی دعائیں کروں۔ لیکن اگر اتنا بھی نہیں ہو سکتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غیرت حق کی آخری چنگاری بھی میرے اندر بجھ رہی ہے، اور اگر اس سے آگے بڑھ کر میں اس دعوت حق کو فتنہ قرار دے دوں، لوگوں کو اس کی طرف بڑھنے سے روکنے لگ جاؤں اور اس کے لیے حوادث روزگار کی تمنائیں کروں تو میری بدبختی کی یہ انتہا ہوگی اور ایسی صورت میں مجھ کو اسلام کا نام لیتے ہوئے شرم معلوم ہونی چاہیے کیونکہ حالات اور مظاہر کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ میں بالکل اسی مقام پر ہوں گا جہاں سے کچھ کور باطن لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے فداکار ساتھیوں کو اس نگاہ سے دیکھ رہے تھے جس کا ذکر قرآن نے ان لفظوں میں کیا ہے:

..... یَتَرَبَّصُ بِکُمُ الدَّوَآئِرَ (توبہ-۱۰) — یہ لوگ تمھارے نذر آفات ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔

یا پھر وہاں، جہاں سے پیغمبر عالم کی دل نشیں اور مسحور کن صدائے حق کو یہ کہکر ٹالا گیا تھا کہ:

شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ (طور-۳) یہ ایک (سحر طراز) شاعر ہے، ہم اس کے لیے حوادث روزگار کی راہ دیکھ رہے ہیں

پس جنھیں اللہ نے عقل دی ہے انھیں پوری سنجیدگی اور احساس ذمہ داری کے ساتھ اس طرز عمل پر غور کرنا چاہیے جو نری جہالت کی پیداوار ہے اور جس کے ساتھ ایمان کی محبت کبھی جمع نہیں ہو سکتی۔

مہدی موعود کے منتظر

آخری گروہ ان لوگوں کا ہے جو مہدی موعود کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ان کے فکر و استدلال کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے تیس سال کے بعد خلافت راشدہ کے ختم ہو جانے اور پھر قرب قیامت میں، امام مہدی کے ہاتھوں اس کے از سر نو قائم ہونے کی خبر دی ہے۔ اور نقطۂ انجام یہ ہے کہ "اس نصب العین کے برحق ہونے کے باوجود اب ہم اس کی اقامت کے مکلف نہیں" دین اور اس کے اصول و مطالبات سے بے خبری کا یہ عالم ہے کہ اب اس قسم کی باتوں کو بھی دلیل سمجھا جاتا ہے اور اتنی زبردست دلیل جو مسلمان کی زندگی کا مطمح نظر ہی بدل دے سکتی ہے۔ ضرورت تو یہ تھی کہ اس قسم کی مہمل باتوں کی تردید میں وقت، کاغذ اور روشنائی کا ضیاع برداشت نہ کیا جاتا مگر اس مصیبت کا کیا علاج کہ اس افیون کی گولی نے نہ صرف ہمارے عوام بلکہ کتنے ہی مدعیان علم اور ارباب تقوی کو مدہوش اور بے حس بنا رکھا ہے اس لیے انھیں بتا دینے کی ضرورت ہے کہ جس دیوار کا تم نے سہارا لے رکھا ہے اس کی بنیاد ریت سے اٹھائی گئی ہے تاکہ جس کو ترک فرض کی ہلاکت خریدنی ہو پورے علم و شعور کے ساتھ خریدے۔

روایات مہدی کی حیثیت سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ ظہور مہدی کی خبر ہمیں ملی کہاں سے ہے اور حقائق دینی کی فہرست میں اس کا مقام کیا ہے؟ سو ہر صاحب علم جانتا ہے کہ قرآن کے صفحات اس کے ذکر سے بالکل خالی ہیں۔ حالانکہ اگر تعلیمات دین میں اس امر کو کوئی ایسی اہمیت، جو ہماری زندگی کا مقصد ہی بدل دے سکتی ہو، حاصل ہوتی تو عقل عام چاہتی ہے کہ قرآن اس کے متعلق ہم کو واضح ہدایتیں دیتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ لے دے کر اس کا ذکر روایتوں میں آتا ہے مگر یہ روایتیں بھی اس پایہ کی ہیں کہ طبقۂ اولیٰ کی کتب احادیث میں سے کسی ایک کے اندر بھی وہ بار نہ پا سکیں، نہ امام بخاری نے ان کو درخور اعتنا سمجھا، نہ امام مسلم نے، نہ امام مالکؒ نے۔ صرف بعد کے مصنفین کی کتابوں میں یہ دکھائی پڑتی ہیں۔ لیکن جب ان کو محدثانہ معیار تحقیق پر رکھ کر پرکھا جاتا ہے تو ایک روایت بھی کھری ثابت نہیں ہوتی اور ان کے اکثر و بیشتر راوی شیعہ نکلتے ہیں۔ روایت کے الفاظ پر نگاہ ڈالیے تو ان میں صاف طور پر شیعوں کے مخصوص عقائد اور خیالات کی روح جھلکتی نظر آتی ہے۔ یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر علمائے محققین کا ایک گروہ ان احادیث کو افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں دیتا۔

نرالی منطق لیکن اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ یہ احادیث موضوع نہیں ہیں اور فی الواقع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہور مہدی کی پیشنگوئی کی ہے تو سوال یہ ہے کہ اس کو اقامت دین کے فریضہ سے کیا تعلق؟ اس سے زیادہ سے زیادہ جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ اتنی ہی تو ہے کہ اس دنیا کا نظام فنا ہونے سے پہلے ایک دور مبارک آئے گا جب سطح زمین کے ایک ایک گوشہ سے ظلم اور فساد مٹ جائے گا، دنیا عدل سے بھر جائے گی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کی طرح کی "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" ہفت اقلیم میں قائم ہو جائے گی۔ لیکن اس سے کس طرح لازم آگیا کہ بیچ کے زمانوں کے لیے ساری دنیا پر کفر و طاغوت کی فرماں روائی مقدر ہو چکی ہے؟ اس میں تو کوئی دور کا بھی

اشارہ اس امر کا موجود نہیں ہے کہ خلافت راشدہ کے اختتام سے لے کر ظہور مہدی تک زمین کے کسی بھی خطہ پر اللہ کا دین قائم نہ ہوگا۔ بلکہ اس کے خلاف اس کی تاریخ گواہ ہے کہ خلافت راشدہ کے ختم ہونے کے ستر برس بعد ہی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ہاتھوں مملکت اسلام میں قریب قریب وہی بہار سعادت پھر آگئی جو خیر القرون میں تھی۔ اور اس دور کو بھی خلافت راشدہ کا دور تسلیم کیا گیا۔ اس کے علاوہ جس پایہ کی ظہور مہدی والی روایات ہیں اسی پایہ کی دوسری روایات ایسی بھی ملتی ہیں جن میں صراحت کے ساتھ یہ پیشگوئیاں کی گئی ہیں کہ مہدی موعود کے علاوہ اور ان سے پہلے اور بھی علمبرداران قیام دین اٹھیں گے جن کی حمایت و نصرت مسلمانوں پر واجب ہے۔ مثال کے طور پر دو روایتیں ذکر کی جاتی ہیں:-

(۱) اذا رأیتم الرایات السود قد جاءت من قبل خراسان فأتوها ولو حبوا علی الثلج فان فیها خلیفۃ اللہ المھدی

جب تم یہ دیکھو کہ خراسان کی طرف سے سیاہ نشانات آرہے ہیں تو وہاں پہنچنا۔ اگرچہ تمہیں برف کے اوپر گھسٹ کر ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ اس لیے کہ ان نشانات کے اندر اللہ کا مہدی یا خلیفہ ہوگا۔

(۲) یخرج رجل من وراء النھر یقال لہ الحارث حراث علی مقدمتہ رجل یقال لہ منصور یمکن لآل محمد کما مکنت قریش لرسول اللہ وجب علی کل مسلم نصرہ (ابوداؤد)

ماوراء النہر سے "حارث حراث" نامی ایک شخص نکلے گا جس کا پیش رو "منصور" نامی ایک آدمی ہوگا۔ وہ آل محمد کے لیے قوت و اقتدار پیدا کرے گا جس طرح کہ قریش نے رسول اللہ کے لیے کیا۔ اس کی مدد کرنی ہر مسلمان پر واجب ہے۔

یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان روایتوں میں جن اشخاص کے ظہور کی خبر دی گئی ہے ان سب سے مراد ایک ہی شخص یعنی وہی مہدی موعود ہیں کیونکہ مہدی موعود کا ظہور حسب بیان روایت مدینہ منورہ سے ہوگا نہ کہ ماوراء النہر یا خراسان سے۔ اسی طرح ان کا نام آنحضرت صلعم کے نام پر ہوگا نہ کہ "حارث حراث" نیز یہ کہ وہ اہل عرب کے جلو میں نکلیں گے نہ کہ خراسانی یا تورانی افواج کے ساتھ۔ پھر یہ غلط فہمی بھی نہ ہونی چاہیے کہ ان روایات میں ان کا حصر ہو گیا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام داعیان حق کی فہرست گنا دی ہے جو قیامت تک اقامت دین کا علم لے کر اٹھنے والے ہیں۔ بلکہ ان روایتوں میں، بشرطیکہ وہ صحیح ہوں، صرف بعض افراد (اور افواج) کا ذکر آیا ہے اور مقصود اس امر کی تاکید ہے کہ جب کبھی بھی ایسے مواقع پیش آئیں تو ہر مومن کا فرض ہو جائے گا کہ خدا کی راہ میں اپنے آپ کو پیش کرے۔

پس ان روایات میں نہ صرف یہ کہ مہدی موعود کے ماسوا بھی حق کے مجاہدوں اور دین قیم کو زندہ و پائندہ کرنے والوں کی آمد کی بشارت سنائی گئی ہے بلکہ ہر مسلمان پر واجب گردانا گیا ہے کہ سر کے بل بھی چلنا پڑے تو چل کر ان دعاۃ حق کے پاس پہنچے اور ان کی اعانت و اطاعت میں جان کی بازی لگا دے۔ اس طرح ان اوہام کی جڑ کٹ جاتی ہے جو مہدی موعود کے نام سے پیدا کر لیے گئے ہیں۔

پھر قطع نظر ان روایات کے، اصل سوال تو فرض زندگی کا ہے۔ جب یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اقامت دین کا فریضہ ہر مسلمان کی زندگی کا مقصد ہے اور اس کی خاطر جد و جہد کرنا اس کے ایمان کا معیار و مظہر ہے اور جب مومن کی عین فطرت ہی یہ قرار دی گئی ہے کہ وہ باطل اور منکر کو جینے کا حق نہیں دینا چاہتی خواہ وہ دنیا کے کسی بھی گوشہ میں موجود ہو اور جب اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اتباع قرآن کے عہد کا سب سے پہلا اور سب سے آخری مطالبہ ہی یہ ہے کہ انسان کا پائے سعی و جہد اس وقت تک نہ تھمے جب تک کہ دین الٰہی کی ایک

دفعہ بھی معطل ہے۔ اور زمین کا ایک ذرہ بھی باطل کے پاؤں تلے دبا ہے تو ہر مومن کو یہ جہد و جہاد لازماً کرنی پڑے گی اور ہر حال، ہر دور، ہر ماحول، اور ہر جگہ کرنی پڑے گی۔ امام مہدی اگر آئیں گے تو وہ اپنا فرض ادا کریں گے نہ کہ میرا اور آپ کا۔ ان کی تمام دوڑ دھوپ اپنے اس بوجھ کو سر سے اتارنے کے لیے ہوگی جو اللہ رب العالمین کی طرف سے ان پر ڈالا گیا ہوگا۔ ان کا کوئی فعل کسی بھی مدعی اسلام کے ادائے فرض کا قائم مقام نہ ہوگا۔ نہ تو وہ کسی دوسرے کے بدلے نماز پڑھیں گے نہ روزے رکھیں گے اور نہ حج ادا کریں گے اور نہ قتال کریں گے۔ آج جو ان کی مساعی پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں جبکہ ان کا وجود اس عالم [illegible] اور دنیا [illegible] ہر گز بھی [illegible] آیا ہے [illegible] کیجیے کہ [illegible] اس وقت تک بھی کوئی مسلمان ان کے عوض تلوار نہ چلائیں گے جو ان کے زمانہ میں موجود ہوں گے۔ اس وقت بھی ہر مسلمان کو اپنا اپنا فرض ٹھیک اسی طرح ادا کرنا ہوگا جس طرح [illegible] حضرت مسیح کے لفظوں میں [illegible] خود [illegible] ظاہر ہے کہ "آسمانی بادشاہت" میں داخل نہ ہو سکے گا۔ اس لیے ہر مسلمان کو یہ دعا اور یہ آرزو و فکر کرنی چاہیے [illegible] نصب العین ہو جب امام مہدی اپنی تمام برکتوں کے ساتھ ظہور فرما ہوں گے اور ظلم و فساد سے بھری ہوئی دنیا عدل و قسط کی رحمتوں سے مالا مال ہو جائے گی مگر ایک بحث یہ بھی ہے [illegible] انتظار کیا جا رہا ہے۔ حضرت موصوف کے صادق ہیں اب سارے مسلمان زندگی کی ذمہ داری [illegible] اقامت دین کی [illegible] سبکدوش [illegible] ہیں جس طرح عیسائی حضرات اس خوش گمانی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ [illegible] نے سولی پر چڑھ کر [illegible] بے نیاز کر دیا ہے۔

احتساب نفس کی ضرورت

اقامت دین کے بارے میں [illegible] مختلف گروہ ہیں ہم نے کوشش کی ہے کہ ان میں سے ہر گروہ کے خیالات اور دلائل کو بیان کر کے ان کی غلطی واضح کی جائے۔ توقع ہے کہ ان [illegible] ٹھنڈے دل سے اور حق طلبی کے جذبات کے ساتھ غور کیا جائے گا اور [illegible] گروہی، سیاسی اور تقلیدی تعصبات سے بالاتر ہو کر خالص علمی نقطۂ نظر سے اپنے مشاغل زندگی کا جائزہ لیا جائے گا۔ [illegible] اس پر کسی غیر مانوس [illegible] مطلوب حقیقت کا سامنا [illegible] تیر تک استعمال کر ڈالتا ہے جو اس سے قربانیوں کی طلب گار ہو۔ صرف جان اور مال ہی کی قربانیاں نہیں بلکہ جذبات کی بھی، پندار علم و فکر کی بھی، سابق طرز عمل کی محبت اور عصبیت کی بھی۔ بسا اوقات ان چیزوں کی قربانیاں جان و مال کی قربانیوں سے بھی زیادہ دشوار ہوتی ہیں۔ ادھر سے [illegible] اور دل [illegible] ادھر نفس کے حیلے اور دھوکے اٹھتے ہیں اور انسان سے پوچھتے ہیں کہ کیا اب تک کی تیری ساری تگ و دو باطل کی راہ میں تھی؟ کیا زمانہ کے اقطاب و ابدال اور وقت کے مراکز علم و دانش جن منزلوں کی طرف جا رہے ہیں وہ سب کی سب غلط ہیں؟ یہ سوالات نفس کی تحریکوں سے اتنے مسلح اور اتنے جذبات انگیز ہوتے ہیں کہ انسان ان سے مسحور ہوئے بغیر نہیں رہتا اور ایک چیز کو حق سمجھنے کے باوجود اسے حق نہیں مانتا۔ یہ نفس انسانی کی وہی جبلی کمزوری ہے جو ہر دور میں حق کے قبول کرنے سے مانع ہوتی رہی ہے اور ہر نبی کی آواز کے جواب میں بدبخت انسانوں کی زبان سے یہ آواز بلند کراتی رہی ہے کہ:

بَلْ نَتَّبِعُ مَا اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا — ہم تو اسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔

پس نفس کی اس مہلک کمزوری اور دسیسہ کاری سے پوری طرح چوکنے ہو کر اپنے فکر و عمل کا احتساب کرنا چاہیے اور اس

اصول کو کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ حق و باطل کا معیار نہ تو کوئی شخص ہے ___ بجز ایک شخص کے جس کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے اور نہ ہی کوئی جماعت ہے ___ سوا ایک جماعت کے، جس کو دنیا اصحاب محمدؐ کے نام سے پکارتی ہے ___ اس لیے اس سلسلہ میں صرف اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت اور اصحاب رسول کا اسوہ ہی ہمارے سامنے ہونا چاہیے اگر ان چیزوں میں زندگی کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں بتایا گیا ہو کہ اس کا ہر سانس اقامت دین کے ذکر و فکر اور سعی و جہد میں بسر ہونا چاہیے تو پھر اس کے بعد اس کے اعتراف اور امتثال میں نہ تو کسی پیر و مرشد کی ارادت مانع ہونی چاہیے، نہ کسی شیخ و امام کی عقیدت، نہ تو کسی استاذ کا تلمذ اس ادائے فرض سے باز رکھنے کا حق رکھتا ہے اور نہ کسی جماعت کا تعصب۔ نہ کسی دیرینہ روش کی حمیت کو اس راہ میں آڑے آنا چاہیے نہ کسی فکر سابق کی عصبیت کو۔ کہ یہ سب چیزیں نفس کے حجابات اور شیطان کے فتنے ہیں اور قدرت نے ان کو انسان کے گوش و چشم پر صرف اس لیے پھیلا دیا ہے تاکہ اس کی حق پرستی کی آزمائش ہو۔ مبارک ہے وہ بندہ جو ان حجابوں کو چاک کر کے اور ان فتنوں کو کچل کر اپنے فرض کی پکار پر حرکت میں آجائے، ورنہ یاد رہے کہ اپنے ذاتی رجحانات کی پچ میں یا اپنے ہاعتی افکار و مشاغل کی حمایت و عصبیت میں یا بزرگوں کی تقلید میں اس سے گریز کرنا اپنے آپ کو دانستہ نذر ہلاکت کرنا ہے، کسی بزرگ کا طرز عمل ہم کو خدا کی گرفت سے بچا نہیں سکتا۔ جب تک یہ راز حق دل پر نہ کھلا ہو، انسان کسی حد تک تو معذور تصور کیا جا سکتا ہے مگر جب حقیقت بے حجاب نظر آگئی اور دل نے اس کی صداقت کا اعتراف کر لیا تو بس یوں سمجھیے کہ اللہ کی حجت تمام ہو گئی۔ اس وقت اعتذار کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں، اب آگے یا تو آمادگی عمل اور کامرانی حیات ہے یا پھر انکار فرض و حصول نامرادی۔ کیونکہ حق کو حق سمجھ لینے کے بعد اس سے انکار اور اعراض کرنا اس سنت فرعونی کی پیروی کرنا ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ:-

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا	جب فرعون اور اس کے پیروؤں کے سامنے ہماری نشانیاں بالکل کھلے طور پر آئیں تو انھوں نے کہا یہ تو زرا جادو ہے۔ اور باوجود اس کے کہ ان کے دل ان نشانیوں کی صداقت پر یقین رکھتے تھے انھوں نے ظلم اور سرکشی کی بنا پر ان کو ماننے سے انکار کر دیا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کتنے ہی لوگ اس سنت کے پیرو ہیں اور ___ "ظلم و علو" نہ سہی ___ گروہ پرستی اور اکابر پرستی کے باعث جَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ کے مرض میں مبتلا ہیں۔ کاش اس مرض کی خطرناکی کا احساس کیا جاتا اور جو راہ اللہ نے ان پر کھول دی ہے اس پر چلنے سے کوئی تعلق مانع نہ ہوتا، ورنہ ہمیں خطرہ ہے کہ یہ اعتراف حق ان کے جرم کو کچھ ہلکا کرنے کے بجائے الٹا سخت کر دیگا۔

آخری گذارش | ابتدائے بحث سے لے کر یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا اس کا مدعا صرف یہ ہے کہ امت مسلمہ نے جس نصب العین کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لی ہے اس کا حق ادا کرے، جن اصولوں پر اس کے وجود کی بنا رکھی گئی ہے، ان کو از سر نو اپنا مرکز عمل بنائے اور حالات زمانہ، مشکلات ماحول اور مصالح وقت سے صرف نظر کر کے، نیز نفس و شیطان کے اختراع کیے ہوئے حیلوں اور وسوسوں سے دل و دماغ پاک کر کے، اپنے چھوڑے ہوئے فرض زندگی کو سرانجام دینے میں لگ جائے۔ بلاشبہ بڑی کٹھن راہ ہے اور اس کا ہر قدم کانٹوں سے بھرا ہوا ہے مگر رضائے حق کی بارگاہ تک جانے والی اس کے سوا کوئی دوسری راہ نہیں۔ مقصد حیات کی اس توضیح اور تبلیغ کے بعد آخری گذارش یہ ہے کہ جن لوگوں کے تلوے ان کانٹوں کا خیر مقدم کرنے کی ہمت نہیں رکھتے ان کے لیے آخری چارۂ کار جس کو برداشت کیا جا سکتا ہے، یہ ہے کہ وہ جہاں ہیں وہیں قدم روکے کھڑے رہیں اور کم از کم

دوسرے پوچھنے والوں کو تو یہ ضرور بتا دیں کہ گو ہم میں اس راہ دشوار گذار کو طے کرنے کی ہمت نہیں مگر حق اور نجات کی شاہراہ یہی ہے۔ بس یہ تاکہ کل اللہ تعالیٰ کے روبرو ترک فرض کے ساتھ ساتھ کتمان حق کے جرم میں بھی ماخوذ ہوں۔ اور اگر بدقسمتی سے یہ بھی ممکن نہ ہو تو اپنے قدموں کی طرح اپنی زبانوں کو بھی روکے رہیں مگر خدارا دوسروں کو اس راہ سے روکنے کا بوجھ اپنی گردن پر نہ لیں۔ یہ "صد عن السبیل" کی وہ لعنت ہے جس کے تصور ہی سے ایک مسلمان کے رونگٹے کھڑے ہو جانے چاہئیں۔ یہ بعینہٖ وہی روش ہے جو سیدنا مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں اشقیائے یہود نے اختیار کی تھی اور جس کے جواب میں حضرت مسیحؑ نے فرمایا تھا:

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو۔ نہ آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔"

خدا نہ کرے کہ کوئی مسلمان اس حد تک آپ اپنی دشمنی پر کمربستہ ہو جائے اور خود تو اقامت دین کی جدوجہد سے جی چراتا ہی ہے، اوروں کو بھی اس سے باز رکھنے کا موجب بنے۔

اقامت دین کے اصول و مناہج

جب یہ بات واضح ہو چکی کہ ہماری زندگی کا نصب العین بہر حال اللہ کے دین کو قائم کرنا ہے تو اب ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس نصب العین کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟ آیا اس کا کوئی مخصوص طریق کار ہے یا جس سمت سے چاہیں اس گول کی طرف بڑھ سکتے ہیں؟ سو جن لوگوں نے اجتماعیات کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہوگا، ان کے لیے یہ معلوم کر لینا چنداں دشوار نہیں کہ ہر جماعت کا جو کسی خاص مقصد کو لے کر اٹھی ہو، جس طرح ایک مخصوص طریق فکر اور زاویۂ نگاہ ہوتا ہے اسی طرح اس کی تاسیس، تعمیر اور تنظیم کا انداز بھی مخصوص ہوتا ہے۔ اس طریق فکر، اس زاویۂ نگاہ اور اس انداز تعمیر کی تعیین وہی مقصد کرتا ہے جس کو لے کر یہ جماعت اٹھی ہے۔ مثلاً اگر آپ کو ایک نیشنل اسٹیٹ قائم کرنا ہو تو اس کے لیے ضرورت ہے کہ آپ اپنے مخاطبین کے دلوں کو وطن اور قوم کے عشق اور احترام سے معمور کریں۔ اپنے اوپر آپ حکمراں ہونے کا عقیدہ اور عزم پیدا کریں، پھر قومی ناموس کی قربان گاہ پر نثار ہو جانے کے لیے ان کے اندر سرفروشی کے جذبات پیدا کریں۔ جب یہ سب آپ کر لیں گے اور اس طرح کے آدمی آپ کے اردگرد جمع ہو جائیں گے تو سمجھیے کامیابی کی تمام شرطیں آپ نے پوری کر لیں۔ آپ کو یہ دیکھنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں کہ میرے جھنڈے کے نیچے جو لوگ جمع ہیں وہ توحید کے متعلق، رسالت کے متعلق اور قیامت و جزائے عمل کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟ ان کے اندر مذہب کی پابندی کتنی ہے؟ انھوں نے احسان و تقویٰ، عدل و انصاف، رحم و مروت، عفت و پاکدامنی، جود و سخاوت وغیرہ اوصاف سے اپنے کو کہاں تک آراستہ کر لیا ہے؟ ان میں سے کسی چیز کو دیکھنے کی حاجت نہیں، کیونکہ جو مقصد اور نصب العین آپ کے سامنے ہے، اس کے لیے یہ چیزیں سرے سے مطلوب ہی نہیں، بلکہ شاید کچھ مضر ہی ہوں، یہاں تو جو شے مطلوب ہے وہ صرف حریف کی غیر مشروط عداوت و مخالفت اور قوم، قومی اقتدار، قومی وقار اور قومی عروج کی انتہائی شیفتگی اور فدا کاری ہے۔

اسی طرح اگر آپ ایک ملک میں کمیونزم کا اقتدار اور کمیونسٹ نظام قائم کرنا چاہتے ہوں تو آپ کو پہلے وہاں کے باشندوں کے ذہنوں میں کمیونسٹ فلسفۂ زندگی، کمیونسٹ نظام معیشت و حکومت اور کمیونسٹ نظریہ اخلاق کی خوبیاں اتارنی ہوں گی، سرمایہ داری کے

خلاف ورزی بھی [illegible] نفرت سی اگر پیدا ہوگئی ہو، اور [illegible] کے ساتھ وہ عقیدت پیدا کرنی ہوگی جو خدا اور پیغمبر کے لیے اہل مذہب کے دلوں میں ہوا کرتی ہے۔ [illegible] خدا، رسول، مذہب، آخرت، اخلاق اور اعمال صالحہ کے الفاظ کو خود غرض سرمایہ پرستوں کے ہتھکنڈے قرار دے کر ان کے نقوش ارادت کو ذہنوں سے مٹا کر محض مادی تصورات اور حیوانی تصور کائنات ان پر ثبت کرنا ہوگا۔ پھر جب آپ یہ بنیاد بنا لیں گے اور یہ بنیادیں [illegible] معقول تعداد میں لوگوں کو اپنا گروہ بنا لیں گے تو ان سب کو ایک جتھے میں منظم کر کے ایک طاقت بنائیں گے [illegible] کے زور سے مسحور کرنے کی جدوجہد جاری رکھیں گے اور دوسری طرف خفیہ [illegible] ذرائع سے موجودہ نظام حکومت کے تختے کو الٹنے کی مہم شروع کر دیں گے تاآنکہ عوام کے ہاتھوں پر تخت الٹ کر اشتراکی حکومت قائم ہو جائے۔

علیٰ ہذا القیاس [illegible] نظم [illegible] جو [illegible] اپنے لوازم [illegible] کرے گا [illegible] ان کے دل اور دماغ [illegible] رکھتے ہوں [illegible] جو [illegible] ہوں [illegible] بزدل، نرم دل، اور غارت گری و خونریزی سے متنفر ہوں۔ پھر اپنے مقصد کے مطابق لوگوں کو [illegible] مطلوب [illegible] استحکام پیدا کرنے کی تدبیر [illegible] کرے گا۔ لوٹ مار کے ذریعے [illegible] ایسی مہم کا آغاز کر سکے گا۔

غرض دنیا کا ہر [illegible] مقصد [illegible] یہی حال ہے [illegible] اپنے اندر جگہ دیتی ہے جو اس کے پیش نظر مقصد سے تعلق [illegible] اور [illegible] پالیسیاں اختیار کرتی ہے جو اس مقصد کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں [illegible] یہ مقصد بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بھی ایک خاص طریق کار ہونا چاہیے [illegible] ۔

اس وضاحت سے جب ہماری [illegible] فطرۃً قرآن اور سنت ہی پر جا کر ٹھہرتی ہے۔ اور جب واپس لوٹتی ہے تو طمانیت کی ٹھنڈک لے کر لوٹتی ہے۔ جس طرح قرآن اور [illegible] قرآن نے اقامت دین کے نصب العین کو پوری تشریح اور وضاحت کے ساتھ [illegible] سامنے رکھ دیا ہے [illegible] اس کے طریق کار کے بارے میں بھی کسی حجاب کو حائل نہیں ہونے دیا ہے بلکہ ایک دیدۂ بینا کو بالخصوص قرآن [illegible] نمایاں نظر آتا ہے جس طرح اندھیری راتوں میں آسمان کے سینہ پر کہکشاں۔ قرآن، قرآن کے لانے والے اور قرآن کے [illegible] اس طریق کار کی طرف رہنمائی کی ہے، ہم کہتے ہیں تو تین الگ الگ وجود ہیں مگر [illegible] مقصد کے اعتبار سے تینوں در اصل ایک ہی ہیں۔

قرآنی اصول و ہدایات | قرآن کو [illegible] پڑھیے اور اس کی تمام تعلیمات کو مجموعی طور پر سامنے رکھیے تو بڑی آسانی اور وضاحت کے ساتھ وہ اصول و نکات [illegible] جن پر اقامت دین کی جدوجہد کی بنا ہونی چاہیے۔ اور یہی اصول و نکات در اصل تعلیمات قرآن کا مغز ہیں [illegible] حقیقت سارے قرآن کا [illegible] مرکزی [illegible] مقصد اقامت دین ——— ہے اور اس کی ساری تفصیلات اسی مقصد کے اصول کی شرح ہیں۔ لیکن [illegible] حقیقت [illegible] اس مغز کو حاصل کرنے کے لیے قرآن کے چشمہ حیوان کو اچھی طرح متھنے کی ضرورت ہے، جس کے لیے [illegible] وقت درکار ہے، اس لیے ہم اس وقت پر قرآن کی صرف ان آیتوں کی طرف توجہ دلائیں گے جو مسلسل ایک ہی رکوع میں درج ہیں اور ہمارے مبحث کے لحاظ سے گویا پورے قرآن کا خلاصہ ہیں یعنی اقامت دین کے جو اصول نکا[illegible]

قرآن کے سیکڑوں صفحات میں پھیلا کر بیان کیے گئے ہیں وہ یہاں چند سطروں میں سمیٹ دیے گئے ہیں۔ یہ آیتیں اقامت دین کے طریق کار کے نہ صرف عملی اصولوں ہی کی وضاحت کرتی ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ان اصولوں کی ترتیب اور اس نصب العین کے فطری ارتقاء کے تدریجی ادوار و منازل کی نشاندہی بھی کرتی ہیں، اس لیے ان آیتوں کو ایک بار ترتیب کے ساتھ پڑھ لیجیے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ...... وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ...

(آل عمران ۱۰۲)

اے ایمان لانے والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ تقویٰ کا حق ہے اور تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔ اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور ٹولی ٹولی نہ ہو جاؤ۔ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو تم پر ہوا ہے، جب کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دل باہم جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی ہو گئے ...... اور چاہیے کہ تم میں کچھ گروہ ہوں جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکتا رہے ایسے ہی لوگ فلاح یاب ہوں گے اور (دیکھو) کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو واضح ہدایتیں پانے کے باوجود ٹولیوں میں بٹ گئے اور اختلافات میں مبتلا ہو گئے۔

ان آیات کا زمانہ نزول مدینہ کی ابتدائی زندگی یعنی ۲ھ یا ۳ھ ہے، یہ وہ زمانہ ہے جب امت مسلمہ کی اجتماعی اور سیاسی زندگی تاسیس و تعمیر کے ابتدائی مرحلوں سے گزر رہی تھی۔ عین اس زمانہ میں یہ آیات کریمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اقامت دین اور نظام مومنین کا ایک مختصر مگر جامع ربانی پروگرام لے کر آئیں، اس ربانی پروگرام پر غور کیجیے تو بالترتیب اس کے حسب ذیل بنیادی تین نکات نظر آتے ہیں :-

(۱) التزام تقویٰ (۲) اعتصام بحبل اللہ (۳) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔

ان نکات سہ گانہ کو تفصیل کی روشنی میں دیکھیے :-

(۱) التزام تقویٰ

پہلی چیز جو اقامت دین کے سلسلہ میں مطلوب ہے۔ اور جس کو اس قصر کا سنگ بنیاد بننا چاہیے اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ہے۔ یعنی ہر وہ فرد جو ایمان کا مدعی ہو، جو اس فرض کو ادا کر کے اپنے سر سے بندگی کا ذمہ اتارنا چاہتا ہو، اس کے لیے یہ لازم ہے کہ اللہ کا "تقویٰ" اختیار کرے اور تادم واپسیں، ہر آن اور ہر لمحہ، ایک مسلم کی طرح زندگی بسر کرے تقویٰ کا مفہوم، جو قرآن نے متعین کیا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا ٹھیک ٹھیک اتباع کیا جائے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اس نے جو حدیں قائم کر دی ہیں ان کی پاسداری کی جائے۔ اس کے کسی امر کی عدم تعمیل سے بھی ڈرا جائے اور کسی نہی کے ارتکاب سے بھی خوف کھایا جائے۔ اور مسلم کے معنی ہیں فرمانبردار اور اطاعت کیش کے۔ یعنی وہ شخص جس نے اوامر الٰہی کے سامنے رضاکارانہ اپنی گردن جھکا دی ہو۔ تو گویا اقامت دین کے پروگرام کا پہلا نکتہ یہ ہوا کہ انسان سب سے پہلے خود اپنے اوپر اللہ کے دین کو قائم کرے، خوف و رجا کی ساری نیازمندیاں بس اسی ایک ذات کے لیے مخصوص کر دے اور تسلیم و تعظیم اور تذلل و تواضع کے تمام جذبات اسی کی رضا جوئی میں نثار کر دے، تمام اطاعتوں سے منہ موڑ کر اسی ایک آقا کی اطاعت کا حلقہ اپنی گردن میں ڈال لے۔

اپنے نفس کو ان تمام رذائل سے پاک کرے جو ناخوشنودی رب کے موجب بنتے ہیں اور ان تمام محاسن سے آراستہ کرے جو رضائے الٰہی کے باعث ہیں۔ اپنے کو اللہ تعالیٰ کا ہمہ وقتی غلام سمجھتا رہے اور اس کے کسی حکم کی بجا آوری میں نہ تو لیت و لعل کرے اور نہ دل تنگ ہو۔ حق نگاہ کو رضائے حق اور امتثال امر رب پر پوری طرح جمائے رکھے خواہ کتنی ہی مخالفتیں، مصیبتیں، ناسازگاریاں اور دل شکنیاں اس کی راہ میں کیوں نہ حائل ہوں کہ دراصل یہ چیزیں مشکلات و مصائب نہیں ہیں بلکہ اتباع حق اور التزام تقویٰ کی وہ امتحان گاہیں ہیں جن سے گزرے بغیر کسی مدعی ایمان کا ایمان و تقا خدا کے ہاں سند اعتبار اور شرف قبول نہیں حاصل کرتا۔ جیسا کہ قرآن کا فیصلہ ہے:-

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الخ (البقرہ - ۱۹)

ہم ضرور تم کو (یعنی تمہارے اور ماننے ایمان کو) خطروں اور فاقوں اور تمہارے مال و جان اور پیداوار کے نقصانوں کے ذریعہ آزمائیں گے۔ اور اے نبی! ان لوگوں کو کامرانی کا مژدہ سنا دو جو ان خطرات و نقصانات کو صبر و ضبط سے برداشت کریں۔

أَحَسِبَ النَّاسُ أَن يُتْرَكُوا أَن يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ (عنکبوت - ۱)

کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہہ دینے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور انھیں پرکھا نہ جائے گا؟ حالانکہ (یہ آزمائش ہماری ہمیشہ کی سنت ہے اور) ہم نے ان سے پہلے بھی لوگوں کو پرکھا ہے۔ سو یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ یہ ضرور دیکھے گا کہ تم میں سے کون سچے ہیں اور کون جھوٹے۔

پس ان چیزوں سے گھبرانے کے بجائے ان کا خوش دلی کے ساتھ خیر مقدم کرنا چاہیے ورنہ وہ دل ایمان کا لذت شناس نہیں ہو سکتا جو ان عوائق کے آگے سپر ڈال دے اور وہ سینہ تقویٰ کے نور سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتا جو اس آزمائش کی ہمت نہ رکھتا ہو۔ ہر ت وہ سکے میں ہوگا وہ شخص جو حدود اللہ کی پاسداری اور احکام قرآنی کی پیروی میں اپنے جانی اور مالی، گروہی و طبقاتی، قومی اور وطنی مفادات کا بیاد پہلے کر لینے کی فکر کرے اور اتباع حق کو جان و مال کی کامل حفاظت کے ساتھ مشروط رکھتا ہو۔ ایسے شخص کی زبان پر اسلام، اور اس کی شکل و صورت میں تقویٰ تو ہو سکتا ہے مگر اس کا باطن ان طائران قدس کا آشیانہ نہیں بن سکتا۔ غرض ابتلائے مومنین اللہ تعالیٰ کی ایک عام سنت ہے، اور اسی سنت کو پوری کرنے کے لیے اس نے اسلام اور تقا کا راستہ مشکلات اور مصائب کی چٹانوں سے بھر رکھا ہے اس لیے جو شخص اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ کے فرمان الٰہی کی تعمیل کرنا چاہتا ہو اس کو ان چٹانوں سے ٹکرانا اور ان کی ٹھوکریں برداشت کرنا ناگزیر ہے۔

(۲) اتحاد و تنظیم اس پروگرام کی دوسری دفعہ یا دوسرا نکتہ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا کے الفاظ میں بیان ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام اہل ایمان جو اپنی انفرادی اصلاح و تزکیہ میں کوشاں اور احکام الٰہی و حدود خداوندی کی پابندی میں سرگرم عمل ہوں، مل کر ایک مضبوط اور منظم جماعت بن جائیں۔ اور ان کو باہم جوڑنے اور متحد کرنے والی چیز نہ تو کوئی نسلی رشتہ ہو، نہ کوئی وطنی مفاد۔ نہ کوئی معاشی و سیاسی غرض ہو۔ نہ کوئی دنیوی اور مادی مقصد، بلکہ صرف اللہ کی "رسی" یعنی وہ کتاب ہو جس کو قرآن کہا جاتا ہے، وہ شریعت ہو جس کی پیروی کا ہر مومن نے عہد کیا ہے، وہ دین ہو جس کی اطاعت و اقامت کے لیے بندگان خدا کی آفرینش ہوئی ہے۔ پس یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ اسلام کے نزدیک نفس اتحاد ہی کوئی مطلوب و محبوب شے ہے۔ اگر اتحاد کی بنیاد کسی فاسد مقصد پر رکھی گئی ہو تو نہ صرف یہ کہ وہ اسلام کو مطلوب نہیں بلکہ اس کی نظروں میں وہ صد درجہ مردود و مبغوض ہے اور

اس اتحاد سے بال برابر بھی مختلف نہیں جو چوروں اور ڈاکوؤں کے مابین ہوا کرتا ہے۔ اسلام کا مطالبہ اس اتحاد و ائتلاف کا ہے جس کا شیرازہ اتباعِ حق اور اقامتِ حق ہو۔

اقامتِ دین کا یہ نکتہ یعنی اتحادِ امت، اگر ذرا غور کیجیے تو، پہلے نکتہ سے کوئی بالکل الگ اور متغائر شئے نہیں ہے بلکہ اسی کا ایک فطری تقاضا ہے۔ ایک طالب علم کو اس کی اپنی طبیعت مجبور کرتی ہے کہ اپنے رفقائے درس سے بے تکلفی، دل بستگی اور الفت و محبت رکھے۔ ایک صاحب علم کی فطرت چاہتی ہے کہ اربابِ علم و دانش کی ہم نشینی اختیار کرے۔ ایک رنگین طبع اپنے جیسے رنگین مزاجوں کی طرف کھنچ اٹھنے سے اپنے آپ کو روک نہیں سکتا اور اگر کسی طالب علم کو اپنے رفقا سے، کسی صاحب علم کو علما و افاضل سے، کسی رنگین مزاج کو اپنے ہم مشربوں سے کوئی گہری وابستگی نہ ہو تو یقین کرنا چاہیے کہ وہ صحیح معنوں میں طالب علم، صاحب علم اور رنگین طبع نہیں ہے۔ یہی وہ کشش ہے جس کو عام اصطلاح میں جاذبۂ جنسیت کہا جاتا ہے اور یہی جاذبۂ جنسیت اہل تقویٰ کے درمیان بھی اپنا کام کرتا ہے۔ ایک وہ انسان جو خدا پرستی اور اتباعِ احکام قرآنی کے جذبات سے سرشار ہو، لازمی طور پر ان لوگوں کی طرف کھنچے گا جو اسی کی طرح اتباعِ حق اور تقویٰ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ دونوں میں خدا کا حقیقی تقویٰ موجود ہو لیکن وہ آپس میں کٹے ہوئے ہوں۔ ان میں جذب و انجذاب لازمی ہے، اور اگر ایسا نہ ہو تو سمجھنا چاہیے کہ تقویٰ کی صورت میں اندر کوئی دوسری ہی روح پرورش پا رہی ہے۔ ایک ہی منزل اور ایک ہی راہ کے دو مسافر ایک دوسرے کے غیر بن کر نہیں رہ سکتے۔ یہی راز ہے جو آپ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعریف کہیں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ کے الفاظ سے کی گئی ہے اور کہیں رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ ان کی علامت فارقہ بتلائی گئی ہے کہیں اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ان کا نشانِ امتیاز ٹھہرایا گیا ہے۔ گویا اسلام کے مدعیوں اور پیروؤں کا باہم جڑ کر رہنا ان کے ایمان اور اتقا کی کسوٹی ہے۔ پھر دوسری طرف اس رنگ وحدت کو برقرار اور شوخ سے شوخ تر کرنے کے لیے منفی پہلو سے بھی اس پر روشنی ڈال دی گئی ہے اور تصریح کے ساتھ تمام اہل ایمان کو متنبہ کر دیا گیا ہے کہ:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَاۗءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَاۗءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَي الْاِيْمَانِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (توبہ۔ ۳)

اے ایمان لانے والو! اگر تمھارے باپ اور بھائی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو ترجیح دیں تو ان کو اپنا ولی نہ بناؤ اور جو ان کو اپنا ولی بنائیں گے تو وہی ظالم ہوں گے۔

معلوم ہوا کہ جس طرح ایک سچا مومن اور متقی، دیگر اتقیا اور صالحین سے بُعد اور کشیدگی نہیں رکھ سکتا خواہ وہ اس کے بیگانے ہی کیوں نہ ہوں، اسی طرح وہ فساق و فجار سے رابطۂ قلبی بھی نہیں رکھ سکتا خواہ وہ اس کے یگانے ہی کیوں نہ ہوں۔ قرآن اس امکان کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں:۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَاۗدُّوْنَ مَنْ حَاۗدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَاۗءَهُمْ اَوْ اَبْنَاۗءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ (مجادلہ۔ ۳)

تم کسی ایسے گروہ کو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو ان لوگوں سے الفت و مودت کا رشتہ رکھتا ہوا نہ پاؤ گے جو اللہ اور اس کے رسول کی عداوت اور مخالفت پر کمربستہ ہوں خواہ وہ اس کے اپنے ہی باپ بیٹے یا بھائی یا اہل خاندان کیوں نہ ہوں۔

غرض ایک اصول اور نصب العین کی علمبردار پارٹی جس طرح اپنے ارکان کو ڈسپلن کی سخت تا بندشوں میں باندھ کر رکھتی ہے

اسی طرح قرآن نے امت کے تمام رشتوں کو کاٹ کر ایک مرکز سے جڑ جانے کا مطالبہ کیا ہے، چنانچہ یہی بات اس نے اتحاد و اتصال کی تفہیم کے ساتھ بھی واضح کر دی ہے اور کھلے لفظوں میں فرما دیا ہے کہ خبردار ان بدبخت لوگوں کی روش نہ اختیار کرنا جو بینت الٰہی کے نوار رکھتے ہوئے بھی افتراق و تشتت کی تاریکیوں میں کھو گئے (وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ)

(۳) امر بالمعروف و نہی عن المنکر اقامت دین کے پروگرام کی تیسری دفعہ وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ کے ارشاد الٰہی میں واضح کی گئی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ انفرادی طور پر اپنی ذات کے اوپر دین حق قائم کرنے اور پھر ایسے تمام افراد کا باہم جڑ کر ایک جماعت بننے کے ساتھ ساتھ اس "خیر و معروف" کی طرف دوسروں کو بھی بلایا جائے جس کو خود قبول کیا گیا ہے اور اس منکر کو حسب استطاعت اور حسب مواقع کہیں بزور شمشیر کہیں بذریعہ زبان، اور کہیں بواسطۂ انکار قلب، مٹا ڈالنے کی مسلسل سعی جاری رکھی جائے جس کو خود ترک کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ خدا کی زمین کے کسی گوشہ میں اس کے دین کے سوا کسی اور دین کا اثر و اقتدار باقی نہ رہ جائے۔ جس طرح اقامت دین کی دوسری دفعہ یعنی افراد امت کا ارتباط و اتحاد پہلی دفعہ یعنی انفرادی صلاح و تقویٰ کا لازمی تقاضا ہے اسی طرح یہ تیسری دفعہ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ان کا عین مقتضائے فطرت ہے۔ نہ کوئی خارجی اور غیر متعلق اور مختلف المزاج حکم۔ محبت کا فطری مطالبہ ہی یہ ہے کہ گرد و پیش انہی احوال و مناظر کی کارفرمائی ہو جو محبوب کو پسند خاطر ہوں۔ وہ دل سوز محبت سے آشنا نہیں کہا جا سکتا جو محبوب کی مرضی کو پامال ہوتا ہوا دیکھے اور دیکھ کر سیماب وار تڑپ نہ اٹھے۔ اس لیے خدا کی محبت اور حق کی جاذبیت، کہ روح تقویٰ عبارت ہے انہی چیزوں سے۔ ایک خدا پرست اور "متقی و مسلم" کو چین سے بیٹھنے نہیں دے سکتی جب تک کہ صفحۂ ارض پر اس کی نگاہ میں چبھنے کے لیے ایک باطل اور ایک منکر بھی موجود ہو۔ اس کے اسلام اور ایمان کے یہ شے منافی ہے کہ کسی شخص یا گروہ یا ملک کو وہ دین الٰہی کے حلقۂ انقیاد سے آزاد اور طاغوت کا فرمان بردار دیکھے اور ٹھنڈے دل سے اسے برداشت کرے۔ پس اقامت دین کا فرض ادا نہیں ہو سکتا جب تک کہ پیروان دین حنیف کی جمعیت امر بالمعروف کے فرض کو سرانجام نہ دے رہی ہو۔ اور اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ کی منزل طے نہیں ہو سکتی اگر اہل ایمان خود اتباع احکام الٰہی کرنے ہی پر اکتفا کریں اور ان کو اس سے کوئی بحث نہ ہو کہ باقی دنیا کدھر جا رہی ہے۔

اس اقتضائے ایمانی کے علاوہ امر بالمعروف کی ایک خالص سیاسی ضرورت بھی ہے۔ فطرت کا یہ ایک اٹل قانون ہے کہ وہی زندہ رہتا ہے جو اقدام کی عملی جرات رکھتا ہو، بقا اور ارتقا صرف جارحانہ پیش قدمی میں ہے۔ زبردست سے زبردست لشکر بھی اپنے آپ کو شکست کی ذلت سے نہیں بچا سکتا اگر وہ دشمن کے خلاف جارحانہ حملے کرنا نہ جانتا ہو۔ کوئی تحریک زوال و انحطاط کے انجام سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی اگر وہ اپنی داخلی تعمیر و تنظیم کے ساتھ ساتھ اپنے بیرونی ماحول کی تسخیر کی مہم سے غافل ہو۔ اسی طرح وہ جماعت جو اللہ کے دین کی علمبردار ہو، اس وقت تک زندگی اور پایندگی کی مستحق نہیں ہو سکتی، نہ ہی اس کے اپنے اوپر دین کا قیام باقی اور مستحکم رہ سکتا ہے، جب تک کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اسلحوں سے طاغوتی مورچوں پر مسلسل جارحانہ حملے نہ کرتی رہے۔ جس طرح ایک جاندار کا جسم محنت و مشقت کے بعد اپنے بعض اجزا کے تحلیل ہو جانے کی وجہ سے کمزور ہوتا رہتا ہے اور اس کمزوری

کو دور کرنے اور اصل طاقت غریزی کو بحال رکھنے کے لیے غذاؤں کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ جسم کی رگوں میں تازہ خون پہنچا کر اس کی زائل شدہ قوت کو واپس لاتی رہیں اسی طرح اقامت دین کا نصب العین رکھنے والی جماعت کی قوت خیر و تقویٰ کو بقا و استحکام اور مزید نشو و نما دینے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی رگوں میں امر بالمعروف کے ذریعہ خدا پرستی کا خون تازہ بتازہ داخل کیا جاتا رہے، ورنہ رفتہ رفتہ اس میں روح تقویٰ مضمحل ہوتی جائے گی اور خود اس کے اوپر سے دین کا اقتدار ڈھیلا ہوتا جائے گا۔ یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ کائنات طبعاً متحرک پیدا کی گئی ہے، سکون و جمود سے اس کی فطرت ناآشنا ہے، اگر اس کو آگے کی طرف بڑھنے کا موقع نہ ملے گا تو یقیناً پیچھے ہٹنے لگے گی۔ کوئی شے کسی ایک حالت پر قائم نہیں رہ سکتی، ضرورت ہے کہ شئی کسی سمت حرکت کرتی رہے۔ اس لیے قیام دین کی تحریک اگر آگے نہ بڑھے گی تو پیچھے ہٹنا شروع کر دے گی۔ جب آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ نازل ہوئی تو حضرت عمرؓ رو پڑے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رونے کی وجہ پوچھی تو کہا "آج تک ہمارا دین ترقی کے زینے طے کرتا رہا لیکن اب جب کہ وہ اپنی حد کمال کو پہنچ گیا ہے۔ اس کے انحطاط کا آغاز ہوگا، کیونکہ جو شے بھی کامل ہو جاتی ہے وہ ناقص ہو کر رہتی ہے" آنحضرت صلعم نے فرمایا "بیشک تم نے بہت صحیح بات کہی"۔ پس نہ صرف اس لیے کہ فریضۂ اقامت دین کا امر بالمعروف ایک لازمی عنصر ہے، بلکہ اس لیے بھی کہ یہی امر بالمعروف اسلامی جماعت کے جوہر ایمان و اتقا کا محافظ ہے اس کو اس فرض کی ادائگی سے کوئی چارہ کار نہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ قرآن مجید نے اقامت دین کے یہ تین نکات پیش کیے ہیں اس لیے اس فرض کو ادا نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ ان تینوں نکات پر پورے عزم و استقلال کے ساتھ عمل نہ کیا جائے۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ ان میں کوئی اس قسم کی زمانی ترتیب ہے کہ جب پہلے نکتہ پر کامل طور سے عمل ہو لے تب دوسرے کی بسم اللہ کی جائے اور جب دوسرے کا کمال اتباع معرض وجود میں آ لے تو تیسرے کو سامنے لایا جائے۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ ان تینوں نکات پر بیک وقت عمل شروع ہو جانا چاہیے اور اس سے پہلے اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو صرف ایک چیز کی ہے، یعنی ذہن کی پوری یکسوئی اور قلب کی سچی شہادت کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ پر ایمان لانا۔ اس اقرار و اعتراف کے بعد جب ایک شخص يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے زمرہ مخاطبین میں آ گیا تو قرآن بیک وقت اس کے سامنے یہ تینوں مطالبے رکھ دیتا ہے اور اس کے لیے اپنے حالات اور اپنی استطاعت کے مطابق ان تینوں نکات پر ایک ساتھ عمل کرنا لازمی ہو جاتا ہے کیونکہ ان تینوں نکات میں عمل کے لحاظ سے تفریق کرنا سرے سے ممکن ہی نہیں اور حقیقت تو یوں ہے کہ دوسرے اور تیسرے نکتے بھی پہلے ہی نکتہ کے اجزا یا یوں کہیے کہ اسی کے تکملات ہیں نہ کہ اس سے علیحدہ مستقل بالذات نکتے۔ اس طرح دوسرے اور تیسرے نکتوں پر عمل پیرا ہونا دراصل پہلے ہی نکتہ کے اتباع کی تکمیل ہے اور جب تک ان دونوں پر عمل نہ ہو لے، پہلے پر عمل کا حق ادا نہیں ہو سکتا کیونکہ جب تک کسی کل کے تمام اجزا موجود نہ ہو لیں وہ کل اپنی کامل شکل میں وجود پذیر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس دعویٰ کی صحت معلوم کرنے کے لیے کسی بڑی بحث و تحیص کی ضرورت نہیں بجز اس کے کہ تقویٰ کے صحیح مفہوم کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ تقویٰ ان تمام حدود کی ٹھیک ٹھیک پابندی کا نام ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے میدان زندگی کے ہر چہار اطراف میں قائم کر دی ہیں اور آدمی اس وقت تک متقی نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ اپنی زندگی کے تمام مسائل و معاملات میں ـــــ خواہ ان کا تعلق اس کے اپنے نفس اور اپنی انفرادی زندگی سے ہو، خواہ منزلی اور معاشرتی

زندگی سے، تمدنی، سیاسی اور اجتماعی زندگی سے — غرض ہر جگہ اور ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے احکام کا اتباع اور اس کی قائم کی ہوئی حدود کی حفاظت اور نگرانی نہ کرے۔ اس حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد اس امر سے انکار کرنا کہ اقامت دین کے باقی دو نکات دراصل پہلے ہی نکتہ کے مقتضیات اور تکملات ہیں، ایسا ہی ہے جیسے کوئی دو دونی کے چار ہونے سے انکار کر دے۔ کیونکہ اپنے نصب العین زندگی کی خاطر تمام اہل ایمان کا باہم متحد رہنا اور امر بالمعروف میں اشتغال دائمی رکھنا بھی تو منجملہ انہی احکام و حدود کے ہے جن کی پابندی کا نام تقویٰ ہے۔ قرآن کی ان آیتوں کو غور سے پڑھیے:۔

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ (توبہ - ۱۵)

اے ایمان لانے والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور راست بازوں کے ساتھ رہو۔

(۲) إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (حجرات - ۱)

مسلمان تو آپس میں بھائی بھائی ہیں، سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان (اختلاف و عناد پیدا ہونے کی صورت میں) صلح کرا دو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ اس کی رحمت سے سرفراز ہو سکو۔

(۳) ...... وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (روم - ۴)

...... اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو۔ یعنی ان لوگوں میں سے جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور مختلف ٹولیوں میں بٹ کر رہ گئے اور اب ہر کوئی اپنے اپنے خیالات و افکار میں مست ہے۔

ان میں سے پہلی آیت میں سچے مومنوں سے جڑ کر رہنے کو اور دوسری میں دو باہم پھٹے ہوئے مومن دلوں کے دوبارہ جوڑ دینے کو "اتقا" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور تیسری آیت میں اس رشتۂ اخوت و یگانگت کے فقدان کو بالکل شرک کا مظہر قرار دے کر اس حقیقت کے چہرے سے آخری حجاب بھی دور کر دیا گیا ہے کہ ایمان و تقویٰ کے تحقق کے لیے جماعتی اتحاد و مرکزیت شرط لازم ہے۔ اس اصل دینی کی پوری وضاحت اور اہمیت دیکھنی ہو تو ان آیات کے ساتھ ان احادیث کو بھی سامنے رکھ لینا چاہیے جن میں جماعت کے لزوم پر کفر و ایمان تک کا فیصلہ کر دیا گیا ہے اور صاف طور سے بتا دیا گیا ہے کہ اس جماعت مومنین سے، جو "الجماعت" ہے اور جو صحیح معنوں میں دین حق کی علمبردار اور رسول کے سنن کی حامل، اور اصحاب رسول کے نقوش قدم کی پیرو ہے، الگ ہونے والا دائرۂ اسلام سے خارج، اس کی زندگی کافرانہ، اس کی موت جاہلیت کی موت اور اس کا انجام آگ کا انجام ہے۔

اس کے بعد چند دوسرے نصوص ملاحظہ ہوں جن میں امر بالمعروف کو تقویٰ کا کام قرار دیا گیا ہے:۔

...... يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ ...... وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ (آل عمران - ۱۲)

یہ لوگ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، معروف کا حکم دیتے ہیں منکر سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں پوری سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں ...... اور اللہ متقیوں سے واقف ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ (توبہ - ۱۶)

اے ایمان لانے والو! ان کافروں سے لڑو جو تمھارے قریب ہیں اور چاہیے کہ وہ تمھارے اندر درشتی محسوس کریں، یاد رکھو اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔

پہلی آیت میں یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو صفاتِ متقین اور لوازم تقویٰ میں شمار کیا گیا ہے اور دوسری میں نہی عن المنکر کی ایک خاص شکل یعنی قتالِ کفار کو تقویٰ سے موسوم کیا گیا ہے۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (توبہ - ۹)

اور مومن مرد اور مومن عورتیں سب آپس میں ایک دوسرے کے "ولی" ہیں نیکی کا حکم دیتے ہیں اور بدی سے روکتے ہیں۔

اس آیت نے دونوں چیزوں کو اجزائے ایمان کے تحت ایک ہی ساتھ جمع کر دیا ہے اور باہم جڑ کر ایک منظم پارٹی کی طرح رہنا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنا مومنین کا نشانِ امتیاز اور مقتضائے ایمان قرار دیا ہے۔

ان آیات کی روشنی میں اس وہم کی تاریکی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ جب تک اقامت دین کے پہلے نکتہ پر پورا پورا عمل نہ ہولے اور انسان کا باطن نورِ تقویٰ سے بخوبی منور نہ ہولے اس وقت تک اس کے لیے دوسرے اور تیسرے نکات کی طرف توجہ کرنے کی اجازت نہیں۔ در اصل یہ وہم ایک زبردست حجاب ہے جو ہمارے نیکوکار افراد کی بصیرتوں پر پڑا ہوا ہے جس کا ظاہری پہلو یقیناً بڑا ہی جاذبِ نظر اور روحانیت نواز دکھائی دیتا ہے مگر اس کا باطن اوہامِ باطلہ اور فریبِ جہل سے یکسر مملو ہے۔ جب ایک شخص متقی اسی وقت ہو ہی سکتا ہے جب وہ دیگر اہلِ ایمان سے اتحاد و ولایت کا رشتہ جوڑ لے اور بقدرِ امکان امر بالمعروف کے فرائض سر انجام دیتا رہے تو یہ بات کتنی لایعنی ہوگی کہ آدمی پہلے متقی کامل بن لے تو "اعتصام بحبل اللہ جمیعاً" اور امر بالمعروف کی مہم کا آغاز کرے۔ ان تینوں نکات کی مثال تو بالکل ایک درخت کے اجزاء کی سی ہے جس طرح بیج سے ننھا سا پودا اگتے ہی اس میں جڑ، تنہ اور پتے کی تخلیق ہو جاتی ہے اور تینوں ایک ساتھ نشو و ارتقا حاصل کرتے ہیں ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ بیج سے جڑ نکل کر خوب موٹی تازی ہولے تب اس میں سے تنہ نکلے اور جب تنہ اپنی پوری بالیدگی کی حد کو پہنچ لے تو اس میں سے پتیاں نکلنی شروع ہوں اسی طرح تخمِ ایمان سے پھوٹتے ہوئے شجرِ اسلام کا حال بھی ہے۔ طہارتِ نفس یعنی انفرادی تقویٰ کو اس شجرۂ مبارکہ کی جڑ اور اتحاد و ائتلاف کو اس کا تنہ اور امر بالمعروف کو اس کی پتیاں سمجھنا چاہیے۔ زندہ جڑ کا فطری تقاضا یہ ہے کہ ابتدا ہی سے اس میں سے شاخیں، اور شاخوں سے پتیاں نکلنی شروع ہوں۔ اسی طرح نفسِ انسانی میں طہارت اور روحِ تقویٰ کا وجود اس امر کو مستلزم ہے کہ اس میں سے اتحاد و اخوت اور امر بالمعروف کی مساعی کا ظہور ہو۔

قرآن کے طریقۂ نزول سے رہنمائی

اقامت دین کا یہی وہ طریقۂ کار ہے اور ٹھیک یہی وہ اصولی نکات ہیں جو قرآن حکیم کی حکیمانہ ترتیبِ نزول سے بھی مستنبط ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے جو آیتیں اور سورتیں نازل ہوئیں ان میں صرف دو چیزوں کی تعلیم تھی، ایک تو ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت وغیرہ کی تعلیم، دوسری اقامت صلوٰۃ اور محاسن اخلاق کی تعلیم جس طرح ایک کسان اپنی زمین میں مہینوں ہل چلاتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ بیج کو روئیدگی بخشنے کے لیے بالکل تیار ہو جاتی ہے تو اس وقت وہ جو بیج بھی اس میں ڈالتا ہے، فوراً اگ آتا ہے، اسی طرح تیرہ برس کی طویل مدت تک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو صرف ایمان کی، اور ذکر و نماز اور اسی طرح کے چند بنیادی امور کی تعلیم و تلقین کرتا رہا۔ چنانچہ بالکل ابتدائی سورتوں مثلاً سورہ مزمل سورہ مدثر وغیرہ کو پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس بارِ عظیم کے اٹھانے کے لیے، جو پیغمبر اور اس کے حواریوں پر ڈالا جانے والا تھا، کس طرح ایمان کو دلوں میں اتارنے کے ساتھ ساتھ نماز اور ذکرِ الٰہی، صبر اور توکل اور انابت و خشیت کی تاکید کی گئی ہے۔ یہ اس لیے تاکہ دل اس بوجھ کو سہارنے کے لیے تیار ہو جائیں جو آگے چل کر ان پر پڑنے والا ہے اور طاعت و انقیاد کے لیے اس حد تک آمادہ ہو جائیں کہ جس وقت جو حکم بھی اوپر سے آئے بلا چون و چرا اس کی تعمیل کے لیے اپنی جان و مال حاضر کر دیں۔ اور شہادتِ حق و اقامتِ دین کا جو فرض ان پر عائد کیا جانے والا ہے اس کو ادا کرنے کے لیے مستعد

ہوجائیں جب انفرادی حیثیت سے تزکیہ قابل اہل ایمان حد تک پہنچ چکا تو زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق حدود و احکام کا نزول شروع ہوا اور وہ سورتیں نازل ہونے لگیں جن میں ایک منظم پارٹی کی حیثیت سے مسلمانوں کو سامنے رکھکر ہدایتیں دی گئی تھیں۔ اس ضمن میں وہ احکام بھی آئے جو تمام اہل ایمان کو ایک جماعت بن کر رہنے کی ہدایت پر مشتمل تھے اور وہ احکام بھی جو ایک جماعت کی تطہیر و تحصین کی ہدایات سے متعلق تھے۔ مدنی سورتوں کو پڑھیے تو یہ حقیقت پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آجائے گی۔ پھر امر بالمعروف کا حکم بھی حالات کے لحاظ سے ایک خاص ترتیب کے ساتھ نازل ہوتا رہا۔ مکی زندگی میں یہ حکم زبانی تبلیغ و ارشاد تک محدود رہا۔ مدینہ میں زبان کے ساتھ ساتھ ہاتھ سے کام لینے کی بھی تاکید کی گئی لیکن ایک عرصہ تک حالات کے لحاظ سے یہ کام صرف مدافعت کی حد تک محدود رہا۔ پھر فتح مکہ کے بعد جب عرب میں کفر نے سپر ڈالدی اور مسلمانوں کو اطمینان اور بے خوفی کی فضا میسر ہوئی اور وہ ایک بالادست قوت کی حیثیت میں ہو گئے۔ تو تمام کفر و شرک سے براءت کا اعلان کرکے دفاع۔ اقدام سے بدل دیا گیا اور وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ فرماکر اس وقت تک کے لیے اہل ایمان کو امر بالمعروف یعنی حق کی اشاعت اور اقامت کا ذمہ دار بنادیا گیا جب تک کہ یہ دنیا باقی ہے اور اس میں حق سے باطل، معروف سے منکر، ایمان سے کفر اور دین الٰہی سے دین طاغوت حریفانہ برد آزمائی کے لیے موجود ہے۔

اسوۂ رسول اقامت دین کا یہ طریق کار اور اس کے اصول تو ہمیں قرآن سے حاصل ہوتے ہیں، اب اگر آپ معلم قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ مبارک پر نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ وہی اصولی تعلیمات جو قرآن کے اندر الفاظ کے جامہ میں تھے، یہاں واقعات اور تجربات کی شکل میں موجود ہیں اور نبی اکرمؐ نے ٹھیک انہی لائنوں پر امت کی تاسیس اور تربیت و تنظیم کی۔ سب سے پہلے تو آپ نے عرب کے اس کفرزار میں جس کا چپہ چپہ دین طاغوت کی آہنی گرفت میں جکڑا ہوا تھا، ایک آواز بلند کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ انسان اپنے تمام جذبات و میلانات اور اپنی زندگی کے تمام مسائل و معاملات کو اس ذات واحد کے تابع فرمان بنادے جس کے سوا اس زمین پر کسی کو اپنی مرضی منوانے اور اپنا حکم چلانے کا استحقاق نہیں۔ یہ نامانوس آواز جن بہرے کانوں سنی گئی اور اس کو دبانے کے لیے جن انسانیت سوز مظالم سے کام لیا گیا ان سے کوئی صاحب نظر ناواقف نہیں ہے، سیاسی حالات نے آنکھیں دکھائیں۔ وطنی مفاد نے آڑے آنے کی کوشش کی۔ وقت اور ماحول نے ساتھ دینے سے انکار کیا، مصلحتوں نے دامن پکڑا، مشکلات نے راستہ روکا، ہلاکتوں کا طوفان نمودار ہوا، مگر اللہ کے اس بندہ نے اپنی آواز میں کبھی کوئی پستی نہیں آنے دی اور حالات زمانہ، رفتار واقعات اور مستقبل کے امکانی خدشات، غرض ہر طرف سے آنکھیں بند کرکے اس حقیقت کو دوسروں پر برابر کھولتا رہا جو خود اس پر کھل چکی تھی اور باوجود اس کے کہ وہ اپنے عقیدۂ توحید اور نظریۂ زندگی میں تن تنہا تھا اس نے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ گوارا نہیں کیا کہ اس عقیدہ اور نظریہ کو چھپائے رکھے اگرچہ پوری دنیا اس کی زبان بندی پر کمربستہ تھی۔ بالآخر اس دعوت حق نے دلوں کو مسخر کرنا شروع کیا اور ان لوگوں میں سے جن کے اندر قبول حق کی صلاحیتیں ابھی زندہ تھیں، ایک ایک دو دو کرکے آپ کے حلقۂ اطاعت میں آنے لگے۔ آپ نے ان کے قلوب و اذہان میں ایک خدا کی غلامی اور پرستش کا گہرا نقش بٹھایا اور اصولی طور پر ان کو یہ بات سمجھادی کہ رہنا صرف اس کی چاہیے جس نے تمھیں زندگی اور سامان زندگی عطا کیا اور حکم صرف اس کا مانو جس کے سوا سب تمھاری ہی طرح عاجز و درماندہ ہیں۔ یہ نقش بٹھانے کے بعد ان کو زندگی کے احوال و مسائل میں بتدریج وہ احکام سنانے شروع کیے جو احکم الحاکمین کی طرف سے آپ پر نازل ہوتے رہے اور ہر حکم پر خود عمل کرتے ہوئے ان کو اس پر عمل کرنے کی تعلیم دی، جاہلیت کی کثافتوں سے ان کے باطن پاک کرکے ان میں مکارم اخلاق کی تخم ریزی کی اور اپنی بے مثال قوت تربیت سے ان کے دلوں کو ایک خدا کی بندگی کا ایسا عقیدت کیش بنایا کہ اعدائے توحید نے اپنے ترکش ظلم و انتقام کے سارے تیر خالی کردیے مگر کسی بندۂ مومن کا دل توحید کے نشہ سے خالی نہ کرسکے۔ اس تربیت اور تزکیہ کے ساتھ ساتھ آپ ان سب لوگوں کو، جو آپ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے حلقۂ اسلام میں داخل ہوتے جارہے تھے، ایک خاندان کے افراد کی طرح باہم جوڑتے گئے۔ یہ جڑنا اتنا پائیدار تھا کہ

بھائی بھائی کے رشتے اس کے سامنے ماند پڑ گئے۔ پھر اسی کے ساتھ توحید کی دعوت و تبلیغ نہ صرف یہ کہ باقی رہی بلکہ اس کا دائرہ گھر سے خاندان، خاندان سے قبیلہ، قبیلہ سے شہر اور شہر سے اطراف ملک تک وسیع ہوتا گیا۔ آنحضرت صلعم بھی اور آپ کے اتباع بھی سب کے سب اسی امر حق کی تبلیغ و اشاعت میں ہمہ دم مصروف رہتے اور جس کسی کو شرک و کفر کی نجاستوں میں آلودہ پاتے اسے پاک کر کے ایک خدا کا پرستار اور ایک آقا کا غلام اور ایک حاکم علی الاطلاق کا محکوم بنانے کی کوشش کرتے رہتے، جس بدی کو دیکھتے اس کو مٹانے کی تدبیر کرتے اور کفر و شرک کے جس طوفان سے رحمت حق نے انھیں نجات دی تھی اس میں دوسروں کو ڈوبتے دیکھنا انھوں نے کسی لمحہ بھی گوارا نہ کیا۔ یہ جد و جہد تیرہ برس تک مکہ میں جاری رہی، پھر وہ وقت آیا جب دشمنان حق کے لیے اس دعوت توحید کی مقبولیت اور روز افزوں ترقی ناقابل برداشت ہو گئی اور انھوں نے آنحضرت صلعم کے قتل کا انتظام کر کے اس دعوت کو فنا کر دینا چاہا، تو داعی حق اور اس کے پیروان صادق نے مکہ کو خیرباد کہہ کر مدینہ کو اپنے مشن کا مرکز بنایا اور وہاں سے اس نصب العین کی خاطر جد و جہد شروع کر دی جس کو وہ اپنا مقصد زندگی بنا چکے تھے، اور جب کفار نے وہاں بھی چین نہ لینے دیا اور ادھر اہل ایمان کی ایک منظم جمعیت بھی فراہم ہو چکی تھی تو دین کے استیصال اور دین و ملت کی بقا کے لیے تلوار اٹھائی گئی۔ ایک مدت تک تو طاغوتی طاقتیں خود بڑھ کر مدینہ پر حملہ آور ہوتی رہیں اور مسلمان صرف مدافعت کرتے رہے۔ اس دوران میں وہ خوف، دہشت، بے اطمینانی اور طرح طرح کے خطرات برداشت کرتے رہے اور جان و مال کی ہر ممکن قربانی کر کے حق کی شہادت دیتے رہے۔ یہاں تک کہ جب عرب میں کفر کی شوکت ٹوٹ گئی اور طاغوت کا علم سرنگوں ہو گیا اس وقت مسلمانوں کا قلب اس تائید و نصرت الٰہی پر شکر و امتنان کے جذبات سے بھر گیا مگر ان کی سواریوں کے کجاوے اسی طرح بندھے کے بندھے رہے اور ان کی تلواریں اسی طرح کھنچی رہیں۔ ان کے ہاتھ جو اب تک دفاع کے لیے حرکت کرتے تھے اب جارحانہ اقدام کے لیے سرگرم کار ہو گئے کیونکہ گو عرب میں بدی نے ہتھیار ڈال دیے تھے، مگر اس کے باہر ہر چہار طرف اس کی حکمرانی پوری شان کے ساتھ قائم تھی اور مسلمان اپنے اس مشن کو بھول نہیں سکتے تھے کہ منکرات کو مٹا دینا چاہیے، جہاں کہیں بھی ہو۔ اور غیر اللہ کی آقائی پامال ہو جانی چاہیے، خواہ وہ کسی گوشۂ ارض پر ہو۔ یہ زمین خدا کی پیدا کی ہوئی ہے اس پر اسی کا حکم چلنا چاہیے، اسی کے قانون کا اتباع ہونا چاہیے، اسی کی مرضی پوری ہونی چاہیے، اور اس "چاہیے" کی کل ذمہ داری میرے سر پر ہے۔ چنانچہ یہ ذمہ داری انھوں نے پورے احساس فرض کے ساتھ ادا کی، اور جب تک وہ ایسا کرتے رہے اللہ تعالیٰ کی موعودہ تائید و نصرت ان کے ہم رکاب رہی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ سے باندھا ہوا عہد اقامت دین فراموش ہونا شروع ہوا اور دین حق کا چڑھتا ہوا سورج مسلمانوں کی قسمت کا ماتم کرتا ہوا زوال پذیر ہونے لگا، اور اب دوبارہ بام عروج پر آنے کے لیے اس مبارک صبح کا منتظر ہے جس میں حاملین قرآن عہد فراموشی کے خواب گراں سے بیدار ہو کر اپنے فرض منصبی کو از سر نو سنبھالیں گے۔

رسائل و مسائل

جذباتی اور غیر حکیمانہ طرزِ تبلیغ

سوال: - میں نے ایک طالب علم کو جماعت اسلامی کا لٹریچر پڑھنے کی ترغیب دی اور زبانی طور پر بھی میں اس کو جماعت کے نصب العین کی طرف دعوت دیتا رہا جس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ اب وہ اس مقصد کے لیے اپنے آپ کو بالکل وقف کرنے کا تہیہ کر چکا ہے۔ نتیجہ کے طور پر اس کا ماحول بھی اس کا دشمن ہو رہا ہے اور وہ بھی اس سے سخت بیزار ہے۔ اب اس کی خواہش یہ ہے کہ اپنے مقصد کی خاطر ہجرت کر کے دار الاسلام چلا جائے۔ اس کی والدہ بعض شرائط پر راضی ہو گئی ہیں مگر والد سے اجازت ملنے کی کوئی توقع نہیں، اس لیے اس نے مجھ سے استفسار کیا تھا کہ کیا والدین کی اجازت اور مرضی کے علی الرغم دار الاسلام ہجرت کر جاؤں؟ میں نے اس کو جواب دے دیا ہے کہ "مکہ سے مدینہ جانے کے قبل تمام مہاجرین نے اپنے والدین سے اجازت نہیں مانگی تھی"۔ اس کا دوسرا استفسار یہ تھا کہ "کیا جماعت میری پشت پناہی پر آمادہ ہوگی؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اِن برے سلوک اور مصائب سے دوچار ہوں"۔ اس کے جواب میں میں نے اس کو لکھ دیا ہے کہ "گو اس کے متعلق صاف صاف کچھ کہنا میرے لیے مشکل ہے مگر اتنا یاد رکھنا چاہیے کہ نظام باطل کے تحت ہزاروں روپیہ کی کمائی اور ساری دنیوی لذتیں، نظام حق کی جد وجہد کی خاطر فقر و فاقہ کی زندگی کے مقابلہ میں ہیچ ہیں، رسول عربی کا اسوہ، جس کے اتباع کا ہم مسلمان دم بھرتے ہیں، ہم کو یہی بتاتا ہے مگر اس کے باوجود تم کو یقین رکھنا چاہیے کہ جماعت ہمیشہ اور ہر وقت ایسے لوگوں کی پشت پناہی پر آمادہ ہے جو نظام باطل سے بھاگ کر نظام حق کی طرف آرہے ہوں، بلکہ وہ ایسے لوگوں کا خیر مقدم کرے گی بشرطیکہ وہ صرف حق پرست اور حق طلب ہو کر بھاگ رہے ہوں"۔

اب ان امور کے متعلق براہ راست آپ کے ہدایتیں مطلوب ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک چیز اور بھی سامنے آگئی ہے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میں ایک مدرسہ میں معلم ہوں۔ جب میری ان تبلیغی سرگرمیوں کی اطلاع حکومت کے محکمۂ تعلیمات کو ملی تو اس نے مجھ سے چند سوالات کیے جن میں مجھ سے جماعت کی حیثیت، اس کے مقاصد، امیرِ جماعت کی شخصیت وغیرہ امور کی بابت استفسار کرتے ہوئے یہ جواب طلب کیا گیا ہے کہ تم ایک فرقہ وار جماعت کے رکن کیوں ہو اور فلاں طالب علم کو کیوں اس بات پر ورغلاتے ہو کہ وہ موجودہ نظامِ تعلیم کو ترک کر کے خلاف مرضی والدین دیگر ممالک کو ہجرت کر جائے ... وغیرہ۔

فرمایئے اس مراسلہ کا کیا جواب دوں؟ میرا تو ارادہ تو صاف صاف اظہار حق کا ہے۔

جواب: - آپ نے یہ غلطی کی کہ لوگوں کو تبلیغ کی تیز تیز خوراکیں دے کر ہجرت اور ترک علائق پر آمادہ کرنا شروع کر دیا حالانکہ میں صحیح پوزیشن کئی مرتبہ واضح کر چکا ہوں۔ ہم ابھی تک اُس مرحلہ میں نہیں پہنچے ہیں جبکہ مختلف مقامات سے اپنے سب ہم خیالوں کو ایک جگہ سمٹ آنے کی دعوت دے سکیں۔ نہ ہمارے پاس جگہ ہے، نہ ذرائع ہیں، نہ صحیح معنوں میں ایسا کوئی دار الاسلام بن گیا ہے جس کی

دارالکفر سے ہجرت کرنا ضروری ہو، اور نہ اصولاً یہ بات صحیح ہے کہ تحریکی زندگی کی بھٹی سے اچھی طرح گذرے بغیر لوگ مجرد عقیدہ و نصب العین قبول کر کے کسی ایک مقام پر جمع ہونے لگیں، کیونکہ اس طرح وہ مضبوط سیرت تو کبھی بن ہی نہیں سکتی جو ایک کافی مدت تک مخالف ماحول میں کشمکش کرنے اور استقامت دکھانے سے بنا کرتی ہے۔ لہٰذا اس وقت لوگوں کو ہجرت کی دعوت دینا ہمارے کام کے لیے اصولاً غلط بھی ہے اور شدید نقصان دہ بھی اور اس پالیسی کے بھی خلاف ہے جس پر ہم اس وقت کام کر رہے ہیں۔ ہم اپنے مرکز کو ذرائع کی کمی اور مشکلات کے ساتھ بتدریج مضبوط بنا رہے ہیں اور اس مرحلہ پر صرف ان لوگوں کو بلا رہے ہیں جن کی فی الواقع ہم کو ضرورت ہے۔ اس تدریجی نقشے کے خلاف ایک زائد آدمی کا آجانا بھی ہماری مشکلات میں غیر معمولی اضافہ کر دیتا ہے۔ پھر ہماری کوشش یہ ہے کہ اس مرحلہ پر ہم صرف آزمودہ آدمیوں ہی کو بلائیں جن کے متعلق ہمیں پوری طرح اطمینان ہو کہ وہ ساری اسکیموں میں ٹھیک ٹھیک مددگار ہو سکتے ہیں۔ ناآزمودہ آدمیوں کے بلا انتخاب جمع ہو جانے سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں اور ایسے اشخاص کے اجتماع سے کام میں مدد ملنے کے بجائے الٹی خرابیاں رونما ہونے لگتی ہیں۔ جب تک میں اپنے نقشے کے مطابق ایک صحیح و مستحکم ماحول پیدا نہ کر لوں جس پر مجھے یہ اطمینان ہو کہ اب جو اس ماحول میں آئے گا وہ اس کے مزاج کے مطابق ڈھلتا چلا جائے گا اس وقت تک میں یہ مناسب نہیں سمجھتا کہ غیر معلوم الحال اصحاب بطور خود مرکز میں آکر رہنا شروع کر دیں۔ سردست جو لوگ مرکز میں آنے کے امیدوار ہوں ان کو ایک کافی مدت تک اپنے ماحول میں رہ کر مشکلات کا مقابلہ کر کے اور فتنوں کے مقابلہ میں صبر و استقامت دکھا کر اپنی اس قابلیت کا ثبوت دینا چاہیے کہ وہ مرکز میں بلائے جانے کے لائق ہیں۔ اب اخلاقی جرأت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ خود ان نوجوان دوست کو لکھیں کہ آپ جو ان کو ہجرت کرنے کی ترغیب دی تھی وہ آپ کی غلطی تھی اور آپ سے یہ غلطی جماعتی پالیسی کے خلاف سرزد ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ آپ انھیں تلقین کیجیے کہ وہ ایک طرف اپنی دینی معلومات کو ضروری حد تک مکمل کرنے کی کوشش کریں، اور دوسری طرف ہماری جماعت کے نام پر کوئی کام کرنے سے پہلے ہمارے لٹریچر کو اچھی طرح پڑھ کر ہمارے مسلک اور طریق کار کو سمجھ لیں پھر اس کے مطابق اپنے ماحول میں ٹھیک ٹھیک کام کرنے کی کوشش کریں۔

آپ کی یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ آپ نے عزیز موصوف کو ان کے والد کے علی الرغم ہجرت کرنے کی رائے دی۔ اول تو مکہ میں مشرک و کافر ماں باپ کے متعلق جو طرز عمل اختیار کیا گیا تھا وہ بعینہ ان مسلمان ماں باپ کے معاملہ میں اختیار کرنا درست نہیں ہے جو ہمارے نزدیک خواہ کتنی ہی غفلت و ضلالت میں مبتلا ہوں مگر بہرحال ہیں مسلمان۔ دوسرے یہ کہ اگر کسی مرحلہ پر والدین کی اجازت کے بغیر، بلکہ ان کے حکم کے خلاف کوئی اقدام کرنا اولاد کے لیے جائز ہو بھی سکتا ہے تو صرف اس صورت میں جبکہ امیر جماعت تمام شرعی پہلوؤں کو نظر رکھ کر ایسا کرنے کا حکم دے۔ ایسے باضابطہ حکم کے بغیر کسی شخص کا بطور خود یہ فیصلہ کر لینا کہ یہ وقت والدین کی نافرمانی کر گذرنے کا ہے کسی طرح صحیح نہیں۔

عزیز موصوف کا جو خط براہ راست میرے پاس آیا ہے اس کو دیکھنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ جماعت کو، اس کے نظام کو اور اس کے طریق کار کو بالکل نہیں سمجھے ہیں اور ان کے ذہن میں جماعت کی پوزیشن کا کچھ عجیب تصور قائم ہو گیا ہے۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ شاید اس جماعت نے اپنا کوئی اسٹیٹ قائم کر لیا ہے اور وہ اسٹیٹ بھی بڑا دولت مند ہے، اس لیے ان کا خیال یہ ہے کہ انھیں یہاں آنے کے مصارف ہم بھیجیں گے، یہاں ان کی ضروریات کی کفالت بھی ہم ہی کریں گے، اور ان کو سال میں دو مرتبہ گھر بھی ہم اپنے ہی

[illegible] کہ اس تصور کو لیے ہوئے اگر وہ دار الاسلام آنے پر آمادہ نہ ہوتے تو اور کیا کرتے؟ اور اگر ہماری دعوت [illegible] بیان میں سے کسی کو اپنی نوکری چھوڑ دینے یا مدرسے سے نکل آنے میں تامل ہو سکتا ہے [illegible] یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آپ کا طرز تبلیغ [illegible] جس میں فہم کا عنصر کم اور جذباتی جوش کا عنصر زیادہ ہے، اسی وجہ سے ایسے لوگ [illegible] ہمارے مسلک [illegible] کو پانچ فی صدی بھی نہیں سمجھے ہیں، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہمارے ساتھ آملنے کو [illegible] فی صدی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ براہ کرم اس طرز تبلیغ کی اصلاح کیجیے ورنہ جو پیچیدگی ان عزیز کے معاملہ میں پیش آئی ہے [illegible] زیادہ [illegible] پیش آنے کا خطرہ ہے۔

[illegible] بات [illegible] سے پہلے آپ کو یہ بتا دینا [illegible] کہ جب تک آپ سرکاری ملازمت میں ہیں قواعدِ ملازمت کے اندر رہتے ہوئے کام کیجیے۔ اور [illegible] سے تنخواہ لینے کے بعد ان [illegible] کی پابندی نہ کرنا جن کے تحت وہ تنخواہ دے رہا ہے اخلاقی اعتبار سے درست نہیں [illegible] دوسرے یہ کہ اگر آپ قواعد کے خلاف کام کریں گے اور اس کی پاداش میں برطرفی یا کسی اور قسم کی سزا پائیں گے تو اس سے آپ کی اخلاقی پوزیشن [illegible] ہو جائے گی، حالانکہ اس وقت نظام جاہلیت کے خلاف ہمارا سب سے بڑا اسلحۂ جنگ اگر کوئی ہے تو وہ اخلاق ہی ہے۔ [illegible] آپ نے طالب علم [illegible] کو جس طرز کی تبلیغ کی اور اس کی [illegible] جو بازپرس آپ سے ہوئی وہ ان ہدایات کے خلاف [illegible] جو آپ کو [illegible] دی گئی تھیں۔ اب آپ کو ان سوالات کے جواب میں، جو آپ سے کیے گئے ہیں، بالکل سیدھے اور صاف طریقہ سے صحیح [illegible] بیان [illegible] چاہیے۔ لیکن جواب آپ کا تحت نہ ہونا چاہیے۔ زبان اور لب و لہجہ میں پوری معقولیت ہو۔ جو غلطی ہے اس [illegible] تسلیم کر لیجیے اور [illegible] اس جماعت کی جو صحیح پوزیشن ہے اس کو بے تکلف بیان کر دیجیے۔

ہمارے طریق کار پر چند اعتراضات اور انکا جواب

سوال:۔ [illegible] میں ہم کو چند بنیادی غلطیاں نظر آتی ہیں جن کو نیچے درج کیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ ان کے متعلق اپنے خیال [illegible] فرمائیے۔

(۱) آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ کا طریق تبلیغ وہی ہے جو انبیائے کرام کا تھا۔ مگر ہر نبی پہلے خالص توحید کی دعوت دیتا تھا اور ایک ایک باطل [illegible] کی پرستش سے لوگوں کو منع کرتا تھا۔ لیکن آپ ان باطل [illegible] کا ذکر ضمناً کرتے ہیں۔ اصل مقصد تبلیغ سے [illegible] کیا کسی نبی نے [illegible] اس کام کو موخر کیا تھا اور پہلے صرف ربوبیت کے تصور کو پیش کرنے ہی پر اکتفا کیا تھا؟ آپکے اس طریق [illegible] مگر اس بھیڑ میں بہت کم لوگ شرک سے کلی طور پر پاک ہوں گے۔ مثلاً آپ کی جماعت کے ایک رکن [illegible] اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک ایک ایک مشرکانہ فعل پر انگلی رکھ کر نہیں بتایا جائے گا مسلمان شرک سے پاک نہیں ہو سکتے۔ اس لیے لازمی ہے کہ آپ بھی حضرت شاہ اسماعیل شہید کی طرح موجودہ دور کے ایک ایک مشرکانہ فعل کی تشریح کر کے اس کی حقیقت واضح کریں۔

(۲) آپ کا خیال ہے کہ موجودہ دور میں حکومت سب سے بڑا بت اور طاغوت ہے جس کی پرستش ہو رہی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس حکومت کے کارندے اس بت کے پجاری ٹھیرے، یعنی شرک کے مرتکب۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آپ ایسے اشخاص کو اپنی جماعت میں

شامل ہونے کی اجازت دیتے ہیں جو ریل، ڈاک اور تعلیم کے سرکاری محکموں میں ملازم ہیں؟ اگر آپ اضطرار کی رخصت کی بنا پر اجازت دیتے ہیں تو اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ ایسے تمام لوگ واقعۃً حالتِ اضطرار ہی میں مبتلا ہیں اور رخصت اضطرار کے تمام شرائط اپنے اندر رکھتے ہیں؟

(۳) آپکے خیال میں مذہب کو سیاست سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ بنی اسرائیل اپنے نبی کے ذریعہ ایک بادشاہ کے تقرر کی درخواست کرتے ہیں اور انھیں یہ جواب نہیں دیا جاتا کہ جب نبی تمھارے اندر موجود ہے، تو تم یہ کیسا مطالبہ کر رہے ہو۔ بلکہ بادشاہ مقرر کر دیا جاتا ہے؛ نیز جَعَلَكُمْ مُلُوكًا کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہی نبوت سے الگ مستقل طور پر ایک نعمت ہے۔ اسی طرح سلیمان علیہ السلام بھی "ملک" حاصل ہونے کی دعا کرتے ہیں اور ملنے پر اللہ کا شکر بجا لاتے ہیں اور بحیثیت ایک بادشاہ ہی کے ملکۂ سبا سے اطاعت چاہتے ہیں۔ ان واقعات سے واضح ہوتا ہے کہ بادشاہی کی خواہش کرنا بذاتِ خود محمود چیز ہے اور دین کے قیام کے نتیجے کے طور پر اس کا حصول تو اللہ کا مقرر کردہ انعام ہے۔

نیز حضرت موسیٰؑ کا بنی اسرائیل کی ساری قوم کو فرعونیوں کی غلامی سے نکال کر الگ لے جانا بھی اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ بھی اپنی قوم کے افراد کی انفرادی اصلاح اور تزکیہ سے پہلے غلامی سے نجات دلانا ضروری خیال فرماتے ہیں۔ چونکہ نبی کا کوئی فعل اپنی رائے سے نہیں ہوتا اس لیے حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کی مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ انفرادی اصلاح اور تزکیہ سے پہلے اگر مسلمان کہلانے والی قوم کو سیاسی غلبہ دلانے کی کوشش کی جائے اور بعد میں ان کے اعمال کی خرابیوں کی اصلاح کی جائے تو یہ طریقہ بھی صحیح ہے۔

جواب (۱) معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ہمارے لٹریچر کا اچھی طرح مطالعہ نہیں کیا۔ ہمارا طریق دعوت بعینہٖ وہی ہے جو حضرات انبیائے کرام کا تھا۔ البتہ زمانہ کے اقتضا سے ہم نے شرک کی اُن اقسام پر اصلی ضرب لگانے کی کوشش کی ہے جو اس عہد میں نہ صرف یہ کہ لوگوں سے مخفی تھیں بلکہ ان کا شمار اجزائے توحید میں ہونے لگا تھا اور وقت کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی ان کو خدا پرستی سمجھے بیٹھا تھا۔ "محمد غوث" جیسے ناموں پر مورچے قائم کرنے والوں اور مردہ خداؤں کی نذروں اور منتوں پر تکفیر کرنے والوں کی تو کمی نہیں تھی، البتہ زندہ خداؤں اور بااقتدار طاغوتوں اور آلہہ کی بندگی کو شرک قرار دینے کی نہ صرف یہ کہ جرأت لوگوں میں مفقود تھی بلکہ اس کے شرک ہونے کا تصور بھی مسلمانوں میں مردہ ہو چکا تھا۔ ہم اس وقت یہی کام کر رہے ہیں اور اس کی تفہیم کے لیے ہم جو چیز مسلمانوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں اس کا اثر انشاء اللہ یہ ہوگا کہ شرک اپنی تمام جلی و خفی قسموں اور اپنے تمام اشباہ و قوالب کے ساتھ ختم ہو جائے گا، اور لوگ اپنے ناموں اور کاموں ہر چیز میں شرک سے نفرت کرنے لگیں گے۔

(۲) ہم موجودہ زمانے کے ان کمزور مسلمانوں کو جو طاغوت کی بندگی میں لگے ہوئے ہیں تھوڑا سا الاؤنس محض اس وجہ سے دے رہے ہیں کہ ان پر امرِ حق واضح کرنے کی کوشش پہلے نہیں کی گئی ہے۔ انھوں نے ایک باطل نظام کی خدمت اس کو باطل سمجھ کر نہیں کی ہے بلکہ اس کو یا تو اسلام اور مسلمانوں کی عزت و سرفرازی سمجھ کر اختیار کیا یا کم از کم اسے حصول رزق کا ایک پاک وسیلہ سمجھا۔ جو لوگ ان کی اس جہالت کو دور کر سکتے تھے، یعنی حضرات علما، انھوں نے طرح طرح سے اس جہالت کو اور زیادہ بڑھانے کی کوشش کی۔ اب ہماری دعوت سے جو لوگ متنبہ ہوئے ہیں اور موجودہ حالت سے بیزاری محسوس کرنے لگے ہیں ہم ان سے یہ توقع نہیں کر سکتے

گروہ دفعۃً حضرت نکا کر باطل سے حق کی طرف آجائیں گے۔ وہ ایک حد تک مہلت پانے کے بہرحال مستحق ہیں اور جن مسلمانوں تک ابھی ہماری دعوت پہنچی ہی نہیں ہے ان کو تو دعوت پہنچانے سے پہلے ہمیں سرے سے ملامت کرنے کا حق ہی نہیں ہے۔

(۳) بنی اسرائیل میں بادشاہی کا آغاز نبوت سے الگ ہو کر نہیں ہوا، بلکہ نبوت کے تحت ہوا۔ ہر بادشاہ کے زمانہ میں ایک نبی بھی ہوتا تھا اور وہ سارے نظام میں وہی حیثیت رکھتا تھا جو نظام جسم میں آنکھ کی پتلی کو حاصل ہے۔ بادشاہ بالکلیہ اس کے تحت ہوتا تھا اور جو کچھ کرتا تھا اس کی ہدایت کے مطابق کرتا تھا۔ توریت میں ہر زمانے کے ملوک اور انبیاء کی تفصیل موجود ہے۔ قرآن میں مقام مدح میں ملک کا لفظ اصطلاحی (monarch) کے مفہوم میں استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ مجرد صاحب اقتدار کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اگرچہ یہ اقتدار خدا کے قانون کا بخشا ہوا ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قول اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ کے متعلق بھی آپ کو غلط فہمی ہے۔ یہ فرعون سے بنی اسرائیل کی سیاسی آزادی کا مطالبہ نہیں تھا بلکہ توریت میں تصریح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو قربانی کرنے کے لیے کسی ایسے مقام پر لے جانا چاہتے تھے جو بیابان میں تین دن کی راہ کے فاصلہ پر تھا۔ قرآن کے الفاظ سے اس کی تائید ہوتی ہے اور بلا دلیل توریت کے اس بیان کی تردید کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ کچھ لوگ حضرت یوسف علیہ السلام کے اسوہ کو دلیل قرار دے کر انگریزوں کی غلامی اور چاکری کو ثواب بتاتے ہیں اور کچھ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مطالبہ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ کو دلیل قرار دے کر موجودہ تحریک آزادی کو فرض دینی بناتے ہیں۔ اور ان میں سے کسی بزرگ کو اس بات پر غور کرنے کی توفیق نہیں ہوتی کہ آخر یہ کیا مذاق ہے کہ ایک نبی یہ پیغام لے کر آئے کہ فرعون کی نوکری کرو اور دوسرا پیغمبر یہ دعوت لے کر اٹھے کہ فرعون کے اقتدار سے آزادی حاصل کرو۔ اگر ان حضرات کی قرآن فہمی کا یہی حال ہو تو عجب نہیں کہ صریح کفر و شرک کو بھی یہ لوگ انبیاء کا لایا ہوا دین ثابت کر دیں۔

گناہ کبیرہ پر تکفیر

سوال:۔ ہم نے اپنی ایک جماعت بنائی ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہو جاتا ہے ہم فسق اور کفر میں کوئی فرق نہیں سمجھتے ہماری جماعت عام مسلمانوں کو وہی حیثیت دیتی ہے جو قرآن نے اہل کتاب کو دی ہے۔ مثلاً ہم شادی بیاہ جماعت کے اندر ہی کرتے ہیں، غیر جماعتی مسلمانوں سے لڑکیاں تو لے لیتے ہیں مگر اپنی لڑکیاں ان کے عقد میں نہیں دیتے۔

ہمارے اس عقیدہ اور طرز عمل کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ یہ صحیح ہیں یا غلط؟ اگر غلط ہوں تو تشفی بخش طریقہ پر ہماری غلطی ہم پر واضح فرمائیے۔

جواب:۔ تحقیق کرنے سے مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ آپ کی جماعت میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو دین کا صحیح علم اور تفقہ رکھتا ہو، اور اس کا ثبوت خود ان مسائل کی نوعیت سے بھی ملا۔ کیونکہ یہ مسائل آپ ہی ظاہر کر رہے ہیں کہ ان کو پیدا کرنے والا ذہن کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں نظر نہیں رکھتا۔ اب اگر میں یہ کہوں تو اس پر برا نہ مانا جائے بلکہ اسے اس حق نصیحت کی ادائگی سمجھا جائے جو ایک مسلمان کے لیے دوسرے مسلمان پر واجب ہے کہ علم دین کے بغیر دین کے مسائل میں رائیں قائم کرنا اور ان کو دین قرار دے کر انفرادی یا اجتماعی زندگی کے لیے اصول بنا لینا خود سب سے بڑا فسق اور تمام کبائر سے بڑھ کر کبیرہ ہے۔ اس لیے کہ ہم مسلمان اگر ہو سکتے ہیں تو اس دین پر ایمان لا کر اور اس کی پیروی کر کے ہو سکتے ہیں جو خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں پیش کیا گیا ہے۔

اور اس ایمان اور اتباع کا تقاضا یہ ہے کہ ہم جو کچھ بھی اصول اخذ کریں اور اپنے عقائد و اعمال کے لیے جن چیزوں کو بنیاد قرار دیں وہ سب کتاب اللہ اور سنت رسول سے ماخوذ ہوں۔ لیکن جو شخص یا گروہ قرآن اور سنت میں بصیرت اور تفقہ نہ رکھتا ہو اور اپنے رجحانات کی بنا پر کچھ رائیں قائم کر کے ان کو دین قرار دے لے وہ حقیقت میں دین کا پیرو تو نہیں ہے، اپنی آراء اور رجحانات کا پیرو ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے کبائر کی کیا حقیقت ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ دین پر ایمان لانے کے لیے جو مجمل علم کافی ہے اور دین کے موٹے موٹے اصول جاننے کے لیے قرآن کی عام فہم تعلیمات کا جو علم اور حدیث پر جو سرسری نظر کافی ہے، اسے مسائل دینی میں رائے قائم کرنے اور دینی طریق پر لوگوں کی رہنمائی کرنے کے لیے کافی سمجھ لینا غلطی ہے اور اسی غلطی کا نتیجہ وہ خطرناک بڑی غلطی ہے جس کی طرف اوپر میں نے اشارہ کیا ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب میں ان مسائل کا مختصر جواب دیتا ہوں جو آپ نے میرے سامنے پیش کیے ہیں:۔

کفر دراصل اس چیز کا نام ہے کہ کسی آدمی کے سامنے دین کو پیش کیا جائے یا دین اس کے سامنے پیش ہو اور وہ جان لے کہ یہ دین ہے اور پھر وہ اس کو ماننے یا اس کے مطالبات اور احکام میں سے کسی کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دے۔ نادانی کی حالت جس میں آدمی دین کو جانتا ہی نہ ہو اور اس وجہ سے اس کے خلاف زندگی بسر کر رہا ہو، کفر کی تعریف میں نہیں آتی بلکہ اس کو جاہلیت کہتے ہیں۔

پھر کفر کے متعلق یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو سے کفر اس منکرانہ اور باغیانہ حالت کو کہتے ہیں جو اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے خروج از ایمان ہو۔ دوسرے پہلو سے کفر اس غیر مسلمانہ حالت کو کہتے ہیں جس کے رونما ہونے پر ایک آدمی دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جائے گا اور مسلمانوں کی سوسائٹی سے اس کا تعلق کاٹ ڈالا جائے گا۔

پہلی قسم کے کفر کو معصیت کے ساتھ خلط ملط کرنا زیادتی اور خلاف قرآن ہے۔ اس میں شک نہیں کہ معصیت ایمان کی ضد ہے، لیکن مجرد معصیت، خواہ وہ کتنی ہی بڑی ہو، لازماً ایمان کے مستقل طور پر سلب ہو جانے کی موجب نہیں ہوتی۔ کافر کی طرح مومن سے بھی بڑے سے بڑا گناہ سرزد ہو سکتا ہے۔ البتہ جو چیز مومن کے گناہ اور کافر کے گناہ میں فرق کرتی ہے وہ یہ ہے کہ مومن جب گناہ کرتا ہے تو عین حالت گناہ میں تو ایمان اس سے نکلا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ شہوات نفس کے اس غلبے اور نادانی کے اس پردے سے، جو عارضی طور پر اس کے قلب پر پڑ گیا تھا، باہر نکل آتا ہے تو اس کو شرمساری لاحق ہوتی ہے، خدا سے نادم ہوتا ہے، آخرت کی سزا کا خوف کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ پھر اس سے ایسی حرکت کا ارتکاب نہ ہو۔ اس قسم کی معصیت خواہ کتنی ہی بڑی ہو آدمی کو کافر نہیں بناتی، صرف گناہ گار بناتی ہے، اور توبہ اس کو پھر ایمان کی طرف واپس لے آتی ہے۔ برعکس اس کے کافر کے گناہ کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ اسی گناہ گارانہ طرز عمل اور طرز زندگی کو اپنے لیے مناسب اور لذیذ اور درست سمجھتا ہے، اس کو خدا کی اور اس کے حکم کی کچھ پروا نہیں ہوتی کہ اس نے اس فعل کو گناہ اور حرام قرار دیا ہے، وہ پورے اصرار اور استکبار کے ساتھ اسی فعل کا ارتکاب کیے جاتا ہے، ندامت اس کے پاس نہیں پھٹکتی۔ یہ دوسری قسم کی گناہ گاری سلب ایمان کی موجب ہے اور یہ بجائے خود کبیرہ ہے خواہ اس جذبہ کے ساتھ کوئی ایسا کام کیا جائے جس کو عرف عام میں صغیرہ

سمجھا جاتا ہو۔ ان دونوں قسم کے گناہوں کو ایک ہی حیثیت دینا اور ان پر یکساں کفر کا حکم لگا دینا بالکل غلط ہے اور اس قسم کی افراط و تفریط جو کبیرہ کی تعریف میں کی گئی ہے۔ پہلی صدی سے آج تک بجز خارجیوں کے یا معتزلہ کے ایک گروہ کے اور کسی نے یہ رائے قائم نہیں کی ہے۔

اب دوسری قسم کے کفر کو لیجیے جو کسی انسان کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دینے اور مسلمانوں کی برادری سے اس کا رشتہ کاٹ دینے کے لیے کافی ہو۔ اس چیز کے متعلق جان لینا چاہیے کہ شریعت نے ایسی تکفیر کو بچوں کا کھلونا نہیں بنایا ہے۔ جس طرح کسی انسان کے جسمانی قتل کے لیے یہ شرط ہے کہ نظام اسلامی موجود ہو، با اختیار قاضی تمام شہادتوں اور پوری صورت حال پر اچھی طرح غور کر کے پوری تحقیق کے بعد یہ رائے قائم کرے کہ یہ شخص واجب القتل ہے تب اس کو قتل کیا جا سکتا ہے، اسی طرح ایک شخص کے روحانی قتل یعنی تکفیر کے لیے بھی یہ شرط ہے کہ اس کے اوپر جو الزام کفر لگایا گیا ہو اس کی ایک قاضی شرع پوری تحقیق کرے، اس کا اپنا بیان لے، اس کے اقوال و افعال کو جانچ کر دیکھے، شہادتوں پر غور کرے، اور اس کے بعد فیصلہ کرے کہ یہ شخص جماعت مسلمین سے کاٹ کر پھینک دینے کے قابل ہے۔ جہاں ایسا نظام موجود نہ ہو، نہ قضائے شرعی ہو اور نہ وہ شرائط جو تکفیر کے لیے ناگزیر ہیں پوری ہو سکتی ہوں، وہاں تکفیر کا فیصلہ کر دینا اور کسی شخص یا گروہ کو مسلم سوسائٹی سے خارج قرار دینا اگر صحت کا احتمال رکھتا ہے تو غلطی کا احتمال بھی رکھتا ہے، اور یہ افراد کے اور بے اختیار جماعتوں کے شرعی اختیارات سے باہر ہے، اور اس کا فساد اس فساد سے کچھ کم نہیں ہے جو غیر مومن لوگوں کے مسلم سوسائٹی کے ساتھ جڑے رہنے سے رونما ہوتا ہے۔

جو گروہ یا شخص واقعی دینی اصلاح چاہتا ہو اس کو چاہیے کہ پہلے جاہلوں، گناہ گاروں، اصلی کافروں اور مسلمانوں کی سوسائٹی سے کاٹ پھینکنے کے قابل منافقوں کے فرق کو اچھی طرح سمجھ لے اور ہر شخص و گروہ کے ساتھ نہیں بلکہ انصاف کے ساتھ ان کے معاملہ میں رائے قائم کرے کہ کس کی فی الواقع کیا پوزیشن ہے۔ پھر جاہلوں تک دین کا علم پہنچانے کی کوشش کرے اور جب وہ اپنے آپ کو خود مسلمان سمجھتے ہوں تو خواہ مخواہ انھیں یہ یقین دلانے کی کوشش نہ کرے کہ تم مسلمان نہیں ہو۔ اس کے بجائے اس کو ان سے یوں کہنا چاہیے کہ جب تم مسلمان ہو، اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو، مسلمان رہنا چاہتے ہو تو جانو کہ اسلام کیا ہے اور جان کر اس کی پیروی کرو۔ جن لوگوں کو گناہ گاری کی حالت میں پائے ان کو خدا کا خوف دلائے اور ان کے اندر ایمان کی جو چنگاری دبی ہوئی ہے اس کو بھڑکانے کی کوشش کرے۔ جن لوگوں کے اندر وہ کفر محسوس کرے ان کو کافر کہنے اور ان کی تکفیر کا اعلان کرنے پر اصرار نہ کرے بلکہ اپنی جگہ یہ سمجھ کر کہ یہ لوگ حالت کفر میں مبتلا ہیں ان کو ایمان کی دعوت دے اور حکمت و موعظت حسنہ سے ان کے دلوں میں ایمان اتارنے کی سعی کرے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی طبیب کسی شخص کے اندر دق کی بیماری محسوس کرے تو اس کا اپنی جگہ یہ سمجھ لینا اور جان لینا ضروری ہے کہ یہ دق میں مبتلا ہے کیونکہ اس کے بغیر تو اس کا علاج ہی نہیں کیا جا سکتا، لیکن ایک طبیب کے لیے اس سے بڑی اور کوئی حماقت نہیں ہو سکتی کہ وہ جس کسی میں دق محسوس کرے اس کے منہ پر بھی پھٹ سے کہہ دے کہ تو دق میں مبتلا ہے۔ یہ اس کے علاج کا نسخہ تو نہیں ہے بلکہ مار دینے کا نسخہ ہے۔

رہے وہ لوگ جو صریح طور پر اس قابل نظر آتے ہیں کہ مسلمانوں کی سوسائٹی سے ان کو کاٹ پھینکا جائے، ان کے معاملہ میں صحیح طرز عمل یہ ہے کہ جب قضائے شرعی موجود نہیں ہے اور ایسا نظام نافذ نہیں ہے کہ جو شخص اسلامی نظام جماعت سے نکال دینے کے قابل ہے اس کو واقعی نکال دیا جائے تو تکفیر اور خروج از ایمان کے اعلانات کرنے سے پرہیز کیا جائے اور صرف اس بات پر اکتفا

کیا جائے کہ اہل ایمان خود ہی ایسے لوگوں سے ولایت اور محبت کے تعلقات اور دوستی و ہم نشینی ترک کر دیں، مگر تبلیغ کے لیے ملنے کا دروازہ کسی حال میں بند نہ کرنا چاہیے۔

شادی بیاہ کے متعلق آپ کے طرزِ عمل کی بنیاد بھی غلط فہمی ہے جو تکفیر کے باب میں آپ لوگوں کو لاحق ہوئی ہے اور اس کے دور ہو جانے سے یہ سوال خود بخود حل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں مزید توضیح کے لیے اتنا کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ مسلم سوسائٹی اس وقت پائی جاتی ہے اس کو جملۃً واحدہ قرار دے کر اس پوری سوسائٹی کو ایک ہی لکڑی ہانک دینا بڑی زیادتی ہے اور ایک غیر شرعی طرزِ عمل ہے۔ اس سوسائٹی میں ہر طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو سچے مومن، دیندار اور صالح ہیں، وہ بھی جو جاہلیت میں مبتلا ہیں، وہ بھی جن کے اندر کفر پایا جاتا ہے، اور وہ بھی جو اس قابل ہیں کہ انھیں مسلم سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جائے مگر اس وقت محض نظامِ اسلامی نہ ہونے کی وجہ سے ان کو کاٹا نہیں جا سکتا۔ ان سب کو ایک گروہ قرار دے کر ان سے اہلِ کتاب کا سا معاملہ کرنا آخر کس شریعت کی رو سے صحیح ہے؟ ان میں جو لوگ مومن اور دیندار ہیں ان سے شادی بیاہ کے تعلقات محض اس وجہ سے منقطع کرنا کہ وہ آپ کی جماعت میں نہیں آتے ہیں، بیجا تعصب نہیں تو اور کیا ہے؟ اس قسم کی تفریق کرنے کا شریعت نے آپ کو حق نہیں دیا ہے۔ رہے جاہلیت میں پڑے ہوئے لوگ اور وہ لوگ جو فسق و فجور اور کافرانہ خصائل میں مبتلا ہیں، تو ان سے فی الواقع شادی بیاہ کے تعلقات قائم نہیں کرنے چاہییں، مگر اس بنا پر کہ وہ سب کے سب کافر ہیں بلکہ اس بنا پر کہ شریعت میں ہم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم شادی بیاہ کے معاملات میں سب سے پہلے آدمی کے دین اور تقویٰ کو دیکھیں۔

غالباً جس چیز نے آپ لوگوں کو اپنی جماعت سے باہر کے تمام مسلمانوں سے اہلِ کتاب کا سا معاملہ کرنے پر آمادہ کیا ہے وہ التزامِ جماعت کے متعلق احادیث کے وہ احکام ہیں جن کی رو سے جماعتی زندگی ہی اسلامی زندگی ہے اور جماعت کے بغیر جو زندگی ہے وہ جاہلیت کی زندگی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آپ حضرات اچھے خاصے صالح مسلمانوں کو بھی جو آپ کی جماعت سے باہر ہیں من شذ شذ فی النار کا مصداق ٹھیرا کر انھیں بیٹیاں دینا جائز نہیں سمجھتے۔ لیکن اگر یہ آپ کا خیال ہے تو قطعاً ایک غلط خیال ہے۔ حدیث میں جس جماعت کو یہ حیثیت دی گئی ہے کہ اس سے علیحدگی اسلام سے علیحدگی کی ہم معنی ہے وہ "الجماعۃ" ہے نہ کہ کوئی جماعت جسے چند مسلمان مل کر بنالیں۔ اور "الجماعۃ" کا اطلاق صرف اس جماعت پر ہو سکتا ہے جو:

(۱) خالص اقامتِ دین کے لیے بنی ہو یعنی جس کے وجود کا مقصد ہی یہ ہو کہ خدا کے دین کو بحیثیت ایک نظامِ زندگی کے عملاً قائم کرے۔

(۲) جس میں اہلِ ایمان کا سوادِ اعظم شامل ہو۔

(۳) جس کے ہاتھوں دین کے وہ تمام کام انجام پا رہے ہوں جن کی خاطر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ دنیا میں کلمۃ اللہ قائم ہو۔

ایسی جماعت اگر موجود ہو تو اس سے انقطاع یقیناً دین سے انقطاع ہے اور اس شخص کا ایمان و اسلام ہرگز معتبر نہیں ہے جو اس سے علیحدہ ہو یا علیحدہ رہے۔ لیکن اس نظامِ جماعت کے درہم برہم ہو جانے اور امت کا شیرازہ بکھر جانے کے بعد جو جماعتیں اس غرض سے بنائی جائیں کہ "الجماعت" کے فقدان کی تلافی ہو، ان میں سے کسی کو بھی الجماعت کے شرعی حقوق و اختیارات اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ عملاً الجماعت کے مرتبے پر نہ پہنچ جائے۔ آپ خواہ کتنے ہی صالح اور نیک نیت اور آپ کا مقصد خواہ ٹھیک ٹھیک وہی ہو جو انبیا علیہم السلام کی بعثت کا مقصد تھا، اور آپ کے اصولِ اجتماع بھی وہی ہوں

جو اسلامی نظامِ جماعت کے اصول ہیں، بہرحال شریعت آپ کو یہ حق ہرگز نہیں دیتی کہ آج آپ چند آدمی مل کر ایک جماعت بنائیں اور کل یہ اعلان کر دیں کہ دنیا بھر کے وہ سارے مسلمان غیر مسلم ہیں جو آپ کی اس جماعت میں شامل نہیں ہیں اور ہر اس مسلمان کی موت جاہلیت کی موت ہے جس کی گردن میں آپ کے امیر کی بیعت کا حلقہ نہیں ہے۔ اس طرح کا رویہ آپ اختیار کریں گے تو اپنے شرعی حقوق سے تجاوز کریں گے اور اصلاح کے بجائے امت کے اندر مزید خرابیوں کے موجب بنیں گے۔ آپ خود ہی ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ آخر اس بیچارے صادق الایمان و صالح العمل مسلمان کے کافر ہونے کی کیا وجہ ہے جو استکبار و نفسانیت کی بنا پر نہیں، بلکہ ناواقفیت یا عدم اطمینان کی وجہ سے آپ کی جماعت میں شامل نہیں ہوتا؟ اور اس بات کی کونسی معقول وجہ ہے کہ جماعت بنانے کا حق صرف آپ کو حاصل ہو اور دوسرے مسلمانوں کو نہ ہو؟ دورِ انتشار میں تو اصلاح کی کوشش کرنے والا گروہ لازماً ایک ہی نہیں ہوتا، بلکہ بیک وقت ایسے بہت سے گروہ موجود ہوتے ہیں اور ہو سکتے ہیں جو صحیح مقصد کے لیے صحیح طریقہ پر کام کر رہے ہوں۔ اور بکثرت افراد ایسے بھی ہوتے ہیں اور ہو سکتے ہیں جو ایک مدت تک یہی فیصلہ نہ کر سکیں کہ ان میں سے کسی کے ساتھ شامل ہوں یا نہ ہوں اور شامل ہوں تو کس کے ساتھ ہوں۔ اس حالت میں کسی گروہ کا اپنے لیے وہ حقوق ثابت کرنا جو شریعت میں صرف الجماعت کو دیے گئے ہیں، جھوٹ بھی ہے اور فساد انگیز بھی۔ ایسے دعوے کرنے کے بجائے ہر گروہ کو اپنی اپنی جگہ کام کرنا چاہیے، اور اپنے دل میں یہ مخلصانہ خواہش رکھنی چاہیے کہ کسی طرح پھر وہی الجماعت وجود میں آ جائے جو عہدِ خلافتِ راشدہ میں موجود تھی، اور ہمیشہ اس بات سے چوکنا رہنا چاہیے کہ کہیں اس کی اپنی گروہ بندی اس الجماعت کی پیدائش میں مددگار ہونے کے بجائے الٹی مانع و مزاحم نہ ہو جائے۔

خدا کے ناقص الاعضا بندوں کی حیثیت

سوال:۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا تعالیٰ کسی نفس پر ظلم نہیں کرتا۔ اس عقیدہ کی بنیاد پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کو حق تعالیٰ پیدائشی طور پر کیوں اندھا، لنگڑا، لولا یا احمق بنا دیتا ہے؟ اگر اسے نطفہ کی خرابی پر محمول قرار دیا جائے تو بھی یہ اعتراض باقی رہتا ہے کہ ماں باپ کے اندر اگر کوئی نقص تھا تو اس کی سزا بچہ کو کیوں ملے؟ آخر کیا ناکارہ اور عیب دار ہستی پیدا کرنا خدا کے احسن الخالقین ہونے پر ایک دھبہ نہیں ہے؟

جواب:۔ جو سوال آپ نے ہم سے پوچھا ہے بعینہٖ یہی سوال حضرت مسیح علیہ السلام سے پوچھا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مادرزاد اندھوں کو کس لیے پیدا کیا؟ حضرت نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: ”اس لیے تاکہ آنکھ والوں کو سجھائی دے۔“ حضرت کے اس ارشاد سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں:۔

پہلی یہ کہ مادرزاد اندھے، لنگڑے اور بہرے عبرت اور تعلیمِ خلق کے لیے پیدا کیے گئے ہیں تاکہ جن کو اللہ تعالیٰ نے آنکھ کان اور صحیح سالم اعضا و جوارح کے ساتھ پیدا کیا ہے وہ مغرور نہ ہوں اور ان قوتوں کو پاکر زمین میں فساد نہ پیدا کریں، بلکہ ہر دم ان قوتوں کے بخشنے والے کے شکرگزار رہیں اور یاد رکھیں کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کو بھی ان اعضا سے محروم کر سکتا تھا اور پھر وہ کسی طرح بھی ان نعمتوں کو حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ یہ تعلیمِ شکر تمام تعلیموں میں سب سے اعلیٰ اور تمام نیکیوں کی بنیاد ہے۔ اس وجہ سے

خدا نے ہماری اصلاح کے لیے اس کا انتظام خود اس دنیا کے نظام کے اندر کر دیا ہے (یعنی یہ صورتیں اگرچہ دنیا کے طبیعی نظام علت و معلول کے تحت واقع ہوتی ہیں مگر ان سے ایک بڑا اخلاقی فائدہ از خود حاصل ہوتا ہے) اور اس اہم کام کو بالکلیہ ہمارے مدرسوں اور یونیورسٹیوں پر نہیں چھوڑا ہے۔

دوسری یہ کہ یہ لوگ کسی جرم کی پاداش میں اندھے بہرے نہیں بنائے گئے، بلکہ جس طرح امیر و غریب، کمزور و قوی، ہر طرح کے لوگ پیدا کیے گئے ہیں، اسی طرح یہ لوگ خلق کی رہنمائی کے لیے خدا کی طرف سے سرکاری ڈیوٹی پر مامور ہیں اور قیامت کے دن ان کے اس نقص اور محرومی کی تلافی کی جائے گی اور ان میں سے جو شخص جس درجہ میں اللہ کی نعمتوں سے محروم ہے اسی قدر وہ یقیناً حاصل کرے گا اور اس سے جو پرسش ہوگی اس الاؤنس کے بعد ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان لوگوں کا جو درجہ ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ایک حدیث قدسی میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کے بھیس میں خلق کی آزمائش کے لیے اترتا ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ قیامت کے روز لوگوں سے فرمائے گا کہ میں تمہارے دروازہ پر بھوکا آیا تو تم نے مجھے نہیں کھلایا، وغیرہ وغیرہ الیٰ آخر الحدیث۔ اور جب لوگ جواب دیں گے کہ اے پروردگار تو کیسے بھوکا اور بیمار ہو سکتا ہے تو پروردگار فرمائے گا کہ تمہارے دروازے پر جو فلاں سائل آیا تھا وہ میں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر صالح سوسائٹی میں ان لوگوں کے لیے سب سے زیادہ احترام ہے، بلکہ سوسائٹی کا نظم ہوتا ہی دراصل ایسے لوگوں کی خدمت کے لیے ہے۔ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کی حکومت اس کی بہترین مثال ہے جس میں سب سے زیادہ حقدار وہ سمجھا جاتا تھا جو سب سے زیادہ محتاج ہو۔ اس عہد میں جو لوگ اس رمز الٰہی کو سمجھتے تھے ان کا حال یہ تھا کہ جب کسی اندھے بہرے کو دیکھتے، اپنی اچھی حالت پر خدا کے شکر میں سجدہ میں گر جاتے اور جب اس طرح کے لوگوں کی مدد کرتے تو جھک کے مدد کرتے اور اپنے دینے پر فخر کرنے کے بجائے ان کے قبول کرنے پر ان کے ممنون ہوتے، کیونکہ وہ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ معذورین خدا کی طرف سے خلق کی تعلیم کی ڈیوٹی پر مامور ہیں اور ان میں وہ لوگ بھی ہیں جن کی آستینوں میں خدا کا ہاتھ چھپا ہوا ہے۔

قدرت الٰہی کے ان مظاہر کی وجہ سے جو لوگ خدا کے احسن الخالقین ہونے پر معترض ہوتے ہیں، ان کی نگاہ میں دو طرح کے نقص ہیں۔ ایک یہ کہ وہ دنیا پر بحیثیت مجموعی نگاہ نہیں ڈالتے، ان کی نظر صرف اجزا پر رہتی ہے اور انھیں ان کے فریم کے اندر رکھ کر انھوں نے کبھی نہیں دیکھا ہے۔ کسی حسین رخسار کے تل کو اگر اس کی جگہ سے الگ کر کے دیکھیے تو وہ ایک سیاہ داغ نظر آئے گا، حالانکہ وہی چیز اپنی جگہ پر ایک صاحب ذوق کے لیے غارت گر ہوش و ایمان ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر ان اندھوں اور لنگڑوں کو اس دنیا کے نظام مجموعی سے الگ کر کے دیکھیے تو یہ دنیا پر داغ نظر آتے ہیں، لیکن اگر اس کے مجموعہ میں ان کی جگہ پر رکھ کے دیکھیے اور اس مقصد پر بھی نگاہ ڈالیے جو اس مجموعہ سے ان سے پورا ہو رہا ہے تو یہ آپ کو انگشتری پر نگینہ سے بھی زیادہ خوبصورت دکھائی دیں گے۔ اس دنیا میں کوے اور چیل کی چیخ بھی ہے اور بلبل کا نغمہ بھی اور ان دونوں کے اتار چڑھاؤ اور زیر و بم کے اندر اس ارغنون ہستی کے نغمہ کی اصل دلکشی چھپی ہوئی ہے۔

دوسرا نقص یہ ہے کہ ان لوگوں کی نظر کسی چیز کے صرف مادی پہلو تک محدود رہتی ہے۔ اس کی گہرائیوں کے اندر اتر کر اس کی اخلاقی اور روحانی قدروں کا اندازہ نہیں کرتی۔ ایک پتھر ذرا کھردرا نظر آیا اور ان کی نظروں سے گر گیا، حالانکہ صاحب نظر اس کھردرے پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتا ہے۔ امید ہے کہ ان اشارات سے آپ کی تشفی ہو جائے گی۔

آپ نے یہ جو ارشاد فرمایا ہے کہ نطفہ کے ذریعے سے والدین کے جسمانی و ذہنی عیوب و نقائص کا انتقال اولاد میں ہونا ناانصافی ہے، تو اس کی اساس بھی کائنات کے مجموعی نظم و مفاد کو نظر انداز کرکے غور کرنے پر ہے۔ اچھا اب فرض کیجیے کہ آپ کا مجوزہ انصاف دنیا میں نافذ کر دیا جائے اور بیج کے اثرات سے پودے کو اور نطفہ کے اثرات سے حیوانی بچوں کو آزاد کر دیا جائے تو نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ کہ گندم سے جو اور جو سے گندم پیدا ہونے لگے، گدھے سے خرگوش اور اونٹ سے مینڈک اور مچھلی سے آدمی پیدا ہونے لگے۔ بیٹے کی آنکھیں، باپ کی ٹانگیں، دادا کی ناک، بچے کی پیٹھ پر لگ گئیں، ماں کی ناک چہرے پر تھی، بچے کی پیٹھ پر جا لگی۔ دادا کے تمام صفات ۔۔۔ تھے اور پوتے صاحب ان میں سے بھی محروم ہیں۔ کسی کا قد بارہ فٹ ہو اور کسی کا چھ انچ۔ کوئی گوشت خور درندوں کی نسل سے پیدا ہو اور کوئی گھاس کھانے والا جو پایہ بن سکے۔ ۔۔۔ قانونِ توارث کو اگر اس نظام کائنات میں معطل کر دیا جائے تو پھر تو کوئی ہست و بود کا نظام ہی نہیں رہ سکے گا کہ انھیں ایک نوع یا جنس میں شمار کیا جا سکے۔ پس اللہ تعالیٰ نے جو قانون نافذ فرمایا ہے بہ حیثیت مجموعی یہی کائنات اور انسانی دنیا کے لیے مفید ہے اور محض چند جزئی ناخوشگواریوں کی وجہ سے اسے غلط یا نہیں قرار دیا جا سکتا۔

ختم قلوب کا مفہوم

سوال: ایک ہندو دوست اسلام لے دروازے پر کھڑا یہ اعتراض کرتا ہے کہ آیت خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ کے ماتحت کوئی شخص راہ ضلالت پر چلتا ہے تو اس کا اپنا کوئی قصور نہیں بلکہ (نعوذ باللہ) قصور اللہ کا ہے۔ اس صورت میں جزا و سزا بے معنی ہے۔

جواب: قرآن حکیم کے بیان کردہ اصول و سنن پر اطلاع حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ گہری بصیرت کے ساتھ ان پر تدبر کیا جائے اور قرآن کی ساری تعلیمات کو مجموعی طور پر سامنے رکھ کر آیات کا مفہوم متعین کیا جائے۔ آیت زیر بحث پر جو اشکال وارد کیا گیا ہے وہ انہی شرائط اولیہ کا لحاظ نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ ورنہ ایک صاحب فہم و بصیرت کے لیے اس میں کوئی اشکال نہیں۔

کسی فعل کی نسبت کسی کی طرف مختلف اعتبارات سے ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ نے ہدایت و ضلالت کو اپنی طرف منسوب کیا ہے اس سے مقصود نفس اس فعل کی نسبت نہیں بلکہ اس قانون کی نسبت ہے جو اس نے ہدایت و ضلالت کے لیے بنا دیا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ خدا نے بلحاظ فطرت تمام انسانوں کو یکساں نیکی اور بدی الہام فرمائی ہیں۔ سو جو لوگ اپنے اختیار سے نیکی کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کو نیکی کی توفیق عطا فرماتا ہے اور جو لوگ بدی اور سرکشی کی راہیں اختیار کرتے ہیں ان پر بدی کی راہیں فراخ کی جاتی ہیں۔ پھر اگر وہ بدی میں اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ نیکی کی طرف لوٹنے کا امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا تو ان سے نیکی کی وہ صلاحیت (بھی) سلب ہو جاتی ہے جو ان کو ابتداءً فطرت میں عطا ہوئی تھی۔ اسی چیز کو قرآن نے "ختم قلوب" سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ مذکورہ قانون الٰہی کے مطابق واقع ہوتا ہے اور یہ قانون عین حکمت و عدل کے مطابق ہے۔ اور اسی وجہ سے خدا کو حق حاصل ہے کہ وہ لوگوں کو ان کی گمراہیوں پر سزا دے اور نیکیوں پر جزا۔ قرآن میں جہاں خدا کی مطلق مشیت کا بیان ہوتا ہے یا مطلق اضلال کا ذکر ہوتا ہے وہاں اس کی قدرت کاملہ اور اس کے بلا شرکت غیرے تصرف کا بیان مقصود ہوتا ہے، اس کی حکمت اور اس کے مذکورہ قانون عدل کی نفی مقصود نہیں ہوتی۔

ایک آیت قرآنی سے غلط استدلال

سوال: - سورۂ ہود کی حسب ذیل آیات مہدویوں کے نزدیک بڑی اہم ہیں جن سے حضرت سید محمد جونپوری کی مہدویت کا ثبوت نکالا جاتا ہے:-

أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِن قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۚ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۚ وَمَن يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ ۚ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ -

اس آیت میں "بَيِّنَةٍ" "يَتْلُوهُ شَاهِدٌ" اور "كِتَابُ مُوسَىٰ" کو ایسی خصوصیات کا حامل سمجھا جاتا ہے جن کی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ "أَفَمَنْ" کے "مَنْ" سے کوئی خاص ہستی ہی مراد لی جاسکتی ہے، نہ کہ کوئی غیر معین شخص۔ آگے چل کر "فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ" میں چونکہ خطاب خود رسول اللہ سے ہے کہ آپ اس بارے میں شک میں نہ پڑیں تو اس سے یہ حجت قائم کی جاتی ہے کہ "فَمَنْ" کے "مَنْ" سے ذات رسول مراد نہیں لی جاسکتی بلکہ یہاں اشارہ ذات مہدی کی طرف ہے۔

ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے آیت کی تشریح فرمایئے۔

جواب: - آپ نے یہ نہیں ظاہر فرمایا کہ مہدوی اس آیت سے کس طرح استدلال کرتے ہیں۔ اس وجہ سے جواب میں ان کے دلائل کو پیش نظر رکھنا مشکل ہے۔ البتہ ہم آیت کی صحیح تاویل بالاختصار بیان کر دیتے ہیں، اس سے غلط توہمات کی بنیاد خود بخود ڈھے جائے گی۔

اس آیت سے اوپر کی آیات میں، کفار قرآن کی جو مخالفت کر رہے تھے اس کا بیان اور ساتھ ہی اس کا جواب ہے، اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ کون لوگ اس کتاب پر ایمان لائیں گے اور کون لوگ نہیں ایمان لائیں گے۔ اس کی تفصیل یوں بیان فرمائی:

أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ الآیۃ (کیا وہ لوگ جو اپنے رب کی جانب سے ایک بصیرت رکھتے ہوں اور اس کے بعد ان کے سامنے ایک شاہد آئے خدا کی جانب سے اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب امام اور رحمت بن کر آچکی ہے۔ وہی لوگ اس پر ایمان لائیں گے اور جو اس کا انکار کریں گے جماعتوں میں سے تو جہنم ان کی وعدہ گاہ ہے۔ پس تم اس کی طرف سے شک میں نہ پڑو وہی حق ہے تمہارے رب کی جانب سے لیکن اکثر لوگ ایمان نہ لائیں گے (۱۷، ہود)

اس میں ایمان لانے والی جماعت اور اس کے وجوہ ایمان کی وضاحت کر دی گئی ہے لیکن ایمان نہ لانے والوں کے صرف انجام کو بیان کیا گیا ہے، ان کے ذکر کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مقابل کا ذکر دوسرے مقابل پر خود دلیل تھا اور استفہامیہ جملوں میں یہی اسلوب عام ہے اور اس کی مثالیں قرآن مجید میں بکثرت ہیں۔ اگر اس محذوف کو ظاہر کر دیا جائے تو پوری عبارت یوں ہوگی "کیا وہ لوگ جو اپنے رب کی جانب سے بصیرت رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو بصیرت سے محروم ہیں یکساں ہوں گے؟ — دونوں اس قرآن کے باب میں یکساں نہیں ہوسکتے۔ اس پر ایمان صرف پہلا گروہ لائے گا۔" اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اندر اولاً تو خدا کی بخشی ہوئی بصیرت موجود ہے جس سے وہ سمجھتے ہیں کہ اس دنیا کا ایک خالق ہے، وہ وحدہٗ لاشریک ہے، اس کی

شکر گذاری واجب ہے، وہ انسان کو شتر بے مہار نہیں چھوڑے گا بلکہ اس نے جزا کا ایک دن ضرور مقرر کیا ہے اور اس دن نیکو کار
اپنی نیکیوں کا اور بدکار اپنی بدیوں کا بدلہ پائیں گے۔ ثانیاً ان کے پاس خدا کی طرف سے ایک شاہد آکر انہی حقیقتوں کی شہادت دیتا
ہے اور وہ اپنی فطری بصیرت سے جن باتوں کو خود حق خیال کرتے تھے انہی کو وہ مزید مبرہن، مدلل اور آشکارا کرتا ہے۔ اس
ہم آہنگی کی وجہ سے وہ اس سے کوئی بیگانگی نہیں محسوس کرتے بلکہ اس کو اپنا دردآشنا اور اپنے ہی دل کی بات کہنے والا
سمجھتے ہیں۔ ثالثاً وہ دیکھتے ہیں کہ اس سے پہلے تورات آچکی ہے جو اسی طرح آسمانی وحی کا صحیفہ ہے، اس میں اس کی پیشینگوئیاں
درج ہیں اور اس کی تعلیمات میں اصولاً کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ بصیرت اور وحی الٰہی کی اس کے ساتھ مطابقت اور پھر تورات
کی ان ساری باتوں کی طرف امام (Guide) کی طرح رہنمائی ان کے لیے کسی بحث وجدال کا موقع نہیں چھوڑتی اور
وہ تمہاری باتوں پر سنتے ہی ایمان لاتے ہیں۔ باقی رہے وہ لوگ جو اپنی فطرت کو مسخ کر چکے ہیں اور تمہاری باتیں سرے سے سننے
ہی نہیں ہیں اور تورات کو بھی پس پشت ڈالے ہوئے ہیں ان سے ایمان کی توقع نہ رکھو۔ یہ سب لوگ خواہ کفار قریش میں سے
ہوں یا یہود میں سے یا نصاریٰ میں سے، سب کا ٹھکانا جہنم ہے اور ان سب کی متحدہ مخالفت کی وجہ سے تمہارے دل میں یہ
گمان نہ گذرے کہ تمہاری دعوت ہی میں کوئی غلطی ہے۔ تمہارے رب کی طرف سے اترا ہوا حق تو یہی ہے جو تم پیش کر رہے ہو لیکن
ان میں سے اکثر ایمان نہیں لائیں گے۔

یہ آیت کا سیدھا سادہ مطلب عرض ہوا ہے۔ اب اس کے بعد اسی سورہ سے ہم اس آیت کے شواہد نقل کرتے ہیں تاکہ یہ واضح ہو جائے
کہ آیت کا جو مطلب ہم نے بیان کیا ہے قرآن کے دوسرے مواقع سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ
مِنْ رَبِّي وَآتَانِي رَحْمَةً مِنْ عِنْدِهِ فَعُمِّيَتْ
عَلَيْكُمْ أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَأَنْتُمْ لَهَا كَارِهُونَ

کہا اے میری قوم کے لوگو! بتاؤ تو سہی اگر میں بینہ پر ہوں اپنے
رب کی جانب سے اور اس نے مجھے بخشی اپنے پاس سے رحمت
اور وہ تم سے پوشیدہ ہو جائے تو کیا ہم اس کو تم پر زبردستی چپکا سکتے
ہیں درانحالیکہ تم اس سے نفرت کر رہے ہو۔

اس آیت میں "بینہ" سے مراد وہ فطری بصیرت ہے جو نبی میں بعثت سے پہلے موجود ہوتی ہے اور رحمت سے مراد وحی ہے
جو اس کی فطرت کے بالکل مطابق ہوتی ہے اور جس سے انکار کرنا اپنی فطرت سے لڑنے کے ہم معنی ہے۔ نبی کی قوم میں سے جن
لوگوں کی فطرت مسخ نہیں ہوتی ہے وہ بھی اس وحی کو اپنے دل کی صدا ہی سمجھ کر قبول کرتے ہیں، البتہ جو لوگ اپنی فطرت کو مسخ کر لیتے ہیں
ان کے اندر اس روشنی کے نفوذ کے لیے کوئی راہ باقی نہیں رہتی، اور کسی کے بس میں نہیں ہے کہ وہ وحی کی تعلیمات کو ان کے اوپر
چپکا سکے۔

حضرت صالح فرماتے ہیں:۔

قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ
مِنْ رَبِّي وَآتَانِي مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَنْصُرُنِي مِنَ
اللَّهِ إِنْ عَصَيْتُهُ

کہا اے قوم بتاؤ تو سہی اگر میں ایک بینہ پر ہوں اپنے رب کی جانب سے
اور وہ اپنے پاس سے مجھے رحمت بخشے تو اس کے بعد اگر میں اس
کی نافرمانی کروں گا تو کون اس کے مقابلہ میں میری مدد کرے گا۔

یعنی فطرت اور وحی دونوں کی رہنمائی کے بعد بھی اگر میں خدا کی نافرمانی کروں تو خدا کے غضب سے مجھے کون بچا سکے گا۔

حضرت شعیب علیہ السلام فرماتے ہیں:

قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَى بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّي وَرَزَقَنِي مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا — کہا اے قوم بتاؤ تو سہی اگر میں اپنے رب کی جانب سے ایک بینہ پر ہوں اور وہ مجھے بخشے اپنی طرف سے اچھی روزی۔

اس آیت میں بھی بینہ سے مراد فطری بصیرت ہے البتہ وحی کے لیے رزق حسن کا لفظ یہاں آیا ہے اور وحی کی یہ تعبیر قرآن میں بھی موجود ہے اور اگلے صحیفوں میں بھی کلام الٰہی کو رزق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ آدمی صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خدا کی طرف سے آتا ہے۔

تلا یتلو کے ۲ معنی ہو سکتے ہیں۔ تلاوت کرنا اور کسی شے کا کسی چیز کے پیچھے آنا۔ یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں۔ اگر تلاوت کے معنی لیے جائیں تو ضمیر مفعول کا مرجع مَا يُوحَى إِلَيْكَ ہوگا جس کا ذکر آیت ۲ میں بھی ہوا ہے۔ اور بعد میں آیات ۱۳، ۱۴ میں بھی ہے۔ اور پیچھے آنے کے معنی لیے جائیں تو ضمیر کا مرجع بینہ کا لفظ ہوگا۔ اور باعتبار مفہوم ضمیر مذکر کی لائی گئی ہے جو عربی زبان اور قرآن میں معروف ہے یعنی بینہ سے برہان اور دلیل وغیرہ مراد لیں گے۔

شَاهِدٌ سے مراد حضرت جبریل بھی ہو سکتے ہیں اور آنحضرت صلعم بھی اور وحی الٰہی بھی، اور یہ تینوں باعتبار حقیقت ایک ہیں۔ آنحضرت صلعم کے لیے شاہد حضرت جبریل امین ہیں اور دوسروں کے لیے آنحضرت صلعم اور قرآن حکیم۔

مَنْ سے مراد یہاں کوئی خاص شخص نہیں ہے۔ اولاً تو مَنْ سے کسی خاص شخص کو مراد لینا عربیت کے خلاف ہے۔ اصلاً یہ نکرہ کے لیے آتا ہے۔ ثانیاً یہاں اس بات کی تصریح ہوگئی ہے کہ مَنْ سے مراد یہاں جماعت ہے کیونکہ أُولَئِكَ کا اشارہ مَنْ کی طرف ہے اور أُولَئِكَ جمع کے لیے ہے نہ کہ واحد کے لیے۔ چنانچہ فعل بھی يُؤْمِنُونَ جمع استعمال ہوا ہے۔

فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِنْهُ میں ضمیر مجرور کا مرجع مَا يُوحَى إِلَيْكَ ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے (۲ت) آنحضرت صلعم کو اس وحی الٰہی کے منجانب اللہ ہونے میں شک نہیں تھا لیکن اس کی مخالفت اس شدت و قوت کے ساتھ اور پوری قوم کی طرف سے ایسی ہم آہنگی کے ساتھ ہو رہی تھی کہ آنحضرت صلعم کا عزم تبلیغ اس متحدہ مخالفت کے مقابل میں ضعیف ہو رہا تھا، اور جیسا کہ فطرت انسانی کا خاصہ ہے کہ سورج کی طرح واضح بات بھی اگر اس کی متحدہ مخالفت کی جائے تو کہنے والے کی نظر میں دھندلی ہونے لگتی ہے۔ اس وجہ سے اس موقع پر سخت ضرورت تھی کہ آنحضرت صلعم کے عزم و یقین کو پابرجا رکھنے کے لیے آپ کو تسلی دی جائے۔ چنانچہ اس آیت کے اوپر کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کس قدر سخت حالات سے آنحضرت صلعم دوچار تھے اور آپ کے قلب کی پریشانیوں کا کیا حال تھا (فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوحَى إِلَيْكَ وَضَائِقٌ بِهِ صَدْرُكَ أَنْ يَقُولُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ أَوْ جَاءَ مَعَهُ مَلَكٌ ۚ إِنَّمَا أَنْتَ نَذِيرٌ)

اس آیت کی نظیر اس سے پہلے والی سورہ، سورہ یونس میں موجود ہے جس سے اس مفہوم کی مزید تشریح ہو جاتی ہے۔ فَإِنْ كُنْتَ فِي شَكٍّ مِمَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ فَاسْأَلِ الَّذِينَ يَقْرَءُونَ الْكِتَابَ، لَقَدْ جَاءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَتَكُونَ مِنَ الْخَاسِرِينَ إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ

(اگر تم شک میں ہو اس چیز کے متعلق جو ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے تو ان لوگوں سے پوچھو جو تم سے پہلے سے کتاب کی تلاوت کر رہے ہیں (یعنی اہل کتاب) تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق آیا ہے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ بنو اور نہ بنو ان لوگوں میں سے جنھوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی ہے کہ نامرادوں میں سے ہو جاؤ۔ بے شک جن لوگوں پر تیرے رب کا کلمہ حق ہو چکا ہے وہ اس کتاب پر ایمان نہیں لانے کے)

اس طرح کے مواقع پر شک اور تذبذب وغیرہ کی جو نسبت نبی کی طرف کی جاتی ہے اس کی ایک وجہ تو وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان مواقع میں نبی بحیثیت اپنی امت کے وکیل کے مخاطب ہوتا ہے اور امت میں بہتیرے ایسے ہو سکتے ہیں کہ دوسروں کی متحدہ مخالفت کے سبب ان کی نظروں میں وہ حق مشتبہ ہو جائے جس پر وہ ایمان لائے ہیں۔ یہ حالت نیک نیت سے نیک نیت انسان پر بھی طاری ہو سکتی ہے۔ ایک نیک نیت آدمی جب دیکھتا ہے کہ جس بات کو وہ مان رہا ہے اس کے سوا سب اس کے خلاف ہیں اور پوری قوت کے ساتھ اس کی تکذیب کر رہے ہیں تو کبھی کبھی اس کا یقین بھی متزلزل ہونے لگتا ہے کہ ممکن ہے میں ہی غلطی پر ہوں۔ اس طرح کے مواقع میں نبی پر جو اظہار عتاب ہوتا ہے اگرچہ ظاہر میں اس کا خطاب نبی کی طرف ہوتا ہے لیکن در اصل اس کی خفگی کا رخ ان لوگوں کی طرف ہوتا ہے جو حق کی تکذیب کرتے ہیں۔

ان مختصر اشارات سے امید ہے کہ آیت کا صحیح مفہوم آپ کے سامنے آجائے گا۔ اگر کوئی بات مزید توضیح کی محتاج ہو تو اس کو مکرر دریافت فرما سکتے ہیں۔

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصہ اول

اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اِس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے

حصہ دوم

اس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کرکے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اِس وقت تک مُلک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصول اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ اِس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے:۔

حصہ سوم

مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش کا عملی حل کیا ہے، اسلامی حکومت کن اُصولوں پر قائم کیجاسکتی ہے، ایسا اقدام کرنے والے گروہ کو کن اُصولوں پر منظم کیا جاسکتا ہے، اور اِن اصولوں پر جس قدر اعتراضات وشبہات کئے جاسکتے ہیں اُن کا جواب کیا ہے؟ یہ تمام باتیں اِس حصہ میں شرح وبسط کے ساتھ بیان کردی گئی ہیں:۔

قیمت حصہ اول ۱-۴-۰ حصہ دوم ۲-۸-۰ حصہ سوم ۱-۱۲-۰

علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ ــ مکتبہ جماعت اسلامی دارالاسلام جمالپور، پٹھانکوٹ (پنجاب)